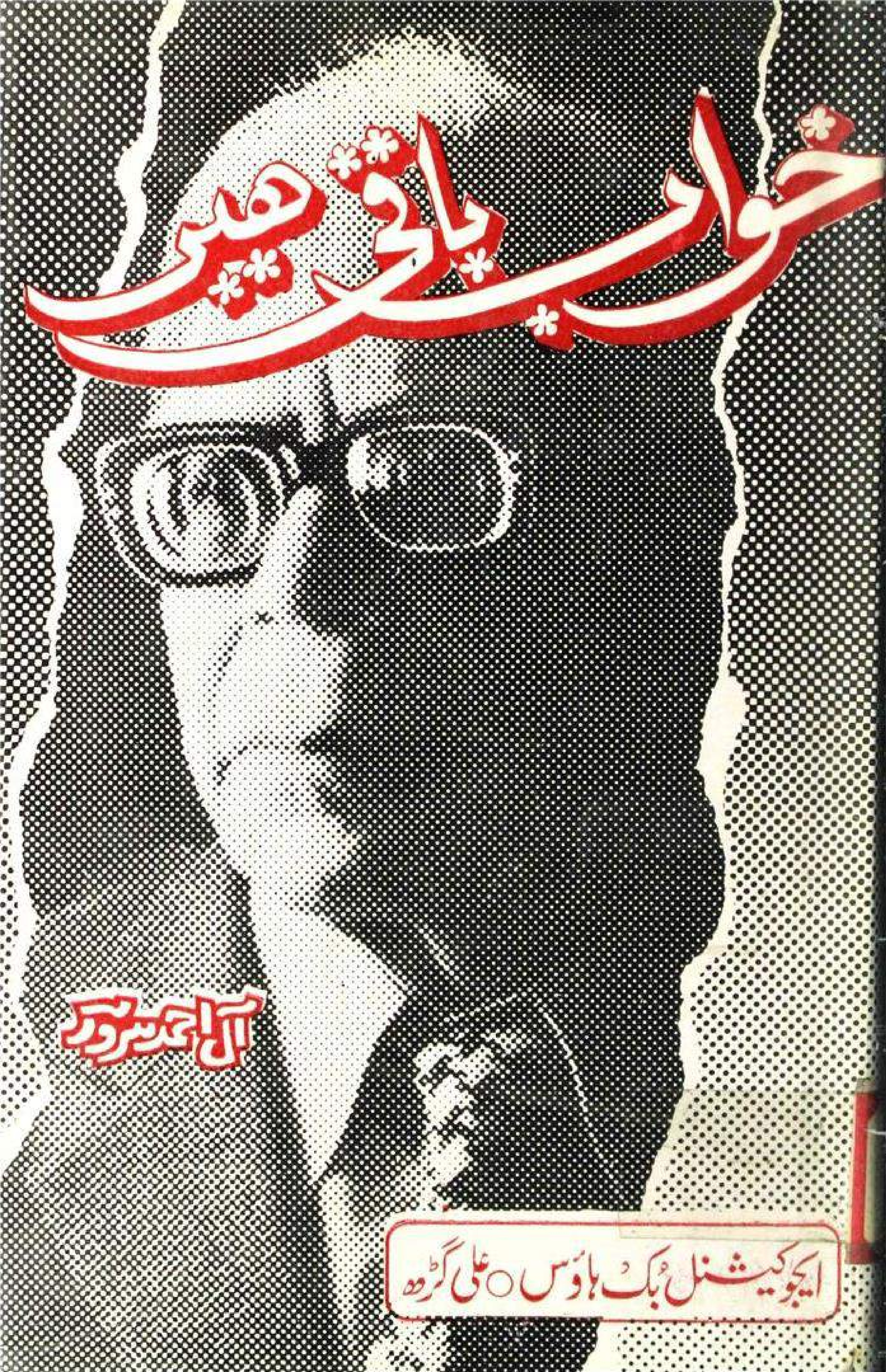

خواب باقی ہیں

آل احمد سرور

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

خواب باقی ہیں

(خود نوشت)

"ہزاروں خواب ہیں پامال لیکن خواب باقی ہیں"

آل احمد سرور

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

اشاعت	۱۹۹۱ء
قیمت	۱۵۰/-
مطبع	عام آفسٹ پرنٹرس، دہلی
کتابت	سلطان احمد، جمال پور

KHUAB BAQI HAIN

(AUTOBIOGRAPHY)

PROF. ALE AHMAD SUROOR

Published by

Educational Book House
MUSLIM UNIVERSITY MARKET
ALIGARH-202002

Price Rs. ________ 150/=
Edition ________ 1991

ایجوکیشنل بک ہاؤس
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

اپنے نواسے عرفی اور اپنی نواسیوں رخشی، تابی اور زرین کے نام

"اُمنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے"

(اقبال)

اعتراف

شاید الیٹ نے کہیں کہا ہے کہ ہر نئی کوشش ایک مختلف قسم کی ناکامی ہوتی ہے۔ مجھے یہ سطریں لکھتے وقت اس کا احساس ہے۔

یہ خود نوشت خاصے پس وپیش کے بعد لکھی گئی ہے۔ مجھے اس کا خیال تو بار ہا آیا لیکن باقاعدہ اور مسلسل اپنے حالات لکھنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا۔ کوئی چھ سات سال ہوئے میری ایک شاگرد نصرت اندرابی نے مجھ سے کہا کہ آپ خود تو لکھیں گے نہیں، اس لیے میں روزانہ کچھ وقت نکال لوں گی تاکہ آپ مجھے لکھوادیا کریں۔ یہ سلسلہ کوئی دس پندرہ دن ہی جاری رہ سکا کیوں کہ مجھے بول کر لکھوانے کی عادت نہیں ہے اور جب کبھی لکھوانے کا اتفاق ہوا ہے تو تشنگی کا احساس بھی رہا ہے۔ عام طور پر میں قلم برداشتہ لکھتا ہوں اور بعد میں عبارت کی نوک پلک درست کرتا ہوں مگر لکھوانے کے بعد تحریر میں بہت کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس لیے یہ سلسلہ بیس پچیس ۲۵ صفحے کے بعد منقطع ہو گیا۔

میں سری نگر سے علی گڑھ آیا تو اپنی بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کرنے کے ساتھ خود نوشت کا کام آگے بڑھانے کا بھی خیال آیا۔ اسی زمانے میں اپنے مضامین صاف کرانے کے لیے عزیزی امتیاز احمد کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ چنانچہ میں نے کچھ صفحے روزانہ لکھنے کا ارادہ کر لیا اور کوئی چھ مہینے میں خود نوشت کا بیشتر حصہ لکھا گیا اور صاف ہوتا رہا۔ اس عرصے میں کئی ناشروں نے اسے شایع کرنے کی پیش کش کی، مگر میں نے مناسب سمجھا کہ کتابت اپنی نگرانی میں سلطان احمد صاحب سے کراؤں اور کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ شایع کرے۔ امتیاز احمد، سلطان احمد اور اسد یار خاں مالک ایجوکیشنل بک ہاؤس کا شکریہ بھی واجب ہے۔ کتابت کے دوران کچھ اضافہ بھی ہوتا رہا۔

میری بیوی اکثر میری تحریریں تنقیدی نظر سے پڑھتی ہیں، ان کا کہنا یہ تھا کہ اس میں

"گھر کم ہے اور باہر زیادہ"۔ میں کوئی سرکاری افسر تو ہوں نہیں جس کے پاس دستاویزیں، دفتر کے ریکارڈ اور ڈائریاں محفوظ ہوں۔ میں نے تو اس داستان میں اپنی یادداشت پر بھروسہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اہم باتیں رہ گئی ہوں اور کچھ معمولی باتیں راہ پا گئی ہوں، کہیں کہیں تکرار بھی ہو گئی ہو گی۔ میں نے سارا مسودہ ایک دفعہ ضرور دیکھا ہے مگر چونکہ اپنے سے عشق میں مبتلا نہیں ہوں اس لیے بار بار نہ پڑھ سکا۔ ویسے بھی اپنی چھپی ہوئی تحریر صرف اس لیے دیکھ لیتا ہوں کہ کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی اور بس۔

اردو میں سب سے اچھی خود نوشت سید رضا علی کی 'اعمال نامہ' ہے اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی کی 'آشفتہ بیانی میری'، جوش کی 'یادوں کی برات' اور خواجہ غلام السیدین کی 'مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں' بڑی قابل قدر تصانیف ہیں۔ انگریزی میں اس صنف نے بہت بلندی حاصل کی ہے۔ میں نے ایسی خاصی تحریریں پڑھی ہیں لیکن برٹرنڈ رسل کی اور گراہم گرین کی اس ذیل میں تحریریں بہت پسند آئیں۔ دراصل خود نوشت کے سلسلے میں بھی اقبال کا یہ شعر رہبری کر سکتا ہے ؎

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

اپنی پوری زندگی پر نظر ڈالنا یعنی اس میں ڈوب جانا مگر اس سے ابھر بھی آنا کوئی آسان کام نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو اس میں داستان گو زیادہ نظر آئے۔ میں تو یہی عرض کر سکتا ہوں کہ واقعات جہاں تک یادداشت نے ساتھ دیا صحیح ہیں اور چونکہ یہ میری داستان ہے۔ اس لیے اگر اسٹیج پر روشنی میرے اوپر زیادہ ہے تو اس صنف کی مجبوری ہے۔ مجھے جہاں کچھ کرنے کا احساس ہے وہاں بہت کچھ نہ کر سکنے کا بھی۔ ہو سکتا ہے کہ بقول حسرت یہ "شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی" والی بات ہو۔ میں نہ تو اپنا قصیدہ پڑھنے کا قائل ہوں نہ بے جا انکسار کا۔ جس طرح وقت گزرا، جو سوچا، جو کیا، جو نہ کیا، جس طرح بکھرا اور سمٹا، ٹوٹا اور جڑا، جو پایا اور کھویا، اس کی جھلک تو بہرحال ان صفحات میں مل جائے گی۔ دیکھنا ہے اس کی پذیرائی کیسی ہوتی ہے۔

سرسید نگر، علی گڑھ
۱۰ ستمبر ۱۹۹۰ء

آل احمد سرور

حرفِ آغاز

بہت سیکھا، بہت سوچا، بہت زہ پی کے چھلکایا!
بہت توڑا، بہت جوڑا، بہت چاہا بہت پایا
مگر پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

خود نوشت سوانح لکھنا بظاہر بہت آسان ہے لیکن دراصل خاصا مشکل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کے واقعات کو کافی عرصہ گذر جانے کے بعد دہرانے میں مکمل معروضیت ممکن نہیں ہے۔ جو واقعات پہلے گذر چکے ہیں وہ بعد میں یا تو کچھ بڑھے اور پھیلے ہوئے یا کچھ چھوٹے اور سکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ صرف حافظے کی کرشمہ سازی نہیں ہے بلکہ وقت گذر جانے کے ساتھ آدمی کی شخصیت میں بھی کچھ تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ بچپن اور عنفوانِ شباب کی یادیں قدرتی طور پر کچھ زیادہ سنہری ہوتی ہیں۔ ان کے بیان میں جذباتیت سے مکمل طور پر رہائی ممکن نہیں ہے۔ پھر خود نوشت سوانح عمری کا فن چوں کہ محض نظارے نہیں، نظر کا بھی فن ہے۔ اس لیے سائنسی صحت اور واقعیت کے بجائے ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کی اہمیت شاید یہاں زیادہ ہے۔ خود نوشت تاریخ نہیں ہے مگر اس میں تاریخی حقائق ضروری ہیں۔ یہ واقعات کا خشک بیان بھی نہیں ہے۔ ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں ان کی داستان بھی ہے۔ واقعات اس لیے اہم ہیں کہ ان واقعات نے کیا تاثرات اور کیفیات عطا کی ہیں یعنی ان سے دل پر کیا گذری ہے۔ آپ بیتی جگ بیتی بھی ہے کیونکہ اپنی زندگی میں ایک فرد اپنے خاندان، ماحول، علمی اداروں، تحریکوں، شخصیات، تہذیبی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ ان سے بہت کچھ لیتا ہے اور شاید تھوڑا بہت ان کو دیتا بھی ہے۔ بہرحال کوشش یہ ہونی چاہیے کہ لکھنے والا اپنے ساتھ

ایمان داری برتے۔ وہ نہ تو یہ کوشش کرے کہ اپنی تلخیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان بیان کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے، نہ اپنے آپ کو خلاصۂ کائنات سمجھ کر ہر شخص اور واقعہ پر ہمالہ کی بلندی سے تنقید کرے، نہ اپنا کوئی بت بنا کر پیش کرے تاکہ لوگ اس کی پرستش کریں اور نہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے کسی نظریے کے شکنجے میں دم بدم بدلتی ہوئی متضاد، رنگارنگ، حیرت انگیز جلوہ ہائے نو بہ نو سے معمور زندگی کو کسی اشتہار بازی کی سرخیوں سے آلودہ کرے۔ جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی ایک فنِ لطیف۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی سچائی، بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے۔ اس کا راستہ بھی پل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔

میری زندگی خاصی بھرپور رہی ہے۔ میرا حال غالب کے اس شعر کے مصداق ہے ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مجھے آپ بیتی لکھنے کا خیال تو اکثر آیا مگر سچی بات یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اس کے لیے دیر میں تیار کیا۔ دو چار دفعہ ڈائری لکھنے کی کوشش کی مگر چند اندراجات سے آگے یہ سلسلہ نہ بڑھ سکا۔ میری زندگی میں کوئی نظم و ضبط نہیں ہے ہاں ایک آزاد رو ضرور ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا کسی کتاب، کسی جلوے، کسی منظر، کسی کیفیت نے متاثر کیا تو کچھ دیر کے لیے اسی کا ہو رہا۔ میرے ایک کرم فرما ہیں حبیب احمد صدیقی وہ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ آئی۔ اے۔ ایس کے آفیسر تھے۔ شاعر بھی ہیں اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ سرکاری کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود اپنی باقاعدگی کی وجہ سے لکھنے پڑھنے، شعر کہنے اور مخصوص دوستوں سے ملنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے، یعنی جب چاہتے تھے ایک دنیا کا سوئچ آف کر دیتے تھے اور دوسری کا آن کر دیتے تھے۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میرا سوئچ اس طرح آف یا آن نہیں ہو پاتا۔ اگر شاعری کا موڈ ہے تو جی چاہتا ہے کہ پھر دنیا کے دوسرے مخمصے اس بزم میں بار نہ پائیں۔ اگر کوئی اچھی کتاب پڑھ رہا ہوں تو پھر اس کو چھوڑ کر دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا میرے لیے آسان نہیں ہے۔ پھر میری کمزوری (یا شاید طاقت) یہ ہے کہ مجھے ہر چیز سے دلچسپی ہے۔ ادب سے تو عشق ہے ہی لیکن علم کی پیاس بھی ہے۔ پھر اپنے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر بھی نظر رہتی ہے۔ اقبال کی طرح حسنِ نسوانی میرے لیے بھی تجلی ہے فطرت کے مناظر بھی میرے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ میں ان مناظر سے صرف سکون ہی نہیں پاتا بلکہ ان سے ایک نئی توانائی، شخصیت میں ایک نئی شادابی اور زندگی کے لیے ایک نئی امنگ اور جینے کے لیے ایک نیا ولولہ پاتا ہوں۔ مجھے ذہنی INTELLECTUAL مشاغل سے گہری دلچسپی ہے۔ تعلیمی ادارے کدھر جا رہے ہیں، نئی نسلوں کی تربیت کس طرح ہو رہی ہے۔ ہمارے تعلیمی اور سیاسی نظام میں کیا خرابیاں در آئی ہیں اور انھیں کیسے دور کیا جا سکتا ہے، یہ سب فکریں بھی مجھے ستاتی رہتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو کوئی جینیس (GENIUS) نہیں سمجھتا۔ مجھے اپنے متعلق کوئی مغالطہ نہیں ہے۔ مگر میں بیجا انکسار کا بھی قائل نہیں ہوں۔ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، سوچا ہے، دیکھا ہے، بھگتا ہے۔ مجھے اپنے دور سے، اپنے ذاتی معاملے میں کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں نے چاہا بھی ہے اور چاہا بھی گیا ہوں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے کسی کی چاہت کا جواب نہ دیا اور ایسا بھی ہوا ہے کہ میری چاہت کا جواب نہ ملا۔ یہ تو زندگی میں ہوتا ہی ہے۔ لیکن مجھے کئی اچھے دوست ملے ہیں۔ گھر میں اور بیوی بچوں میں سچی مسرت ملی ہے۔ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ زیادہ تر بے مانگے ملا ہے۔ میں نے اپنے لیے بہت کم پیروی کی ہے۔ ہاں! کچھ مقاصد کے لیے، کچھ اداروں کے لیے، کچھ لوگوں کے لیے ضرور کوشش کی ہے۔ میں نے محبت میں سودے بازی نہیں کی ہے۔ نوجوانوں سے اور نئے میلانات اور تجربات سے مجھے برابر ہمدردی رہی ہے۔ مگر میں روایات کا عرفان ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اقبال کے الفاظ میں "نہ ملّا مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند" میں جدید دور کا انسان ہوں اور اس دور کو کسی سنہرے دور سے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوں گو اس دور کی برکتوں کے ساتھ اس کی لعنتوں پر بھی میری نظر ہے۔

میرا وطن بدایوں ہے۔ یہ مغربی اتر پردیش کا ایک تاریخی شہر ہے۔ اس کا پرانا نام بودھا سو تھا۔ مہاتما بدھ کے زمانے سے اس کا ذکر ملتا ہے۔ سیّد محفوظ علی بدایونی جو اُردو کے ایک ممتاز ادیب اور مزاح نگار تھے اور مولانا محمد علی اور ظفر علی خاں کے رفیق اور ساتھی، ہمدرد میں مُلّا بودھا موئی کے نام سے مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ ہمارے محلے کے قریب وہاں ایک جامع مسجد ہے جو التمش نے بنوائی تھی اور جامع مسجد شمسی کے نام سے مشہور ہے۔ اکبر کے زمانے میں اس کی تعمیرِ نو ہوئی۔ اس مسجد کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ شاید یہ دہلی کی جامع مسجد کے برابر ہے اور بچپن میں میرا خاصا وقت یہاں گذرا ہے۔ جب بھی میں بدایوں میں ہوتا تھا تو جمعہ کی نماز وہیں پڑھتا تھا۔ نماز کے بعد اکثر وہاں مذہبی یا سیاسی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ چناں چہ مولانا عبدالماجد بدایونی اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالحامد بدایونی کی تقریریں میں نے اکثر وہاں سنی ہیں۔ مجھے بچپن سے جلسوں، عرسوں اور مشاعروں میں شرکت کا بہت شوق تھا اور اب سوچتا ہوں کہ اس سے مجھے بڑا فایدہ ہوا۔ جامع مسجد کے ایک گوشے سے متعلق یہ روایت تھی کہ یہاں جنات نماز پڑھتے ہیں اور میں اکثر خوف اور تجسّس کے ملے جلے جذبے کے تحت اس گوشے میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ مسجد کا گنبد اتنا اونچا تھا کہ اگر زور سے اللہ اکبر کہا جاتا تھا تو آواز گونجتی تھی اور اس آواز سے مجھ پر اور میرے ساتھی بچوں پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی تھی مگر اس کی کشش بھی اب تک یاد ہے۔

بدایوں میں شہدا کے مزار اور زیارتیں بکثرت ہیں۔ مصحفی نے اپنے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
جس کے قدم قدم پہ مزارِ شہید ہے

مشہور زیارتوں میں شاہ ولایت صاحب (بدرالدین صاحب) سلطان جی صاحب، سیدمحمد صاحب،

(حضرت نظام الدین اولیا کے بڑے بھائی)، حضرت جمال الدین ملتانی اور میراں جی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہمارے محلّے کے قریب جامع مسجد کے دوسری طرف وہ حجرہ ہے جہاں حضرت نظام الدین اولیا نے دہلی جانے سے پہلے کچھ دن گذارے تھے۔ بدایوں دریائے سوت کے کنارے واقع ہے جو آگے جاکر رام گنگا میں ملتا ہے۔ اس کو پار کر کے شاہ ولایت صاحب اور سلطان جی صاحب کے مزارات ہیں۔ حضرت سید احمد صاحب کا مزار شہر سے تھوڑے سے فاصلے پر بریلی جانے والی سڑک کے قریب واقع ہے اور اس سڑک پر کچھ اور دور جاکر مُلّا عبدالقادر بدایونی کا مزار ہے۔ مُلّا نے جو اکبر کے دور کے ممتاز عالم اور مورخ اور منتخب التواریخ کے مصنف ہیں اپنے ایک قصیدے میں بدایوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بدایوں کے بجائے بدَون نظم کیا ہے۔ غالباً اس زمانہ میں شہر کا یہی نام ہو۔ ؎

اے صبا از من بگو اہلِ بدّون را سلام

زیارتوں اور مزارات کی کثرت کی وجہ سے گھر گھر بزرگوں کی فاتحہ اور عرسوں کا سلسلہ تھا۔ ہم لوگ شیخ صدیقی ہیں۔ مولوی رضی الدین کی تاریخ اکمل التواریخ سے، جس میں ہمارے بزرگوں کا ذکر ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مصر کے ایک قصبے فرشور سے آئے تھے اور ہمارا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن ابوبکرؓ سے ملتا ہے۔ میرے لکڑ دادا (دادا کے دادا) مولوی ذکراللہ شاہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے بزرگ تھے۔ ان کے والد کا نام محمد اشرف تھا۔ بچپن میں میں نے ایک سجع سنا تھا جس میں ذکراللہ شاہ صاحب اور ان کے والد محمد اشرف اور ان کے پیر سید آل احمد مارہروی تینوں کا نام بڑی خوبی سے نظم ہو گیا تھا ؎

ذکراللہ وثنائے آلِ احمد اشرف است

میرا نام آلِ احمد انھیں بزرگ کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ذکراللہ صاحب سید آل احمد مارہروی کے خلیفہ تھے۔ انھوں نے میرے پردادا احسان اللہ شاہ کو بھی خلافت عطا کی تھی ذکراللہ صاحب ایک دو منزلہ مکان کی بالائی منزل پر رہا کرتے تھے۔ یہ پتھر والا مکان کہلاتا تھا اور میری جوانی تک موجود تھا۔ ذکراللہ شاہ صاحب کا زیادہ وقت اپنے حجرے ہی میں گذرتا تھا۔ میرے پردادا نے ایک مسجد بنوائی تھی جو ہمارے آبائی مکان سے متصل تھی۔ اسی مسجد میں

وہ مدفون ہیں۔ میرے دادا حافظ محمد احمد کا انتقال تقریباً چالیس سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ یہ حج کرنے گئے تھے اور واپس آکر ایک مختصر سی بیماری کے بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میرے والد مولوی کرم احمد اس وقت ایم۔اے۔او (M.A.O) کالج علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے۔ وہ ایف۔اے پاس کر چکے تھے اور انھیں بی۔اے کرنے کی بڑی خواہش تھی۔ مگر والد کے انتقال کے بعد ملازمت کرنی پڑی۔ انھوں نے ایک پوسٹ آفس (ڈاک خانے میں) اور ایک آبکاری کے محکمے میں درخواست دی تھی۔ چوں کہ پہلے جگہ ڈاک خانے میں ملی اس لیے اسی محکمے میں چلے گئے۔

ہماری چھوٹی سی زمین داری تھی اور ایک آبائی مکان کے علاوہ ہمارے دادا نے ایک مکان اور بنوایا تھا جو کوٹھی کہلاتا تھا اور گھر کے سامنے ہی تھا۔ میرے پردادا احسان اللہ شاہ بھی ایک درویش صفت آدمی تھے۔ میرے پردادا کی ایک لڑکی میرے نانا کو بیاہی تھیں اور میری دادی میرے نانا کی بہن تھیں۔ میرے نانا مولوی حامد بخش شہر کے بڑے زمین داروں میں سے تھے اور بدایوں میں میونسپلٹی کے وائس چیرمین تھے۔ چیرمین اس زمانے میں کلکٹر ہوتا تھا۔ ان کے نام سے کئی نعتیہ دیوان شائع ہوئے تھے اور میں بچپن میں بیت بازی کے لیے اشعار انھیں دیوانوں میں سے تلاش کیا کرتا تھا۔ روایت ہے کہ دراصل وہ خود شعر نہیں کہتے تھے بلکہ ان کے چچا مولوی علی بخش شرر جو سر سید کے ایک مخالف کی حیثیت سے مشہور ہیں ان کے نام سے یہ دیوان چھپوایا کرتے تھے۔ اس روایت کی صحت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری بیوی کے دادا انھیں علی بخش شرر کے بھتیجے تھے۔ روایت ہے کہ مولوی علی بخش شروع میں غزل کہتے تھے اور ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔ مگر جب یہ دیوان مرتب کر کے اپنے پیر کے پاس لے گئے تو انھوں نے کہا تمھیں تو نعت و منقبت کہنا چاہیے۔ چناں چہ یہ دیوان انھوں نے رد کر دیا۔ ہاں! چار نعتیہ دیوان وہ بھی اپنے بھتیجے (میرے نانا) حامد بخش صاحب کے نام سے شائع کرائے۔ اس کے علاوہ ایک دیوان صنعت مہملہ (غیر منقوطہ) میں بھی تھا۔ شرر کے عشقیہ کلام کی ایک نقل شادی کے بعد ان کی کتابوں میں سے میں نے ڈھونڈ نکالی تھی اور اس کی نقل بھی کروائی تھی مگر وہ مکان بدلنے میں ضائع ہو گئی۔ ان کی ایک بیاض اشعار بھی مجھے ملی تھی جس میں انھی شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ شرر کے متعلق جو معلومات مجھے حاصل ہو سکیں وہ میں نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "[illegible]

ایک مخالف“ ہے۔ رسالہ اردو میں ۱۹۴۰ء میں شائع کرا دیا تھا۔ ہمارے خاندان میں کچھ توکل اور قناعت کی روایات رہی ہیں۔ چناں چہ ہمارے پردادا نے بہت سادہ زندگی گزاری وہ ہمارے گھر سے ملی ہوئی اس مسجد میں مدفون ہیں جو ہمارے پردادا نے بنوائی تھی ان کے متعلق اور اپنے میکے کے متعلق ہماری دادی نے جو مُلّی کہلاتی تھیں (ان کا نام مطیب النسا تھا) مجھے بہت سے قصّے سنائے تھے۔

میں جب حافظے کو کریدتا ہوں تو بچپن کی کچھ دھندلی اور بے ربط سی یادیں ذہن کو جگمگاتی ہیں۔ میری پیدائش ۱۵ رمضان ۱۳۲۹ھ کی ہے۔ تقویم کے مطابق یہ ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء ہوتی ہے میری دادی نے مجھے بتایا تھا کہ میں منجھلے روزے کو پیدا ہوا تھا۔ میری ماں اپنے میکے میں تھیں جب دردِ زہ شروع ہوا تو وہ میری دادی کے پاس آگئیں۔ والد اس زمانے میں نینی تال میں ملازم تھے اور والدہ زیادہ تر میکے میں رہتی تھیں۔ دادی کی روایت یہ تھی کہ میں آدھی رات سے کچھ پہلے پیدا ہوا ہوں لیکن چوں کہ والد کے الٰہ آباد کے تبادلے تک والدہ کا زیادہ قیام میکے میں رہتا تھا اس لیے میری ابتدائی یادیں بھی ننہیال سے وابستہ ہیں۔ ہمارے پانچ ماموں تھے اور بڑے ماموں مولوی وحید بخش کے یہاں میری والدہ کا قیام زیادہ رہتا تھا ان کی ایک بڑی بارعب شخصیت تھی اس لیے میں بچپن میں ان سے بہت ڈرتا تھا۔ اس زمانے میں بزرگ بچوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں ہوتے تھے۔ میں اپنے ماں باپ کی بیچ کی اولاد ہوں۔ ان کے اٹھارہ بچے ہوئے، بچے ہر سال ہوتے تھے اس لیے بہت سے شیر خواری میں فوت ہو گئے۔ صرف چھ اولادیں بڑی عمر کو پہنچیں۔ جن میں میں تیسرا ہوں۔ مجھ سے بڑے ایک بھائی اور ایک بہن تھیں۔ دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں جن میں سے سب سے چھوٹی زندہ ہیں۔ ایک چھوٹا بھائی خدا کے فضل سے اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اقتصادیات میں پروفیسر ہے۔ چھوٹی بہن کراچی میں ہیں۔ بڑے بھائی ابن احمد بڑے فرشتہ صفت آدمی تھے۔ صحت خراب رہتی تھی، ڈاکخانے میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال مارچ ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ میں اس زمانے میں امریکہ میں تھا بڑی بہن بیوہ ہو گئی تھیں اور نومبر ۱۹۲۵ء میں ذیابیطس کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ بچپن میں میری زیادہ تر دیکھ بھال انھوں نے ہی کی تھی اس وجہ سے میں ان سے بہت مانوس تھا۔ جب

ہیں ضد کرتا تھا اور کسی سے نہ سنتا تھا تو وہی مجھے مناتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ بچپن کی یادوں میں سب سے تلخ ماں کے طرزِ عمل سے وابستہ ہیں۔ مجھے پھنسیاں بہت نکلتی تھیں اور ایک طرف ان کی وجہ سے چراتیا اور شہتیرا پینا پڑتا تھا جو نہایت کڑوا ہوتا تھا اور دوسری طرف اماں جان میرے سر کے بالوں میں قینچی سے عملِ جراحی کرتی تھیں جس کی وجہ سے میں بہت رویا کرتا تھا اور اس زمانے میں جب اُن کو دیکھتا تھا تو شور مچانے لگتا تھا۔ اُس وقت میری بڑی بہن مجھے پیار کرتی تھیں اور خاموش کراتی تھیں۔ شاید میں اس وقت تین چار برس کا ہوں گا۔ ایک اور بچپن کی یاد جو نہایت شیریں ہے رمضان اور عید کی ہے۔ سحری کے لیے بڑے ماموں کے یہاں روغنی مٹی کے پیالوں میں کھیر تیار کی جاتی تھی اور صبح کو سب بچوں کو بھی ملتی تھی۔ اس کھیر کی شیرینی کا ذائقہ اب تک یاد ہے، یہ بھی یاد ہے کہ عید کا چاند ہونے کے بعد ایک دفعہ میرے کھٹولے پر میرے لیے عید کا جوڑا مع نئے جوتوں کے رکھ دیا گیا تھا اور میں ایک ایک چیز کو بڑے شوق سے دیکھتا اور آنکھوں سے لگاتا تھا ہماری ماں خاصی دبلی پتلی اچھے ناک نقشے کی تھیں۔ چار بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھیں اور چوں کہ انھیں اپنے بھائیوں سے بہت محبت تھی اس لیے اپنے بچوں پر زیادہ توجہ نہیں کرتی تھیں۔ والد کے الٰہ آباد کے قیام کے زمانے میں وہ ایک ہی دفعہ چند مہینے کے لیے الٰہ آباد گئی تھیں جہاں محلہ کٹرہ میں والد نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ الٰہ آباد کی صرف ایک یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے اور وہ وہاں کے برآمدے کی ہے۔ غالباً برسات کا زمانہ تھا میری آنکھیں دُکھنے آئی تھیں اور میری والدہ نے ایک سفید رنگ کا سفوف انگلیوں سے پپوٹوں پر ملا تھا جس سے بڑی سخت تکلیف ہوئی تھی لیکن بالآخر اسی سے کھٹک کم ہوئی تھی اور میں سو گیا تھا۔

رواج کے مطابق پانچ برس کی عمر میں میری بسم اللہ ہوئی۔ مجھے پڑھنے اور مکتب میں بیٹھنے کا اتنا شوق تھا کہ اس سے پہلے میں دوسرے رشتہ دار لڑکوں کے ساتھ جو مکتب میں پڑھتے تھے اور مجھ سے بڑے تھے بیٹھا کرتا تھا اور ان کا سبق سُنا کرتا تھا۔ میرے چھوٹے چچا مولوی شفیع احمد مجھے لے کر بسم اللہ کے لیے مولانا عبدالقدیر کے پاس گئے تھے۔ مولانا عبدالقدیر خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے، پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ غرض انھوں نے مجھے سورہ اقرا کی چند آیتیں پڑھائیں اور مٹھائی کا خوان جو ساتھ تھا اس پر نیاز کر کے حاضرین میں مٹھائی تقسیم کردی، چلیے ہمارا

مکتب ہو گیا۔ شاید کپڑے نئے بنے تھے۔ اس کے بعد میں ایک مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ اس زمانے کا دستور یہ تھا کہ خوش حال گھرانوں میں بچوں کو پڑھانے کے لیے کوئی نہ کوئی میاں جی رکھے جاتے تھے۔ پہلے بغدادی قاعدہ پڑھایا جاتا تھا اس کے بعد قرآن شریف شروع کرا دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ آمدنامہ اور پھر کریما، پھر گلستاں۔ میرے منجھلے ماموں کے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک مکتب تھا جس میں میرے منجھلے ماموں زاد بھائی فاروق بخش اور میں ایک میاں جی مولوی فیض بخش سے پڑھا کرتے تھے۔ یہ بہت باتونی آدمی تھے اور سبق دینے کے علاوہ بدایوں کے بزرگوں کے حالات اور واقعات بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ اس زمانے کی تعلیم میں علاوہ سبق پڑھنے کے تختی لکھنے کی بھی بڑی اہمیت تھی اور تختی کو دھونا، دھوپ میں سکھانا اور اس پر سلکھڑی لگانا ہم لوگوں کا بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ بازار سے قلم منگوائے جاتے تھے اور مولوی فیض بخش بڑے اہتمام سے قلم بناتے تھے اور اس پر قط رکھتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی مولوی فیض بخش سے پڑھنے پر مار کھائی ہو کیوں کہ مجھے سبق جلد یاد ہو جاتا تھا مگر میرا خط باوجود کوشش کے اچھا نہ ہو سکا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میری طبیعت میں صبر نہ تھا اور خوش خطی سیکھنے میں بڑا پتّا مارنا پڑتا ہے۔ میں نے بدایوں میں مکتب میں چند مہینے پڑھا تھا۔ قرآن شریف کے شاید تین چار پارے پڑھے ہوں گے اور آمدنامہ اور کریما ختم کر کے گلستاں شروع کی تھی کہ والد کا تبادلہ الٰہ آباد سے میرٹھ ہو گیا اور پہلی دفعہ میری والدہ جم کر ان کے ساتھ رہیں۔ یہ غالباً سن سولہ کے آخر کا واقعہ ہے۔ میرٹھ کے قیام کی بہت سی یادیں روشن ہیں۔ ہمارا مکان لال کرتی (چھاؤنی) میں تھا۔ والد بہت سویرے پانچ بجے اٹھ کر ڈاک خانے جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے پاس ایک نوجوان لڑکا غلام رسول رہا کرتا تھا جو سویرے اٹھ کر والد صاحب کے لیے سائیکل صاف کرتا اور ان کو دفتر کے لیے رخصت کرتا تھا۔ غلام رسول مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا اور میں اکثر اس کے پاس سویا بھی کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک کھجور، ایک جامن اور ایک کھرنی کا پیڑ تھا۔ اس وقت ہم دو بھائی تھے اور دو بہنیں۔ مکان کے پاس ایک نالہ تھا۔ ایک دن بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میری چھوٹی بہن جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی نہ جانے کس طرح پھسلی اور نالے میں گر گئی۔ یہ نالہ کوئی پندرہ بیس گز کے بعد ایک بڑے نالے میں گرتا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کھیلتے ہوئے میں نے اپنی چھوٹی بہن

(تصویر فاطمہ) کے رونے کی آواز سنی جو آہستہ آہستہ بڑے نالے کی طرف بڑھ رہی تھی، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور شور مچایا تو اندر سے والدہ دوڑی ہوئی آئیں اور کسی طرح ہم نے اسے نکالا۔ اس کی پیشانی پر بائیں طرف نالے میں گرنے کی وجہ سے اچھا خاصا زخم لگا تھا جس کا نشان ساری عمر رہا۔ بعد میں وہ مجھے چھیڑا کرتی تھی کہ تم نے مجھے نالے میں ڈھکیل دیا تھا اور میں کہا کرتا تھا کہ اگر میں نے ڈھکیلا تھا تو پھر نکالا بھی تو تھا۔ پڑوس میں ایک ہندو ڈاکٹر رہتے تھے اور میں اُن کے پاس اکثر جایا کرتا تھا وہ مجھے بابو لوگ کہتے تھے۔ اکثر وہ پوجا کرتے ہوتے اور میں ان کے پوجا کے کمرے میں گھس جاتا تھا۔ ان کی مہری جب مجھے پوجا کے کمرے میں جاتے دیکھتی تھی تو بڑا شور مچاتی تھی۔ یہ مہری اس وجہ سے بھی یاد ہے کہ وہ سوائے دھوتی کے اوپر کوئی کپڑا نہیں پہنتی تھی۔ جب کبھی میں ڈاکٹر صاحب کے پوجا کے کمرے میں گھس جاتا تھا تو وہ خفا ہونے کے بجائے خاموشی سے مجھے گود میں اٹھا کر کمرے سے باہر نکال دیتے تھے اور دروازہ بند کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ میں کودتا اچھلتا ہوا ان کے پاس گیا۔ کمرے میں شیشے کا کوئی ٹکڑا پڑا ہوا تھا وہ میرے پیر میں گھس گیا اور میں چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب پوجا چھوڑ چھاڑ کر مجھے گود میں لے کر بھاگے، مرہم پٹی کی گئی، کئی دن تک میری بڑی خاطر ہوتی رہی اور سارے گھر والے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ یاد پڑتا ہے کہ اچھا ہو جانے کا افسوس ہوا تھا۔ ہاں اس کے بعد مہری مجھے ڈاکٹر صاحب کے پاس جانے سے روکتی نہ تھی۔

پڑوس میں ایک مسلمان گھرانہ بھی تھا جس میں ایک لڑکی مجھ سے دو تین سال بڑی تھی اس کا نام غالباً عائشہ رہا ہو گا۔ مگر ہم لوگ اسے آشا کہتے، یہ لڑکی اکثر دلہن بنتی اور مجھے دولہا بناتی۔ اپنا دوپٹہ ہم دونوں پر ڈال لیتی۔ یہ سب باتیں بہت عجیب اور پراسرار معلوم ہوتی تھیں ان میں ایک بے نام سی لذت بھی تھی۔

۱۹۱۹ء میں والد کا تبادلہ میرٹھ سے پیلی بھیت ہو گیا۔ میرٹھ سے ہمارا خاندان برابر بدایوں جاتا رہتا تھا اور اب یاد آتا ہے کہ بدایوں میں مجھے انگریزی شروع کرائی گئی تھی۔ میرے منجھلے ماموں کے یہاں بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک ماسٹر رہتے تھے۔ وہ کچہری میں کلرک تھے۔ مگر ماموں کے یہاں قیام و طعام کے عوض میرے ماموں زاد بھائیوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ میرٹھ سے ہم لوگ آئے

تو مجھے بھی چند ماہ یہاں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ماسٹر صاحب جن کا نام محمد علی تھا ذرا سی بات پر مار بیٹھتے تھے۔ ہمارے ماموں زاد بھائی تو برابر پٹتے رہتے تھے مگر مجھے مارنے کا انھیں کوئی موقع نہ ملا تھا کیوں کہ مجھے بے پڑھے اُستاد سے پڑھنے کے بعد سبق یاد رہتا تھا۔ جب میری کنگ ریڈر (KING READER) ختم ہوئی تو جمعرات کا دن تھا۔ جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی۔ ماسٹر صاحب نے چھٹی دیتے ہوئے کہا کہ کم از کم تین دفعہ پوری کتاب پڑھنا میں سوال پوچھوں گا۔ تیسرے دن انھوں نے اِدھر اُدھر سے سبق پڑھوائے لفظوں کے ہجے اور معنی پوچھے۔ بعض الفاظ کے جملے بنوائے۔ غرض کہ کوئی آدھے گھنٹے تک خوب رگیدا مگر میں نے باوجود نروس ہونے کے ہر بات کا صحیح جواب دیا۔ اب ماسٹر صاحب کو مارنے کا کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ چناں چہ انھوں نے پوچھا کہ کتاب کتنی دفعہ پڑھی تھی۔ حالاں کہ میں نے کتاب کھول کر بھی نہیں دیکھی تھی مگر ڈر کے مارے اتنا کہا کہ (سچ ہے زیادہ تر جھوٹ ڈر کے مارے بولے جاتے ہیں جان کر کم بولے جاتے ہیں) ایک دفعہ پڑھی تھی۔ بس پھر کیا تھا ماسٹر صاحب نے ایک زوردار چانٹا رسید کیا جس سے میرے گال پر پانچوں انگلیوں کے نشان پڑ گئے اور کہا کم بخت تین دفعہ کیوں نہیں پڑھی۔ اس کے بعد میں روتا ہوا اتاں کے پاس گیا اور کہا میں ان سے نہیں پڑھوں گا کیوں کہ سبق یاد نہ ہونے پر مار کھانا میرے نزدیک جائز تھا مگر سبق یاد ہونے کے باوجود پٹنا میرے نزدیک ایک ظالمانہ فعل تھا۔ اس وقت میرے ننھے سے دماغ میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ جھوٹ بولنا تھا تو پورا جھوٹ بولتے اور تین دفعہ کہہ دیتے لیکن شاید ماسٹر صاحب مارنے کا کوئی اور بہانہ نکال لیتے۔

ہم لوگ سن انیس میں پیلی بھیت میں تھے۔ یہاں پہلی دفعہ والد پوسٹ ماسٹر تھے اور ڈاک خانے کے ساتھ ہی ہم لوگوں کا مکان تھا۔ وہاں مجھے قریب کے ایک مکتب میں بٹھلایا گیا۔ بدایوں میں قرآن شریف صرف شروع کرایا گیا تھا لیکن اس مکتب میں میں نے سال بھر سے زیادہ پڑھا اور پورا قرآن شریف ختم کیا۔ مکتب میں میرے ساتھ کئی لڑکے میرے ہم عمر تھے اور کچھ مجھ سے بڑے بھی تھے۔ ہم عمروں میں سجاد حیدر یلدرم کے ایک بھانجے امتیاز حیدر، شیخ قمرالدین کے لڑکے کریم الدین اور شہر کے ایک توحید بخش یاد آتے ہیں۔ مولوی صاحب باری باری سے ہر ایک کو سبق پڑھاتے اور باقی وقت ہم سبق یاد کرنے میں صرف کرتے۔ میرٹھ میں غلام رسول اور پیلی بھیت میں

ڈاکخانے کا ایک ملازم یہ دو اشخاص ایسے یاد آتے ہیں جو مجھے قصے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ بیلی بھیت کا چپراسی ہندو تھا اور وہ زیادہ تر رامائن اور مہابھارت کے قصے سنایا کرتا تھا۔ ڈاکخانہ محلہ پکڑیا میں تھا۔ جہاں سے ایک دریا دیوہا قریب تھا۔ یہ دریا آگے چل کر رام گنگا میں مل جاتا ہے۔ میں اکثر کسی نہ کسی کے ساتھ دریا کے کنارے جایا کرتا تھا۔ ڈاکخانے کی نئی عمارت شہر سے باہر اور ریلوے اسٹیشن کے قریب بن رہی تھی۔ جب یہ ۱۹۲۰ء میں مکمل ہوئی تو ہم لوگ وہاں منتقل ہو گئے۔ میرا قرآن شریف ختم ہونے والا تھا۔ اس لیے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں بغیر کسی کو اطلاع کیے گھر سے دو ڈھائی میل چل کر اپنے مکتب پہنچا اور وہاں سے شام کو واپس ہوا۔ دو تین روز کے بعد والد نے یہ انتظام کیا کہ میں دوپہر کا کھانا مولوی صاحب کے ساتھ جا کر ان کے گھر کھاتا اور شام کو کوئی آدمی مجھ کو گھر پہنچا دیتا۔ مکتب میں پہلی دفعہ بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے اس وقت بے خبر تھا۔ حافظ جی کے آنے سے پہلے مجھ سے بڑی عمر کے لڑکے، لڑکیوں اور لڑکوں کے متعلق بعض ایسی باتیں کہتے جن کا مجھے پہلے علم نہ تھا۔ کئی دفعہ بعض بڑی عمر کے لڑکوں نے مجھے بھی ورغلانا چاہا لیکن خاندانی روایات کی وجہ سے میں طرح دے گیا۔ میرے چھوٹے چچا اس زمانے میں وہاں موجود تھے وہ مجھے انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا میری تربیت میں بڑا حصہ ہے۔ وہ اکثر گھر کے بچوں کو جمع کر کے انھیں نظمیں سناتے، شعر یاد کراتے اور ان کی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں ہم محلہ پکڑیا سے ریلوے اسٹیشن کے قریب ڈاکخانے کی نئی عمارت میں منتقل ہو گئے۔ بیلی بھیت ترائی میں ہے۔ برسات میں نئے مکان میں سانپ بہت نکلتے تھے۔ کنوئیں میں پانی اتنا اونچا ہوتا کہ گز ڈیڑھ گز سے ڈول بھر لو۔ مجھے یاد ہے کہ اس سال میں نے پہلی دفعہ روزہ رکھا۔ سہ پہر سے پیاس کے مارے بری حالت تھی مگر کسی نہ کسی طرح برداشت کیا۔ افطار کے وقت خوشی صرف اس کی نہیں تھی کہ کھانے پینے کا موقع ملا بلکہ اس بات کی بھی تھی کہ بڑوں کی طرح روزہ رکھا۔

غالباً ۲۰ء کے اکتوبر یا نومبر میں یہ طے ہوا کہ میرا اسکول میں داخلہ کرا دیا جائے۔ ہیڈ ماسٹر سیٹھ سے والد کی ملاقات تھی۔ چناں چہ داخلے کے لیے ٹیسٹ ہوا۔ انگریزی کے ماسٹر کا نام شنکرن

تھا۔ انھوں نے جو پوچھا بے جھجک بتادیا۔ حساب میں بہت کمزور تھا چناں چہ ماسٹر منوہر لال نے جو سوالات دیے سب کے جواب غلط تھے۔ جغرافیہ میں بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ اسکول جاتے وقت بڑے بھائی نے جو نویں درجے میں پڑھتے تھے یہ بتایا تھا کہ پیلی بھیت کے ضلع میں تین تحصیلیں ہیں: پیلی بھیت، پورن پور، اور بیسل پور۔ جغرافیہ کے ماسٹر صاحب نے سب سے پہلے یہی سوال کیا اور اس کا میں نے صحیح جواب دیا۔ غرض سوائے حساب کے سب مضامین میں پاس ہو گئے۔ اردو کے امتحان میں تو کئی شعر بھی سنا دیے لیکن حساب میں فیل ہونے کی وجہ سے اس وقت داخلہ نہ ہوا۔ بعد میں ۱۷ر جنوری ۱۹۲۱ء کو ایک دن صبح والد صاحب نے بڑے بھائی کو حکم دیا کہ مجھے ساتھ لے جاکر میرا داخلہ کرادیں اور تیسرے درجے میں میرا داخلہ ہوا۔ اپریل میں سالانہ امتحان ہوا۔ اگرچہ پڑھائی پر نہ میں نے کوئی توجہ کی نہ میرے والدین نے مگر کلاس میں دوسری پوزیشن آئی اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہال میں نتیجے کا اعلان کرتے وقت پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن لانے والوں کو ڈائس پر بلا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ اسکول کے ماسٹروں میں ایک خاص طور پر یاد ہیں۔ ان کا نام عباد الرحمٰن خاں تھا۔ یہ اس وقت اگرچہ ہائی اسکول پاس تھے مگر ہیڈ ماسٹر کی ناک کا بال تھے۔ بعد میں ترقی کرکے یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ کے صدر ہوئے اور پھر یوپی میں ڈائرکٹر ایجوکیشن بن گئے۔

یہ اور دوسرے حضرات اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ میں چوں کہ بہت چھوٹا تھا اس لیے مجھے میز پر بٹھادیا جاتا اور مجھ سے اسماعیل میرٹھی یا حالی کی کوئی نظم سنی جاتی تھی۔ اسکول ہمارے گھر سے بہت قریب تھا۔ میرے چھوٹے چچا کی شادی اسی سال ہوئی تھی، ہماری چچی بڑی خوبصورت تھیں اور میں اکثر ان سے لپٹا رہتا تھا۔ میری والدہ اس وجہ سے مجھ پر ناراض بھی ہوا کرتی تھیں۔ میں نے پیلی بھیت میں چوتھے درجہ میں تین چار مہینے پڑھا تھا کہ والد صاحب نے چھٹی لی اور ہم لوگ بدایوں آ گئے۔ یہاں میرا اکتوبر ۱۹۲۱ء میں چوتھے درجے میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخلہ ہوا۔ وہاں ماسٹر عبدالغنی ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ مولوی ممتاز احمد اردو پڑھاتے تھے اور مولوی اعزاز عالم ہیڈ ماسٹر تھے۔ ششماہی امتحان شروع دسمبر میں ہوا تھا۔ آخر دسمبر میں چھٹیوں سے ایک دن پہلے کلاس ہو رہا تھا کہ اعزاز عالم صاحب ایک رجسٹر

لیے ہوئے داخل ہوئے اور انھوں نے امتحان کا نتیجہ سنایا اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ میری فرسٹ پوزیشن تھی حالاں کہ مجھے اسکول میں داخل ہوئے مہینے دو مہینے ہی ہوئے تھے۔

مارچ ۱۹۲۲ء میں میری بڑی بہن کی شادی میرے ایک ماموں زاد بھائی سے ہوئی تھی۔ چوں کہ میرا سالانہ امتحان ہونے والا تھا اس لیے مجھے دادی کے پاس بدایوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ والدہ اور والد بجنور چلے گئے تھے۔ طے یہ تھا کہ اپنے امتحان کے بعد دادی کے ساتھ میں بھی بجنور جاؤں گا۔ میرے چھوٹے چچا بھی گھر پر تھے۔ اس زمانے میں رمضان شروع ہوا۔ دادی مجھے خاندان کے بزرگوں کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ تیسرے یا چوتھے رمضان کو انھیں بخار آگیا اور دو تین دن میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ پہلی موت تھی جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی میں دادی سے بہت مانوس تھا اور اتفاق سے جب ان کا دم نکلا تو میں ہی ان کے پاس تھا (چھوٹے چچا گھر سے لگی ہوئی مسجد میں تراویح پڑھنے گئے ہوئے تھے)۔ میں روتا ہوا ان کو بلانے گیا اور وہ جلدی سے رکعت ختم کر کے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد گھر عزیزوں سے بھر گیا۔ والد کو دادی کی علالت کی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ انتقال سے کچھ دیر بعد رات میں پہنچے اور صبح تدفین ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تدفین کے بعد والد زار و قطار رو رہے تھے اور میری والدہ ان کو ڈانٹ رہی تھیں کہ مرد ہو کر بچوں کی طرح روتے ہو۔

چند روز بعد میرے سالانہ امتحان کے نتیجے کا اعلان ہوا اور میں فرسٹ آیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہی ہم بجنور چلے گئے جہاں جولائی میں پانچویں درجے میں میرا داخلہ ہوا۔ اس زمانہ میں بجنور کے لیے نگینے سے بس جاتی تھی اور چوں کہ ڈاک کے لیے بس کا الگ انتظام تھا اس لیے میں اکثر ٹھیکے دار کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ ٹھیکے دار کی منظور نظر ایک عورت تھی جس سے سب لوگ مذاق کیا کرتے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ آتا تھا کچھ نہ آتا تھا کہ سب لوگ اس عورت کو کیوں چھیڑا کرتے ہیں۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مہدی حسن ناصری تھے جن کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

ناصری قبر پہ عبرت کے لیے لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شب تنہائی نے

ناصری صاحب لمبے تڑنگے سیاہ فام تھے۔ میرے والد کے پاس اکثر آیا کرتے تھے اور اپنے انگریز ڈائرکٹر کے قصے سنایا کرتے تھے۔ ایک قصہ اب تک یاد ہے۔

یہ ڈائرکٹر لمبی بات پسند نہیں کرتا تھا چناں چہ داخلے کے ایک امیدوار اس کے پاس گئے۔ اس نے پوچھا تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا: "داخلہ" صرف اس بات پر اس کا داخلہ کر دیا گیا جب کہ اس سے پہلے کئی لوگوں نے جب اپنی بپتا سنائی تھی تو ان کو ناراض ہو کر نکال دیا گیا تھا۔

میں کبھی کورس کی کتابیں گھر پر پڑھتا نہیں تھا جو کلاس میں پڑھایا جاتا تھا یاد ہو جاتا تھا میرے والد کا معمول یہ تھا کہ وہ روزانہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر مطالعہ کرتے تھے۔ انگریزی یا اُردو کی کوئی کتاب، کوئی ناول یا تاریخ یا کوئی مذہبی کتاب۔ انگریزی کی کتابیں تو اس وقت میری سمجھ میں نہ آتی تھیں لیکن اُردو کی کوئی کتاب بغیر پڑھے نہ چھوڑتا تھا۔ بدایوں میں بھی اکثر یہ ہوتا تھا کہ طلسم ہوشربا کی کوئی جلد ہاتھ لگ گئی اب صبح سے شام تک اسی طلسم میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ابن خلدون اگر ہاتھ آ گئی تو اس کی کئی جلدیں پڑھ ڈالیں۔ مراۃ العروس اور توبۃ النصوح بھی اسی زمانے میں پڑھ لی تھیں۔ والد کی کتابیں پڑھتے اگر پکڑا جاتا تو ناول پڑھنے پر ضرور ڈانٹ پڑتی تھی ویسے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ چناں چہ پانچویں درجہ میں بھی میں اُردو کی بہت سی تاریخی کتابیں، بہت سے شعراء کے دیوان اور بہت سی ناولیں پڑھ چکا تھا۔ دسمبر کے مہینے میں امتحان سے پہلے والد کا تبادلہ سیتا پور ہو گیا تھا اور آخر دسمبر میں ہم لوگ سیتا پور پہنچ گئے۔ وہاں ایک عیسائی (DANIEL) سے والد صاحب نے چارج لیا۔ سیتا پور کا اسکول گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ چناں چہ میں تقریباً ڈیڑھ دو میل پیدل جایا کرتا۔ اسی زمانے میں مجھے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت پڑ گئی۔ گھر سے چلتا تو کبھی اپنے آپ کو فاتح سمجھتا، کبھی مصنف، کبھی بڑا افسر۔ اس طریقے سے راستہ کٹ جاتا۔ سیتا پور کی چند یادیں اب تک نقش ہیں۔ ایک تو یہ کہ والد فسانۂ آزاد پڑھ رہے تھے، میرا سالانہ امتحان سر پر تھا۔ اس زمانے میں فسانۂ آزاد پڑھتا ہوا پکڑا گیا۔ والدہ نے شکایت کردی چناں چہ والد نے خوب کان کھینچے۔ مجھے یاد نہیں کہ والد نے مجھے کبھی مارا ہو لیکن کان اس زور سے کھینچتے تھے کہ میں بلبلا جاتا تھا ہاں والدہ کے ہاتھوں سے

کئی دفعہ مار کھائی ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ DANIEL صاحب جو ڈاکخانے کے احاطے ہی میں علیحدہ کوارٹر میں رہتے تھے کبھی کبھی رات کو کسی ضرورت سے یا کسی سے ملنے جایا کرتے تھے اور چوں کہ ان کی بیوی اکیلی ہوتی تھیں اس لیے والد سے کہہ کر مجھے دو سرات کے لیے بلا لیا کرتے تھے، عام طور پر دس گیارہ بجے وہ واپس آجاتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ آئے اور میں گھر واپس آنے لگا تو انھوں نے مجھے لپٹا کر پیار کیا اور میرا منہ چوما، میں جلدی سے اپنے آپ کو چھڑا کر گھر آگیا۔ اگلی دفعہ جب انھوں نے والد صاحب سے کہا کہ مجھے پھر چند گھنٹوں کے لیے جانا ہے لڑکے کو بھیج دینا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ والد نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا وہ مجھے پسند نہیں ہیں کیوں کہ وہ مجھے اچھے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔ والد خاموش ہو گئے اور انھوں نے DANIEL صاحب کو ٹال دیا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے جس پر مجھے اب بھی حیرت ہوتی ہے۔ ہمارے ڈاکخانے میں ایک ہندو کلرک تھے جن کا نام تو اب یاد نہیں لیکن ان کا تخلص یاد ہے وہ عاصی تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے معلوم نہیں کیوں مجھے اپنا کلام سنایا، مجھے کچھ مصرے ناموزوں معلوم ہوئے اور میں نے ان پر یہ بات واضح کر دی وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے کہا میری بیاض پر آپ نظرِ ثانی کیجیے۔ چناں چہ کئی نظموں اور غزلوں میں میں نے ناموزوں مصرعوں کو موزوں کیا اور بعض الفاظ بدلے۔ مادری زبان کے ساتھ موزونیت کا احساس بھی آتا ہے۔

سیتاپور میں ہم لوگوں کا قیام بجنور کی طرح مختصر ہی رہا اور نومبر میں ہم گونڈے آگئے۔ سیتاپور سے میں نے پانچویں درجے کا امتحان پاس کیا تھا اور چھٹے درجے میں تھا۔ چناں چہ اس چھٹے درجے میں گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں میرا داخلہ ہوا۔ سیتاپور میں ایک عیسائی ٹامسن ہیڈ ماسٹر تھے۔ گونڈے میں جو ہیڈ ماسٹر تھے ان کا نام رام پرشاد تھا۔ شاید یہی رام پرشاد ہیں جنھوں نے اقبال کے ساتھ تاریخ کی کچھ درسی کتابیں لکھی تھیں۔ یہ کئی اُردو کتابوں کے مصنف تھے اور اکثر اسکول کے سب لڑکوں کو جمع کر کے تقریریں کیا کرتے تھے۔ گونڈے کا اسکول بھی گھر سے بہت دور تھا۔ چناں چہ میرے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت یہاں آکر اور مستحکم ہو گئی۔

شاعری سے دل چسپی تو بدایوں میں بیت بازی کے رواج اور عرسوں اور مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے بہت کم عمری سے تھی مگر پہلی نظم میں نے آگرے میں کہی تھی جب میں چھٹیوں میں بڑے چچا کے پاس گیا ہوا تھا جو وہاں ٹریننگ کالج میں ہڈ کلرک تھے۔ اس زمانے میں مولوی رحمان بخش قادری جن کی لڑکی سے بعد میں میری شادی ہوئی ڈپٹی کلکٹر نامزد ہو کر آئے تھے۔ ماں کی طرف سے ان سے ہماری رشتے داری بھی تھی اور بڑے چچا سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی۔ چنانچہ روزانہ شام کو چچا صاحب مجھے لے کر ان کے ہاں جایا کرتے تھے جہاں گھنٹے دو گھنٹے احباب کی محفل جمتی تھی، چوں کہ مجھے شعر بہت یاد تھے اور چھوٹی موٹی تقریر بھی کر لیتا تھا اس لیے اکثر یہ لوگ تفریح طبع کے لیے مجھ سے کچھ نہ کچھ سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے شراب کے مضر اثرات پر کسی رسالے کی ایک نظم دیکھ کر اور اس میں کچھ لفظ بدل کر اپنے نام سے پڑھ دی اس پر بڑی واہ واہ ہوئی اور ہم شاعر تسلیم کر لیے گئے۔ تک بندی کا سلسلہ اس کے بعد سے شروع ہو گیا، لیکن اس پہلی حماقت کے بعد پھر میں نے کسی اور کی نظم کو تختۂ مشق نہیں بنایا اور اپنے طور پر شعر موزوں کرتا رہا۔

آگرے کے اسی زمانے کے قیام کا ایک واقعہ اور یاد آتا ہے۔ میری بڑی چچی کی والدہ سوتیلی تھیں اور ان کی بیچ بڑے خالو سے شادی ہوئی تھی۔ یہ شاہ جہاں پور کی پٹھانی تھیں۔ خالو اس زمانے میں آگرے میں تھے اور نمک کے محکمے میں ملازم تھے۔ انھیں دورے پر جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ چچا سے یہ طے ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں سوتیلی خالہ کے پاس میں رہوں۔ چچا نے رسالہ زمانہ کے کچھ پرچے لائبریری سے نکلوا کر مجھے دیے تھے میں نے ایک یا دو دن میں پڑھ ڈالے۔ خالہ مجھ سے رشتہ داروں کو خط لکھوایا کرتی تھیں جن میں یا تو عزیزوں کی شکایتیں ہوتی تھیں یا مٹھائیوں کی فرمائش۔ یاد رہے کہ اس سال میں نے چوتھے درجے کا امتحان پاس کیا تھا۔ خط لکھتے لکھتے اکتا گیا، رسالے بھی سب پڑھ چکا تھا۔ چنانچہ چچا کے یہاں سے خیریت دریافت کرنے کوئی چپراسی آیا اور میں بغیر خالہ سے کہے اس کے ساتھ شہر سے شاہ گنج آ گیا جہاں چچا رہتے تھے، مجھے دیکھ کر چچا نے برہمی ظاہر کی کہ خالہ کو اکیلا چھوڑ کر کیوں آئے۔ ادھر بعد میں خالو بہت خفا ہوئے، مگر میں نے کہا کہ میرا دل گھبرا رہا تھا کیوں کہ پڑھنے کو کچھ نہ تھا۔ اس سفر میں میرے

خالو زاد بھائی اور دوست افضال حسین قادری بھی میرے ساتھ تھے۔ میرے بڑے چچا کو بھی مطالعے کا شوق تھا وہ ٹریننگ کالج میں ہیڈ کلرک تھے۔ پڑھنے کے لیے لائبریری سے اکثر کتابیں لایا کرتے تھے میں بھی انھیں پڑھا کرتا تھا۔ ایک جلد میں کوئی "تاریخ اور نشتر" نام کا ناول تھا۔ میں یہ ناول پڑھ رہا تھا۔ افضال نے چچا سے شکایت کردی اور ناول پڑھنے پر ڈانٹ پڑی۔ آگرے کے قیام کے زمانے میں چچا بھی مجھے تاج محل، سکندرہ اور اعتماد الدولہ کا مزار دکھانے لے گئے تھے۔ اب ساری باتیں تو یاد نہیں۔ ہاں یہ یاد ہے کہ تاج محل کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ سکندرہ میں اکبر کے مزار میں سنگِ موسیٰ کی قبر دیکھ کر ہیبت طاری ہو گئی تھی اور اعتماد الدولہ کے مزار کی جالیاں بہت اچھی لگی تھیں، کچھ دن کے بعد ہم بدایوں واپس آگئے تھے۔ جولائی میں بجنور چلے گئے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے بدایوں کا ذکر کردیا جائے۔ ہم لوگ مولوی ٹولہ میں رہتے تھے جو جامع مسجد سے قریب تھا۔ اس سے آگے چل کر محلہ سوتھا آتا تھا جہاں ہماری ننہیال تھی۔ مولوی ٹولہ کے دوسری طرف سید واڑہ اور قاضی ٹولہ مشہور محلے تھے۔ مولوی ٹولے سے ملا ہوا فرشوری ٹولہ تھا جہاں سے زیارت کو راستہ جاتا تھا۔ یہ زیارت مولوی عبدالقادر بدایونی اور مولوی عبدالمقتدر بدایونی کی تھی۔ محرم کے مہینے میں مولوی عبدالمقتدر کا عرس بڑی دھوم سے ہوتا تھا، عرس میں تقریروں کے علاوہ نعت اور منقبت کی نشستیں بھی ہوتی تھیں میں ان عرسوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتا تھا۔ اس زمانے میں بدایوں میں جن شعرا کی شہرت تھی وہ تھے تولا بدایونی، محمد مبین نازش، مجتہد الدین عیش، عبدالجامع جامی بدایونی، یعقوب بخش راغب، کفیل الدین حالی، اکرام احمد لطف اور غلام سجاد تسکیں جو فارسی میں کہتے تھے۔ قاضی غلام امیر کی لڑکی کی شادی میرے چھوٹے ماموں سے ہوئی تھی اس لیے ہم لوگ کبھی کبھی قاضی ٹولے بھی جایا کرتے تھے۔ یہ قاضی غلام امیر، ذوق کے قائل تھے غالب کے نہیں۔ اس زمانے میں قمر بدایونی کی بھی شہرت تھی مگر یہ عرسوں میں نہیں جاتے تھے۔ ایک اور شاعر مولوی عطا احمد تھے جو ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ چھوٹی سی زمین داری تھی اور شاعری اور مقدمہ بازی یہی دو مشغلے تھے۔ یہ قصیدہ کہا کرتے تھے۔ ان کے یہاں شام کو اکثر نشستیں رہتی تھیں اور

میں ان میں شریک ہوتا تھا۔ یہ ہر لفظ کو بہت کھینچ کر پڑھتے تھے۔ ان کا ایک مطلع اور ایک شعر اب تک یاد ہے:

استادہ ہے خلقِ خدا کچھ اِس طرف کچھ اُس طرف
ہاں گوشۂ چشمِ عطا، کچھ اِس طرف کچھ اُس طرف

اللہ رے ضربِ قاسمی، گھوڑے سے ازرق ساجری،
چورنگ ہوکر گر گیا کچھ اِس طرف کچھ اُس طرف

عطا احمد فرشوری تھے اور انھیں اپنے خاندان پر بہت فخر تھا۔ چوں کہ ہم لوگ بھی فرشوری تھے اس لیے عطا احمد ہمیں خاندان کے بزرگوں کے قصّے سنایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے قصّے بھی سنایا کرتے تھے جو فحش ہوتے تھے۔

شعرا میں اکرام احمد لطف مجھے اس زمانے میں بہت اچھے لگتے تھے، یہ جھوم جھوم کر شعر سنایا کرتے تھے۔ غزل داغ کے رنگ میں کہتے تھے مگر نعت اور منقبت بھی کہتے تھے۔ ان کا ایک نعت کا شعر اب تک یاد ہے اور اقبال کی زمین میں یہ شعر واقعی اعجاز ہے:

رُخِ مصطفیٰؐ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دُکانِ آئینہ ساز میں

فانی اس زمانے میں بدایوں سے باہر تھے مگر ان کی یہ غزل اتنی مشہور ہوگئی تھی کہ میراثنیں بھی گایا کرتی تھیں ؎

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ
سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

جامع مسجد میں اکثر جمعہ کی نماز کے بعد تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ خلافت تحریک کے زمانے میں میں نے وہاں اکثر علما اور سیاسی لیڈروں کی تقریریں سنیں۔ میری سمجھ میں ساری تقریریں تو نہ آتی تھیں مگر لطف بہت آتا تھا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی صرف مقرر ہی نہیں خطیب بھی تھے

تقریر شروع کرتے تو اتنی آہستہ کہ چند جملے سمجھ میں نہ آتے، پھر رفتہ رفتہ آواز بلند ہوتی جاتی اور آواز کی بلندی کے ساتھ وہ اِدھر اُدھر مڑجاتے یہاں تک کہ وہ گھوم گھوم کر لفظوں کا ایک آبشار گراتے جاتے اور لوگ جا بجا اللہ اکبر کے نعروں سے ان کا ساتھ دیتے رہتے تھے۔ عبدالماجد بدایونی کے علاوہ مولانا عبدالقدیر، سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد سبحانی کی تقریریں میں نے اسی جامع مسجد میں سُنی تھیں۔

خلافت تحریک کے دوران بی اماں (والدہ مولانا محمد علی) بدایوں آئیں اور انھوں نے بھی جامع مسجد میں تقریر کی ان کی تقریر سے پہلے وہ نظم پڑھی گئی جو اُس زمانے میں بہت مقبول تھی:

بولیں اماں محمد علی کی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی   جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بعد میں ہم بچے یہ نظم اکثر گایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے یہاں کسی کی فاتحہ تھی اور گھر میں بہت سی عورتیں تھیں۔ میں نے اور میرے خالہ زاد بھائی افضال حسین قادری نے بڑوں کی دیکھا دیکھی عورتوں کے مجمع میں جاکر خلافت فنڈ میں چندے کے لیے اپیل کی اور ایک ایک دو دو پیسے کرکے ساری عورتوں سے ایک روپیہ جمع کرلیا اور جب جاکر اپنے چھوٹے چچا کو دیا کہ خلافت فنڈ میں جمع کردیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہمیں شاباشی دی۔

ہمارے گھر میں خاصا مذہبی ماحول تھا، نماز پابندی سے پڑھنے کی تاکید تھی مگر شاید اس وجہ سے کہ صبح اٹھنے کی کوئی خاص تاکید نہ تھی میں فجر کی نماز قضا پڑھتا تھا یا گول کرجاتا تھا۔ والد رات کو دیر تک مطالعہ کرتے تھے اس لیے وہ بھی صبح کو دیر میں اٹھتے تھے ہاں روزے سارا گھر پابندی سے رکھتا تھا۔

غلام رسول جسے سب سے پہلے میرٹھ میں میں نے دیکھا تھا غازی پور تک ہمارے ساتھ رہا۔ ویسے تو وہ نوکر تھا مگر والد اس کا بہت خیال کرتے تھے اور اس لیے ہم بچوں سے محبت کرنے کے باوجود ہمیں ڈانٹتا بھی تھا چونکہ والد دن بھر مصروف رہتے تھے اس لیے میں اکثر غلام رسول کے ساتھ شہر جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ سیتا پور میں وہ سائیکل پر بٹھاکر مجھے پہلے توچھاؤنی

لے گیا اور وہاں اپنے ایک دوست کو آواز دی، پھر غلام رسول اور اس کے دوست کسی قصبے کے لیے روانہ ہوئے۔ میں سائیکل پر ایک تکیے کے سہارے بیٹھا تھا کوئی گھنٹہ بھر میں ہم ایک جگہ پہنچے جہاں ناچ گانا ہو رہا تھا معلوم ہوا یہی ہماری منزلِ مقصود تھی کوئی گانے والی گیت اور غزلیں گا رہی تھی، اچھی خاصی صورت تھی میں بہت غور سے گانا سن رہا تھا۔ مگر غلام رسول اور اس کا دوست آپس میں کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے۔ کچھ الفاظ میرے کانوں میں ایسے پڑے جن سے اندازہ ہوا کہ غلام رسول کا دوست اس گانے والی سے گانے کے بعد ملنا چاہتا تھا اور غلام رسول واپس ہونے کی جلدی میں تھا۔ بہر حال چلتے چلاتے غلام رسول کے دوست نے اس گانے والی سے کچھ باتیں کیں جنھیں میں نہ سن سکا کیوں کہ غلام رسول مجھے لے کر الگ ہٹ گیا تھا اتنا ضرور سمجھ میں آگیا کہ شاید وہ اس گانے والی پر عاشق ہو گیا تھا۔ کچھ دن بعد میں نے اسے ڈاکخانے کی مہترانی سے جو جھاڑو دے رہی تھی باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ مہترانی جوان تھی اور اس کی صورت بھی اچھی خاصی تھی۔ پھر جب غلام رسول کا یہ دوست اس سے ملنے آتا تو میں گھر میں چلا جاتا کیوں کہ اُسے میں اچھا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔

گونڈے میں ہمارے ڈاکخانے کے پڑوس میں ایک بیرسٹر رضی الدین احمد رہتے تھے۔ ان کا لڑکا قمر الدین میرے ساتھ چھٹے اور ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ یہ تھا تو بہت دُبلا پتلا مگر جمنازیم میں بہت ماہر تھا۔ قمر الدین کی والدہ مشہور شاعر احمد علی شوق قدوائی کی بیٹی تھیں۔ قمر الدین سے چھوٹا ایک لڑکا فخر الدین اور ایک شیر خوار لڑکا نصیر الدین تھا۔ قمر الدین بعد میں کلکتے میں پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہو گئے تھے۔ فخر الدین علی گڑھ میں جیالوجی کے پروفیسر تھے آج کل کشمیر میں ہیں نصیر الدین علی گڑھ میں جیالوجی میں ریڈر تھے۔ کچھ سال کے لیے کشمیر یونیورسٹی میں جغرافیہ کے پروفیسر رہے۔ حال میں واپس علی گڑھ چلے آئے ہیں۔

اس زمانے تک یاد نہیں میں نے کوئی باقاعدہ کھیل کھیلا ہو۔ کبھی اسکول میں کسی گھنٹے میں ہاکی یا فٹ بال کھیلنے کا موقع ملا تو کھیل لیا۔ ہاں شام کو میلوں ٹہلنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر کوئی نہ کوئی اسکول کا دوست ساتھ ہوتا۔ گونڈے میں تار کے کھمبے پر بلی کی طرح چڑھنا اور تاروں کو چھونا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ گھر پر حاشیہ اِدھر اُدھر کی چیزیں پڑھیں مگر پاس اچھے نمبروں سے ہوا۔ جلد جلد

تباولوں کی وجہ سے پانچویں اور چھٹی کلاس میں پانچویں اور چھٹی پوزیشن آئی جس کا غم ہوا۔ جب نومبر ۱۹۲۴ء میں ساتویں درجے میں وکٹوریہ ہائی اسکول غازی پور میں داخل ہوا تو پھر ہائی اسکول تک اسی اسکول میں پڑھا اور آٹھویں درجے سے پھر اچھی پوزیشن آنے لگی۔

غازی پور میں ہم گورا بازار میں رہتے تھے۔ یہ شہر سے دو ڈھائی میل دور تھا۔ اسکول پیدل جانا ہوتا تھا۔ اسکول سے گنگا بہت قریب تھی، جمعہ کی نماز کے لیے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی تھی۔ ہم مسلمان لڑکے جن کی تعداد کل دس بارہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ ایک جغرافیہ کے مسلمان استاد کے ساتھ جن کا نام نورالحسن تھا گنگا کے کنارے شاہ خاندان کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ برسات میں گنگا کا دوسرا کنارہ دکھائی نہ دیتا تھا اور اس کنارے پر مسجد کی دیوار پر گنگا کی موجیں سر ٹیکتی تھیں۔ گنگا میں اسٹیمر چلتا تھا اور دوسرے کنارے پر تاڑی گھاٹ کا اسٹیشن تھا۔ جہاں سے دلدار نگر کو ریل جاتی تھی۔ غازی پور عام طور پر لوگ بنارس سے چھوٹی لائن سے جاتے تھے۔ بنارس سے بلیا جو چھوٹی لائن جاتی ہے اس پر غازی پور آتا ہے اگر بڑی لائن سے جانا ہوتا تو ہم اسٹیمر سے گنگا پار کر کے تاڑی گھاٹ اور وہاں سے دلدار نگر پہنچتے تھے جو کلکتہ دہلی مین لائن پر واقع تھا۔

غازی پور کی بہت سی چیزیں یاد ہیں۔ آٹھویں درجے میں کلاس ٹیچر رام ناتھ تھے جو ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ہم لوگ انھیں پروفیسر کہا کرتے تھے۔ حساب کے استاد کا نام یاد نہیں مگر جب وہ پڑھاتے تھے تو ان کے منہ سے تھوک بہت اڑتا تھا اور پہلی صف میں بیٹھنے والوں کی ڈسک تک چھینٹے آتے تھے۔ میں چوں کہ پہلی صف میں تھا اس لیے مجھے بہت گھن آتی تھی۔ سوا حساب کے سب مضامین میں بہت اچھا تھا اس لیے استاد بہت خیال کرتے تھے۔ ماسٹر رام ناتھ نے ایک دن کہا تم ہائی اسکول اسکالرشپ کے امتحان میں بیٹھو تمھاری کامیابی کا خاصا امکان ہے۔ امتحان بنارس میں ہوتا تھا۔ چناں چہ والد نے کسی ڈاکخانے والے کے ذریعہ سے بنارس میں قیام کا انتظام کر دیا اور ہم نے وہاں سے ہائی اسکول اسکالرشپ کا امتحان دیا مگر چوں کہ حساب کا پرچہ خراب ہوا تھا اس لیے ہمیں وظیفہ نہ ملا۔

آٹھویں درجے کی ایک یاد بہت روشن ہے۔ یہ ۱۹۲۵ء دسمبر کا زمانہ تھا۔ علی گڑھ

میں اوآر کی گولڈن جوبلی منائی جانے والی تھی۔ میرے بڑے بھائی علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے والد کو لکھا کہ آل احمد کو کسی اولڈ بوائے کے ساتھ بھیج دیجیے جوبلی دیکھ لیں گے۔ غازی پور میں بہت سے اولڈ بوائے تھے۔ جعفر حسن زیدی ڈپٹی کلکٹر، مصطفےٰ حسین رئیس، عبدالعظیم وکیل۔ چناں چہ ایک شام کو میں ایک چھوٹی سی پوٹلی میں دو جوڑے کپڑے اور ایک اونی چادر لیے ہوئے غازی پور کے گھاٹ پر موجود تھا۔ جعفر حسن زیدی ہمارے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ خاصا تام جھام ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ تمھارے ساتھ جاڑے کا سامان ہے، میں نے اپنی پوٹلی دکھائی اور کہا اس میں ایک اونی چادر ہے۔ بہت ہنسے۔ کہنے لگے۔ دسمبر کی راتوں میں ایک اونی چادر سے کیا ہوگا۔ خیر ہمارے ساتھ کئی فالتو کمبل ہیں۔ اسٹیمر سے تاڑی گھاٹ پہنچے۔ وہاں سے دلدار نگر۔ اب زیدی صاحب اور مصطفےٰ صاحب نے سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور میرے لیے انٹر کا ٹکٹ لیا گیا اور عبدالعظیم صاحب کے ساتھ کر دیا گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ زیدی صاحب کو سکنڈ کلاس میں جگہ نہ ملی اور انھوں نے دوسری گاڑی سے آنے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ طے ہوا کہ عظیم صاحب مجھے لے کر کانپور جائیں اور عبدالرؤف صاحب ڈپٹی کلکٹر کے گھر پہنچ جائیں جہاں بعد میں زیدی صاحب اپنی پارٹی کے ساتھ آجائیں گے۔ اس جلدی میں کمبل دینا زیدی صاحب بھول گئے۔ چنانچہ میں نے اپنی اونی چادر میں کسی طرح رات کاٹی اور صبح کو کانپور پہنچا۔ ناشتے کے بعد عظیم صاحب نے کہا کہ وہ خلافت کانفرنس کے جلسے میں جائیں گے جہاں ان کو اپنے لڑکے سے ملنا ہے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ اس زمانے میں کانپور میں آل انڈیا کانگریس اور خلافت کمیٹی دونوں کا اجلاس ساتھ ساتھ ہو رہا تھا۔ سروجنی نائڈو کانگریس کے اجلاس کی صدر تھیں۔ مولانا آزاد خلافت کمیٹی کے اجلاس کے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر کانگریس کے پنڈال میں رہے۔ مسز نائڈو تقریر کر رہی تھیں۔ انھیں میں پہلے بجنور میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے بعد عظیم صاحب خلافت کمیٹی کے جلسے میں لے گئے جہاں مولانا آزاد تقریر کر رہے تھے۔ پنڈال کے گیٹ پر عظیم صاحب کے لڑکے عبدالعلیم سے ملاقات ہوئی۔ دبلے پتلے، لمبے، گورے، بال سنہرے، یہ جامعہ میں پڑھتے تھے اور خلافت کمیٹی کے جلسے میں والنٹیر تھے۔ آگے چل کر یہ ڈاکٹر ہوئے اور لکھنؤ میں ایک عرصہ تک عربی کے لکچرر رہنے کے بعد علی گڑھ میں

پہلے ریڈر، پھر پروفیسر اور آخر میں وائس چانسلر بنے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کا گہرا تعلق رہا اور اس کے بانیوں میں تھے۔ مولانا آزاد کی تقریر کا موضوع اب یاد نہیں مگر ان کی خطابت کا نقش باقی ہے۔ ہم لوگ گھوم پھر کر دوپہر کو عبدالرؤف صاحب کے گھر پہنچے۔ اس وقت تک زیدی صاحب بھی آچکے تھے۔ رات کی گاڑی سے ہم سب علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ اب میرے نگراں عظیم صاحب تھے۔ علی گڑھ میں اولڈ بوائز کو مختلف ہوسٹلوں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ عظیم صاحب ماریسن کورٹ میں تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے مجھے ایک لڑکے کے ساتھ منٹو سرکل بھیجا جہاں میرے بھائی پڑھتے تھے۔ وہ کرشنا آشرم میں مقیم تھے۔ چناں چہ میں بھائی کے پاس کرشنا آشرم پہنچ گیا۔ اس کے وارڈن میرے خالہ زاد بھائی ابرار حسین قادری تھے جو پاس ہی احمد علی خاں کے بنگلے میں رہتے تھے۔ میں دن میں اپنے خالہ زاد بھائی افضال کے ساتھ جوبلی کے مختلف جلسوں میں شریک ہوتا تھا اور رات میں کرشنا آشرم میں سوتا تھا۔

جوبلی کے جلسوں میں پہلا نقش یونین کے مباحثے کا ہے۔ اس وقت یونین کے صدر کنور محمد اشرف تھے، یہی بعد میں ڈاکٹر اشرف کے نام سے مشہور ہوئے۔ بڑے شاندار مقرر تھے۔ انھوں نے مباحثے کو بڑی خوبی سے چلایا۔ دوسرا نقش جوبلی کے جلسے کا ہے جس میں سارے اکابرین جمع تھے۔ یاد آتا ہے کہ جب نواب مزمل اللہ خاں نے جو اس وقت قایم مقام وائس چانسلر تھے ایک لاکھ کے عطیے کا اعلان کیا تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس کے بعد اور عطیوں کا بھی اعلان ہوا اور غالباً ڈھائی لاکھ روپیہ جوبلی فنڈ میں جمع ہوگیا تھا۔ اسی رات کو جوبلی کا مشاعرہ تھا۔ پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر شور بہت ہو رہا تھا۔ مجھے صرف یہ یاد ہے کہ ساغر نظامی کی غزل اور خواجہ دل محمد کی نظم کی بہت تعریف ہوئی تھی۔

علی گڑھ کے قیام کی آخری شب میں جوبلی کے مباحثے کی یاد آتی ہے۔ اس میں ایک چھوٹے سے قد کے خوبصورت سے نوجوان نے نہایت اعتماد سے مباحثے کے لیے یہ تجویز پیش کی تھی:

"THE SOLUTION OF THE INDIAN PROBLEM

LIES IN THE SUPERSESSION OF THE COMMUNAL

PROGRAMME BY A NATIONAL ONE".

"اس ایوان کی رائے میں ہندوستان کے مسئلے کا حل فرقہ وارانہ پروگرام کے بجائے قومی پروگرام میں ہے۔" یہ مجوز خواجہ غلام السیدین تھے۔ انھوں نے نہایت اچھی تقریر کی۔ مخالف عبدالعزیز پوری تھے جو انٹر کالج میں تاریخ کے لکچرر تھے اور اچھے مقرر سمجھے جاتے تھے مگر ان کی تقریر میں لفاظی زیادہ تھی۔ اس مباحثے میں محمد علی جناح اور سر علی امام جیسے لیڈروں نے بھی حصہ لیا تھا اور تجویز کی مخالفت میں تقریریں کی تھیں۔ مگر مباحثے کے آداب کے مطابق جب خواجہ غلام السیدین نے حزب مخالف کے مقرروں کا جواب دیا تو نہ صرف حاضرین نے بلکہ ان لیڈروں نے بھی زور زور سے تالیاں بجائیں۔ سیدین صاحب نے اصل تقریر سے بہتر تقریر کر کے مخالفین کے سارے دلایل کا جواب دیا تھا۔

جوبلی کے کچھ جلسے باقی تھے مگر میں ۲۹ دسمبر کو صبح بدایوں کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاں میرے ایک ماموں زاد بھائی کی شادی تھی۔ شادی میں شرکت کر کے اپنے منجھلے ماموں پیغمبر بخش کے ہمراہ واپس غازی پور آیا۔ اب یہ یاد کر کے ہنسی آتی ہے کہ اس شادی میں میری والدہ بڑی خواہش کے باوجود شریک نہ ہو سکی تھیں۔ میں جب بدایوں سے چلنے لگا تو ممانی نے مٹھائی کی ایک ہنڈیا ان کے لیے ساتھ کر دی تھی۔ راستے میں ماموں نے خود بھی یہ مٹھائی کھائی اور مجھے بھی کھلائی۔ جو بچی وہ میں ماموں کے یہاں چھوڑ آیا۔ گھر پہنچا تو والدہ نے بہت ڈانٹا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میں مٹھائی کی ہنڈیا ماموں کے یہاں چھوڑ آیا ہوں تو اور بھی ناراض ہوئیں۔ بات یہ تھی کہ انھیں اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں سے بہت محبت تھی۔ شادی میں شریک نہ ہو سکیں تو وہاں کی مٹھائی ہی مل جاتی وہ بھی میری غفلت کی وجہ سے نہ ملی، چنانچہ وہ خود بھی روتی رہیں اور مجھے بھی رلایا۔

آٹھویں درجے سے میں کلاس میں مباحثوں میں تقریریں کرنے لگا تھا۔ دراصل میں بہت شرمیلا تھا۔ مجمع کو دیکھ کر گھبراتا تھا اور تقریر کرنے کھڑا ہوتا تھا تو ٹانگیں کانپتی تھیں اور آواز بہت مدھم نکلتی تھی۔ مجھے اس کمزوری کا احساس تھا اور اس لیے اسے دور کرنے کی برابر کوشش

کرتا تھا اور رفتہ رفتہ بے جھجک تقریر کرنے پر قادر ہو گیا تھا۔

غازی پور میں جنگلی گلاب کے کھیت بہت تھے۔ افیم تیار کرنے کی ایک فیکٹری تھی۔ لارڈ کارنوالس دوسرے گورنر جنرل کا مقبرہ تھا۔ گنگا کا چوڑا پاٹ تھا۔ بنارس قریب تھا۔ کئی دفعہ سیر کے لیے ہم بنارس گئے اور وہاں کے مندر اور گھاٹ دیکھے۔ افیم کی فیکٹری میں منوں افیم کے ذخیرے دیکھے۔ ہم لوگ امرود کے باغوں میں گھومتے تھے اور خوب امرود کھاتے تھے۔ ایک دفعہ شام کو کسی کے ساتھ میں لارڈ کارنوالس کے مقبرے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک انگریز اور اس کی میم ملے۔ دونوں کے درمیان کوئی گز بھر کا فاصلہ تھا۔ میں بجائے بچنے کے ان کے بیچ میں سے گذر گیا۔ میرا ساتھی کترا کر نکل گیا تھا۔ اس انگریز نے گھور کر دیکھا مگر میں تیر کی طرح نکلتا چلا گیا۔ میرے ساتھی نے بعد میں مجھے سمجھایا کہ مجھے ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اس زمانے میں اخبار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انگریزی اخبار تو چھٹے ساتویں درجے سے پڑھنے لگا تھا اُردو کی کتابوں کے علاوہ انگریزی کی کتابیں بھی پڑھا کرتا تھا ROBINSON CRUSOE اور A TALE OF TWO CITIES جیسی کتابیں میں نے اُسی زمانے میں پڑھیں۔

اسکول میں ماسٹر رام ناتھ، مولوی عظمت اللہ، ماسٹر تواری، ماسٹر جبتی خاص طور سے مہربان تھے۔ جب نویں درجے میں تاریخ کے بجائے جغرافیہ لیا تو ماسٹر رام ناتھ کو بہت رنج ہوا تھا۔ مولوی عظمت اللہ فرنگی محل کے تھے۔ ان کے پاس اودھ پنچ آتا تھا۔ اس میں سے اکثر مزاحیہ نظمیں سنایا کرتے تھے۔ یاد ہے اختر شیرانی کی نظم پر کسی کی پیروڈی تھی۔ عنوان تھا "بکری"۔ ماسٹر جبتی اُردو اچھی نہیں جانتے تھے۔ چناں چہ اُردو کی کاپیوں کے جواب کلاس میں مجھ سے سنا کرتے تھے اور جتنے نمبر بتاتے تھے انھیں میں دے دیتا تھا۔ اس زمانے میں "زمانہ" اور "نگار" جیسے رسالے برابر مطالعے میں رہتے تھے۔

نویں درجے کا سالانہ امتحان ہوا تو میرے انگریزی، اُردو جغرافیہ میں اسّی فی صد کے لگ بھگ نمبر آئے۔ سائنس میں ساٹھ فی صدی کے لگ بھگ نمبر آئے۔ مگر حساب میں صرف ۳۲۔ پاس ہونے کے لیے کم سے کم چالیس نمبر کی قید تھی۔ چناں چہ اس سال پاس ہونے کے لیے چالیس کے بجائے ۳۲ نمبر مقرر کیے گئے۔ اس طرح میری کلاس میں تیسری پوزیشن آئی۔

جب ہم لوگ دسویں درجے میں آگئے تو ہمارے ہڈماسٹر بدل گئے۔ نئے ہڈماسٹر کا نام ماتھر تھا اور انھیں اُردو اور فارسی سے بہت دلچسپی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھ پر بہت مہربان ہو گئے تھے اور اکثر مجھ سے باتیں کیا کرتے تھے۔ حافظ کا یہ شعر سب سے پہلے انھیں کی زبانی سنا تھا ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

اس وقت میری عمر سولہ برس کی ہوگی۔ حساب میں کمزوری کی وجہ سے والد نے دسویں درجہ میں ایک ٹیوٹر رکھ دیا تھا۔ یہ صاحب نگار کے خریدار تھے اور نیاز کے عاشق۔ یہ ویسے تو مجھے حساب پڑھاتے تھے مگر زیادہ وقت ان سے نگار اور نیاز کے متعلق باتوں میں گذر جاتا تھا۔ ایک بنگالی ماسٹر تھے بھٹاچاریہ۔ ایک دن کسی استاد کی غیر حاضری میں انھوں نے ہماری کلاس لی اور جولیس سیزر ڈرامے کا وہ سین سنایا جس میں بروٹس اور انٹونی کی تقریریں ہے۔ اس تقریر سے مجھے پورا ڈرامہ پڑھنے کا شوق ہوا اور وہ تقریر یاد ہو گئی۔

دسویں درجے میں سہ ماہی امتحان میں فرسٹ آیا۔ ششماہی امتحان میں حساب کا پرچہ کر رہا تھا کہ دوسرے لڑکوں نے کہا پرچہ مشکل ہے اور چھے سوال لازمی قرار دیے گئے ہیں اس لیے ہم لوگوں کو اسٹرائک کرنا چاہیے۔ مجھے سوال مشکل نہ لگتے تھے مگر ان لوگوں کے کہنے سے میں بھی ہال سے باہر آگیا۔ شور سن کر ہڈماسٹر ماتھر آئے۔ مجھ سے پوچھا کہ تم لوگ ہال سے باہر کیوں آگئے۔ اس پر تمھارے خلاف تادیبی کارروائی ہوگی۔ میں نے سب کی طرف سے جواب دیا کہ چھے کے بجائے پانچ سوال لازمی ہونے چاہئیں اور وقت ڈھائی گھنٹے کے بجائے تین گھنٹہ ہونا چاہیے۔ ہڈماسٹر صاحب نے ہماری بات مان لی مگر ساری کلاس سے ناراض ہو گئے مجھ تو بہت ہی خفا تھے۔

چنانچہ امتحان کے بعد درجے کے سبھی لڑکے میدان میں جمع ہوئے اور طے ہوا کہ دسویں کلاس کے طلبا کی ایک انجمن بنا دی جائے جو طلبا کے حقوق کی حفاظت کرے۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ دراصل یہ ساری کارروائی ہڈماسٹر کے خلاف ایک بنگالی ماسٹر کی شہ پر ہوئی

تھی۔ کچھ بنگالی طلبا اس میں پیش پیش تھے۔ ان میں ایک ممتاز کھلاڑی بھی تھا جس سے میری خاصی دوستی تھی۔ چناں چہ اسی کے اصرار پر میں ہال سے باہر نکل آیا تھا۔ اب لوگوں نے مجھے اس انجمن کا صدر بنا دیا۔ اس کے جلسے اسکول کے اوقات کے بعد ہوتے تھے اور میں باقاعدہ اس کی روداد انگریزی میں لکھتا تھا۔ اس سال سے ہائی اسکول میں انگریزی کے ذریعے جوابات دینا لازمی ہو رہا تھا۔ اردو یا ہندی میں بھی جوابات دیے جا سکتے تھے مگر میں نے انگریزی میڈیم اختیار کی تھی۔ انگریزی دوسرے کمزور ساتھیوں کو پڑھایا بھی کرتا تھا۔ غرض اس انجمن کے کئی جلسے ہوئے ایک جلسے میں طے ہوا کہ ہم لوگ دسہرے میں شرکت کریں چناں چہ اس کے لیے آٹھ آنے فی کس چندہ مقرر ہوا۔ ایک لڑکے نے کہا کہ وہ دسہرے میں شرکت نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ رادھا سوامی ست سنگھ کا پیرو تھا اور وہاں مورتیوں کی پرستش منع تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ میرے مذہب میں مورتیوں کی پرستش جائز نہیں مگر ہم لوگ پوجا کرنے نہیں جا رہے ہیں میلے میں شریک ہونے جا رہے ہیں جب میں اٹھنی چندہ دے رہا ہوں تو تم کیوں نہیں دے سکتے مگر وہ نہیں مانا۔ چنانچہ اسے چھوڑ کر باقی لوگوں نے دسہرے کے جلوس میں شرکت کی۔

اس زمانے میں اسکول میں اکا دکا نقل کے واقعات ہوتے تھے۔ کچھ لڑکے اپنے کارنامے فخر سے بیان بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ اگر مسلمان نگراں ہوا تو کسی مسلمان لڑکے نے کسی دوسرے مسلمان لڑکے کو کوئی پرچہ دے دیا، یا کسی ہندو لڑکے نے کسی ہندو لڑکے کو۔ کچھ لڑکے دوسرے لڑکوں سے اپنے عشق کے واقعات بھی بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔ باتوں میں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک لڑکے نے بورڈ پر اقبال کی نظم "حقیقت حسن" لکھ دی۔ ہم لوگوں نے فوراً یاد کر لی۔ ہمارے کورس میں ترک اردو تھی۔ رامائن کا ایک سین اور بہت سی نظمیں اور غزلیں یاد ہو گئی تھیں اور کبھی کبھار انجمن کے جلسوں میں یا بے تکلف صحبتوں میں یہ نظمیں سنایا کرتا تھا۔ خود بھی شعر کہتا تھا مگر اپنے اشعار سنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس زمانے میں میں انگریزی اخبار بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اس علاقے میں اخبار لیڈر الٰہ آباد مقبول تھا۔ ہمارے یہاں بھی یہی اخبار آتا تھا۔ اگر شہر میں کسی لیڈر کے اعزاز میں جلسہ ہوتا

تو میں ضرور شرکت کرتا۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ مدن موہن مالویہ آئے تھے انھوں نے مرکزی اسمبلی کے لیے برلا کی حمایت کی تھی اور کانگریس کی مخالفت۔ ان سے اختلاف کے باوجود ان کی خطابت سے متاثر ہوا تھا۔ اس زمانے میں مرکزی اسمبلی میں سوراج پارٹی پرجس کے لیڈر موتی لال نہرو تھے حکومت نے الزام لگایا تھا کہ وہ اقتدار کی بھوکی ہے، اس کا جواب موتی لال نہرو نے بڑا شاندار دیا تھا ان کی تقریر کے آخری الفاظ اب تک یاد ہیں:

"OUR AMBITION, OUR HIGHEST AMBITION, IS, TO BE BURIED IN THE FOUNDATIONS OF A FREE INDIA, TO BE BURIED THERE AND TO LIE THERE, BUT WITH THE SUPREME SATISFACTION THAT THE NOBLE EDIFICE OF INDIA'S FREEDOM SHALL RISE ON OUR BONES".

"ہماری آرزو، ہماری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کی نیو میں دفن ہوں، اسی میں دفن ہوں اور وہیں پڑے رہیں، لیکن یہ تسکین رہے کہ ہندوستان کی آزادی کا قصر رفیع ہماری ہڈیوں پر سے بلند ہوگا"۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم لوگ بدایوں ضرور جاتے تھے۔ افضال جو میرے خالہ زاد بھائی اور دوست تھے علی گڑھ میں پڑھنے لگے تھے۔ وہ بھی آجاتے تھے۔ میری دوستی ان سے سب سے زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ ماموں زاد بھائی رحمٰن بخش سے بھی دوستی تھی۔ بعد میں میری چھوٹی بہن سے اُن کی شادی ہوئی۔

غازی پور میں استادوں اور ساتھی طلبا سے بہت محبت ملی۔ ماسٹر رام ناتھ کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ان کے علاوہ تواری اور جٹی بھی بہت مہربان تھے۔ دسویں درجے میں مسلمان طلبا تین چار سے زیادہ نہ تھے۔ مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ مجھ سے کوئی امتیاز برتا جاتا ہے۔ شام کو میں گھر سے نکل جاتا تھا۔ کچھ کلاس فیلو ساتھ ہوتے تھے۔ ان میں درگا پرشاد کا نام یاد ہے۔ ایک اور طالب علم لکشمی شنکر بھی اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ میں اس زمانے میں لائبریری سے انگریزی

ناولیں منگوا کرے آتا تھا اور رات گئے تک پڑھتا رہتا تھا۔ میرا کمرہ الگ تھا اس لیے کوئی پابندی نہ تھی۔

۱۹۲۰ء میں میں نے ہائی اسکول کا امتحان دیا۔ والدین طویل چھٹی لے کر بدایوں جا چکے تھے۔ بنارس میں امتحان ہوتا تھا۔ ہم تین چار لڑکوں کو والد صاحب نے کسی کے ساتھ بنارس میں ٹھہرا دیا تھا۔ ہم لوگ دو تین دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ رات کو دیر تک امتحان کی تیاری کرتے تھے لیکن شام کو دیر تک بنارس کے گھاٹوں کی سیر ضرور کرتے تھے۔ گنگا میں کشتیوں کا منظر، گھاٹ پر اشنان کا لطف، گنگا کے کنارے پر نیم دائرے کی شکل میں مندروں کی قطار۔ ان کی یادیں آج بھی دل میں گدگدی پیدا کرتی ہیں۔ میرے پرچے اچھے ہو گئے تھے مگر حساب میں محنت کرنے کے باوجود پرچے معمولی ہوئے۔ چناں چہ مجھے سکنڈ کلاس ملا۔ امتحان کے بعد میں بدایوں چلا آیا تھا اور میرا زیادہ وقت ساتھیوں کے ساتھ گذرتا تھا۔ کبھی کبھار شاہ ولایت صاحب کی زیارت یا سلطان جی کی زیارت، یا سید احمد صاحب کی زیارت چلا جاتا تھا۔ اس زمانے میں پابندی سے نماز پڑھتا تھا۔ صبح کی نماز ضرور قضا ہو جاتی تھی۔

پہلے ہم بچے اپنے بڑے ماموں سے بہت ڈرتے تھے مگر پھر یہ خوف کم ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ بڑے ماموں نے ہم بچوں کو آم کھانے کے لیے بلایا۔ آموں کا پال کچھ بگڑ گیا تھا۔ بیشتر یا تو سڑ گئے تھے یا کچے رہ گئے تھے۔ ماموں بتاتے جاتے تھے کہ یہ حصہ کھالو۔ چنانچہ میں نے اور افضال نے مل کر یہ شعر کہے۔ افضال نے کہا تھا ؎

کچھ آم آج بھائی میاں کے یہاں بچے — کہنے لگیں پٹھانی کہ بے کار جائیں گے
اتنے میں ہم جو آئے تو بولے حمید بخش — بچے یہ خاندان کے سب ان کو کھائیں گے

میرے اشعار یہ تھے ؎

مدت کے بعد ماموں نے کھلوائے آج آم — کھانے کو زیادہ تھے ولے کم کھا کے رہ گئے
کھانا ضرور تھا ہمیں کچھ ان کے سامنے — دنداں شکن تھے آم تو غم کھا کے رہ گئے

شدہ شدہ ان اشعار کی خبر ماموں صاحب کو بھی پہنچی۔ انھوں نے بلوایا۔ میں تو نہیں ملا لیکن افضال ہاتھ آ گئے۔ ان سے کہا کہ تم لوگوں نے جو اشعار کہے ہیں سناؤ۔ افضال نے شعر تو سنا دیے مگر ڈر کے

مارے یہ کہا کہ یہ اشعار آل احمد نے لکھے تھے میں نے نہیں ۔ اس زمانے کی تہذیب یہ تھی کہ ان اشعار پر ڈانٹ نہ پڑی بلکہ الٹی تعریف ہوئی ۔ ہاں اس کے بعد پھر آموں کی دعوت نہ ہوئی ۔ اس زمانے میں ہم لوگ شام کو یا تو چھوٹے چچا کے یہاں جمع ہوتے یا ایک رشتے دار ماسٹر منور کے یہاں ۔ وہاں شعرو شاعری ہوتی ۔ کتابوں کی باتیں ہوتیں اور ہندوستان کی سیاست پر اظہارِ خیال ۔ میں اب باقاعدہ غزل کہنے لگا تھا ۔ اس زمانے میں ارشد تخلص کرتا تھا بعد میں سرور تخلص اختیار کیا ۔

جولائی ۱۹۲۸ء میں میرا داخلہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں فرسٹ ایر سائنس میں ہوا ۔ والد کا خیال تھا کہ مجھے ایف ۔ ایس ۔ سی کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے تیاری کرنی چاہیے ۔ چنانچہ ہم آگرے اپنے بڑے چچا کے یہاں آ گئے ۔ اسی سال چچا کے یہاں چھوٹے چچا قانون پڑھنے اور میرے ماموں زاد بھائی وصی بخش بی ۔ اے کرنے آ گئے تھے ۔ چچا شاہ گنج کے قریب رہتے تھے ۔ کالج یہاں سے میل ڈیڑھ میل دور ہوگا ۔ سینٹ جانس کالج کی عمارت مغل طرز کی تھی ۔ ہم لوگ انگریزی پڑھنے کالج کی بڑی عمارت میں آتے جس کے قریب ہوسٹل تھے ۔ سائنس بلاک سڑک کی دوسری طرف تھا ۔ ہمیں کیمسٹری ایک گجراتی استاد انتانی ANTANI پڑھاتے تھے ۔ فزکس ایک عیسائی چافن باٹنی مکرجی ، ذوالوجی ، بینی چرن ۔ انگریزی الٰہ آباد کے بھوانی شنکر اور ایس پی شرما ۔ یہ سب بڑے اچھے استاد تھے ۔ ہر سنیچر کو ہیلی بری لکچر میں کالج کا کوئی استاد یا باہر سے آیا ہوا کوئی عیسائی عالم مذہب پر لکچر دیتا ۔ اس میں گون پہن کر سب استاد شریک ہوتے ۔ پرنسپل شروع میں کیپٹن سلے تھے جو فلسفہ پڑھاتے تھے ۔ بعد میں ریورنڈ ڈبلو ۔ ایس ہالینڈ آگئے تھے جو جنوبی ہند میں گاندھی جی کے ساتھ رہ چکے تھے ۔ کالج میں طلبا کوئی چار سو کے قریب ہوں گے ۔ استادوں اور طالب علموں میں خاصا رابطہ تھا ۔ کیمسٹری کے ایک اور نوجوان استاد اسنیل تھے جو نئے نئے آکسفورڈ سے آئے تھے اور کلاس میں دوڑتے ہوئے داخل ہوتے اور لکچر کے بعد دوڑتے ہوئے نکل جاتے ۔ اسی سال رضی الحسن چشتی اور مسرت حسین زبیری سے ملاقات ہوئی ۔ یہ لوگ سکنڈ ایر آرٹس میں تھے ۔ کالج کے دوسرے استادوں میں حامد حسن قادری اور عابد حسین فریدی بھی تھے ۔ یہ اردو اور فارسی پڑھاتے تھے ۔ میرے چچا سے ان کے مراسم تھے ۔ ایک انجمن اردوئے

سلی ٹی بھی تھی جو کبھی کبھی مشاعرے کرتی تھی۔ کالج کی لائبریری سے اُردو کتابیں اکثر لایا کرتا تھا۔ یاد ہے کہ آبِ حیات اور گلِ رعنا اُسی زمانے میں پڑھی تھیں۔ ہمارے ایک ساتھی عشرت علی نے اُسی زمانے میں خود محنت کرکے ایک ریڈیو تیار کیا تھا۔ وہ کبھی کبھار اُس پر گانے بھی سنوایا کرتے تھے۔ کالج کی لائبریری میں میرا خاصا وقت گذرتا تھا۔ کبھی کبھی کالج کے گرجے میں بھی چلا جایا کرتا تھا کیوں کہ آرگن کی دھن پر عبادت بڑی اچھی لگتی تھی۔ میں اُس زمانے میں ترکی ٹوپی پہنتا تھا۔ گرجے میں سب ننگے سر ہوتے۔ ایک دفعہ پادری نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے لو۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیوں کہ ننگے سر رہنے کو میں بے ادبی سمجھتا تھا۔

ہم لوگ اکثر تاج محل کی سیر کرتے یا لال قلعے یا فتح پور سیکری یا سکندرے جایا کرتے اس زمانے میں آگرے کے بازار سے میں اکثر ایک آنے کے انگور اور ایک آنے کے اندرسے لایا کرتا تھا اور مزے لے لے کر کھاتا تھا۔ انگور روپیہ سیر تھے۔ شام کو گھر کے پاس میدان میں ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلتے اور رات کو لوڈو یا کوئی اور کھیل۔ کورس کی کتابیں پڑھنے کی عادت نہ تھی۔ لائبریری سے انگریزی اور اُردو کی کتابیں لے آتا تھا اور رات گئے تک پڑھا کرتا تھا۔ فرسٹ ایر کے ساتھیوں میں دوارکا پرشاد گپتا، گوپال کرشن اور عبدالعلیم یاد ہیں۔ علیم سے خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ فرسٹ ایر کا امتحان ہوا تو میں آرٹس اور سائنس دونوں میں انگریزی میں فرسٹ آیا۔ ٹامسن اسکالرشپ ملا۔ اس زمانے میں میرے کنور نکلے تھے۔ اس لیے فزکس کے پرچے اچھے نہ ہوئے پھر بھی اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا مگر پوزیشن نہ آئی۔ دوسرے سال انگریزی پروفیسر نہال چند سے پڑھی جو انگریزی کے شعبے کے صدر تھے۔ انھوں نے ششماہی امتحان میں مجھے ڈیڑھ سو میں ۱۱۳ نمبر دیے اور بھرے کلاس میں میری بڑی تعریف کی۔ زولوجی، باٹنی اور کیمسٹری سے دلچسپی تھی مگر فزکس سے نہیں۔ عملی امتحانوں میں میرے نمبر زیادہ نہیں آتے تھے۔ ہمیشہ تجربہ گڑبڑ ہو جاتا تھا۔ اس سال کالج نے ایک تجربہ کیا۔ جنرل نالج کا ایک امتحان آرٹس، سائنس اور کامرس کے چاروں سالوں کے طلبا کا ایک پرچے کے ذریعے رکھا گیا۔ میں نے بھی امتحان دیا میرے سو میں سے چھیانوے نمبر آئے اور پورے کالج میں فرسٹ آیا۔ سائنس کے ڈین ڈاکٹر پانڈے اتنے خوش ہوئے کہ اسٹاف کلب میں جا کر دوسرے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ تم لوگ ہمارے طلبا کو معلوماتِ عامہ میں کورا سمجھتے ہو۔ دیکھو میرا اسٹوڈنٹ پورے کالج میں سب سے زیادہ نمبر لایا ہے۔ میں کالج کی

یونین میں تقریر بھی کرنے لگا تھا۔ ایک دفعہ کسی کی تقریر کے جواب میں جوش میں آکر ڈائس پر جاتے ہوئے تقریر شروع کر دی جو ڈائس پر پہنچنے کے فوراً بعد ختم ہوگئی۔ اس پر بعد میں ساتھیوں نے خوب مذاق اڑایا۔ مسرت حسین زبیری بڑی اچھی تقریر کرتے تھے انھیں اپنے پر اعتماد تھا۔ رضی الحسن چشتی نے بھی تقریر کرنا شروع کر دی مگر وہ بات نہ تھی۔ اس سال سینٹ جانس کالج میگزین میں میری غزل شائع ہوئی۔ اس غزل کو بار بار پڑھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ افسوس اب اس کا کوئی شعر یاد نہیں۔ جب میں سکنڈ ایر میں آیا تو مجاز اور جذبی فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ جذبی اس وقت ملالؔ تخلص کرتے تھے، دونوں ہوسٹل میں رہتے تھے۔ طالب علم تو دونوں یوں ہی سے تھے مگر ان کی شاعری اس وقت بھی کالج میں مقبول تھی۔ سکنڈ ایر کا امتحان ہوا تو پھر مجھے سکنڈ کلاس ملی۔ اب سائنس سے طبیعت اچاٹ ہو چلی تھی۔ ڈاکٹری کے امتحان میں بیٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ چاہتا تھا کہ تھرڈ ایر میں آرٹس کے مضامین لے لوں۔ مگر چچا نے کہا کہ سائنس جاری رکھو۔ بی۔ اے میں اب فرسٹ ڈویژن لانا مشکل ہوگا۔ چنانچہ پھر بی۔ ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ پروفیسر مہاجن نے جو اب مجھ پر بہت مہربان ہو گئے تھے سمجھایا بھی کہ بی۔ اے میں آجاؤ مگر میری ہمت نہ پڑی۔ جولائی ۳۰ء میں چچا کا تبادلہ الہ آباد ہوگیا۔ میرے بڑے بھائی جو ڈاکخانے میں ملازم ہوگئے تھے تار دینے کی ٹرینیگ کے لیے آگرہ آئے ہوئے تھے۔ جب چچا چلے گئے تو ہم لوگ ایک پرائیوٹ بورڈنگ ہاؤس میں آگئے جو کالج سے قریب تھا۔ یہاں بدایوں کے ابوالحسن اور غازی پور کے فخرالحسن بھی مقیم تھے۔ ایک حیدر آبادی بھی تھے جن کا نام اب یاد نہیں۔ بڑے بھائی کا تار کی ٹرینیگ میں دل نہ لگا اور وہ واپس بارہ بنکی چلے گئے۔ میں اکتوبر میں بشپ فرنچ ہوسٹل میں آگیا۔

ہوسٹل کی زندگی کا یہ تجربہ کئی حیثیتوں سے خاصا خوش گوار تھا۔ بشپ فرنچ میں بدایوں کے ریحان بخش قادری، پنجاب کے ایک لمبے سے نوجوان محمد یوسف، مظفر نگر کے ضمیر الدین مارہرے کے رشید اشرف رہتے تھے۔ پاس ہی ہیلی بری ہوسٹل تھا۔ اس میں مجاز اور ملالؔ (بعد میں جذبیؔ) رہتے تھے۔ ہم لوگ کبھی کبھی سینما دیکھنے جایا کرتے تھے۔ میرے برابر کا کمرہ خالی

تھا۔ اس میں یار لوگوں نے ڈائننگ روم بنا رکھا تھا۔ میرا کھانا میس سے آیا کرتا تھا۔ ڈائننگ ہال کبھی کبھار ہوتا تھا۔ اس سال یونین کے انتخاب میں جنرل سکریٹری کے عہدے کے لیے میں امیدوار ہوا۔ مقابلہ ایک کلاس فیلو ہری ہر مصرا سے تھا جو ہندی میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں خاصا مقبول ہوں۔ تقریر بھی کر لیتا ہوں۔ کامیاب ہو جاؤں گا۔ مگر کچھ ہندو مسلم سوال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ میں ۳۵ ووٹ سے ہار گیا۔ ہاں یہ یاد ہے کہ مجھے ووٹ دینے میرے استاد اسنیل بھی آئے تھے۔

سینٹ جانس کالج میں استادوں اور طالب علموں کے درمیان خاصا قریبی رشتہ تھا۔ میں اپنے کیمسٹری کے استاد اسنیل SNELL سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ ایک دن کلاس میں پڑھا رہے تھے کہ گھڑی دیکھی۔ گھنٹہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ کہنے لگے آپ مجھے معاف کیجیے گا۔ مجھے تھوڑی دیر میں بمبئی کے لیے ٹرین پکڑنی ہے۔ میری منگیتر انگلستان سے آرہی ہے وہیں شادی ہوگی اور ایک ہفتہ کے بعد ہم لوگ واپس آئیں گے۔ شادی کے بعد مسز اسنیل بھی کالج میں پڑھانے لگی تھیں۔ ہم لوگوں کے پریکٹیکل میں مدد کرتی تھیں۔ ایک اور استاد انٹانی ANTANI تھے۔ یہ INORGANIC-CHEMISTRY پڑھاتے تھے۔ فورتھ ایر میں ڈاکٹر پانڈیا صدر شعبہ کیمسٹری پڑھانے لگے تھے۔ یہ ORGANIC پڑھاتے تھے۔ اسنیل PHYSICAL - CHEMISTRY پڑھاتے تھے۔ اسنیل نے ایک تجربہ کیا تھا۔ چار لڑکوں کو جو مضمون میں سب سے اچھے تھے انھوں نے کلاس سے چھٹی دے دی تھی۔ اس کے بجائے وہ ہفتہ میں ایک بار ایک گھنٹہ ہم لوگوں کو گھر پر پڑھاتے تھے اور لکچر کے بعد لکھنے کا کام دیتے تھے۔ ان چار لڑکوں میں میں بھی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سال کے آخر میں اسنیل نے میری کاپی مجھ سے مانگی تاکہ وہ مسٹر میکنزی ڈائرکٹر تعلیم کو دکھائیں جو کالج کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ مجھے اسنیل اور پانڈیا کی وجہ سے کمسٹری سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ باٹنی میں مسٹر مکھرجی ہمارے استاد تھے۔ یہ اکثر ہم کو سیر کو لے جاتے اور راستے میں پیڑ پودے کی صفات بیان کرتے جاتے۔ زوالوجی، ایل پی۔ ماتھر پڑھاتے تھے۔ یہ سب بہت اچھے استاد تھے۔ میں ان لوگوں کے علاوہ اپنے ہوسٹل کے وارڈن پی۔ سی۔ ایڈی سے خاصا

قریب تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری بہت اچھی تھی۔ وہاں سے اکثر کتابیں لے آیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ فلاسفی کے مسٹر ملفورڈ سے بھی قربت ہو گئی تھی۔ انھوں نے مجھے بہت سی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ ہڈسن کی GREEN - MANSIONS میں نے انھیں سے لے کر پڑھی تھی اور بہت پسند آئی تھی۔ پروفیسر مہاجن بہت کھرے آدمی تھے اور اپنے کو خاصے لیے دیے رہتے تھے مگر مجھ پر وہ بھی مہربان تھے اور میرے کمرے پر بھی آجاتے تھے۔ پرنسپل ریویرنڈ ہالینڈ کبھی کبھی شام کو مجھے ٹہلنے کے لیے لے جاتے تھے۔ ان سے مختلف موضوعات پر بات ہوتی تھی۔ پروفیسر حامد حسن قادری سے بھی خاصا ملنا رہتا تھا۔ اردو ادب اور شاعری سے میری دلچسپی دیکھ کر انھوں نے کالج کی انجمن اردوے معلی کا سکریٹری بنا دیا تھا۔ انجمن سال میں ایک مشاعرہ ضرور کرتی تھی۔ مشاعرے کے لیے دعوت نامہ لے کر میں فانی کے پاس بھی گیا۔ انھوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا مگر آئے نہیں۔ ماتی اور مخمور آئے تھے۔ فانی کو میں آگرہ کالج کے ایک مشاعرہ میں سن چکا تھا۔ اور ان کی پرسوز اور دل میں اتر جانے والی لے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ انھوں نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع اب تک یاد ہے ؎

اے موت تجھ پہ عمر ابد کا مدار ہے
تو اعتبار ہستی نا پائدار ہے

آگرہ کالج میں ایک بار یگانہ کو بھی سنا۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی بہت دل کش تھا۔ پڑھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا محفل کو اور دنیا کو بھول گئے ہیں۔ ایک استغراق ان پر طاری تھا۔ اس موقع پر انھوں نے بہت سی رباعیات سنائی تھیں ایک اب تک یاد ہے ؎

کعبے کی طرف دور سے سجدہ کر لوں یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا اک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

ماتی جائسی، مخمور اکبر آبادی اور میکش اکبر آبادی کا بھی کلام اکثر سنتا رہتا تھا۔ میکش صاحب طلبہ پر بہت عنایت کرتے رہتے۔ میں ان کے یہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے طوائفیں رہتی تھیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ان کے یہاں بیٹھے ہوئے یا ان سے باتیں

کرتے ہوئے نظر اس طرف اٹھ جاتی تھی۔ سیماب صاحب سے ملنے میں ان کے گھر قصر الادب گیا تھا جو نائی کی منڈی میں تھا۔ ان سے تھوڑی دیر باتیں ہوئیں مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور طالب علموں سے کھلتے نہیں۔ میں نے انجمن کے سالانہ مشاعرہ میں دوسرا انعام حاصل کیا تھا۔ پہلا مجاز کو ملا تھا۔ ہم لوگوں کا خیال تھا کہ ملال (جذبی) کو ملے گا۔

میں ہوسٹل آتے ہی کالج کے مباحثوں میں تقریر کرنے لگا تھا۔ کالج میں ہر سال ایک انعامی مباحثہ بھی ہوتا تھا۔ ایک سال میں نے بھی کالج کی نمائندگی کی۔ میں نے اپنی تقریر لکھ کر یاد کرلی تھی مگر نروس ہونے کی وجہ سے میری آواز پست تھی اس پر کچھ شوروغل بھی ہوا تھا۔ دوسرے سال میں کالج کی پارلیمنٹ میں سوشلسٹ پارٹی کا ڈپٹی لیڈر ہوگیا۔ لیڈر مسرت حسین زبیری تھے۔ پارلیمنٹ کے نگراں تاریخ کے پروفیسر جے. بی. تعلقہ دار تھے۔ اسی سال انعامی مباحثے میں علی گڑھ سے عثمان احمد انصاری اور احمد عباس انگریزی کے مقابلے کے لیے اور انصار ہروانی اور ایک طالب علم اُردو کے مقابلے کے لیے آئے تھے۔ اُردو کے مقابلے میں پہلا انعام انصار ہروانی کو اور دوسرا مجھے ملا تھا۔ اُردو کا مباحثہ آگرہ کالج میں ہوا تھا۔ اس جلسے کی صدارت خواجہ غلام السیدین نے کی تھی اور ان کی مختصر تقریر سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ مباحثہ ختم ہونے کے بعد صدر کی دعوت پر ایک گورے سے، لمبے اور نہایت جامہ زیب پروفیسر نے تقریر کی۔ یہ ڈاکٹر ہادی حسن تھے۔ ان کی تقریر میں ایسا جادو تھا، ایسی روانی تھی، ایسی اداکاری تھی کہ پورا ہال مسحور ہوگیا تھا۔ میں اس وقت تک صرف اسٹینلی جونس کا قائل تھا جو اکثر سینٹ جانس کالج میں مذہب پر تقریر کیا کرتے تھے۔ اب ہادی حسن صاحب کا بھی قائل ہوگیا۔ اس سال میں بشپ فرنچ ہوسٹل کی میگزین کا ایڈیٹر مقرر ہوا اور میں نے بڑی محنت سے استادوں اور ساتھیوں سے مضامین جمع کیے۔ ہوسٹل کے وارڈن پی. سی. گپتا تھے جو الہ آباد سے آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امرناتھ جھا کے بہت عزیز شاگرد تھے۔ انھوں نے میری فرمائش پر گالسوردی پر ایک مضمون دیا تھا۔ مضامین کچھ ٹائپ کیے ہوئے تھے اور کچھ ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے۔ جب میگزین لے کر میں پرنسپل کے پاس گیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے بہت شاباشی دی اس کی خوشی اب بھی یاد ہے۔

سینٹ جانس کالج میں سالانہ ڈنر کے موقع پر تفریحی پروگرام بھی ہوتا تھا۔ میں نے اس میں ایک دفعہ ہوسٹل کے کچھ ممتاز افراد پر انگریزی میں تبصرہ کیا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ ایک صاحب افتخار تھے۔ یہ لا میں پڑھتے تھے۔ سب کی خاطر کرتے تھے مگر ان میں خلوص کی کمی تھی۔ ان کے متعلق میرا تبصرہ تھا۔ LOVED BY ALL BUT TRUSTED BY NONE (ان سے محبت سب کرتے ہیں مگر ان پر اعتبار کوئی نہیں کرتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد افتخار مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔

اس سال ہوسٹل کے طلبا ایک ٹرپ پر فتح پور گئے۔ اکبر کے محل میں مشاعرہ بھی ہوا۔ مجاز کی غزل بہت پسند کی گئی تھی جس کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے نا خدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

اس غزل کا مطلع اس وقت یہ تھا ؎

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
یہ کس کو دیکھتا ہوں اور ہنس رہا ہوں میں

مجاز نے بعد میں دوسرا مصرع بدل دیا ؎

یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

اسی سال ۱۹۳۱ء کے جاڑوں میں میرے بڑے بھائی کی شادی ہوئی۔ میری بڑی بہن ایک سال پہلے بیوہ ہو چکی تھیں۔ میرے بہنوئی عثمان بخش کا دق میں انتقال ہو گیا تھا۔ بہن کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ اس کے بعد بہت غمگین رہنے لگیں۔ آخر ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انھیں ذیابطیس ہو گئی تھی۔

۱۹۳۲ء میں امید تھی کہ مجھے فرسٹ کلاس مل جائے گا۔ مگر پریکٹیکل بہت اچھے نہیں ہوئے۔ تھیوری میں فرسٹ کلاس مارکس تھے اور جنرل انگلش میں بھی اچھے نمبر تھے۔ بہر حال سکنڈ کلاس ہی آیا۔ اب میں نے طے کر لیا کہ سائنس چھوڑ دوں گا اور ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لوں گا۔ جولائی میں میرے والد کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ چنانچہ ہم علی گڑھ آ گئے۔ یونیورسٹی اس

زمانے میں جولائی میں بند ہوتی تھی اور یکم اکتوبر کو کھلتی تھی۔ سینٹ جانس کالج والے چاہتے تھے کہ میں وہیں آجاؤں، مجھے مہاجن نے انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے لیے کہا اور تیس روپے کا ایک اسکالرشپ بھی دینے کا وعدہ کیا۔ مکرجی نے بوٹنی میں اور ماتھر نے زوالوجی میں ایم۔ ایس۔ سی کرنے پر اصرار کیا مگر اب میں طے کر چکا تھا کہ علی گڑھ میں پڑھوں گا۔

سینٹ جانس کالج کی تعلیم کے زمانے میں دو ایسے سفر ہوئے جو اب تک یاد ہیں۔ غالباً ۱۹۳۱ء کی گرمی میں میں بدایوں میں تھا۔ میرے ماموں زاد بھائی غنی بخش دہرہ دون میں سروے ڈپارٹمنٹ میں کچھ دن کے لیے کلرک ہو گئے تھے۔ ان کے دوستوں نے ان سے دہرہ دون آنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا اور یہ لالچ دی کہ دو تین دن کو مسوری بھی جائیں گے۔ پہاڑوں کی سیر کو میرا بہت جی چاہتا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں دہرہ دون پہنچے اور وہاں ان کے ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔ طے یہ ہوا کہ وہاں سے پیدل ایک چھوٹے راستے سے مسوری جائیں گے۔ راج پور سے پیدل راستہ مسوری تک سات میل کے قریب ہوگا۔ بہرحال کسی طرح مسوری پہنچ گئے۔ وہاں لنڈھور بازار میں بدایوں کے ایک فخر الدین سروے میں تھے۔ ان کے یہاں قیام کیا۔ اُن کے ایک عزیز بھی سروے میں تھے۔ دونوں بہت باتونی تھے۔ مجھے مسوری پہنچ کر بخار آگیا تھا۔ رات کو صرف دودھ پیا۔ دوسرے دن بخار اتر گیا تو ہم لوگ مسوری کی سیر کو نکلے۔ خوشگوار موسم۔ پہاڑوں کی سر بہ فلک چوٹیاں۔ بازار کی رونق، حسینوں کے پرے، ان سب مناظر نے بہت متاثر کیا۔ تین دن مسوری رہ کر ہم دہرہ دون واپس آگئے۔ وہاں ایک دن ٹھہر کر بدایوں پہنچے۔ مسوری سے میں چھڑیاں لایا تھا جو بڑے شوق سے ٹہلنے میں استعمال کرتا تھا۔ مسوری کے متعلق میں نے دو نظمیں بھی کہی تھیں۔ ان میں سے ایک "سلسبیل" میرے پہلے مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔

دوسرا سفر ۱۹۳۱ء کے جاڑوں میں سہارنپور اور دہلی کا تھا۔ میرے چچا کے کوئی اولاد نہ تھی، چچی کو بچے کا بہت ارمان تھا۔ اسی لیے پہلے ہم لوگ اجمیر شریف گئے تھے۔ سلیم چشتیؒ کے مزار پر فتح پور سیکری بھی گئے تھے وہاں بھی انھوں نے منت مانی تھی۔ جب کچھ نہ ہوا تو کلیر شریف جانے کی ٹھانی۔ سہارن پور میں مولوی رحمان بخش قادری ڈپٹی کلکٹر تھے جو میرے چچا کے بہت

گہرے دوست تھے۔ میری ماں کے وہ رشتے کے بھائی بھی ہوتے تھے۔ راستے میں خورجہ پر ہمارا بکس کسی اور مسافر نے اپنے سامان کے ساتھ اتار لیا۔ غازی آباد پہنچے تو معلوم ہوا۔ چچا تو بکس کی تلاش میں خورجہ واپس گئے۔ میں چچی کو لے کر سہارنپور پہنچا۔ وہاں دوسرے دن شام کو چچا بھی آ گئے بکس نہیں ملا۔ تیسرے دن قادری صاحب ہم لوگوں کو کار میں کلیر شریف لے گئے۔ راستہ بڑا خوبصورت تھا۔ وہاں چند گھنٹے قیام کر کے سہارن پور واپس آ گئے۔ یاد پڑتا ہے کہ قادری صاحب کے دوست عزیز صاحب نے مجھے پہننے کو کرتا پاجامہ دیا تھا کیوں کہ میرے کپڑے تو سب بکس میں تھے۔ سہارن پور سے چچا تو آگرے واپس آ گئے۔ چچی میرے ساتھ اپنی سوتیلی ماں کو دیکھنے دہلی گئیں۔ وہ بی اماں میں حکیم محمد احمد کے زیرِ علاج تھیں، کوئی لمبی بیماری تھی۔ وہاں بی اماں (چچی کی سوتیلی ماں) کا ایک بھانجا عبدالواحد کوئی بارہ تیرہ برس کا ہوگا۔ نہایت خوبصورت، نہایت ذہین اور بڑے کام کا۔ بی کا سارا کام وہی کرتا تھا۔ دوا لاتا، حکیم صاحب سے حال کہنے جاتا، سودا سلف لاتا۔ چنانچہ اس کے ساتھ میں نے دہلی کی سیر کی۔ چاندنی چوک، لال قلعہ، نظام الدین، قطب صاحب گیا۔ تین دن دہلی میں قیام کر کے آگرے واپس آ گیا۔ چچی کچھ دن بعد آئیں۔

میں جولائی ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آ گیا تھا۔ والد علی گڑھ کے صدر ڈاکخانے کے پوسٹ ماسٹر تھے۔ ڈاکخانے کے ایک حصے میں ہم لوگ رہتے تھے۔ ایک بڑا سا میدان طے کر کے یونیورسٹی کا وکٹوریہ گیٹ آ جاتا تھا۔ اب اس میدان میں نقوی پارک ہے اور یہ علاقہ خاصا سرسبز ہے۔ اس زمانے میں خاک اڑتی تھی۔ میری چھوٹی بہن اس زمانے میں ہسٹریا کی شکار تھی۔ اس کے علاج کے سلسلے میں مجھے بلند شہر جانا پڑا۔ بلند شہر میں آٹھ دن بڑی بے لطفی میں گذرے۔ مکھیاں بہت تھیں، سوائے نہر کے کوئی سیرگاہ نہ تھی۔ شامتِ اعمال کہ واپسی کے بعد پھر وہاں جانا پڑا کیوں کہ اب کے انھیں ڈاکٹر سے چچی کو علاج کرانا تھا۔ ایک ہفتہ اور اس کی نذر ہوا۔

خدا خدا کر کے موسم بدلا۔ یکم اکتوبر کو یونیورسٹی کھلی۔ میں نے ایم۔ اے پریویس میں داخلہ لیا۔ میرے دوست اور خالہ زاد بھائی افضال حسین قادری ایم۔ ایس۔ سی کر چکے تھے اور زوالوجی میں لکچرر ہو گئے تھے۔ انگلش ڈپارٹمنٹ کے صدر ہیڈ و ہیرس تھے جو ریڈر تھے۔ دوسرے ریڈر

خواجہ منظور حسین تھے۔ مجھ سے بڑی محبت سے ملے۔ انگریزی کے شعبے میں سید محمود حسین اور مختار حامد علی سے افضال نے ملاقات کرائی۔ یونیورسٹی میں سید راس مسعود وائس چانسلر تھے۔ ایک جوش، فخر و مباہات اور سرخوشی کا سا عالم تھا۔ اسی سال انٹر کالج ختم کر دیا گیا تھا اور انٹر کے درجے یونیورسٹی میں ملا دیے گئے تھے۔ ایم۔ اے کو ہیرن دو پرچے پڑھاتے تھے اور دو خواجہ منظور حسین۔ منظور صاحب کے پڑھانے کا طریقہ سب سے نرالا تھا۔ وہ ہر لکچر لکھ لاتے تھے اور کلاس میں پڑھ دیتے تھے۔ ہم لوگ انھیں صحیح معنی میں ریڈر کہا کرتے تھے۔ خاصے شرمیلے آدمی تھے۔ کلاس میں غالباً پندرہ طلبا تھے۔ لڑکیاں اس وقت تک نہیں تھیں۔ منظور صاحب ڈاکٹر جانسن پڑھاتے تھے۔ ہیرن صاحب شیکسپیر، ہیرن صاحب گریرسن کے شاگرد تھے۔ وہ نوٹ لکھاتے تھے اور بیچ بیچ میں تبصرہ کرتے جاتے تھے۔ ٹیوٹر منظور صاحب تھے۔ ان کے لیے میں نے ٹیوٹوریل لکھنے شروع کیے۔ پہلا کسی عام موضوع پر تھا جو انھوں نے پسند کیا۔ مجھے مضمون لکھنے اور تقریر کرنے کا شوق تھا اس کے لیے مطالعہ کیا کرتا تھا بعد میں صرف پوائنٹ لکھ لیتا تھا اور ان کی مدد سے تقریر کیا کرتا تھا۔ منظور صاحب علی گڑھ میگزین (اردو) کے نگراں تھے۔ چنانچہ داخلے کے ایک مہینے کے بعد انھوں نے مجھے علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر مقرر کر دیا اور ہدایت کی کہ مضمون لینے کے لیے رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، اشفاق حسین، بشیر ہاشمی سے ملوں۔ اس زمانے میں اختر رائے پوری اور حیات اللہ انصاری بی۔ اے میں تھے۔ منظور صاحب کا خیال تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو جوائنٹ ایڈیٹر بنایا جائے مگر بات نہ بنی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ رشید صاحب سے ملنے کو جب منظور صاحب نے کہا تو یہ بھی کہا کہ شاید وہ میگزین کے لیے مضمون لکھنے کو تیار نہ ہوں مگر مجھے ان سے ملنا چاہیے۔ چنانچہ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہاں ڈاکٹر عباد الرحمان صدر شعبۂ جغرافیہ موجود تھے جو مجھے آگرے سے جانتے تھے۔ وہاں ٹینس کے ایک کھلاڑی علی قدیر بھی بیٹھے ہوئے تھے جو میرے ساتھ ایم۔ اے انگریزی میں تھے مگر کلاس میں کم ہی آتے تھے۔ لا بھی جوائن کر رکھا تھا اور ٹینس کے کپتان بھی تھے۔ رشید صاحب سے میں نے اپنا تعارف کرایا اور میگزین کے لیے مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے اس دن

میری طرف کم توجہ کی۔ چلتے وقت صرف یہ فرمایا کہ پہلے آپ منظور صاحب سے پوچھ لیجیے کہ وہ میرا مضمون شائع بھی کریں گے یا نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں بڑے اشتیاق سے رشید صاحب سے ملنے گیا تھا مگر ان کی سرد مہری اور بے نیازی دیکھ کر خاصا دل برداشتہ ہوا۔ منظور صاحب سے یہ قصہ بیان کیا تو انھوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے رشید صاحب نے ایک مضمون فلسفۂ ازدواج پر لکھا تھا جس میں جدید تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین پر خاصی طنز کی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے دونوں میں کچھ کشیدگی ہو گئی تھی۔ یہ سب بتا کر منظور صاحب نے کہا۔ خیر کوئی بات نہیں آپ ان سے مل کر پھر مضمون کی فرمائش کیجیے اور کہیے کہ وہ جو لکھیں گے میگزین میں شائع ہوگا۔

چند دن بعد میں خواجہ غلام السیدین سے ملا۔ انھوں نے بڑی محبت اور اخلاق سے میری پذیرائی کی۔ یہ بھی کہا کہ منظور صاحب آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ مضمون لکھنے کا وعدہ کیا اور بہت سی ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ میں اس پہلی ملاقات کا بہت اچھا تاثر لے کر آیا۔ بشیر ہاشمی صاحب ٹریننگ کالج میں استاد تھے۔ پطرس اور تاثیر کے دوست۔ اشفاق حسین تاریخ میں لکچرر تھے۔ انھوں نے آسکر وائلڈ کے کئی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے پہلی ملاقات ہی میں ترجمے کی مشکلات کا ذکر کیا۔ ایک کہانی کا عنوان ہے THE HAPPY PRINCE اس کا ترجمہ انھوں نے شہزادۂ دل شاد کیا تھا۔ ایک اور جگہ کسی ڈرامے میں یہ جملہ آتا ہے JUDGE HER, JUDGE THE EAVES DROPPER اس کے سلسلے میں دیر تک گفتگو رہی۔ میں کہتا تھا کہ اس کا فیصلہ کر دو سے کام چل جائے گا۔ وہ کہتے تھے کہ اس میں سارا مفہوم نہیں آتا۔

یونیورسٹی میں اس زمانے میں زیادہ طالب علم نہیں تھے۔ کوئی بارہ تیرہ سو رہے ہوں گے۔ یونیورسٹی میں ہر ہفتے ڈبیٹ ہوتا تھا۔ زیادہ تر انگریزی میں۔ میں شروع میں پابندی سے ہر ڈبیٹ میں موجود رہتا اور غور سے لوگوں کی تقریریں سنتا۔ اس زمانے میں اکثر کسی مباحثے کا آغاز پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم کرتے۔ مخالفت رئیس یا تھم پرو وائس چانسلر کرتے کبھی خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر محمد اشرف بھی ہوتے۔ اشرف اسی سال انگلستان سے واپس آئے تھے۔ کوئی ملازمت نہ ملی تھی۔ علی گڑھ میں اپنے ایک دوست منظور حسین بیرسٹر

کے یہاں قیام پذیر تھے۔ ان کا خواجہ منظور صاحب سے بہت ملنا جلنا تھا۔ اس زمانے میں ہر سال دسمبر میں ایک سالانہ آل انڈیا ڈبیٹ انگریزی اور اردو میں ہوتا تھا۔ یونین کے نائب صدر عبدالرحمٰن میسوری تھے۔ اچھے مقرروں میں عثمان احمد انصاری، احمد عباس، انور شیخ، نفیس احمد تھے۔ میں نے مباحثوں میں تقریر کرنا شروع کر دیا تھا اور اس لیے مجھے آل انڈیا اردو ڈبیٹ میں یونیورسٹی کی نمایندگی کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ موضوع تھا "سرمایہ داری اسلام کی تعلیم کے منافی ہے"۔ اردو کے اچھے مقرروں میں انصار ہروانی کا شمار ہوتا تھا۔ ان کو موضوع کی حمایت میں اور مجھے مخالفت میں بولنا تھا۔ یونین کے قاعدے کے مطابق علی گڑھ کے نمایندے مباحثے کا آغاز کرتے تھے مگر مقابلے میں حصہ نہ لیتے تھے۔ میں نے خاصا مطالعہ کر کے اپنی تقریر تیار کی اور اُسے یاد کر لیا۔ ججوں میں رشید صاحب، ڈاکٹر اشرف اور غالباً بشیر ہاشمی تھے۔ میں بہت نروس تھا مگر میری تقریر اچھی خاصی رہی۔ دو تین دن بعد میں رشید صاحب سے ملنے گیا۔ اطلاع کرائی تو اندر بلا لیا۔ ایک قمیص اور نیکر پہنے صحن میں گھاس کھود رہے تھے۔ ایک پیڑھی میری طرف بڑھا دی۔ میری تقریر کی بہت تعریف کی۔ یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر اشرف کے نزدیک مباحثے میں سب سے اچھی تقریر آپ کی تھی۔ مضمون لکھنے کا بھی وعدہ کر لیا۔ معلوم یہ ہوا کہ رشید صاحب اس وقت تک طالب علموں کو منہ نہیں لگاتے جب تک ان میں کوئی خاص بات نہ ہو۔ میں ان کے نزدیک قد غن پار کر چکا تھا۔ اس کے بعد ان کے یہاں اکثر جانے لگا۔ اور وہ مجھ سے بہت محبت کرنے لگے۔ دسمبر میں انجمن حدیقۃ الشعر کا مشاعرہ ہوا اس کے لیے اصغر گونڈوی، حفیظ جالندھری، مولانا حسرت اور کچھ اور شعرا تشریف لائے تھے۔ راس مسعود وائس چانسلر مشاعرے کے صدر تھے۔ اصغر صاحب اور حفیظ جالندھری رشید صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ مشاعرے سے ایک رات پہلے رشید صاحب کے یہاں شعری نشست میں حفیظ نے اپنا سلام سنایا۔ حفیظ کا ترنم مشہور تھا۔ انھوں نے کئی نظمیں سنائیں۔ کچھ دیر بعد رشید صاحب کے بچے اقبال اور احسان آ گئے۔ رشید صاحب نے بے ساختہ کہا حفیظ صاحب آپ کے اصلی سامعین تو اب آئے ہیں۔ سب نے قہقہہ لگایا اور حفیظ نے بچوں کے لیے نظمیں اور گیت سنائے۔ مشاعرے میں اصغر کی غزل صغیر احمد صدیقی نے سنائی۔ غزل کا مطلع تھا ؎

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردہ سمجھتے ہیں

حفیظ نے تین نغمے سنائے۔ ٹیگور، اقبال اور حفیظ۔ ایک غزل بھی سنائی۔ یہ میں نے اسی وقت میگزین کے لیے لکھ لی تھی۔ غزل کا مطلع تھا ؎

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دل کش اور سہانا ہے
افسوس مجھے نیند آئی ہے افسوس مجھے سو جانا ہے

ایک اور شعر جو بہت پسند کیا گیا تھا یاد آیا ؎

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دل داری کے جھولے میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

ایک اور شعر یاد آیا ؎

اظہارِ محبت ہو بھی چکا، تم ہنس بھی چکے میں رو بھی چکا
اب سینے سے لگ جانا ہے یا اور ابھی ترسانا ہے

یہ بھی میں نے میگزین میں چھاپ دیا تھا۔ حفیظ کو اس شعر کی اشاعت پسند نہ تھی۔ یہ بعد میں اندازہ ہوا کہ کیوں؟

طلبا کے لیے نظم کا عنوان صبحِ بہار مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے بھی نظم پڑھی تھی اور مجاز نے بھی۔ طلبا پر ہوٹنگ تو ہوتی ہی ہے۔ مگر میری نظم پر حسنِ اتفاق سے ہوٹنگ نہ ہوئی اور مجاز کی نظم پر خاصی ہوئی۔ اصغر صاحب کو یہ نظم پسند آئی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے اپنے رسالے "ہندوستانی" میں چھاپیں گے۔ مشاعرے میں آخر میں حسرت نے اپنی غزل سنائی۔ ان کو سننے کا بہت اشتیاق تھا۔ انھیں دیکھ کر پہلی نظر میں بڑی مایوسی ہوئی۔ دبلے پتلے، کم رو، بے ڈھنگی سی داڑھی، چنچناتی ہوئی آواز۔ مگر غزل پسند آئی مطلع تھا ؎

طلب عادت نہیں اہلِ رضا کی
یہ لغزش تھی زبانِ مدعا کی

اس غزل میں ایک شعر شوخ اور مولانا کے خاص رنگ کا تھا ؎

اب ان آنکھوں میں ہے صبحِ شبِ وصل
نہ شوخی کی نہ گنجائش حیا کی

اس پر حفیظ بے اختیار پکار اٹھے۔ واہ مولانا یہ عمر اور ایسا جوان شعر۔ یاد آتا ہے کہ حفیظ کا یہ کہنا سبھی کو ناگوار گذرا تھا یہ مولانا حسرت کا سب احترام کرتے تھے۔

جب مشاعرے کا پہلا دور ختم ہو گیا تو راس مسعود نے معذرت چاہی اور اپنی جگہ عبدالمجید قریشی کو صدر بنا کر رخصت ہو گئے۔ حفیظ کی شہرت اس وقت اپنے شباب پر تھی۔ شاہنامۂ اسلام کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی اور اکثر میلادوں اور قومی جلسوں میں پڑھی جاتی تھی۔ وہ اس زمانے میں دوسری جلد لکھ رہے تھے۔ چنانچہ قریشی صاحب نے ان سے فرمائش کی کہ شاہنامہ سنائیں بلکہ یہ کیا کہ وہ اپنی کرسی چھوڑ کر سامعین کی صف میں آکر بیٹھ گئے اور ان سے کہا کہ صدارت کریں۔ حفیظ صدارت کی کرسی کے قریب کھڑے ہو گئے اور جنگِ بدر کا حصہ سنایا۔ حضرت حمزہ رضؓ کی جنگ سے متعلق اشعار سناتے ہوئے انھوں نے کہا کہ رزم نگاری انیس کا حصہ ہے مگر میرے لیے تفصیل کا موقع نہیں تھا اس کے بعد یہ شعر سنایا ؎

جنابِ حمزہؓ نے تلوار کو تلوار پر روکا
سبکدستی سے تھپکی دے کے مہلک وار کو روکا

وہ دیر تک شعر سناتے رہے اور مجمع تحسین و آفرین کی صدائیں بلند کرتا رہا۔ آخر اس شعر پر صحبت ختم ہوئی ؎

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

دو ڈھائی بجے ہم لوگ یونین ہال سے اٹھے۔ حفیظ اس کے بعد کئی دفعہ علی گڑھ آئے مگر جتنی داد انھیں اس مشاعرے میں ملی پھر کبھی نہیں ملی۔ دوسرے دن دس گیارہ بجے جب میں رشید صاحب کے یہاں پہنچا تو محفل گرم تھی۔ حفیظ شاہنامہ سنا رہے تھے اور پندرہ بیس آدمی ہمہ تن گوش سن رہے تھے۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا۔

علی گڑھ میگزین کے لیے میں نے جنوری ۱۹۳۲ء کے شمارے کے مضامین مرتب کر کے دسمبر ۱۹۳۲ء کے آخر میں

یونیورسٹی پریس میں دے دیے تھے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے پریس کے منیجر مقتدا خاں شروانی تھے۔ انھیں رعایت لفظی کا بہت شوق تھا۔ نذیرالدین کاتب تھے۔ بعد میں انھوں نے اپنا پریس کھول لیا اور خوب ترقی کی۔ مجھے شعبے کی رائے لٹریری شعبے کا سکریٹری بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔ میں نے کئی جلسے کرائے اور خود بھی سموئیل جانسن پر ایک مقالہ پڑھا۔ اپریل میں یونین کی طرف سے سالانہ انعامی مباحثے ہوئے۔ میں نے سب میں حصہ لیا۔ یاد پڑتا ہے کہ تین اول انعام اور دو دوم انعام مجھے ملے تھے۔ احمد عباس کو دو اول انعام ملے تھے۔

۲۳ - ۱۹۳۲ء کا تعلیمی سال مباحثوں، میگزین کی ادارت، مطالعے اور کلاس کی مصروفیت میں گذرا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی وسط جون سے آخر ستمبر تک بند رہتی تھی۔ پہلی اکتوبر کو نیا سال شروع ہوتا تھا۔ میرے خالہ زاد بھائی اور دوست افضال حسین قادری مجھ سے ایک سال بڑے تھے۔ علی گڑھ میں بھی عرصے سے تھے اس لیے ان کا ساتھ زیادہ رہتا تھا۔ وہ میرے بڑے خالہ زاد بھائی ابرار حسین قادری کے ساتھ احمد علی خاں کے بنگلے میں وقارالملک ہال کے قریب رہتے تھے۔ میں اپنے والد کے ساتھ ڈاکخانے میں رہتا تھا۔ گرمی شروع ہوئی تو یہ طے پایا کہ چھٹیوں میں کشمیر چلیں۔ چنانچہ افضال، ذکی، سید عون اور میں جون کے وسط میں کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ ذکی بہار کے تھے اور فزکس کے شعبے میں لکچرر تھے۔ سید عون، سید محمود حسین کے چھوٹے بھائی تھے جو انگریزی کے شعبے میں لکچرر اور ممتاز ہاؤس کے وارڈن تھے۔ ممتاز ہاؤس میں کشمیر کے تین طالب علم تھے جن سے میری بھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ دراصل میں افضال کے ساتھ ان کے ایک دوست نواب زادہ علی صغیر سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اسی ہوسٹل میں ایک کمرے میں تین کشمیری نوجوان تھے جن سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ یہ تھے مرزا افضل بیگ، غلام محمد صادق اور غلام محمد حکین۔ افضل بیگ اور صادق نے بعد میں شیخ عبداللہ کی قیادت میں تحریک حریت کشمیر میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ افضل بیگ شیخ صاحب کے دست راست تھے۔ شیخ صاحب کی پہلی وزارت میں وزیر مال تھے۔ پھر جیل میں ان کے ساتھ رہے جب ۱۹۷۵ء کے آغاز میں اندرا گاندھی سے سمجھوتہ ہو گیا اور شیخ عبداللہ برسر اقتدار آئے تو افضل بیگ ڈپٹی چیف منسٹر بنے۔ خواجہ غلام محمد صادق بھی وزیر ہوئے اور بعد میں وزیر اعلیٰ۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں اُن کا کا انتقال ہوا۔ غلام محمد حکیم آخر میں ریاست کی پبلک سروس کمیشن کے چیرمین ہو گئے تھے۔ جب ہم وسط جون میں سری نگر کے لیے روانہ ہوئے تو طے یہ تھا کہ ہم لوگ سیدھے پہل گام جائیں گے اور وہاں ایک خیمہ لے کر رہیں گے اور دس بارہ دن بعد سید محمود حسین اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہیں آجائیں گے۔ میں اس سے پہلے مسوری جا چکا تھا۔ پہاڑی مقامات کا میرا یہ دوسرا سفر تھا۔ ہم لوگ فرنٹیر میل سے وزیرآباد پہنچے۔ وہاں سے سیال کوٹ ہوتے ہوئے جموں سہ پہر تک پہنچ گئے۔ رات ایک ہوٹل میں گذاری اور صبح چھے بجے ایک بس کے ذریعے سری نگر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں عام طور پر دو دن میں بسیں سری نگر پہنچتی تھیں مگر ہماری بس جس میں ڈاک جا رہی تھی اور کل پانچ مسافر تھے شام ہوتے ہوئے اننت ناگ پہنچ گئی اور ہم لوگ وہیں ایک ڈاک بنگلے میں رات بھر کے لیے ٹھہر گئے۔ افضل بیگ سے ملنے نہ گئے جو اننت ناگ کے مضافات میں رہتے۔ یہ سفر اور اس کے تجربات اب تک ذہن پر نقش ہیں۔ مجھے بٹوٹ کے منظر اور رام بن کے قریب دریائے چناب کے جلال نے بہت متاثر کیا۔ بانہال کی چوٹی پر جون میں بھی کچھ برف تھی۔ جب ہم بانہال سے اتر کر وادیٔ کشمیر میں داخل ہوئے تو حدِ نظر تک سبزہ، سفیدے کے درخت، ہر طرف ابلتا اور لہریں لیتا ہوا پانی دیکھ کر میں مسحور ہو گیا اور سفر کی ساری تکان دور ہو گئی۔ کشمیر کی حسین وادی سے یہ تعارف آدمی کبھی بھول نہیں سکتا۔ میرے نزدیک ایسے منظر دنیا میں کم ہی ہوں گے۔ صبح اٹھ کر بس کے ذریعے پہل گام کے لیے روانہ ہوئے اور دوپہر تک وہاں پہنچ گئے۔ پہلگام اس زمانے میں سیاحوں کے ہاتھوں آلودہ نہ ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ چند دکانیں، ایک سردارجی کا ہوٹل، اسپتال، پولس کی چوکی اور ڈاک خانہ۔ پلیٹو اور لدر نالے کے دائیں بائیں سیاحوں کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ یہاں لدر جو شیش ناگ اور آڑو نالے سے مل کر وجود میں آیا ہے۔ شور مچاتا، ہنستا کھیلتا بڑی بڑی چٹانوں کو گود میں لیے بڑی آن بان سے بہ رہا تھا۔ ہم لوگوں نے ایک دکان سے خیمہ لیا اور بازار کے اوپر دائیں طرف دیواروں کے ایک جھنڈ میں اپنا خیمہ لگا لیا۔ ذکی تو سیدھے سری نگر چلے گئے تھے۔ افضال، عون اور میں دس بارہ دن رہے، پھر محمود صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ ان کے دو اور چھوٹے بھائی لئیق اور صدیق، ان کی بیوی اور دو چھوٹے بچے تھے۔ ایک لڑکی زبیدہ اور ایک

لڑکا مسعود بھی تھا۔ انھوں نے دو خیمے لگوائے۔ ایک میں وہ سب رہتے تھے۔ دوسرے میں ہم سب کھانا کھاتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد ہم لوگ گھومنے نکلتے۔ دوپہر کو کھانے کے بعد آرام کرتے۔ چائے پی کر پھر ٹہلنے نکلتے۔ اس زمانے میں ہم لوگ چندن واڑی، بائی سرن اور تلین جھیل گئے۔ ایک دن سامنے ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ برا حال ہو گیا۔ گرتے پڑتے اوپر تک پہنچے چڑھائی تقریباً عمودی تھی۔ ہم لوگ جھاڑیاں پکڑتے، بیس پچیس گز چڑھتے اور جب سانس پھولنے لگتی تو رک جاتے۔ پہلگام کی اونچائی ساڑھے سات ہزار ہے۔ ہم لوگ کوئی دو ہزار فٹ اوپر گئے ہوں گے۔ محمود صاحب دبلے پتلے آدمی تھے اور پہاڑوں پر گھومنے پھرنے کے عادی۔ اتفاق سے پہاڑ کی اس چوٹی پر پانی نہ تھا اور سبزہ بھی برائے نام۔ پیاس کے مارے برا حال ہو گیا۔ پھر پگڈنڈی کو چھوڑ کر دوسری طرف لدر کے کنارے اترے۔ وہاں پہنچے تو جی چاہا کہ سارا دریا پی جائیں مگر محمود صاحب اور افضال نے پانی زیادہ پینے نہ دیا۔ گرتے پڑتے شام کے وقت جائے قیام تک پہنچے تو سب کی حالت زار تھی۔ وزن کئی پونڈ کم ہو گیا تھا۔ مگر سب اس تجربے سے خوش بھی تھے۔

یاد آتا ہے کہ افضل بیگ ایک دن ہم لوگوں سے ملنے پہلگام آئے تھے اور ہم لوگ لدر میں نہائے تھے۔ لدر میں بڑی بڑی چٹانیں ہیں۔ کنارے کے قریب ایک چٹان کے نیچے پانی کا بہاؤ زیادہ تیز نہ تھا۔ وہاں ہم لوگ نہائے۔ سردی کی وجہ سے دانت بجنے لگے مگر دھوپ اچھی تھی اس لیے لطف آیا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے دو طالب علم مختار جمیل اور ناصر علی سائیکلوں پر کشمیر آئے اور پہلگام بھی پہنچے۔ دو دن ہمارے ساتھ قیام کیا۔ میں اپنے ساتھ کچھ کتابیں بھی لایا تھا۔ کچھ گھنٹے مطالعے میں گذارتا۔ یہیں محمود صاحب سے لے کر میں نے دوستا یفسکی کی مشہور کتاب ایڈیٹ پڑھی۔ کیا بتاؤں اس کتاب کا مجھ پر کیا اثر ہوا۔ ایسا لگا کہ میں خود پرنس مشکن بن گیا ہوں۔ پہلگام کے مناظر نے مجھے بچا لیا۔ پہلگام میں سب سے خوبصورت منظر پلیٹو سے نظر آتا ہے۔ بائیں طرف سے شیش ناگ آتا ہے۔ دائیں طرف سے اڑو نالہ۔ دونوں نالے چھوٹی چھوٹی ندیوں میں بٹ جاتے ہیں اور دونوں کے بڑے دھارے کچھ آگے جا کر مل جاتے ہیں۔ پلیٹو سے دیکھیے تو لگتا ہے کہ سیال چاندی کی لکیریں ایک دوسرے کو کاٹ رہی ہیں اور دو چاندی

کے لمبے چوڑے ٹکڑے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ آڑو نالے کا پانی سبزی مائل ہے۔ شیش ناگ نالے کا سفیدی مائل۔ میں کبھی کبھی شیش ناگ نالے کے اس پل پر کھڑا ہو جاتا تھا جو پلبیٹو پہنچنے کے لیے عبور کرنا پڑتا ہے۔ لہروں کی تیزی اور تندی گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار جی چاہتا تھا کہ اس میں کود پڑوں۔ پل سے آگے ایک گاؤں تھا جہاں میلے کچیلے مگر چاند سے بچے سلام صاحب پونہ، سلام صاحب پونہ کہکر دوڑتے۔ کبھی کبھار میں اکیلا بھی ٹہلنے نکل جاتا۔ ایک دفعہ چندن واڑی کے راستے پر تین چار میل نکل گیا۔ شام ہو رہی تھی ایک جگہ لدر پر لکڑی کا پل تھا۔ میں نے دیکھا جب کوئی گذرتا تو تختے ایک طرف سے اٹھ جاتے تھے، مگر دیہات کے لڑکے لڑکیاں اطمینان سے آجا رہے تھے۔ میں نے سوچا لاؤ میں بھی اس پل سے دوسری طرف چلا جاؤں۔ آدھا پل طے کیا تھا کہ تختوں کے بار بار اٹھنے اور پانی کے شور سے میں گھبرا گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اب ڈر کے مارے نہ آگے بڑھا جاتا تھا نہ پیچھے۔ اندھیرا ہونے لگا تھا اور میری سمجھ میں آتا تھا کیا کروں۔ پھر چوپایوں کی طرح ہاتھوں اور پاؤں کے سہارے آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ آگے چل کر ایک اور پل ملتا ہے جس سے میں کئی دفعہ گذر چکا تھا۔ چناں چہ اس سے کسی طرح اپنے خیمے تک پہنچا مگر طے کر لیا کہ اب ایسے خطرناک پلوں پر سے نہ جایا کروں گا۔

پہلگام میں ہم لوگوں نے کوئی سوا مہینہ گزارا۔ وہاں سے بس کے ذریعے گاندربل پہنچے۔ یہ جولائی کا آخر تھا۔ گاندربل میں دو دن قیام کے بعد ہمارا قافلہ سونامرگ کے لیے روانہ ہوا۔ ہم لوگوں نے کچھ ٹٹو بھی لے لیے تھے۔ باری باری ٹٹوؤں پر بھی بیٹھ جاتے ورنہ زیادہ تر پیدل چلتے۔ پہلے دن کنگن ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ کنگن بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ دریائے سندھ ریسٹ ہاؤس کے بالکل نیچے بہتا ہے۔ سامنے پہاڑی ایک تاج کی طرح ہے۔ کنگن سے ہم لوگ گنڈ پہنچے۔ وہاں بھی ایک رات قیام کیا۔ گنڈ کے بعد وادی سکڑ جاتی ہے اور پہاڑ قریب آجاتے ہیں گگن گیر سے سونامرگ تک دریائے سندھ اونچے کالے پہاڑوں کے بیچ میں دودھ کے کڑھاؤ کی طرح نظر آتا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں سڑک تپلی تھی۔ میں تنہا ہی چل رہا تھا۔ دریائے سندھ کے شور اور دونوں طرف اونچے کالے پہاڑوں کو دیکھ کر خاصا ڈر لگا۔ بارش بہت

۱۳۲۲

تیز ہو رہی تھی۔ اس عالم میں پہاڑ ہٹے اور سونامرگ کی سبز وشاداب وادی نظر آئی جس کے بیچوں بیچ دریائے سندھ بالکل ایک سانپ کی طرح لہرا رہا تھا۔ میں جا کر ڈاک خانے کے برآمدے میں بیٹھ گیا اور ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔ قریب میں کچھ کشمیری قہوہ پی رہے تھے۔ انھوں نے مجھے سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر قہوہ پینے کی دعوت دی۔ اس قہوہ کا مزہ اب تک یاد ہے۔ ایک ہی پیالے میں سردی غائب ہو گئی اور میں بڑی توانائی محسوس کرنے لگا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد ساتھی بھی آ گئے اور ہم لوگوں نے تیز بارش میں محتاج واس کے ٹیلوں میں ایک جگہ خیمے لگا دیے۔

سونامرگ میں ہم لوگوں کا کوئی دو ہفتے قیام رہا۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد گھومنے نکل جاتے۔ دو تین گھنٹے کے بعد آ کر کھانا کھاتے اور کچھ دیر آرام کرتے۔ شام کو چائے پی کر پھر ٹہلنے کو نکلتے۔ کبھی سفید نالے کے کنارے کنارے میں کبھی گلیشر کی وادی کی طرف نکل جاتا اور وہاں یا تو انگریزی کے رومانی شعرا کا کلام پڑھتا یا شعر کہتا۔ جب ۱۹۲۵ء میں میرا پہلا مجموعہ سلسبیل شایع ہوا تھا تو اس میں زیادہ تر نظمیں وادی کشمیر کے اس سفر میں خصوصاً پہلگام اور سونامرگ میں لکھی گئی تھیں۔ اس زمانے میں میں انگریزی میں بھی شاعری کرتا تھا اور اپنے صدر ہیڈ ماسٹر کو چند نظمیں دکھائی بھی تھیں۔ اس سفر میں سید محمود حسین کو جو انگریزی پڑھاتے تھے اپنے انگریزی اور اردو اشعار دکھائے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کو تو مشق EXERCISES کہا ہاں اردو اشعار کی تعریف کی۔ اس کے بعد میں نے انگریزی میں شاعری ترک کر دی اردو ہی میں شعر کہتا رہا۔

سونامرگ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ طے ہوا کہ سونامرگ سے زوجی لا درے تک چلا جائے چنانچہ محمود صاحب، ان کے بھائی عون، میرے خالہ زاد بھائی افضال اور میں دو ٹٹو لے کر روانہ ہوئے۔ دو اس لیے کہ جو تھک جائے وہ ٹٹو پر بیٹھ لے۔ ایک قلی بھی ساتھ تھا۔ سونامرگ سے نو میل کے فاصلے پر بالتل BALTAL ہے جہاں سے ایک راستہ زوجی لا کو جاتا ہے اور دوسرا امرناتھ کے غار کو۔ بالتل سے کوئی تین میل کی چڑھائی پر زوجی لا کا درہ ہے۔ یہاں سے گذر کر ہم لداخ کے علاقے میں داخل ہوتے ہیں۔ بالتل تک زیادہ چڑھائی نہیں ہے۔ سونامرگ

ساڑھے آٹھ ہزار فٹ ہے اور بالتل ساڑھے نو ہزار فٹ لیکن اس کے بعد تین میل میں ہم کوئی ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کی چڑھائی پر زوجی لا پہنچتے ہیں۔ بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں طرف کے پہاڑ ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ درّے سے نکلتے ہی لداخ کی سرزمین دکھائی دیتی ہے۔ بالتل تک ہم گویا ایک باغ سے گزرے۔ ہر طرف سبزہ، پھول اور سندھ نالے کا شفاف پانی۔ زوجی لا سے گزر کر ایک نیا منظر سامنے آیا۔ ہر طرف سیاہ بے آب و گیاہ پہاڑ۔ زمین پر برف مگر وہ بھی گرد کی وجہ سے کالی۔ اس منظر میں بھی ایک نرالا حُسن تھا۔ میں نے راستے میں ٹٹو نہ لیا۔ سوچا کہ جب تک ہو سکے گا پیدل ہی چلوں گا۔ زوجی لا سے گزر کر ایک جگہ مٹائن آتی ہے سونامرگ سے چودہ میل دور۔ یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ پانی کی جگہ اوپر کی مٹی ہٹا کر برف کٹوردان میں لیا اور اسے دھوپ میں پگھلا کر پیا۔ پھر گھنٹہ بھر آرام کرنے کے بعد واپس ہوئے۔ اب ساتھیوں نے کہا کہ ٹٹو پر بیٹھ جاؤ۔ میں نے کہا آج دیکھنا چاہتا ہوں کہ پیدل کتنا چل سکتا ہوں۔ چنانچہ واپسی کا پورا سفر بھی پیدل کیا۔ آخری دو میل سخت تھے۔ تھوڑی دور جا کر بیٹھ جاتا اور سستا کر آگے بڑھتا۔ ساتھی تنگ آکر جا چکے تھے مگر ایک قلی ساتھ تھا۔ چنانچہ گرتا پڑتا کوئی ساڑھے آٹھ بجے رات کو خیمے پر پہنچا۔ اس دن ۲۸ میل پیدل چلا۔ دوسرے دن گو چلا نہ جاتا تھا مگر ساتھی اصرار کر کے میل دو میل ٹہلانے لے گئے تاکہ ٹھیک ٹھاک رہوں۔ اس ریکارڈ پر آج بھی مجھے فخر ہے۔

سونامرگ سے ایک دفعہ اکیلا ٹہلنے نکلا۔ دریا کے کنارے ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ وہ پگڈنڈی دریا پر آکر ختم ہو جاتی تھی۔ واپس لوٹا تو تعجب ہوا کہ یہاں تک پہنچا کیسے۔ اب پیر پھسلنے لگا۔ آگے راستہ نہ تھا اور واپسی کا راستہ ایسا کچا کہ ہر قدم پر پتھر اکھڑ کر دریا میں گرتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ میں بھی گر جاؤں گا۔ پھر یوں ہی اوپر پہاڑ کی طرف چڑھنا شروع کیا اور بھاری پتھروں کا سہارا لے کر اور کچھ پودوں کو پکڑ کر مشکل سے آدھے گھنٹے میں کوئی پچیس تیس فٹ اوپر پہنچا۔ یہاں سے ایک اور پگڈنڈی مل گئی تو جان میں جان آئی۔ اس کے بعد طے کر لیا کہ پہاڑی پگڈنڈی کے قریب نہ جاؤں گا۔ سڑک پر یا صاف راستے پر چلا کروں گا۔

سونامرگ سے ہم لوگ نسیم باغ آئے اور یہاں خیمے لگا دیے۔ اُس زمانے میں نسیم باغ

میں صرف چنار کے پیڑ تھے۔ ایک سرے پر ایک ڈاکخانہ تھا جس کے پاس سے ڈل جھیل شروع ہوتی تھی۔ ہم نسیم باغ سے شکارے پر شہر جاتے۔ شالی مار، نشاط، ہارون اور چشمہ شاہی۔ لوگ نشاط کو شالی مار پر ترجیح دیتے ہیں۔ مجھے اب بھی شالی مار زیادہ پسند ہے۔ جہاں گیر اور نور جہاں کے عیش کی یادگار۔ شروع ستمبر میں ہم لوگ راولپنڈی کے راستے سے علی گڑھ واپس آ گئے۔ کشمیر کے حسن کا جادو جس نے اس سفر میں مجھے اپنا پرستار بنالیا ایک حسین یاد بن کر اس کے بعد برابر میرے ساتھ رہا۔

یونیورسٹی اکتوبر میں کھل گئی تھی۔ یونین کے الکشن اس زمانے میں شروع دسمبر میں ہوتے تھے۔ شاید نومبر کا وسط تھا۔ میں شام کو ڈاکخانے میں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ غلام احمد مدنی ملنے آئے۔ یہ نواب اسماعیل خاں کے صاحبزادے تھے جو اس وقت یونیورسٹی کے ٹرسٹرار تھے۔ بی۔ اے میں ان کی اور ظفر احمد صدیقی کی پہلی پوزیشن آئی تھی۔ آئی۔ سی۔ ایس کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھ سے انھوں نے کہا کہ وہ اور ان کے دوست احباب مجھے یونین کے نائب صدر کے عہدے کے لیے کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں صدر پرو وائس چانسلر ہوتا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ انور شیخ جو سکریٹری تھے اور اچھے مقرر سمجھے جاتے تھے پنجاب اور سرحد کے طلبا کی مدد سے نائب صدر کے عہدے کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں اور اگر ان کے مقابلے میں کوئی جاندار امیدوار نہ ہوا تو ان کے انتخاب کے اچھے امکانات ہیں۔ ہم لوگ انور شیخ کے مقابلے کے لیے آپ کو سب سے موزوں آدمی سمجھتے ہیں۔ آپ آمادہ ہو جائیے مگر آپ کو ہوسٹل میں آنا پڑے گا کیوں کہ طلبا کوئی ڈے اسکالر منتخب نہیں کریں گے۔ میں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ سب سے پہلے والد سے ذکر کیا۔ وہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور یونین کے نائب صدر کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی کہ میں ہوسٹل چلا جاؤں، پھر میں نے اپنے خالہ زاد بھائی اور دوست افضال حسین قادری سے مشورہ کیا جو پہلے سے علی گڑھ میں تھے اور کئی الکشن لڑا چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ تمھیں یہاں آئے ہوئے ایک ہی سال ہوا ہے مگر اس عرصے میں میگزین کی اڈیٹری اور یونین کے تقریری مقابلوں میں متعدد انعامات حاصل کرنے کی وجہ سے تمھاری کامیابی کے امکانات ہیں۔ بسم اللہ

کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ میں تو اسٹاف میں آگیا ہوں مگر سینیئر طلبا سے میرے اب بھی مراسم ہیں میں ان کی حمایت حاصل کروں گا۔ تم پہلے ہوسٹل میں آجاؤ، پھر اپنی کوالی فیکیشن کا ایک دو ورقہ چھپوالو۔ بہر حال میں ایس ایس ایسٹ کے کمرہ نمبر ۹ میں آگیا جس میں علی قدر ٹینس کپتان پہلے سے مقیم تھے۔ وارڈن سید بشیر الدین تھے اور پرووسٹ میاں محمد شریف۔ چوں کہ میں ممتاز طالب علم تھا اور خواجہ منظور حسین صاحب کے یہاں اکثر جایا کرتا تھا اس لیے شریف صاحب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ خواجہ صاحب انھیں کے داماد تھے۔ غرض ہوسٹل میں آکر میں نے یونیورسٹی پریس سے ایک دو ورقہ چھپوایا جس میں سینٹ جانس کالج آگرہ اور علی گڑھ میں میرے امتیازات کا ذکر تھا۔ اسے دیکھ کر میرے سب کام کرنے والے بہت خوش ہوئے۔ چناں چہ ورک شروع ہوا۔ چند روز کے بعد میرے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی گئی کیوں کہ امیدوار ایک طور پر خانہ نشین کر دیا جاتا تھا۔ ہمارے چیف ورکر بدایوں کے ایک سینیئر طالب علم سید علی تھے۔ پڑھنے لکھنے میں کورے مگر الکشنیات کے ماہر۔ افضال بھی مشورے دیتے رہتے تھے۔ کسی وجہ سے انور شیخ تو بالآخر میدان میں نہ آئے ہاں مقابلہ معین الحق چودھری سے ہوا جو بنگال سے آئے تھے۔ بہر حال میں جیت گیا۔ میرے خلاف صرف ایک حربہ تھا کہ مجھے سال بھر علی گڑھ آئے ہوئے ہوا ہے۔ لیکن تحریر و تقریر میں میرے نام کی وجہ سے یہ زیادہ نہ چلا۔

یونین کے الکشن کے بعد ہارنے والے کا جنازہ نکالنے کی ایک رسم ہوتی ہے۔ معین چودھری میرے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ جنازے کے موقع پر امیدوار سے بحث نہیں ہوتی صرف ورکروں خصوصاً چیف ورکر کے کمرے کے سامنے ہائے ہائے ہوتی ہے اور باقاعدہ مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ شکر ہے کہ اس موقع پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔

اسی دسمبر میں جواہر لال نہرو علی گڑھ آئے اور اسٹریچی ہال میں ان کا لکچر ہوا۔ راس مسعود صاحب وائس چانسلر نے صدارت کی۔ راس مسعود صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ جواہر لال میں تمھارا صرف اس لیے خیر مقدم نہیں کرتا کہ تم ملک کے ایک ممتاز رہنما ہو بلکہ اس لیے بھی کہ تم میرے دوست موتی لال نہرو کے فرزند ہو۔ جواہر لال نے اپنی تقریر کے شروع میں کہا کہ لوگ میرے متعلق کہتے ہیں کہ میں خواب دیکھتا ہوں۔ میں اس جرم کا اعتراف کرتا ہوں کہ

میں خواب دیکھتا ہوں۔ میں ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھتا ہوں۔ پھر انھوں نے آزادی اور جمہوریت اور سوشلزم کے نصب العین پر زور دیا۔ جواہر لال نہرو خطیب نہیں تھے مگر ان کے خلوص اور ان کی پُرمغز تقریر کا اچھا خاصا اثر ہوا۔ اس سے پہلے ۱۹۳۰ء میں، میں آگرے میں گاندھی جی کو اور انھیں دیکھ چکا تھا۔ گاندھی جی کی تقریر نے جو ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں تھی مجھے خاصا مایوس کیا تھا۔ جواہر لال نہرو سے تقریر کرنے کو کہا گیا تھا مگر انھوں نے گاندھی جی کے بعد تقریر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جنوری ۱۹۳۴ء میں ہماری رسم تنصیب ہوئی۔ اس زمانے میں یہ تقریب ایک خاص اہمیت کی حامل ہوتی تھی۔ پہلے ایک ایک کر کے کیبنٹ کے دس ممبر ڈائس پر آتے تھے جو گون پہنے ہوتے تھے۔ پھر لائبریرین، پھر سکریٹری، پھر آخر میں نائب صدر، صدر یونین یعنی پرو وائس چانسلر سے ہاتھ ملاتے تھے اور اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے تھے۔ اس کے بعد نائب صدر اپنا خطبہ پڑھتا تھا۔ جس میں ہندوستان، علی گڑھ، نظامِ تعلیم اور طلبا کے مسایل سے متعلق اظہارِ خیال ہوتا تھا۔ ہمارے سکریٹری فیروز غلام علی رانا تھے جو سندھ کے رہنے والے تھے خاصے صاحب آدمی تھے۔ لائبریرین ممتاز احمد خاں، کیبنٹ میں احمد عباس اور محسن عبداللہ بھی تھے مگر یہ رسم تنصیب میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ میرے خطبے کے بعد صدر نے اپنی تقریر میں مجھے مبارکباد دی اور کچھ مفید مشورے دیے۔ اب یونین کا چارج میرے ہاتھ میں تھا۔ رشید صاحب نے ایک دستی خط میں لکھا "اورنگ نشینی مبارک ہو۔ بقدر دو گولوں کے میں بھی متمتع ہوا۔" اس موقع پر گولے بھی چھوڑے جاتے تھے۔

اس زمانے میں مارچ کے وسط سے امتحانات ہوتے تھے اور شروع فروری میں آغا خاں علی گڑھ آنے والے تھے۔ اس موقع پر وائس چانسلر کے ساتھ مجھے بھی خیر مقدم کے لیے ریلوے اسٹیشن جانا تھا۔ بہت سے اولڈ بوائے بھی آئے ہوئے تھے۔ ان میں مولانا شوکت علی بھی تھے۔ میں جب آغا خاں کے خیر مقدم میں تقریر کرنے کھڑا ہوا تو یونین کے سارے سابق عہدہ دار مع مولانا شوکت علی اور ذاکر صاحب کھڑے ہو گئے۔ اس زمانے میں نائب صدر کا یہ وقار تھا۔ اولڈ بوائز کے سالانہ جلسے کے موقع پر دو تقریریں یونیورسٹی کی طرف سے ہوتی تھیں۔ ایک

وائس چانسلری، ایک یونین کے نائب صدر کی۔

آغا خاں کے درود کے بعد میں ہمہ تن پڑھائی میں لگ گیا۔ ویسے بھی امتحان کے زمانے میں یونین میں مباحثے وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ دوسری سرگرمیاں بھی مدھم پڑ جاتی تھیں۔ ۱۵ مارچ سے امتحان شروع ہوا۔ اس زمانے میں پریویس کے امتحان نہ ہوتے تھے۔ امتحان میں وقفہ صرف ایک دن کا ہوتا تھا۔ شروع اپریل میں وائیوا بھی ہو گیا۔ اس کے لیے پروفیسر بنگ دہلی کالج سے آئے تھے۔ امتحان کے بعد میں ڈاکخانے واپس چلا گیا۔ مگر روزانہ شام کو ہوسٹل آجاتا اور طلبا سے ملتا۔ اپریل کے آخر میں ۲۵ کو کورٹ کا جلسہ تھا۔ راس مسعود نے اس میٹنگ میں اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ کورٹ نے ان کی سفارش کے باوجود رجسٹرار کو توسیع نہیں دی تھی۔ راس مسعود کے مخالفین کا یہ کہنا تھا کہ راس مسعود نے اس کو بہانہ بنایا وہ ذاتی وجوہ سے علی گڑھ سے جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے کچھ دن پہلے شادی کی تھی اور ان کی نئی بیوی علی گڑھ کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی آفتاب احمد خاں کی صاحبزادی تھیں۔ پہلی شادی کے موقع پر مولانا محمد علی نے یہ مشہور مصرع پڑھا تھا ؏

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی

میاں بیوی کے مزاجوں میں بہت فرق تھا۔ اس وجہ سے راس مسعود نے ان بیوی کو ڈیڑھ سال پہلے طلاق دے دی تھی۔ اس وقت تک یونیورسٹی کے سالانہ امتحان ختم ہو چکے تھے۔ صرف قانون کا امتحان دوسرے دن سویرے سے شروع ہونے والا تھا۔ میں جب ۲۵ کی شام کو ہوسٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ طلبا راس مسعود کے استعفیٰ پر احتجاج کے طور پر امتحان کا بائیکاٹ کرنا چاہتے ہیں طلبا اسٹریچی ہال کے سامنے جمع تھے، احمد عباس تقریر کر رہے تھے کہ ہمیں کل کے امتحان کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ میں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ پہلے ہمیں راس مسعود صاحب سے ملنا چاہیے اور ان سے درخواست کرنا چاہیے کہ وہ علی گڑھ کی کشتی کو منجدھار میں نہ چھوڑیں اور اپنا استعفا واپس لے لیں۔ اس پر سب لوگ تیار ہو گئے۔ چناں چہ ہم لوگ وائس چانسلر لاج چلے۔ راستے میں ایک ممبر کورٹ کار میں جا رہے تھے۔ ان کی گاڑی روکنے کی کوشش کی گئی مگر میرے سمجھانے پر انھیں جانے دیا گیا۔ جب ہم راس مسعود صاحب کے دولت کدے پر پہنچے تو فوراً سب کو ڈرائنگ روم

میں بلا لیا گیا۔ کچھ لوگ فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ کنارے پر کھڑے رہے۔ راس مسعود نے کہا: میرے بچو! تم لوگ اس وقت کیسے آئے ہو۔ ہم لوگوں نے کہا کہ جب سے آپ کے استعفے کی خبر سُنی ہے، ہم لوگوں پر بجلی سی گر پڑی ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ کل سے احتجاج کے طور پر ہم قانون کے امتحان کا بائیکاٹ کریں گے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ کسی طرح آپ یونیورسٹی کی قیادت چھوڑ کر نہ جائیں۔ راس مسعود نے کہا کہ دراصل میرا اختلاف کورٹ سے ہے اور اس کی بنا پر میں نے استعفا دیا ہے۔ تم لوگوں کو میں اپنی اولاد کی طرح سمجھتا ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے مستقبل پر اس کا اثر پڑے۔ تم لوگ امتحان دو اور میرے جانے نہ جانے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم لوگوں سے مجھے بڑی محبت ہے میں جہاں بھی رہوں گا تمھارے مستقبل کے لیے جو کچھ بھی کر سکا کرتا رہوں گا۔ اب اس کا کیا جواب تھا۔ ہم لوگ خاموشی سے چلے آئے۔ بہر حال دوسرے دن امتحان ہوا اور سب کام معمول کے مطابق انجام دیے گئے۔ یونین کی مصروفیات کی وجہ سے چوں کہ میری پڑھائی جیسی میں چاہتا تھا نہ ہو سکی تھی اس لیے جب نتیجہ نکلنے والا تھا تو میں بہت نروس تھا بہر حال مئی کے آخر میں نتیجہ نکلا تو مجھے فرسٹ کلاس مل گیا تھا۔ جون میں اپنے دوست اور خالہ زاد بھائی افضال کے ساتھ نینی تال گیا۔ وہاں نینی تال میں بس اسٹینڈ کے پاس ذاکر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اس وقت نینی تال سے واپس جا رہے تھے۔ مجھ سے میرا نتیجہ معلوم کرنے کے بعد انھوں نے پوچھا اب کیا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا آپ ضرور کامیاب ہوں گے مگر آئی۔ سی۔ ایس کر کے کیا کیجیے گا آپ کو تو ایک استاد کی حیثیت سے علی گڑھ کی خدمت کرنی چاہیے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اُن کی بات پر غور کروں گا۔ میں آئی۔ سی۔ ایس کا کوئی خاص خواہش مند نہیں ہوں مگر میرے والد چاہتے ہیں اس لیے خیال تھا۔ انھوں نے کہا بہر حال میری تجویز پر بھی غور کر لیجیے۔ چند روز ہم لوگوں نے نینی تال میں مزے سے گذارے۔ ایک دن دیکھا کہ ہمارے صدر شعبہ ہیڈ و ہیرس، میٹرو پول ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دوسرے دن صبح کو میں ان سے ملنے گیا۔ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے کہ مجھے یقین تھا کہ تمھیں فرسٹ کلاس ملے گا۔ پھر فرمایا کہ تم چاہو تو دو سال کے لیے شعبے میں آجاؤ۔ غلام سرور صاحب دو سال کی چھٹی پر انگلستان جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ

پہلی اکتوبر سے خالی ہوگی۔ میں اس جگہ کے لیے تمھارا نام بھیج سکتا ہوں۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا کہ بھیج دیجیے، میں تیار ہوں۔ بعد میں افضال سے ذکر کیا تو انھوں نے بھی اس بات کو پسند کیا۔

جب جولائی میں یونیورسٹی کھلی تو میں نے یونین کا کام جاری رکھنے کے لیے لا میں داخلہ لے لیا۔ علی قدیر تو لا کے امتحان کے بعد چلے گئے تھے۔ میرے کمرے میں ان کی جگہ عثمان انصاری آگئے تھے۔ یہ مجھ سے پہلے یونین کے نائب صدر رہ چکے تھے۔ اور ہم لوگوں کی اچھی ملاقات تھی ہوسٹل کے قیام کے زمانے میں دوستی ہوگئی۔ عثمان انصاری لا کا فائنل کر رہے تھے۔ ذہین اور پُرخلوص آدمی تھے مگر اپنے کو کچھ لیے دیے رہتے تھے۔ ہر ایک سے بے تکلف نہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھار کسی معمولی بات پر بغیر نوٹس دیے چراغ پا ہو جاتے تھے۔ ان سے بعد میں بھی مراسم برقرار رہے۔ یہ کلکتے کے اخبار (MORNING NEWS) کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں اور قائداعظم محمد علی جناح کے سکریٹری بھی۔ آزادی کے بعد پاکستان کی فارن سروس میں آگئے اور ایک عرصے تک نیو یارک میں رہے۔ اب لندن میں مقیم ہیں۔ صدیق احمد صدیقی کے ہم زلف تھے۔ صدیق احمد صدیقی طالب علمی کے زمانے میں چوٹی کے مقرر سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں بی۔ بی۔ سی میں رہے مگر جوانی میں دل کے عارضے میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بڑے ذہین اور طبّاع آدمی تھے مگر انھوں نے اپنی ساری ذہانت اندازِ گل افشانیِ گفتار کی نذر کر دی۔ ایم۔ اے میں میرے شاگرد بھی رہے تھے۔

جولائی سے ستمبر تک یونین کے جلسوں کی وجہ سے مصروفیت رہی۔ میں لا کے کلاس میں سب سے پیچھے بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھا کرتا تھا۔ مولانا عبدالخالق صدر شعبہ تعزیراتِ ہند پڑھاتے تھے۔ ایک دن لکچر کے بعد مجھے بلایا اور پوچھا کہ آپ کو لا سے دلچسپی ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آج کل کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ کہنے لگے وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ آپ کی وجہ سے اور کچھ لوگ پیچھے بیٹھے رہتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ میں نے کہا اچھا میں اب احتیاط کروں گا۔ چناں چہ اس کے بعد سے کلاس جانا چھوڑ دیا۔ اکتوبر سے میں نے اپنے نئے عہدے کا چارج لیا۔ زیادہ تر فرسٹ اور سکنڈ ایر سائنس کے کلاس تھے۔ دو ٹیوٹوریل

بی۔ اے کے بھی تھے۔ مگر کیش[؟] گھنٹے پڑھانا پڑتا تھا۔ کلاس بڑے ہوتے تھے اور زور سے بولنا پڑتا تھا۔ چناں چہ لکچر کے بعد اکثر گلا خراب ہوجاتا تھا۔

شروع ۱۹۳۶ء میں ذاکر صاحب کے مشورے سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کا ارادہ کیا۔ امتحان مارچ میں تھا۔ اُردو ادب کا مطالعہ تو برابر کرتا رہتا تھا اس لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں ہوئی۔ ہاں امتحان دینے کے لیے ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دی۔ ہمارے صدر ہیڈ ویسے تو مہربان تھے مگر اس دفعہ انھوں نے صاحبیت برتی اور کہا کہ بہت پہلے درخواست دینی چاہیے تھی۔ میں نے پریشان ہوکر محمود حسین سے کہا کہ آپ کسی طرح صدر شعبہ کو رام کریں۔ وہ ان کے گھر گئے اور اُن سے وعدہ کیا کہ وہ اور مختار حامد علی میرے کلاس لے لیا کریں گے۔ بہر حال ایک ہفتے کی رخصت مل گئی۔ اس طرح میں نے ایم۔ اے اُردو کا امتحان دیا۔ جس دن وایوا تھا۔ اس دن میں کلاس لے کر وایوا کے لیے شعبہ اُردو گیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں افضال کے ساتھ کشمیر گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں نینی تال۔ اگست ۱۹۳۵ء میں یہ طے کیا کہ مسوری سے شملے پیدل چلا جائے۔ اس پارٹی میں پہلے سید محمود حسین، مختار حامد علی، سید بشیرالدین اور میں چار آدمی تھے۔ چکراتے سے جے۔ بی۔ دارا بھی شامل ہوگئے تھے۔ ہم لوگ پہلے مسوری پہنچے۔ دو تین دن وہاں ٹھہر کر آگے بڑھے۔ پہلے دن مسوری سے لکھواڑ تک سات میل اترتے چلے گئے اور چھے ہزار فٹ سے اترتے ہوئے دو ہزار فٹ پر جمنا پار کی۔ اس کے بعد اگلے تین میل چڑھائی تھی جو بہت مشکل تھی۔ جب ہم شام کو پانچ بجے لکھواڑ پہنچے تو برا حال تھا۔ مگر چائے پی کر اور تھوڑی دیر آرام کر کے جب ماحول کا جائزہ لیا تو جی خوش ہوگیا۔ لکھواڑ ہے جمنا کنارے مگر سامنے جمنا ایک پہاڑی کو حلقے میں لیے ہوئے ہے۔ یعنی تین طرف جمنا ہے اور ایک طرف لکھواڑ۔ یہ خوبصورت منظر اب بھی یاد آتا ہے۔ رات کو آرام کر کے ہم دوسرے دن ناگ ٹھاٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ ستمبر کا مہینا تھا۔ رات کو بارش ضرور ہوتی تھی مگر دن میں مطلع صاف رہتا تھا۔ ناگ ٹھاٹ میں ہم نے بہت سی جوان عورتیں کھیتوں میں کام کرتے دیکھیں۔ کھیتوں کے کناروں پر مرد آرام سے حقہ پی رہے تھے۔ معلوم ہوا یہاں سارا کام عورتیں کرتی ہیں اور ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں۔ اس علاقے کے رسم و رواج کے متعلق ڈاکٹر پرمار اور ڈاکٹر رام

زرین سکینہ نے خاصا اہم کام کیا ہے۔ ناگ ٹھاٹ سے جب چکراتے کے لیے چلے تو اتفاق سے میں اور مختار حامد علی آگے آگے تھے۔ محمود اور بشیر پیچھے پیچھے سامان کے ساتھ آرہے تھے۔ میں اس دن نیکر پہنے ہوئے تھا۔ مختار صاحب حسبِ معمول شیروانی اور پاجامے میں تھے۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ ان کا سفید اور سیاہ جوتا سُرخ ہو گیا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ جونکیں لپٹ گئی ہیں۔ میرے موزے پر بھی کچھ لپٹی ہوئی تھیں مگر زیادہ خون نہ چوس پائی تھیں۔ کسی طرح ان کو الگ کیا۔ چکراتے کے ڈاک بنگلے پہنچے تو معلوم ہوا کہ دہرہ دون کے کلکٹر نواب جعفر علی خاں اثرؔ اس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس وقت بے تکلف ان سے اپنی ضرورت بیان کرنی چاہیے ورنہ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے گی۔ چناں چہ میں نے اطلاع کرائی اور انھوں نے فوراً اندر بلا لیا۔ میں نے ان سے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہم چار استاد مسوری سے شملے پیدل سفر کے لیے نکلے ہیں ایک رات کو اس ڈاک بنگلے میں اگر آپ کوئی کمرہ دلوا دیں تو بڑی عنایت ہو۔ انھوں نے بڑا کرم کیا۔ ہم لوگوں کے لیے اپنا کھانے کا کمرہ خالی کرا دیا۔ اور مختار صاحب کے پیروں میں جونکیں دیکھ کر ایک آدمی سے ان کے پیر دھلوائے اور پھر چائے تیار کرنے کو کہا۔ اتنے میں محمود اور بشیر بھی آگئے۔ چائے پر اثرؔ صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے ہم لوگوں کو رات کے کھانے کی دعوت دی اور کھانے کے بعد اپنے شعر سنانے شروع کیے۔ ہم لوگ دس بارہ میل پیدل چل کر آئے تھے۔ تکان اور نیند کا غلبہ تھا مگر انھیں شاید عرصے کے بعد ایسے سخن فہم سامعین ملے تھے۔ بہر حال انھوں نے نظمیں، غزلیں اور تراجم سنائے۔ اپنے استاد عزیزؔ لکھنوی کا بڑے احترام سے ذکر کیا۔ معاصرین پر کچھ طنزیہ فقرے کسے۔ اس طرح گیارہ بج گئے۔ اس کے بعد جو ہم لوگ سوئے تو صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ جلدی جلدی تیار ہوئے اور ناشتے کے بعد نو بجے اگلی منزل یعنی دیوبن کے لیے روانہ ہو گئے۔ دیوبن نو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

چکراتہ بہت خوبصورت ہے۔ اس میں اس وقت تک شہر کی بات نہ تھی۔ چند صاف ستھرے بنگلے، ایک چھوٹا سا بازار، ہر طرف دیودار کی قطاریں، سامنے برف پوش پہاڑیاں، بازار سے گزرے تو داراب مل گئے اور انھیں بھی ساتھ لے لیا۔ دیوبن یوں تو صرف ساڑھے چار میل دور

تھا مگر چوں کہ اس کی اونچائی نو ہزار فٹ تھی اس لیے سارا راستہ چڑھائی کا تھا داراب تو کچھ دور چل کر سڑک پر بیٹھ گئے۔ ان کی خاطر ہم سب کو رکنا پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ طے ہوا کہ دو آدمی ان کے ساتھ رہیں اور دو آگے چلیں۔ چناں چہ محمود اور بشیر ان کے ساتھ آئے میں اور مختار آگے چلے۔ غرض کوئی تین بجے دیوبن پہنچے۔ یہاں ستمبر میں بھی خاصی سردی تھی۔ اور ہر طرف دیوداروں کی گھنی قطاریں۔ فضا میں ایک خاموشی تھی اور ایک جلال۔ دوسرے دن صبح دیوبن سے منالی کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ بارہ میل کے فاصلے پر تھی۔ پہلے دس ہزار فٹ کی بلندی آئی تھی۔ پھر دو ہزار فٹ کا اتار۔ حسبِ معمول میں اور مختار آگے چل رہے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ ایک بجے کے قریب ہم لنچ کے لیے رکیں گے اور محمود اور ساتھیوں کا انتظار کریں گے۔ ہم لوگوں نے کوئی گھنٹہ بھر انتظار کیا مگر ان لوگوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ مختار کی طبیعت بڑی جلدی تھی۔ کہنے لگے یہاں انتظار کرنے کے بجائے کیوں نہ منالی پہنچ کر ان کا انتظار کریں۔ غرض ہم دونوں بھوکے پیاسے آگے بڑھ گئے اور پانچ بجے شام کو منالی کے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں جا کر بیٹھ گئے۔ چوکیدار نے کمرہ کھولنے سے انکار کر دیا کیوں کہ اسے ہمارے آنے کی کوئی اطلاع نہ ملی تھی۔ بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ خدا خدا کر کے چھ بجے باقی پارٹی نظر آئی۔ سب سے پہلے میں نے ناشتہ دان مانگا۔ اس میں ہم لوگوں کے لیے پانچ اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ اور ایک پڑیا میں پسا ہوا نمک۔ یہی ہمارا لنچ تھا۔ مختار نے پہلے تو محمود کو بُرا بھلا کہا کہ انھیں صرف اُبلے ہوئے انڈے تیار کرانے کو کس نے کہا تھا اور پھر انڈے کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے خاموشی سے انڈے کھانے شروع کیے۔ چار کھا چکا تھا اور پانچواں اٹھا رہا تھا کیوں کہ بھوک خوب لگی ہوئی تھی کہ مختار نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جب آپ خود انڈے نہیں کھاتے تو مجھے کھانے سے کیوں روک رہے ہیں۔ کہنے لگے "میں کسی کو پانچ انڈے کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔" اس پر پوری پارٹی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بڑی مشکل سے چوکیدار کو ایک کمرہ کھولنے پر راضی کیا اور چائے پیتے ہی سب لوگ خراٹے لینے لگے۔ منالی سے دوسرے دن ہم اگلے پڑاؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ اب اگلے بیس پچیس میل تک اُتار ہی اُتار تھا۔ پھر چڑھائی۔ بعض پڑاؤ چودہ میل کے فاصلے پر تھے۔ بعض دس میل کے۔ کوٹھ کھائی سے پھر چڑھائی

شروع ہوئی۔ پھر چیل اور فاگو ہوتے ہوئے شملے پہنچے۔ یہاں آکر پہلے ایک ہوٹل میں ٹھہرے قلیوں کو رخصت کیا اور دن بھر آرام کیا۔ دوسرے دن شملے کی کچھ سیر کی اور تیسرے دن پوری پارٹی علی گڑھ واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ میں سولن میں رشید صاحب سے ملنے کے لیے اتر گیا یہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ پہاڑوں کا سفر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں چلنے، کچھ دیر آرام کرنے، مناظر سے لطف اٹھانے اور رات کو پڑ کر سو جانے کے سوا سب باتیں غیر اہم ہو جاتی ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور اس کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ فطرت کے بوقلموں مناظر نظر کے سامنے رہتے ہیں۔ کہیں پرشور نالے، کہیں سر بفلک چوٹیاں، کہیں گھنے اور پراسرار دیودار کے جنگل، کہیں دور تک سبزہ، کہیں پتھروں کے ڈھیر۔ رات کو تارے ایسے چمکتے ہوئے جیسے انھیں ابھی نئی روشنی ملی ہے۔ تندرست عورتیں جو سر پر بڑے سے گٹھے اٹھائے لچکتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے اعضا سڈول، اور آنکھیں ہرنوں کی سی، نیچے میلے کچیلے مگر ان کے چہرے چاند سے چمکتے ہوئے۔ ایک مقام پر ایک پہاڑی ملا۔ اس نے پوچھا صاحب کہاں سے آرہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ ہم لوگوں نے بتایا تو وہ تعجب سے بولا۔ ارے ریل سے کیوں نہیں گیا۔ بے فضول پہاڑوں میں ٹکر مار رہا ہے۔ اب اسے کون بتاتا کہ ہم انھیں ٹکروں کی خاطر اتنے دن سے چل رہے ہیں۔

سولن میں تین دن ٹھہرا۔ رشید صاحب بہت خوش ہوئے۔ یہاں ان کے پرانے دوست ڈاکٹر اصغر علی حیدر بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ کئی دن سے وہ بھی رخصت کے لیے پر تول رہے تھے مگر رشید صاحب انھیں روک ہی لیتے تھے۔ ان کی منگیتر کی بہن جرمنی سے آئی ہوئی تھیں۔ نہایت حسین وجمیل اور شوخ وشنگ۔ سارا گھر ان کے پیچھے دیوانہ تھا۔ بعد میں یہی اقبال کے بچوں کی نگراں ہوئیں۔ میں جب جانے لگا اور اصغر صاحب نے بڑی حسرت سے کہا کہ دیکھیں ہمیں کب جانے کا موقع ملتا ہے تو رشید صاحب نے ایک بڑے مزے کا شعر پڑھا۔ خدا جانے کس کا ہے۔ شاید حزیں کا ہو ؎

غیر پاخانے ابھی آیا ابھی لوٹ گیا
اور ہم ہیں کہ بواسیر لیے بیٹھے ہیں

میری بڑی بہن اپنے شوہر کے انتقال کے بعد سے بڑی سنجیدہ رہتی تھیں اس کی وجہ سے انھیں ذیابیطس ہو گئی تھی۔ میں علی گڑھ آیا تو مرض میں شدت تھی اور مسز خسرو کا علاج ہو رہا تھا جو لیڈی ڈفرن ہسپتال میں ڈاکٹر تھیں۔ پھر حکیم عبداللطیف صاحب کا علاج ہوا مگر مرض بڑھتا ہی گیا۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ہم لوگ بس سے ان کی لاش لے کر بدایوں گئے اور مغرب کے بعد اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کیا۔ میں ان سے سب سے زیادہ مانوس تھا۔ یہ بڑی محبت کی اور بڑی شفقت کرنے والی بہن تھیں۔ قد چھوٹا تھا مگر جسم سڈول۔ غصہ تو انھیں آتا ہی نہ تھا۔ مجھے کبھی بخار آ جاتا اور دوا پینے سے انکار کر دیتا تو صرف وہی تھیں جو کسی طرح بہلا پھسلا کر دوا پلایا کرتیں۔ ان کے انتقال کو اب باؤن برس ہو گئے مگر ان کی یاد اب بھی آتی ہے اور بے چین کر دیتی ہے۔ میں ماں سے کم اُن سے زیادہ مانوس تھا۔

میں شعر تو اسکول کے زمانے میں ہی کہنے لگا تھا۔ کالج کی تعلیم کے دوران یہ سلسلہ جاری رہا۔ میری غزلیں اور نظمیں سینٹ جانس کالج میگزین میں بھی چھپیں۔ جب دسمبر ۱۹۳۲ء میں انجمن حدیقۃ الشعر کا مشاعرہ ہوا تو "صبح بہار" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی۔ کشمیر کے سفر سے شاعری کو اور تحریک ہوئی۔ بہت سی نظمیں وہاں لکھیں۔ اس زمانے میں انگریزی میں بھی شعر کہنے کا شوق تھا۔ ہیڈو ہیرس صدر شعبۂ انگریزی نے میری دو تین نظموں کی اصلاح بھی کی۔ مگر جب کشمیر میں میں نے اپنی انگریزی اور اُردو نظمیں محمود حسین کو دکھائیں تو انھوں نے کہا کہ تمھاری انگریزی نظمیں تو ایک طرح کی مشقیں ہیں۔ ہاں اُردو شاعری میں جان ہے۔ اس کے بعد انگریزی میں شعر کہنے سے توبہ کر لی۔ اس زمانے میں لائبریری اکثر جانا ہوتا تھا۔ وہاں بشیر الدین کے کمرے میں رشید صاحب، نواب منظور حسین، مولانا عبدالعزیز میمن، ہادی حسن، محمود حسین، غلام السیدین آ جاتے تھے۔ ان لوگوں سے نئی کتابوں کا علم ہوتا۔ میں نے اس زمانے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ تنقید، ناول، شاعری، افسانے۔ راس مسعود نے ایک مرتبہ پوچھا اس وقت انگریزی کا سب سے اچھا افسانہ نگار کون ہے؟ میں نے آلڈس ہکسلے کا نام لیا جس کے کچھ افسانے پڑھے تھے۔ کہنے لگے تم سمرسٹ ماہم پڑھو تب تمھیں معلوم ہوگا کہ افسانہ کسے کہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے لائبریری

سے اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ (VIRTUE) نکلوایا جس کی پہلی کہانی نے بہت متاثر کیا۔ پھر اس کے طویل افسانے A LTOGETHER اور مختصر افسانے (COSMOPOLITANS) پڑھے۔ پھر اس کی کئی ناولیں پڑھیں۔ ماہم کو آج کل وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو ڈی۔ ایچ لارنس یا فاسٹر کو دی جاتی ہے مگر ماہم بہت اچھا کہانی کار ہے۔ پھر اس کے کئی ناول OF HUMAN BONDAGE CAKES AND ALE, MOON AND SIX PENCE پڑھ ڈالے۔ آج بھی میں اُسے ایک اچھا ناولسٹ اور افسانہ نویس سمجھتا ہوں، وہ کہانی کار بھی ہے اور اچھی نثر بھی لکھتا ہے۔

غرض ۱۹۳۵ء میں کشمیر کے سفر اور کچھ رومانی شعرا کے اثر سے شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ سلسبیل کے نام سے ایک چھوٹا سا مجموعہ مرتب کر کے شایع کرایا۔ رشید صاحب نے اس پر تعارف لکھا تھا۔ اصغر گونڈوی، نیاز فتح پوری اور پطرس نے اس کی تعریف کی تھی، مگر رسالہ اردو میں اختر رائے پوری نے ناخدا کے نام سے اس پر جو ریویو کیا اس میں یک طرفہ تنقید تھی۔ اسی زمانے میں میری نسبت خاندان کے ایک ممتاز رکن خان بہادر رحمان بخش قادری کی بڑی لڑکی سے ہوگئی۔ پیغام تو اور بھی تھے مگر میرے والدین نے اور میں نے بھی رشتہ پسند کیا۔ لڑکی کو دیکھ لیا تھا اور وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں نسبت طے ہوگئی مگر بڑی بہن کے انتقال کی وجہ سے شادی جو دسمبر میں ہونے والی تھی ملتوی ہوگئی اور بالآخر شروع اگست ۱۹۳۶ء میں ہو پائی۔

میں نے اپریل ۱۹۳۶ء میں ذاکر صاحب کے مشورے سے اُردو میں ایم۔ اے کر لیا تھا۔ پہلے ارادہ انگریزی آنرس کرنے کیمبرج جانے کا تھا۔ راس مسعود صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ بھوپال سے دس ہزار روپیہ قرض دلوا دیں گے جو اُس زمانے میں دو تین سال کے لیے کافی ہوتا۔ مگر ایک تو شادی ہوگئی۔ پھر جولائی میں شعبۂ اُردو کی ایک جگہ پر میرا تقرر ہوگیا۔ یہ جگہ جلیل قدوائی کے جانے سے خالی ہوگئی تھی چنانچہ انگلستان جانے کا خیال ترک کرنا پڑا۔ اب سوچتا ہوں چلا جاتا تو اچھا ہی رہتا مگر ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ سعادت اور بخاری نے انگلستان جا کر کون سا تیر مار لیا۔ تم نے انگریزی میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اس مطالعے سے فائدہ اٹھا کر اپنی زبان میں کچھ کام کرو۔ یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔

میری شادی برسات میں ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کے لیے چھٹی لی۔ والدین پہلے ہی بدایوں پہنچ گئے تھے۔ شادی کے موقع پر میرے پرانے دوست رضی الحسن چشتی آ گئے تھے۔ رخصت سہ پہر میں ہوئی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ شام ڈھلتے ہی حجلۂ عیش میں پہنچ جاتا، مگر چشتی دس بجے رات کی گاڑی سے جانے والے تھے۔ ان کے جانے کے بعد زنانے میں گیا۔ نئی نویلی دلہن کو رام کرنے کے لیے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ صبح اتنی جلدی ہو گئی کہ اگلی رات کا صبح سے انتظار کرتا رہا۔ اس زمانے میں دن دعوتوں میں گذرتے رات جاگتے میں۔ علی گڑھ واپس آیا تو نیند آنے میں دس پندرہ دن لگ گئے۔ بیوی چند روز کے لیے علی گڑھ آئیں ان کے دادا پھر آ کر انھیں گورکھپور لے گئے۔ اُس زمانے میں سب سے زیادہ لطف بیوی کو خط لکھنے اور ان کے خط پڑھنے میں آتا تھا۔

اگست ۱۹۳۶ء میں یونیورسٹی کے طلبا کی ایک اسٹرائک ہوئی تھی۔ میں شادی کے بعد واپس آیا تو یہ ہنگامہ دیکھا۔ سردار جعفری اور کچھ اور طلبا کو ابو بکر احمد حلیم پرو وائس چانسلر نے یونیورسٹی سے نکال دیا تھا اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں اُردو کانفرنس ہوئی اس میں بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ مولوی عبدالحق سے سب سے پہلی ملاقات اسی موقع پر ہوئی تھی۔ پریم چند سے بھی پہلی اور آخری دفعہ اسی وقت ملا۔

ستمبر میں میری والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور ان کی علالت لمبی چلی۔ اس عرصہ میں والد کا تبادلہ بمبئی ہو گیا۔ چناں چہ ہم لوگ ڈاکخانے کے سامنے کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔ دسمبر میں بیوی کو لے کر گورکھپور گیا وہاں مجنوں گورکھپوری سے ملاقاتیں رہیں۔ فروری ۳۷ء میں بیوی کو گورکھپور سے بدایوں لایا۔ اس عرصے میں مجھے نذیر احمد روڈ پر ایک مکان یونیورسٹی کا مل گیا تھا۔ بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ مئی میں والدین بھی آ گئے۔ ۱۷ر جولائی کو صدیق کی ولادت ہوئی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی وسط جولائی سے آخر ستمبر تک بند رہتی تھی۔ میں تعطیل میں والد کے پاس بمبئی گیا اور وہاں سے ایک ہفتے کے لیے حیدرآباد۔ اس سفر میں کوئی تین ہفتے صرف ہوئے۔ بمبئی میں پہلی دفعہ سمندر دیکھا۔ چوپاٹی اور میرین ڈرائیو کی سیر کی۔ ایک کشتی میں بیٹھ کر دو تین میل سمندر میں بھی گیا۔ اسمٰعیلیہ کا نجم

اندھیری جا کر نجیب اشرف ندوی اور بذل الرحمن سے ملاقات کی۔ حیدرآباد میں قیام مولوی عبدالحق صاحب کے یہاں رہا۔ ان سے ۱۹۳۶ء کی اُردو کانفرنس میں علی گڑھ میں ملاقات ہو چکی تھی۔ ان کی شفقت اور محبت سے بہت متاثر ہوا۔ مخدوم محی الدین سے مولوی صاحب کے یہاں پہلی دفعہ ملا۔ بنجارہ ہل کی سیر کی۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایک دفعہ شعبۂ اُردو گیا۔ اس زمانے میں شعبۂ اُردو یونیورسٹی کی عارضی عمارت میں تھا۔ ڈاکٹر زور اور عبدالقادر سروری سے ملاقات ہوئی۔ زور صاحب نے اپنی کئی کتابیں نذر کیں۔ مولوی صاحب کے یہاں ہاشمی فرید آبادی سے بھی ملاقات ہوئی۔ مولوی صاحب کی فرمائش پر میں نے رسالہ اُردو کے لیے کئی کتابوں پر ریویو کیا۔ یہ ریویو اڈیٹر کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ ایک ہفتے کے قیام میں، مولوی صاحب سے دنیا جہان کے مسائل پر باتیں ہوئیں۔ وہ نظام اور کچھ حیدرآبادی امراء کا اکثر مذاق اڑاتے تھے۔ مگر مہاراجہ کشن پرشاد کا نام بڑے احترام سے لیتے۔ زور سے زیادہ سروری کے قایل تھے۔ صبح ناشتے کے بعد سے شام کی چائے تک کام کرتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد بھی کچھ دیر مطالعہ کرتے تھے۔ بہت سویرے اٹھ کر ٹہلنے جاتے۔ زیادہ تر باغ عام میں ٹہلتے تھے۔ باتوں میں کچھ شوخی تھی۔ نوجوانوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کے یہاں کئی نوجوان ادیب رہتے تھے۔ شیخ چاند اور عزیز احمد کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں یونیورسٹی میں کچھ خاص لکچروں کا انتظام ہوا تھا پروفیسر حبیب الرحمان، حیدر خاں، خواجہ غلام السیدین، کے لکچروں کے بعد میرا ایک لکچر جدید اُردو شاعری کے میلانات پر ہوا تھا۔ یہ ذاکر صاحب کی خواہش پر رسالہ جامعہ میں شایع ہوا اس کا خاصا چرچا رہا۔

سر شاہ سلیمان ۱۹۳۸ء کے اپریل میں یونیورسٹی کے وایس چانسلر ہو گئے تھے۔ ہوا یہ کہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کورٹ میں اپنے حامیوں کی تعداد بڑھالی تھی۔ مگر ایک حلقہ جس کے قاید اس زمانے میں ذاکر صاحب اور غلام محمد تھے (جو بعد میں پاکستان کے صدر ہوئے) ان کے خلاف تھا۔ یہ لوگ قایدِ اعظم محمد علی جناح کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ کسی کو وائس چانسلری

کے لیے نام زد کر دیں۔ آپ جسے نامزد کریں گے اُس کی کوئی مخالفت نہ کر سکے گا۔ انھوں نے سر شاہ سلیمان کا نام تجویز کیا۔ سر شاہ اس وقت فیڈرل کورٹ کے جج تھے وہ اعزازی طور پر وائس چانسلری کا کام کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ سنیچر کی صبح کے میل سے علی گڑھ آ جاتے اور اتوار کی شام تک یونیورسٹی کا سارا کام نبٹا دیتے۔ ضروری کمیٹیاں کرتے، طلبا اور اساتذہ سے ملتے۔ ویسے اس زمانے میں اکیڈمک کاموں کی نگرانی پرو وائس چانسلر کے سپرد تھی، وائس چانسلر کا سابقہ انتظامی معاملات اور عام نگرانی سے رہتا تھا۔ ان کو آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل کو ہو گیا۔ یونیورسٹی کی طرف سے تعزیتی جلسہ یونین میں ہوا جس کی صدارت سر شاہ نے کی۔ رشید صاحب نے اور میں نے تقریریں کیں۔

۱۹۳۸ء میں مولانا احسن مارہروی ریٹائر ہوئے وہ سینیئر لکچرر تھے۔ یہ جگہ خالی ہوئی تو اس پر اگست ۱۹۳۸ء میں میرا تقرر ہوا۔ ایک جونیئر لکچرر کی جگہ اور ملی تھی اس پر عزیز صاحب کا اور میری جگہ پر ظہیر الدین علوی کا تقرر ہوا۔ یاد پڑتا ہے کہ انٹرویو میں حامد حسن بلگرامی، وقار عظیم اختر اورینوی وغیرہ بھی تھے۔ سر شاہ خود شریک نہ ہوئے تھے کیوں کہ عزیز صاحب ان کے عزیز ہوتے تھے۔ ماہرین میں نواب صدر یار جنگ اور ذاکر صاحب تھے۔ چند روز بعد میری لڑکی مہ جبین پیدا ہوئی۔ اب تک میں نذیر احمد روڈ پر ایک بڑے مکان کے ایک حصے میں رہتا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے اکتوبر میں مجھے ذکاء اللہ روڈ پر وہ مکان مل گیا جس میں مختار حامد علی رہتے تھے۔

۱۹۳۸ء کے شروع میں حاذق صاحب شعبۂ فارسی سے عارضی طور پر شعبۂ اردو میں آ گئے تھے۔ فارسی میں کام کم تھا۔ اردو میں زیادہ۔ اس وقت مولانا احسن کی جگہ تقرر ہونے والا تھا اور وہ بھی اس جگہ کے خواہش مند تھے۔ ذاکر صاحب کے ہم عصر تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ ذاکر صاحب چوں کہ اگزیکیوٹو کونسل میں ہیں اس لیے ان کی بات کی بڑی اہمیت ہے ان سے مدد کے خواہش مند ہوئے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ حاذق صاحب اطمینان رکھیے آپ کے ساتھ انصاف ہوگا۔ اس زمانے میں وہ میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ صاحب لائبریری سے بہت سی

کتابیں لا کر ہم لوگوں پر اپنی علمیت کا رعب ڈال لیتے ہیں۔ پھر کہتے صاحب یہ تنقید کیا ہوئی۔ ایک شعر لکھا پھر اس کی تشریح کر دی، پھر دوسرا اور اس کی تشریح کر دی۔ سب ان کی باتوں سے لطف لیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میری حمایت کر رہے ہیں۔ حاذق صاحب ویسے دلچسپ آدمی تھے۔ خاصے چرب زبان۔ ایف۔ اے کو فارسی پڑھاتے تھے۔ برسوں کی پڑھی ہوئی چند کتابیں۔ شاعری بھی کرتے تھے اور جلسوں میں سپاس نامے، خیر مقدمی نظمیں یا سہرے خوب کڑک کر سنایا کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ضیا صاحب سے شعر لکھوا لیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ ڈائننگ ہال سے اور دعوتوں سے انھیں بہت دل چسپی تھی۔ ایک بیکری بھی چلاتے تھے۔ ایف۔ اے کے طلبا میں بہت مقبول تھے۔ ان کی باتیں خاصی لچھے دار ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر مولوی عبدالحق دہلی لے آئے تھے آئندہ کام کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو دہلی بلایا ان میں میں بھی تھا۔ مولوی صاحب مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ اقبال نمبر کے لیے مجھ سے مضمون کی فرمائش بھی کی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں انجمن کی کل ہند کانفرنس دہلی میں ہوئی۔ اس کے لیے میں نے مولوی صاحب کی فرمائش پر علی بخش شرر (سرسید کے ایک مخالف) کے نام سے مضمون لکھا تھا۔ اس کے علاوہ مسعود علی ذوقی اور شاہد لطیف سے بھی مضامین لکھوائے تھے۔ یہ کانفرنس ٹاؤن ہال دہلی میں ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کا قیام قرول باغ میں تھا۔ رشید صاحب، بشیر الدین صاحب، حکیم عبداللطیف اور بیں علی گڑھ سے اس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ڈاکٹر رضی الدین کو میں نے پہلی دفعہ یہیں دیکھا۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی کا پیغام بھی پڑھا گیا تھا۔ مہدی یار جنگ نے صدارت کی تھی۔ اس کانفرنس میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ شرف الدین یاس ٹونکی کا اکثر بس میں ساتھ ہوتا۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے اور ماہر فن بھی۔ ہر رنگ کے اشعار بے تکلف سناتے تھے۔

میں شعبۂ اردو میں دو پرچے ایم۔ اے کے پڑھاتا تھا۔ بی۔ اے کا ایک اور کچھ کلاس لازمی اردو کے بھی لیتا تھا۔ کل ملا کر ستائیس گھنٹے پڑھاتا تھا۔ لازمی اردو کے کلاس سائنس کے شعبوں میں ہوتے تھے۔ کلاس میں سو ڈیڑھ سو طلبا ہوتے۔ خاصی گلے بازی کرنی پڑتی تھی

کے انتظامی کاموں میں رشید صاحب کی مدد بھی کرتا۔ شام کو کلب جا کر ٹینس کھیلتا۔ رات کو کچھ دیر رشید صاحب کے یہاں گذارتا۔ کھانے کے بعد پڑھنے بیٹھتا۔ طالب علمی کے زمانے سے یہی معمول تھا۔ رات کو دیر تک جاگنا اور صبح دیر سے اٹھنا۔ تدریس کے لیے مطالعے کے علاوہ ادب اور تنقید پر جو نئی کتاب لائبریری میں آتی اس کا مطالعہ بھی کرتا۔ کبھی کبھار رشید صاحب کے ساتھ ان کے دوست ڈاکٹر اصغر علی حیدر کے یہاں چلا جاتا جو کرشنا آشرم کے قریب رہتے تھے۔ وہاں رشید صاحب اور ان کے دوست برج کھیلتے اور میں تماشا دیکھا کرتا۔ انھیں صحبتوں میں ڈاکٹر ہادی حسن اور ڈاکٹر ایل کے حیدر سے بھی ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر ہادی حسن کی تقریروں کی بڑی شہرت تھی۔ غضب کا حافظہ پایا تھا۔ اپنی پوری تقریر یاد کر لیتے تھے۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی اور فارسی اور انگریزی میں بڑی روانی سے تقریر کرتے تھے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کی بھی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی۔ مغربیت اور مشرقیت کا ایک عجیب نمونہ تھے۔ اوپر کی صاحبیت کے ساتھ دوستوں سے بڑی محبت تھی۔ بڑے کھرے اور کھرّے آدمی تھے۔ سرحد کے رہنے والے تھے۔ لڑکی انگلستان میں تعلیم پا رہی تھی اس پر جان چھڑکتے تھے۔

جولائی ۱۹۳۷ء میں راس مسعود کا انتقال ہو گیا۔ ان کی لاش بھوپال سے لائی گئی تھی۔ راس مسعود کی طلاقتِ لسانی غضب کی تھی۔ حافظہ بھی بلا کا پایا تھا۔ ایک دفعہ جس سے ملاقات ہو جاتی اُسے یاد رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں میرے والد اُن کے ہم عصر تھے۔ برسوں کے بعد ملے تو فوراً پہچان لیا۔ انھیں ہزاروں شعر یاد تھے۔ مجھ پر خاصا کرم کرتے تھے۔ وہ جب بھی بھوپال سے علی گڑھ والدہ سے ملنے آتے میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ان کے اندازِ گل افشانیِ گفتار کا جواب نہ تھا۔ مسز نائڈو نے حیدرآباد میں ایک دفعہ مجھے بتایا کہ گفتگو کے مردِ میدان (CONVERSATIONALIST) راس مسعود اور پطرس بخاری جیسے کم ہی ہوں گے۔

۱۹۳۰ء کی گرمی میں فیض آباد میں اُردو ادب پر لکچروں کا ایک سلسلہ تھا۔ میں بھی مدعو تھا۔ میں نے وہاں ایک لکچر اقبال اور دوسرا سید پر دیے۔ علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے

کے یہاں قیام تھا۔ ان کے ساتھ ایک شام اجودھیا گیا۔ دریائے سرجو بڑی شان سے بہ رہا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ مگر گنگا کی طرح ریت میں لپٹا ہوا نہ تھا۔ گلاب باڑی میں اچاریہ نریندر دیو سے ملنے گیا۔ ان کی عالمانہ گفتگو اور دل نواز لہجے سے متاثر بھی ہوا۔ یاد آتا ہے کہ جس دن میرا آخری لکچر تھا۔ اسی دن جگر صاحب کی موت کی خبر آئی ۔ یہ خبر بعد میں غلط نکلی ۔ منتظمین کے اصرار پر میں نے جگر صاحب کی شاعری کی اہمیت پر تقریر بھی کردی۔ شکر ہے کہ چند روز بعد اس خبر کی تردید ہوگئی۔ جگر صاحب کا انتقال ۱۹۶۰ء میں کوئی ۲۲ برس بعد ہوا۔

اس زمانے میں میرا معمول یہ تھا کہ اپنے ایم۔اے کے لکچر خاصے مطالعے کے بعد تیار کرتا۔ اس کے علاوہ لائبریری جاکر نئی کتابیں لاتا۔ خواجہ منظور حسین، سید بشیرالدین، سید محمود حسین اور غلام السیدین سے نئی کتابوں کے متعلق خاصی معلومات مل جاتی تھیں۔ سہ پہر کو اسٹاف کلب میں ٹینس کھیلتا۔ مغرب کے بعد کبھی کبھار اچھے طالب علم یا کچھ دوست آجاتے اُن سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات بھی ہوتا۔ یونین میں کبھی کبھار میری تقریر بھی ہوتی تھی۔

۱۹۳۶ء سے ریڈیو پر تقریر کے لیے بلایا جانے لگا تھا۔ ۱۹۳۸ء سے تو یہ ہوگیا تھا کہ قریب قریب ہر مہینے کوئی نہ کوئی تقریر ہوتی۔ ریڈیو والوں نے کتابوں پر تبصرے کے لیے ایک پینل بنا دیا تھا۔ جس میں مولوی عبدالحق، پروفیسر مرزا محمد سعید (بخاری کے استاد) اور میں تھے۔ شاید اسی زمانے میں ن۔م۔راشد پروڈیوسر ہوکر دہلی آگئے تھے۔ اُردو میں ناول نگاری پر میری تقریر تھی۔ کچھ لمبی ہوگئی تھی۔ انھوں نے پہلے تو اس کی طوالت پر اعتراض کیا۔ میں نے کہا جہاں سے چاہیے کم کر دیجیے۔ اس کے بعد کچھ میری تنقید میں ترمیم چاہی۔ میں نے کہا۔ ریڈیو پر صرف سیاست، جنس اور فرقہ واریت پر پابندی ہے جسے میں تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن ادبی مسائل پر اپنی رائے پر اصرار کرتا ہوں۔ اس لیے کوئی ترمیم گوارا نہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں میری بات اچھی نہیں لگی۔ مگر اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ جب اختر رائے پوری کے افسانوی مجموعہ "محبت اور نفرت" پر میں نے ذرا جارحانہ تنقید کی تو اختر رائے پوری نے ان سے شکایت کی مگر راشد نے یہ کہا کہ میری تخلیقات کو کوئی اتنی اہمیت دے تو اس

کی مخالفت بھی مجھے گوارا ہوگی۔ اور پھر اس بات کا مجھ سے ذکر کیا۔ راشد کو مطالعے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں کاڈویل کی مشہور کتاب (ILLUSION AND REALITY) کا خاصا چرچا تھا انھیں یہ کتاب دہلی میں نہ ملی تو میں نے انھیں یونیورسٹی لائبریری سے نکلوا کر دی پھر میں نے بھی اسے پڑھا۔ ہم دونوں پر اس کتاب نے اس زمانے میں خاصا اثر کیا تھا۔ راشد نے جب رشید صاحب سے ملنے کی خواہش کی تو میں انھیں رشید صاحب کے گھر لے گیا۔ وہاں انھوں نے اپنی نئی آزاد نظم سنائی جس کی ہیئت اور موضوع دونوں رشید صاحب کو پسند نہ آئے اس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں مجھ سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ راشد نے بھی بعد میں رشید صاحب کو قدامت پرست کہا۔

یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں الٰہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کا جلسہ تھا۔ اس میں مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر تارا چند، رشید صاحب اور میں شریک تھے۔ میں نے اس موقع پر ایک مقالہ اقبال اور ابلیس پڑھا تھا۔ سید سلیمان ندوی اس وقت آئے جب میں مقالہ آدھے سے زیادہ پڑھ چکا تھا۔ جلسے کے بعد میں نے ان سے کہا۔ میں چاہتا تھا آپ میرا مقالہ پورا سن لیں مگر آپ کو شاید کہیں دیر ہوگئی تھی۔ کہنے لگے نہیں بھئی میں نے کچھ تو سن ہی لیا۔ جب آیا تو آپ ابلیس کو تھامے ہوئے تھے۔" اس موقع پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے بھی ملاقات ہوئی اور سجاد حیدر یلدرم کو بھی دیکھا۔ ڈاکٹر صدیقی کی علمیت کے سبھی قائل تھے۔ سجاد حیدر کے مزاج میں ایک قلندرانہ لہک تھی، جو بات کہتے بڑے جوش سے کہتے۔ مولوی عبدالحق سب پر فقرے کس رہے تھے۔

۱۹۳۷ء میں لکچرر گریڈ دوم کی جگہ پر مستقل ہوا۔ اس کا بھی ایک قصہ ہے۔ میں نے جولائی ۱۹۳۶ء میں جوائن کیا تھا۔ جلیل قدوائی چھٹی پر شملے چلے گئے تھے جب ان کا استعفا آگیا تو اس جگہ پر میرا تقرر مستقل طور پر ہوا۔ یہ غالباً اپریل کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر تھے وہ مجھ سے زیادہ خوش نہ تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ایک دعوت میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈپٹی رجسٹرار کی جگہ خالی ہے تم اس جگہ پر آجاؤ۔ رفتہ رفتہ رجسٹرار ہوجاؤ گے۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے انتظامی امور سے دلچسپی نہیں ہے۔ آئی۔ سی۔ ایس کا خیال بھی اسی لیے

چھوڑ دیا۔ اب جب میرا تقرر ہوا تو انھوں نے اکزیکیوٹو کونسل میں یہ طے کرا لیا کہ میں اس جگہ پر جولائی سے کام کروں۔ یعنی چھٹیوں کی تنخواہ سوخت۔ کونسل میں اس پر پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم نے کہا بھی کہ اس طرح تو آپ سارے استادوں کو چھٹیوں سے پہلے برخاست کر دیا کریں کافی پیسہ بچ جائے گا۔ مگر وہ نہ مانے۔ میں نے اس پر احتجاج کیا۔ رشید صاحب نے کہا کہ مولانا سلیمان اشرف سے مل لو۔ اتفاق سے وہ میری بیوی کے دادا کے والے تھے۔ یونیورسٹی میں ان کا بڑا اثر تھا۔ میری بیوی کے دادا بھی جب علی گڑھ آتے تھے ان سے ملنے ضرور جاتے تھے۔ بہر حال میں گیا۔ مولانا نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا میں نواب صدر یار جنگ سے کہہ دوں گا۔ مولانا ابوبکر شیث نے بھی ڈاکٹر صاحب سے بات کی۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب بھی کونسل کے ممبر تھے جو پچھلی میٹنگ میں کسی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ بہر حال اب کے میرا تقرر پچھلی تاریخ سے ہو گیا اور مجھے مستقل بھی کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر ضیاء الدین نے مجھے اور رشید صاحب کو بلایا۔ رحم علی الہاشمی یونیورسٹی گزٹ نکالتے تھے۔ نام تو ایڈیٹر کی حیثیت سے وائس چانسلر کا ہوتا تھا مگر اسسٹنٹ ایڈیٹر ہی سب کام کرتا تھا۔ وہ چھٹی پر شملے چلے گئے تو یہ جگہ خالی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے رشید صاحب کو نگراں اور مجھے پچاس روپیہ ماہوار الاؤنس پر رحم علی الہاشمی کی جگہ اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا۔ میں نے یہ کام کرنا منظور کر لیا۔ مگر یہ شرط رکھی کہ کوئی چیز اخبار میں میری مرضی کے بغیر نہ چھپے گی۔ چناں چہ یونیورسٹی کی خبریں، مختصر مضامین، علمی کوائف کے علاوہ انگریزی میں میرا اداریہ بھی ہوتا تھا۔ میرے فرائض میں یہ بھی تھا کہ یونیورسٹی کی ہر میٹنگ میں گزٹ کے لیے نوٹ لینے کے لیے موجود رہوں۔ یہ اجتماع زیادہ تر وائس چانسلر کے گھر ہوتے تھے اور وائس چانسلر لوگوں کی خاطر تواضع چائے یا آموں کے موسم میں آموں سے کرتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی پندرہ بیس آدمی تھے۔ ایک ناند میں غالباً بیس پچیس تخمی آم پڑے ہوئے تھے اور ڈاکٹر صاحب سب کی تواضع کر رہے تھے۔ لوگ اخلاقاً ایک آم اٹھا لیتے تھے۔ میں الگ رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا آپ آم نہیں کھاتے؟ میں نے کہا میں تخمی آم نہیں کھاتا۔ چناں چہ میرے لیے خاص اہتمام سے ایک لنگڑا آم منگایا گیا۔ اس پر بہت سے ساتھیوں کو خاصا رشک ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۰ء میں نظام حیدرآباد کو بلانا چاہتے تھے جو اگرچہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے مگر شاید اس زمانے میں یونیورسٹی سے خوش نہ تھے اس کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ لارڈ ولنگڈن وائسرائے کو آنے پر راضی کر لیا اور یہ قدرتی تھا کہ ان کے استقبال کے لیے چانسلر موجود ہوں۔ چنانچہ نظام آئے۔ پہلے ان کی اسپیشل ٹرین آئی اور یونین ہال میں ان کا استقبال ہوا۔ سارے اساتذہ نیم دائرہ بنائے ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ نظام ایک میلا سا سوٹ پہنے، ہاتھ میں ایک بید لیے بے نیازی سے داخل ہوئے۔ کسی سے ہاتھ ملایا نہ بات کی۔ ان کے پیچھے ولی عہد شاہزادہ اعظم جاہ، شاہزادہ معظم جاہ، سر اکبر حیدری اور دوسرے عمائدین تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے آنے والے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ وہیں رہ گئے اور نظام واپس چانسلر کے ساتھ وائسرائے کو لینے اسٹیشن گئے۔ وائسرائے پھر یونین ہال میں آئے۔ پروفیسر حلیم نے سب اساتذہ کا تعارف کرایا۔ وائسرائے نے سب سے ہاتھ ملایا اور چند اشخاص سے کچھ باتیں بھی کیں۔ یاد آتا ہے کہ کسی سے یہ بھی کہا تھا کہ سمرسٹ ماہم کو جو ہندوستان آئے ہوئے تھے علی گڑھ بلایا جائے۔ مگر ڈاکٹر ضیاء الدین ادب وغیرہ کے زیادہ قائل نہ تھے۔ انھوں نے سنی ان سنی کر دی۔ پھر سب لوگ اسٹریچی ہال میں جمع ہوئے جہاں وائسرائے کو اعزازی ڈگری دی گئی۔ وائسرائے تو فوراً اسپیشل ٹرین سے دلی واپس گئے۔ مگر نظام کے اعزاز میں کچھ مخصوص لوگ لنچ پر تھے۔ وہاں کی روایت کے مطابق نظام نے پہلے تو وہ سارے ہار اتروا لیے جو شہزادوں اور شہزادیوں کو پہنائے گئے تھے اور پھر ہدایت دی کہ انھیں بازار میں فروخت کر دیا جائے اور خود نواب صدر یار جنگ کے یہاں گئے۔ وہاں دستور کے مطابق انھیں نذر کے طور پر کچھ اشرفیاں پیش کی گئیں۔

گزٹ سے میرا تعلق زیادہ عرصے تک نہ رہا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین چاہتے تھے کہ گزٹ میں ان کا پروپیگنڈا ہو۔ ایک دفعہ میرے پاس ایک خبر آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے شملے میں چند انگریز افسروں اور ہندوستانی عمائدین کو ڈنر دیا تھا۔ خبر کے ساتھ مہمانوں کی فہرست گزٹ میں شایع کرنے کے لیے ان کے دفتر سے آئی تھی۔ میں نے اس کی اشاعت روک دی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے برہمی ظاہر کی تو میں نے صاف کہا کہ گزٹ یونیورسٹی کی خبریں چھاپنے کے لیے ہے۔

شبا کی دعوتوں سے اس کا کیا سروکار۔ اس کے بعد میں نے استعفا پیش کر دیا جو کئی مہینے پڑا رہا اور اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ پھر سال بھر کے بعد رحم علی الہاشمی اپنی جگہ پر واپس آ گئے اور اس طرح یہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں شعبۂ اُردو میں آنے سے پہلے رشید صاحب کے کہنے سے میں نے رسالہ 'سہیل' کے دوبارہ اجرا کے لیے مضامین جمع کیے تھے۔ رسالہ جنوری ۱۹۳۶ء میں نکلا۔ ایڈیٹر رشید صاحب اور جوائنٹ ایڈیٹر میں۔ رسالہ میں میں نے خاصی تفصیل سے کئی کتابوں اور رسالوں پر تبصرے کیے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ان تبصروں کی تعریف کی۔ رسالہ 'سہیل' چار سو سے زیادہ صفحات کا تھا اور ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا رہا۔ مگر پھر یہ نکل سکا۔ ہم دونوں کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

۱۹۴۰ء میں دوبارہ کشمیر جانا ہوا۔ عظمت الٰہی زبیری رجسٹرار کا ساتھ تھا۔ ہم لوگ پہلے سیدین صاحب کے یہاں سری نگر میں ٹھہرے۔ سیدین صاحب کے ساتھ کئی لوگوں سے ملنا ہوا۔ سر تیج بہادر سپرو خاص طور سے یاد آتے ہیں۔ اسی زمانے میں عابد صاحب اور ان کی بیگم (سیدین صاحب کی بہن) بھی وہاں تھے۔ سری نگر سے ہم پندرہ دن کے لیے پہلگام گئے۔ وہاں پلیٹو پر قیام کیا۔ ایک کشمیری ملازم سیدین صاحب نے ساتھ کر دیا تھا جو اردو بہت کم سمجھتا تھا مگر ہم نے کسی طرح کام چلا لیا۔ ہم دونوں نے پہلگام پہنچ کر پلیٹو پر ایک خیمے میں قیام کیا۔ عظمت الٰہی صاحب کو سرِ شام ہی بخار آ گیا۔ اور چوں کہ ان کو دمّے کی تکلیف تھی اس لیے تنفس بھی بہت تیز تھا میں بہت گھبرا گیا۔ ۱۹۴۰ء تک پہلگام میں ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ ایک یا دو ہوٹل، ایک ڈاکخانہ۔ ایک اسپتال، ایک پولس چوکی۔ سیاحوں کے خیمے ہر طرف لگے ہوئے تھے۔ عظمت الٰہی صاحب نے کہا کہ کسی طرح بازار جا کر میں ان کے لیے گل بنفشہ لا دوں۔ میں ٹارچ لے کر اور دریا کا پل پار کر کے نیچے بازار پہنچا۔ ایک دوکان پر گل بنفشہ مل گیا۔ اس کی کئی پڑیاں لے کر آیا اور عظمت صاحب کے کہنے کے مطابق کشمیری ملازم سے اس کا جوشاندہ تیار کرا کے کوئی نو بجے رات کو ان کو پلایا، وہ بخار میں پھنک رہے تھے۔ بارہ بجے تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس وقت انھیں پسینہ آیا اور بخار کم ہو گیا۔ ایک دفعہ اور انھیں جوشاندہ پلایا اور پھر میں سو گیا

صبح اٹھا تو بخار ندارد، اور نفس بھی نارمل۔ چند روز کے بعد عابد صاحب بھی آگئے۔ وہ صبح و شام ہم لوگوں کے ساتھ گھومتے اور دن میں دو تین گھنٹے اصل جرمن سے کانٹ کی کلاسک (CRITIQUE OF PURE REASON) کا ترجمہ کرتے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بے تکلف ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ وہیں سید عون جو ۱۹۳۲ء کے کشمیر کے سفر میں ساتھ تھے آگئے۔ ان کے ساتھ میں شیش ناگ گیا۔ ہمارے ساتھ عون کی دوست ایک اینگلو انڈین خاتون بھی تھیں جو جھانسی کے کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ عمر کوئی ۴۵ کے لگ بھگ تھی۔ خیر ہم لوگ صبح پہلگام سے نکلے۔ چندن واڑی دوپہر کو پہنچے۔ یہاں لدّر پر اتنی برف تھی کہ پل بن گیا تھا۔ یہ پہلگام سے نو میل ہے۔ وہاں سے شیش ناگ کے لیے پسّو گھاٹی کی چڑھائی چڑھنی پڑی۔ مگر ہمارے ٹٹو بہت سدھے ہوئے تھے۔ پتھروں پر اس طرح قدم جماتے تھے جیسے ہموار زمین پر چلے جا رہے ہوں۔ تقریباً کوئی پانچ چھ بجے ہم لوگ شیش ناگ پہنچے۔ اب درخت غائب ہو چکے تھے۔ شیش ناگ کوئی ۱۱۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ ہم نے جھیل کے کنارے خیمہ لگایا۔ آخر جون میں بھی بلا کی سردی تھی۔ چودھویں شب کا چاند اپنی پوری تابانی سے ساری فضا کو منوّر کیے ہوئے تھا۔ جھیل کے گرد جو برف پوش پہاڑ تھے وہ اس طرح چاندنی میں جگمگا رہے تھے کہ ان پر نظر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ جھیل کے نیلے پانی میں برف کے تودے تیر رہے تھے وہ بھی چمک رہے تھے۔ عجب طلسمی منظر تھا۔ بہت دیر تک ہم سب اس میں کھوئے رہے۔ پھر سردی لگی اور خیمے میں اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔

دوسرے دن صبح ہم پہلگام واپس ہوئے مگر پسّو گھاٹی پہنچ کر بجائے سیدھے آنے کے دریائے لدّر کو پار کر کے اور چند میل آگے بڑھ کے ایک جھیل تک پہنچے۔ اس علاقے میں چھوٹی چھوٹی بہت سی جھیلیں ہیں جو بڑی خوب صورت ہیں مگر جن تک پہنچنے کے لیے کم سے کم ایک میل پتھروں پر سے گذرنا پڑتا ہے۔ بہرحال شام تک ہم پہلگام آگئے۔

۱۹۴۶ء کے اس سفر میں ہی جھیل وُلر دیکھنے بھی گیا۔ عظمت صاحب کے علاوہ عابد صاحب بھی ساتھ تھے۔ بانڈی پور تک بس سے سفر کیا۔ یہ وُلر کے کنارے واقع ہے۔ چناں چہ وہاں سے ایک کشتی لی۔ کئی میل تک کشتی جھیل میں نرکلوں کے جھنڈ سے گذری جن کے درمیان کشتی

کے لیے راستہ نکالا گیا تھا۔ پھر صاف پانی آیا تو دوپہر ہونے والی تھی۔ روایت یہ ہے کہ دوپہر کے بعد وُلر میں ہوا بہت تیز ہو جاتی ہے اس لیے ہم لوگ تین چار میل تک وُلر کے صاف شفاف پانی میں کشتی چلاتے رہے۔ پھر مانجھی نے کہا کہ اب ہوا تیز ہو رہی ہے واپس جانا چاہیے۔ ساری سیر کوئی تین گھنٹے کی رہی ہوگی۔ وُلر کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جہلم جب اس میں داخل ہوتا ہے تو گندے پانی کا ایک ریلا ہے وُلر کے دوسرے سرے سے نکلتا ہے تو گویا اپنی ساری گندگی وُلر میں دھو کے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اس لیے بارہ مولا میں جہلم سری نگر کے جہلم سے زیادہ خوبصورت ہے۔ سری نگر میں تو سارے شہر کی گندگی نے اُسے میلا مٹیالا بنا دیا ہے۔

۱۹۲۲ء میں کھلن مرگ سے ننگا پربت کا نظارہ نہ کر سکا تھا۔ دوپہر کو پہاڑوں پر بادل ضرور آ جاتے ہیں۔ اس دفعہ بھی بادل تھے۔ اب کے پھر قسمت آزمائی کی تو قدرت نے مہربانی کی۔ ہم لوگ کھلن مرگ میں کبھی ایک طرف سے، کبھی دوسری طرف سے ننگا پربت دیکھنے کے لیے دوڑے دوڑے پھر رہے تھے مگر پہاڑ کی چوٹی بادلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ تھوڑی دیر کے لیے یہ نقاب سرک گئی۔ العظمۃ اللہ، کیا منظر تھا، معلوم ہوتا تھا نگاہوں کو خیرہ کرنے والی برف کا ایک چمکتا ہوا ستون ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ ننگا پربت نے صرف اپنی چوٹی ہی نہیں اپنا بندِ قبا بھی ہمارے لیے وا کر دیا تھا۔ ہم اس وقت سراپا نگاہ تھے اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہماری روح ایک پرندے کی طرح اڑ کر اس کا طواف کر رہی ہے۔ گمبند نوریں شاید اسی کو کہتے ہیں۔

ہم لوگ راول پنڈی کے راستے سری نگر گئے تھے۔ جموں کے راستے واپس آئے۔ جموں سے وزیر آباد کی ریل لی جہاں سے ایک ڈبہ فرنٹیر میل میں لاہور سے لگتا ہے۔ لاہور میں سخت حبس تھا۔ اسٹیشن پر ساری شام پنکھے کے نیچے گزاری۔ آٹھ بجے فرنٹیر میل آیا اس سے دوسرے دن ہم میرٹھ پہنچ گئے۔

۱۹۴۱ء میں یومِ سرسید کے موقع پر جو اس زمانے میں مارچ میں ہوتا تھا میں نے علی گڑھ پر ایک نظم پڑھی۔ اس نظم کا خاصا پرچا رہا اور ڈاکٹر ضیاءالدین کے ملنے کے لوگوں نے اس پر

بڑے اعتراضات کیے۔ ایم۔ بی۔ احمد سیشن جج علی گڑھ نے جو خاصا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے میری اس نظم کی بڑی تعریف کی۔ اس کے ایک شعر سے

کتنوں کو کیا بابِ حکومت پہ نچھاور
تھی جن کی ضیاؤں سے نگاہوں میں جوانی

سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین پر اعتراض ہے حالاں کہ اعتراض کسی شخص پر نہ تھا بلکہ انگریز پرستی کی پالیسی پر تھا۔ بہر حال یہ قصہ کچھ دن ایک مقامی اخبار تحریک میں چلتا رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں اس زمانے میں یونیورسٹی کی زندگی کے ہر شعبے میں دلچسپی لیتا تھا۔ شام کو اسٹاف کلب میں ٹینس کھیلتا۔ اسٹاف ایسوسی ایشن کا سرگرم ممبر تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ غالباً ۱۹۴۴ء میں حیدر خاں کو اس کا سکریٹری اور مجھے جوائنٹ سکریٹری بنایا گیا۔ شریف صاحب جو فلسفے میں ریڈر تھے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب پر اس زمانے میں میڈیکل کالج بنوانے کی دھن سوار تھی۔ ڈاکٹر ہادی حسن اس سلسلے میں اکثر چندہ جمع کرنے دورے پر جاتے تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے کچھ اساتذہ کے سامنے کہا کہ میں نے حساب لگایا ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ صرف ڈیڑھ گھنٹہ پڑھاتے ہیں وہ میڈیکل کالج کے لیے چندے کی مہم میں کوئی مدد نہیں کرتے۔ ایک پرانے استاد کی طرف سے اساتذہ کی کارکردگی پر یہ حملہ قدرتی طور پر اسٹاف ایسوسی ایشن کے عہدہ داران کو ناگوار ہوا اور طے یہ پایا کہ ڈاکٹر صاحب کو اسٹاف ایسوسی ایشن کے ایک جلسے میں مدعو کیا جائے اور اس موقع پر ان کو اساتذہ کے جذبات سے بھی آشنا کیا جائے۔ چناں چہ ایک ایٹ ہوم ہوا۔ چائے کے بعد پہلے حیدر خاں صاحب نے تقریر کی جس میں صرف ڈاکٹر صاحب کا خیر مقدم اور ان کے تشریف لانے پر مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے خاصی سخت تقریر کی اور کہا کہ اساتذہ نہ معلوم کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے شکایت کی کہ چندے کی مہم میں سوا دو ایک کے، استادوں نے کوئی مدد نہیں کی۔ ان کی تقریر کے بعد کسی عہدہ دار کو شکریہ ادا کرنا تھا۔ چناں چہ میں نے حیدر خاں سے کہا کہ شکریہ میں ادا کروں گا۔ میں نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر صاحب کے تشریف لانے پر مسرت کا اظہار کرنے کے بعد ان سے شکوہ کیا کہ اگرچہ وہ ایک استاد رہے ہیں مگر استادوں کے خلاف وہی کچھ نہ کچھ فرماتے رہتے ہیں۔ پھر میں نے منصور حلّاج کا قصہ بیان کیا کہ جب ان کو سولی دینے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو مجمع میں کچھ لوگ انھیں پتھر مار رہے تھے

مگر وہ ہر چوٹ پر ہنس دیتے تھے۔ آگے حضرت شبلی رح کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پھول تھا انھوں نے ازراہِ مزاح وہ منصور پر پھینکا منصور اس پر چیخ مار کر رونے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ عجیب آدمی ہیں، پتھر کھا کر ہنستے ہیں اور پھول کی مار سے روتے ہیں۔ منصور نے کہا کہ جو پتھر پھینک رہے تھے وہ تو انجان ہیں مگر پھول پھینکنے والے تو محرم راز ہیں۔ جانتے ہیں اس لیے ان کی مار میرے لیے پتھر سے زیادہ سخت ہے۔ یہ کہہ کر میں نے شکوہ کیا کہ اساتذہ کو تو قوم کے بہت سے لوگ برا بھلا کہتے رہتے ہیں اور چوں کہ وہ ناواقف ہیں اس لیے ہم ان کے اعتراضات کی پروا نہیں کرتے مگر آپ تو خود استاد رہے ہیں۔ آپ کا اعتراض ہمارے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اساتذہ کا اصل کام تدریس اور تحقیق ہے ان سے یہ مطالبہ کہ وہ چندہ کرنے کے لیے ملک میں مارے مارے پھریں غلط ہے۔ یونیورسٹی کی ترقی کے منصوبوں میں تعاون ہمارا فرض ضرور ہے مگر ہمارا بنیادی کام درس و تدریس، تحقیق، تدقیق اور طلبا کی تعلیم و تربیت ہے۔ اس کے بعد میں نے جوش کا یہ شعر پڑھا ؎

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

بس کیا تھا ڈاکٹر صاحب خفا ہو گئے، کہنے لگے میں خوب سمجھتا ہوں یہ پھول والا شعر۔ اس پر لوگوں نے قہقہہ لگایا کہ پھول والا تو قصہ تھا۔ شعر تو دوسرا تھا۔ پھر کہنے لگے ایسی باتوں پر اساتذہ کے خلاف ایکشن لیا جا سکتا ہے۔ جب وہ جانے لگے تو شریف صاحب اور حیدر خاں پہنچانے گئے۔ مگر میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میرے دوست عظمت الٰہی نے کہا بھی کہ تم بھی کار تک پہنچا آؤ، مگر میں نہ گیا۔ کئی دن تک اس واقعہ کا یونیورسٹی میں چرچا رہا۔ دو تین دن کے بعد حیدر خاں صاحب سے لائبریری میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے کوئی بات نہ کی۔ وہ آدمی لاجواب تھے۔ اپنے پٹھانی لہجے میں کہنے لگے: ناراض ہو۔ معاف کر دو۔ یہ اس طرح کہہ رہے تھے گویا ڈانٹ رہے ہوں۔ مجھے ہنسی آگئی۔ پھر بولے بھئی ممتی (ممتاز جہاں پرنسپل ویمنز کالج، ان کی بیگم) نے منع کر دیا تھا کہ اس وقت تم کوئی شکایت کرو گے تو اس کا اثر ہمارے کالج کی گرانٹ پر پڑے گا اس لیے خاموش رہا مگر مجھے تم جیسے نوجوانوں پر فخر ہے۔ تم نے ہماری لاج رکھ لی۔ ان کی ان باتوں کے بعد

میرے دل کا سارا غبار دھل گیا۔ علی گڑھ میں پھول والے شعر کا لطیفہ بہت دن تک گشت کرتا رہا۔

سر شاہ سلیمان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین پھر وائس چانسلر ہو گئے تھے۔ علی گڑھ میں ۱۹۳۶ء تک قوم پرستی غالب رجحان تھی مگر ۱۹۳۸ء سے مسلم لیگ کا رجحان بڑھا تھا۔ اس زمانے میں کمیونسٹ بھی لیگ کی حمایت کر رہے تھے اور پاکستان کے مطالبے کو حق بجانب ٹھہرا رہے تھے۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن وجود میں آ چکی تھی۔ سید محمد ٹونکی صاحب جو اسکول میں استاد تھے کمیونسٹ بھی تھے اور مذہبی آدمی بھی۔ میرے ایک شاگرد ہادی نقش بندی تھے۔ انھوں نے ٹونکی صاحب کی سرپرستی میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک اخبار "بیداری" نکالا۔ اس کے لیے ٹونکی صاحب نے مجھ سے ایک مضمون کی فرمائش کی۔ چناں چہ میں نے "سرسید کا حقیقی پیغام اور علی گڑھ میں ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ مضمون کے آخر میں میں نے یہ کہا تھا کہ اگر ہم نے سرسید کے پیغام کو ملحوظ نہ رکھا تو ہم پر اقبال کا یہ شعر صادق آئے گا ؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

میں یہ مضمون مکمل کر ہی رہا تھا کہ رشید صاحب آ گئے۔ میرے قریب ہی رہتے تھے اور ہر روز یا دوسرے روز میں ان کے یہاں جاتا تھا، وہ بھی اکثر و بیشتر آ جایا کرتے تھے۔ پوچھا کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا بیداری کے لیے یہ مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے مضمون پڑھا اور بہت تعریف کی۔ مگر یہ کہا کہ آخر میں اقبال کا جو شعر تم نے لکھا ہے اسے نکال دو۔ اس پر فساد ہوگا۔ میں نے ان کی بات نہیں مانی اور مضمون دے دیا۔ جب وہ چھپا تو ڈاکٹر ضیاء الدین کے کچھ حواریوں نے جن میں ابن زبیری پیش پیش تھے اور انھیں کی ادارت میں ایک اخبار تحریک بھی نکلتا تھا اس پر بڑا واویلا مچایا۔ انھوں نے یہ پروپگنڈا کیا کہ یہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف ہے اور انھیں زاغ کہا گیا ہے۔ حالاں کہ اشارہ ان کی طرف نہ تھا بلکہ ایک عمومی بات تھی۔ کہ ہم لوگ سرسید کے انقلابی پہلو سے چشم پوشی کریں گے تو ان کے اچھے جانشین نہ کہلائیں گے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین تو مجھ سے خفا ہی تھے ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ یہ مضمون آپ کے خلاف ہے۔ چنانچہ انھوں نے یونیورسٹی اگزیکیوٹو کونسل میں یہ معاملہ پیش کیا اور مناسب تادیبی کارروائی کی سفارش کی۔ اتفاق سے اس وقت کونسل میں نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی تھے۔ وہ مجھے جانتے تھے کیوں کہ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس منتظمہ کا میں ممبر تھا اور نواب زادہ میری تقریر سن چکے تھے۔ انھوں نے وائس چانسلر سے کہا کہ دیکھوں اس مضمون میں کیا زہر بھرا ہے۔ مضمون ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا اور انھوں نے دس پندرہ منٹ میں پڑھ ڈالا اس کے بعد فرمانے لگے کہ یہ تو بہت اچھا مضمون ہے اس پر اعتراض کیوں؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ میرے خلاف ہے اور کسی استاد کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وائس چانسلر کے خلاف لکھے۔ نواب زادہ صاحب نے کہا کہ آپ کا تو کہیں نام نہیں ہے یہ تو ہم سب پر ہمارا فرض عاید کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر بھی تادیبی کارروائی پر اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ روداد میں کچھ نہ لکھا جائے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ پرو وائس چانسلر سرور صاحب کو بلا کر کہہ دیں کہ آئندہ احتیاط کریں۔ چناں چہ چند روز کے بعد حلیم صاحب نے مجھے بلایا وہ اس مکان میں رہتے تھے جس میں اب اسٹاف کلب ہے۔ میں تار والے بنگلے میں رہتا تھا۔ وقت مقررہ پر حلیم صاحب کے یہاں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی حلیم صاحب نے کچھ روکھے پن سے کہا یہ آپ کیا لکھتے رہتے ہیں؟ ۔ میں نے کہا میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہوں میرا کام ہی لکھنا پڑھنا ہے۔ اگر آپ کو میرے لکھنے پڑھنے پر اعتراض ہے تو براہِ کرم تحریر میں مطلع کیجیے گا کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ دو تاکہ میں طے کر سکوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ پوچھا آپ کیا کریں گے۔ میں نے کہا کہ جب میرے پاس آپ کی تحریر پہنچے گی تو یا تو میں لکھنا پڑھنا چھوڑ دوں گا یا ملازمت سے استعفا دے دوں گا۔ لکھنا پڑھنا تو آسانی سے چھوٹنے والا نہیں۔ ہاں ملازمت سے استعفا دے سکتا ہوں۔ حلیم صاحب نرم پڑ گئے۔ کہنے لگے آپ تو خفا ہو گئے۔ بھائی مجھے تو اگزیکیوٹو کونسل نے اس کام پر مامور کیا ہے کہ آپ کو آگاہ کر دوں، اب آپ جو چاہے کیجیے۔ میں نے کہا یہ بات ہے تو آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا اور مجھے آگاہ کر دیا، اب چائے پلوا دیجیے۔ محمد علی جناح صاحب کے اعزاز میں آج اسٹاف ایسوسی ایشن کی طرف سے سوئمنگ باتھ لان پر پانچ بجے ایٹ ہوم ہے اور اب آپ کی گھڑی میں پانچ بجا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ حلیم صاحب نے گھڑی پر نظر ڈالی اور مسکرائے "یہ گھڑی آدھ گھنٹہ تیز ہے۔ اطمینان سے چائے پیجیے کوئی دس منٹ کا تو راستہ ہے۔" غرض چائے پی کر میں وقت پر ایٹ ہوم میں پہنچا حلیم صاحب حسبِ معمول آدھے گھنٹے بعد آئے۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء کا واقعہ ہے۔

۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایک دورے کے سلسلے میں علی گڑھ آئے۔ قیام رشید صاحب کے یہاں تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک اُردو کانگریس بنانا چاہتے ہیں جس کا مقصد اُردو کی ساری انجمنوں کو متحد کر کے اُردو زبان وادب کی خدمت کرنا ہوگا۔ رشید صاحب اس زمانے میں مولوی عبدالحق صاحب سے آزردہ تھے۔ مولوی صاحب نے چند سال قبل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوبلی اجلاس میں شعبۂ اُردو پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ رسالہ سب رس کے تبصرے میں بھی کچھ اداریے تعریضاً طنز تھا۔ مولوی صاحب یہ بھول گئے تھے کہ کانفرنس کا شعبۂ اُردو، اُردو زبان کے فروغ کے لیے تھا اس کا کوئی تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے نہ تھا۔ یہ شعبہ اُردو ادب کی ایم۔ اے تک تعلیم دیتا تھا اور اس میں ریسرچ بھی شروع ہو گئی تھی۔ مگر بہر حال مولوی صاحب کے اعتراضات کا حاضرین پر اثر ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے شعبۂ اُردو کی کارکردگی کے سلسلے میں جو کچھ کہا تھا وہ بے محل تھا۔ میں نے اس جلسے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ بات واضح کر دی تھی مگر بہر حال مولوی صاحب کے اعتراضات کی وجہ سے قدرتی طور پر رشید صاحب آزردہ تھے۔ زور صاحب نے اس بات سے فایدہ اٹھایا اور رشید صاحب کو اُردو کانگریس کے اجلاس میں شرکت اور ایک شعبہ کی صدارت کے لیے راضی کر لیا۔ رشید صاحب نے زور صاحب سے اصرار کیا کہ میرے ساتھ سرور صاحب بھی ہوں گے اور ان کے سفرِ خرچ کا انتظام آپ کو کرنا ہوگا، وہ اس بات کو مان گئے۔ غرض جولائی کے شروع میں رشید صاحب اور میں حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے۔ مہمانوں کا قیام بشیر باغ میں رکھا گیا تھا مگر ہم نواب چھتاری کے یہاں ٹھہرے تھے وہ اس وقت حیدرآباد کے صدرِ اعظم تھے۔ صدرِ اعظم گویا وزیرِ اعلیٰ تھا۔ رشید صاحب کے ایک عزیز بشیر احمد صدیقی جو شبلی کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل تھے اور قطب الدین مُلّا جو ہمارے ایک دوست تھے ساتھ ہو گئے تھے۔ اتفاق سے جب ہم نئی دہلی کے اسٹیشن پر پہنچے اور گاڑی میں سامان رکھ کر پلیٹ فارم پر کھڑے تھے تو مولوی عبدالحق بھی نظر آئے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ رشید صاحب کو انھوں نے نظر انداز کر دیا اور رشید صاحب نے انھیں۔ جب میں نے بتایا تو انھوں نے کہا کیا انجمن کے خلاف محاذ قائم کرنے میں تم بھی شریک ہو؟ میں نے کہا میں اس لیے جا رہا ہوں کہ انجمن کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جا سکے اس پر مولوی صاحب مطمئن ہو گئے۔ سفر میں دو دفعہ میں مولوی صاحب کے ڈبے میں

بھی گیا اور ان کو یہ اطمینان دلایا کہ رشید صاحب بھی انجمن کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں گے۔ بہرحال کانگریس شروع ہوئی۔ بہت بڑے پیمانے پر انتظامات تھے اور پروگرام بھی خاصا طویل تھا۔ ایک شعبے کے صدر مولوی صاحب بھی تھے۔ میں نے رشید صاحب سے بات کرلی تھی اور یہ طے کرلیا تھا کہ کانگریس کو ضرور کامیاب بنائیں گے۔ مگر انجمن کے مفاد کو ہر طرح محفوظ رکھا جائے گا۔ کانگریس واقعی بڑی شان دار رہی۔ اس کے دستور پر غور کرنے کے لیے جو اجلاس ہوا تھا اس کے صدر غلام محمد تھے جو اس وقت حیدرآباد ریاست کے وزیر مال تھے۔ رشید صاحب سے ان کی پرانی ملاقات تھی۔ غلام محمد صاحب بڑے دبدبے کے آدمی تھے۔ جلسے سے پہلے کچھ لوگوں کا ایک اجتماع غلام محمد صاحب کے گھر پر ہوا جس میں یہ طے کرنا تھا کہ اردو کانگریس کے عہدہ دار کون کون ہوں۔ غلام محمد صاحب کے کہنے پر صدر سر تیج بہادر سپرو، نائب صدر عبداللہ بریلوی اور مولوی عبدالحق، جنرل سکریٹری ڈاکٹر ذاکر حسین اور جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر زور قرار پائے۔ چونکہ ڈاکٹر زور کی ساری اسکیم غتر بود ہوگئی تھی اس لیے انھوں نے معذرت کی کہ میں کسی عہدے کا خواہاں نہیں صرف خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ غلام محمد کو ان کی یہ بات ناگوار ہوئی اور انھوں نے بپھر کر کہا۔ زور میں خوب سمجھتا ہوں کہ تمھارا کیا مطلب ہے؟ اس پر نواب زین یار جنگ اور علی یاور جنگ نے زور کو سمجھایا کہ انکار نہ کرو وہ بادل ناخواستہ راضی ہوگئے۔ یہی عہدہ دار کھلے اجلاس میں منتخب ہوگئے۔ اس طرح انجمن ترقی اردو کو کوئی زک نہ پہنچی اور زور صاحب کی اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ رشید صاحب نے ایک اجلاس کی صدارت کی۔ میں نے "اسٹائل کیا ہے" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ مگر وقت کی کمی کی وجہ سے دس منٹ کی تقریر اس موضوع پر کردی۔

اس کانفرنس میں ایک شعبہ ترقی پسند ادب کا بھی تھا جس کی صدارت سجاد ظہیر نے کی تھی۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں ادب میں عریانی کی لہر کی خاصی مذمت کی تھی اور اس سلسلے میں منٹو کے افسانے "بو" کو خاص طور سے ہدف تنقید بنایا تھا۔ جب عریانی کے خلاف ایک تحریک اجلاس میں پیش ہوئی تو اس کی سب سے پرزور مخالفت مولانا حسرت موہانی نے کی۔ قاضی عبدالغفار بھی حسرت موہانی کے ہم نوا تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادب میں عریانی جائز ہے۔ اعتراض فحاشی پر کرنا چاہیے، عریانی پر نہیں۔ بہرحال مولانا کی مخالفت کی وجہ سے یہ تجویز منظور نہ ہوسکی۔ سجاد ظہیر نے بعد میں کچھ لوگوں سے

کہا کہ مولانا حسرت ہمیشہ گڑبڑ کرتے رہتے ہیں۔ کانفرنس میں ملک بھر سے ادیب آئے تھے۔ آخری رات ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں سکندر علی وجد کی نظم ' اجنتا ' بہت پسند کی گئی۔ مخدوم محی الدین کا کلام بھی بہت سراہا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ واپسی پر اجنتا اور الورا کے غار بھی دیکھ لوں۔ رشید صاحب کو بھی راضی کرلیا۔ معلوم ہوا کہ اورنگ آباد کو جو چھوٹی لائن جاتی ہے اس میں سکنڈ کلاس میں سب جگہیں بھر چکی ہیں۔ غلام محمد صاحب سے اپنی مشکل بیان کی تو انھوں نے ہمارے لیے ایک بوگی اور لگوادی اس موقع پر حیدرآباد ریڈیو سے میری اور رشید صاحب کی تقریر بھی نشر ہوئی تھی۔

شام کو حیدرآباد سے اورنگ آباد ریل جاتی تھی۔ صبح تڑکے ہم اورنگ آباد پہنچے۔ ہم سرکاری مہمان تھے۔ چناں چہ ہمیں اورنگ آباد کے ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر بس سے اجنتا گئے کوئی دو گھنٹے کا سفر رہا ہوگا۔ غار ایک ہلال کی صورت میں بنے ہوئے ہیں۔ بیچ میں ایک چھوٹا سا دریا ہے۔ چوں کہ جولائی کا مہینہ تھا اس لیے ایک آبشار اجنتا کے غاروں کے پاس گر رہا تھا۔ موسم معتدل تھا ہلکی ہلکی بارش اور معمولی خنکی۔ ہم نے کوئی تین گھنٹے غاروں میں صرف کیے۔ یہ غار جو بدھ مت کے ماننے والے فن کاروں کے شاہکار ہیں۔ صدیوں تک لوگوں کی نظر سے اوجھل رہے۔ پھر آرکیالوجی (ARCHEALOGY) کے کچھ ماہرین نے انھیں ڈھونڈ نکالا۔ غلام یزدانی نے اس سلسلے میں بڑا قابل قدر کام کیا تھا۔ جا بجا گوتم بدھ کے مجسمے ہیں۔ دیوار پر تصویروں میں ایک دنیا آباد ہے۔ اس سے اُس دور کی معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لباس، رسم و رواج، راجا، پرجا، پروہت، ساہوکار، صرف چولی اور ساری پہنے عورتیں۔ کچھ نقوش امتداد زمانہ سے مدھم ہوگئے ہیں۔ پھر بھی بہت سے ایسے لگتے ہیں۔ جیسے کچھ عرصہ پہلے ہی وجود میں آئے ہوں۔ اجنتا کی زیارت ایک روحانی تجربہ تھی۔ شام کو اورنگ آباد واپس آئے اور دوسرے دن صبح ایلورا دیکھنے گئے۔ ایلورا میں دیواری تصویریں نہیں ہیں صرف مجسمے ہیں جو بدھ کے مجسموں سے لے کر ہندو دیوتاؤں تک کا ایک سلسلہ پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مجسمہ سازی کا کمال ان مجسموں میں نظر آجاتا ہے۔ قریب ہی خلد آباد ہے۔ وہاں جاکر اورنگ زیب کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ یہ مزار بالکل سادہ ہے۔ صرف سنگ موسیٰ کی ایک قبر ہے اور چھوٹا سا صحن، اوپر کوئی

گنبد بھی نہیں۔ یہاں اقبال کا یہ مصرع بے اختیار زبان پر آگیا ؎

ترکش مارا خدنگ آخریں

خلد آباد کے قریب دولت آباد کا قلعہ بھی ہے۔ یہ بھی دیکھا اور اس کے وسط میں جو بارہ دری ہے وہاں تک گئے۔ پھر رات کو خلد آباد میں آرام کر کے صبح اورنگ آباد واپس آگئے۔ اورنگ آباد سے من ماڑ ہوتے ہوئے علی گڑھ آگئے۔

حیدر آباد سے آئے ہوئے چند دن گذرے تھے کہ ذاکر صاحب دہلی سے آئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ آپ رام پور چلے جایئے۔ میں حیران ہوا کہ ذاکر صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ خود ہی کہتے تھے کہ علی گڑھ میں جم کر بیٹھ جایئے اور اب رام پور جانے کو کہہ رہے ہیں۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ وہاں انٹر کالج کی پرنسپلی خالی ہے۔ زیدی صاحب جو چیف منسٹر ہیں آپ کے مداح ہیں۔ پھر سیدین صاحب عنقریب مشیر تعلیمات ہو کر آنے والے ہیں۔ پرنسپلی کے علاوہ خیال یہ ہے کہ
کے طرز پر اردو میں سو کلاسیکی ادب کی کتابیں شائع کی جائیں۔ آپ اور عرشی صاحب اس کام کے نگراں ہوں گے۔ میں نے جب عذر کیا کہ اول تو میرا کوئی انتظامی تجربہ نہیں ہے، دوسرے مجھے پرنسپلی وغیرہ سے دلچسپی بھی نہیں ہے۔ تو ذاکر صاحب نے کہا کہ آپ تو صرف دو سال کے لیے ڈپوٹیشن پر جایئے دل نہ لگے تو واپس آجایئے گا۔ کچھ انتظامی تجربہ بھی ہونا چاہیے کام ہی آئے گا۔ میں نے کہا شاید رشید صاحب مجھے نہ چھوڑنا چاہیں۔ کہنے لگے میں انھیں سمجھا دوں گا، آپ مان جایئے۔ میں ذاکر صاحب کا بڑا احترام کرتا تھا اس لیے راضی ہو گیا۔ تنخواہ وغیرہ کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ کئی مہینے بعد زیدی صاحب کے پی۔ اے کا خط ملا کہ آکر مل لیجیے۔ چنانچہ میں رام پور گیا۔ زیدی صاحب سے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے مختلف موضوعات پر بات ہوئی۔ اور میرے اوپر ان کے اخلاق کا بڑا اچھا اثر ہوا۔ انھوں نے تنخواہ کے متعلق دریافت کیا تو میں نے کہا، یہ ذاکر صاحب سے طے کر لیجیے۔ انھوں نے مجھے تعجب سے دیکھا اور کہنے لگے اچھی بات ہے۔ اسی شب میں علی گڑھ واپس آگیا۔

کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ نواب رام پور نے میری خدمات دو سال کے لیے مستعار مانگی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ چوں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین مجھ سے خوش نہیں ہیں اس لیے وہ فوراً اجازت دے دیں گے۔ مگر یہ معلوم کر کے حیرت اور مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا: میں انھیں جانے کی اجازت کیسے

دول۔ یونیورسٹی کو ان کی ضرورت ہے۔ مگر چوں کہ نواب صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر بھی تھے اس لیے بالآخر انھیں اجازت دینی پڑی۔

شروع جنوری میں رشید صاحب کا ایک آپریشن آگرے میں ہوا۔ گردے کا آپریشن جو بارہ برس پہلے ہوا تھا اس کا کوئی شاخسانہ رہ گیا تھا وہ فروری میں واپس آئے اس کے بعد مجھے ۱۲ مارچ سے رخصت ملی۔ ادھر الوداعی پارٹیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شعبے کے علاوہ طلبا کی یونین اور اسٹاف کلب نے بھی الوداعیہ دیا تھا۔ خورشید الاسلام نے ایڈریس پڑھا تھا اور شجاع احمد زیبا نے ایک نظم۔ یہ نظم اس طرح شروع ہوئی تھی ؎

تجھے خبر بھی ہے آمادۂ سفر بلبل
غمِ فراق سے ہے دیدۂ چمن نم ناک

میں جب علی گڑھ سے رام پور گیا تو علی گڑھ میں اس وقت مسلم لیگ کا اثر بہت تھا۔ جناح صاحب کئی دفعہ علی گڑھ آچکے تھے۔ مسلم لیگ کے دوسرے لیڈر بھی آتے رہتے تھے۔ اساتذہ اور طلبا بیشتر اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ پھر بھی ایک معتد بہ تعداد ایسے اساتذہ کی بھی تھی جو قوم پرست تھے اور یا تو جامعہ اور ذاکر صاحب سے متاثر تھے یا بائیں بازو کی سیاست سے۔ اس وقت تک رواداری خاصی تھی۔ ہر نقطۂ نظر کے اشخاص یونین کے پلیٹ فارم سے تقریریں کرتے تھے۔

علی گڑھ کے اساتذہ میں اس زمانے میں جو لوگ ممتاز تھے اور جن کی ملک میں شہرت تھی۔ ان میں پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم، پروفیسر محمد حبیب، خواجہ غلام السیدین (یہ ۱۹۳۸ء میں ناظم تعلیمات ہو کر کشمیر چلے گئے تھے)، ڈاکٹر ہادی حسن، پروفیسر ایل۔ کے حیدر، رشید احمد صدیقی، ضیا احمد بدایونی، مولانا عبدالعزیز میمن، خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر ظفر الحسن قابلِ ذکر ہیں۔ اے۔ بی۔ اے حلیم کو لوگ آبا حلیم کہتے تھے۔ آکسفورڈ کے گریجویٹ تھے۔ یونین کے مباحثوں میں اکثر ریس باتھم (پرو وائس چانسلر) اور حلیم صاحب کی تقریریں اس طرح ہوا کرتیں کہ ایک موضوع بحث کی موافقت میں تقریر کرتا اور دوسرا مخالفت میں۔ ریس باتھم ۱۹۳۵ء میں چلے گئے تھے۔ پھر حلیم صاحب پرو وائس چانسلر ہو گئے۔ جہاں آباد (گیا) کے رہنے والے تھے۔ ان سے میں نے سب سے پہلے لفظ رنج رنجیدہ کے معنی میں سنا اور ہمارے حلقے میں یہ لفظ بہت مقبول ہو گیا تھا۔ نواب اسمٰعیل خاں

کی عارضی وائس چانسلری کے زمانے میں ڈاکٹر اشرف کا تقرر عارضی طور پر ہوا۔ یہ لندن سے ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے آئے تھے۔ کئی سال اپنے لندن کے ساتھی منظور حسین بیرسٹر کے یہاں مقیم رہے۔ یونین میں ان کی تقریریں بڑی دلچسپی سے سُنی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک عربی میں لکچرر رہے۔ ایک عارضی جگہ پر تھے۔ بعد میں لکھنؤ چلے گئے اور پھر ۱۹۵۰ء میں ذاکر صاحب کے زمانے میں ریڈر ہوئے اور مولانا میمن کے ریٹائر ہونے کے بعد پروفیسر۔ حبیب صاحب کا لوگ بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے متعلق روایت یہ تھی کہ وہ کلاس لیتے ہیں تو اپنے گھنٹے کے علاوہ دوسرے کے گھنٹے میں بھی پڑھاتے رہتے ہیں۔ طلبا کے بڑے ہمدرد تھے جب ۱۹۲۲ء میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی یادگار کے طور پر آفتاب ہوسٹل بنایا تو اس کے اعزازی پرووسٹ حبیب صاحب ہی تھے۔ انھوں نے ہی ۱۹۲۳ء کے دسمبر میں جواہر لال نہرو کو علی گڑھ مدعو کیا تھا۔ فلسفے کے شعبے میں پروفیسر ظفر الحسن صاحب کے علاوہ عمرالدین صاحب بھی تھے۔ انھوں نے غزالی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ علی گڑھ کے عاشق تھے۔ کسی وجہ بیوی سے نہ بنی اس لیے تنہا رہتے تھے۔ دعوتیں کرنے کا شوق تھا۔ طلبا کی بڑی مدد کرتے تھے۔ ساری عمر علی گڑھ میں رہے مگر لہجہ پنجابی رہا۔ ایک دفعہ ذاکر صاحب کسی میٹنگ کے سلسلے میں دہلی سے علی گڑھ آئے۔ جب رشید صاحب کے یہاں ہم لوگ جمع ہوئے تو انھوں نے بڑا لطف لے کر عمرالدین صاحب کا ایک قصہ سنایا۔ اتفاق سے علی گڑھ آتے ہوئے ریل میں ان کا ساتھ ہو گیا تھا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ عمرالدین راستے بھر میری خدمات کا اعتراف یہ کہہ کر کرتے رہے کہ آپ نے بڑی سیکری فائیاں (SACRIFICES) کی ہیں۔ انگریزی لفظ کی اردو جمع پر ذاکر صاحب بہت محظوظ ہوئے تھے۔ ہمارے حلقے میں یہ لفظ خاصا عام ہو گیا تھا۔ اسی طرح عمرالدین صاحب کی تقلید میں ہم لوگ اسٹیچوٹ (STATUTE) کو اسٹیچو کہتے تھے۔ عمرالدین صاحب جب فلسفہ و نفسیات کے شعبے کے صدر ہوئے تو انھوں نے نفسیات کی عملی تربیت کے لیے بڑی اچھی تجربہ گاہ بنائی تھی۔ بڑے مخلص اور منتظم آدمی تھے۔ ان کے احباب کا حلقہ بھی خاصا وسیع تھا۔ سیدین صاحب کی اس وقت ماہر تعلیم اور ایک دانشور کی حیثیت سے شہرت تھی۔ وہ ذاکر صاحب کے بہت قریب تھے اور عابد صاحب کی تو شادی ان کی بہن مصداق فاطمہ سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ہادی حسن کی مسحور کن خطابت کا اندازہ سب سے پہلے آگرے کے ایک جلسے میں ہوا تھا۔ علی گڑھ میں بار بار اس خطابت کے جوہر دیکھنے میں آئے۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ ان کی ماں ایرانی تھیں اس لیے فارسی ایرانیوں کی طرح بولتے تھے۔ وہ اپنے پورے پورے لکچر یاد کر لیتے تھے اور پھر ان کا اندازِ گل افشانیِ گفتار دیدنی ہوتا تھا۔ مولانا ضیا احمد جیسے

اُردو فارسی اور عربی ادب کے عالم کم دیکھنے میں آئے۔ ہم لوگوں کو جب کسی شعر کی شرح میں دشواری ہوتی تو مولانا ضیاء احمد سے ہی رجوع کرتے تھے۔ ان کے دیوان مومن کی شرح خاصے کی چیز ہے کیوں کہ مومن کے یہاں نازک خیالی کے ساتھ محذوفات بہت ہیں اس لیے ان کے بعض اشعار آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ پروفیسر ایل۔ کے حیدر ہزارہ (سرحد) کے رہنے والے تھے۔ ایک عرصے تک پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے تھے۔ ملازمت کے آخری چند سال انھوں نے علی گڑھ میں گذارے۔ ان کے اندر ایک خاصا طنطنہ تھا۔ وہ ذہنی تربیت کے لیے مشہور ماہر اقتصادیات مارشل کی کتاب کے ابواب کا خلاصہ اپنے شاگردوں سے کراتے اور کلاس میں سنتے تھے۔ مختار مسعود نے اپنی ایک کتاب میں اُن کا ذکر بڑے پُر اثر انداز میں کیا ہے۔ خواجہ منظور حسین ایم۔ اے انگریزی میں میرے استاد تھے۔ انھیں کی تربیت سے میرا انگریزی ادب کا مطالعہ وسیع ہوا اور معیار ادب کی طرف توجہ ہوئی۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کی ادارت اس خوبی سے کی کہ اس کی سارے ملک میں شہرت ہوگئی۔ اقبال کا فارسی کلام میگزین میں ان کے زمانے میں کئی بار شائع ہوا۔ سجاد انصاری کے مضامین کا مجموعہ محشر خیال کے نام سے انھوں نے ہی چھپوایا تھا۔ وہ جب ۱۹۴۸ء میں پاکستان گئے تو میرے نام ایک خط میں غالب کا یہ شعر لکھا تھا ؎

"کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبتِ اہلِ کنشت کو"

جب سبط حسن کی مرتب کردہ کتاب "آزادی کی نظمیں" شائع ہوئی تھی تو خواجہ صاحب نے دیکھا کہ اس میں کلاسیکی اُردو شاعری کے اقتباسات بہت کم ہیں، زیادہ تر ہم عصروں کی ہی نظمیں ہیں۔ چناں چہ انھوں نے ہمارے سارے ممتاز شعرا کے دیوان کھنگال ڈالے، تاریخوں کا مطالعہ کیا اور بہت سا مواد جمع کر لیا۔ یہ مواد بہت بعد میں اُردو غزل کا خارجی روپ بہروپ اور اُردو شاعری اور تحریک جدوجہاد کے نام سے سامنے آیا۔ اقبال اور دوسرے شعرا کے نام سے ایک کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے سب سے پہلے روسی افسانہ نگاروں خصوصاً چیخوف کے تراجم اُردو میں کیے تھے۔ انھیں کی تقلید میں جلیل قدوائی نے بھی بہت سے تراجم کیے۔ خواجہ صاحب انگریزی شعرا کی خصوصیات کو واضح کرنے میں اُردو اور فارسی کے اشعار سے بھی مدد لیتے تھے۔ مولانا عبدالعزیز میمن یگانۂ روزگار تھے۔

کہا جاتا تھا کہ اس دور میں وہ اور جامعہ ملیہ کے مولانا سورتی سب سے ممتاز عربی کے عالم تھے۔ مولانا سیر، خوش خوری اور اپنی پُر لطف گفتگو کے لیے مشہور تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ روپے پیسے کے خرچ میں بہت محتاط تھے مگر انھوں نے مرنے سے پہلے اپنا بڑا اندوختہ علمی کاموں کے لیے دے دیا تھا۔ کیمسٹری کے شعبے میں کرنل حیدر خاں تھے۔ علی گڑھ کے عاشق، جلد بھڑ جانے والے اور جلد مَن جانے والے۔ طلبا سے بڑی محبت کرتے تھے مگر بات بات پر ڈانٹتے بھی تھے۔ لوگ ان سے بڑی محبت کرتے تھے مگر ڈرتے بھی تھے۔ کھیلوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ خاصی عمر میں شادی ہوئی، شیخ عبداللہ بائی گرلس کالج کی لڑکی ممتاز جہاں حیدر سے۔ اُن کے علاوہ ڈاکٹر اصغر علی حیدر یاد آتے ہیں جو رشید صاحب کے بہت گہرے دوست تھے اور رشید صاحب کے ساتھ شام کو اکثر ان کے یہاں جانا ہوتا تھا وہاں ہادی صاحب اور پروفیسر ایل کے حیدر بھی موجود ہوتے، ان کی بیوی جرمن تھیں اور انھیں گھرداری کا بڑا سلیقہ تھا۔ اکثر ان کے یہاں دعوتیں ہوتیں۔ اصغر صاحب کی سالی ہی رشید صاحب کی سفارش پر ڈاکٹر اقبال کے بچوں جاوید اور منیرہ کی کچھ دنوں تک دیکھ بھال کرتی رہیں۔ وہ بیان کرتی تھیں کہ جب وہ لاہور پہنچیں تو پہلے دن اقبال کھانے کی میز پر اُن کی خاطر پورا لباس پہن کر آئے تھے۔ بعد میں انھوں نے اجازت لے لی کہ وہ الگ اپنے عام لباس یعنی بنیان اور تہمد میں کھانا کھا لیا کریں۔ شعبۂ ریاضی میں عبدالمجید قریشی صاحب تھے جو ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کے دستِ راست تھے۔ انھیں انتظامی معاملات کا بڑا تجربہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج کے ۱۹۳۲ء تک پرنسپل رہے تھے۔ پھر صدر شعبۂ ریاضی اور پرووسٹ بھی رہے۔ بعد میں پاکستان چلے گئے تھے۔

اس زمانے میں شعبۂ حیوانیات میں میرے خالہ زاد بھائی اور دوست افضال حسین قادری لکچرر تھے۔ انھوں نے کیمبرج سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور اپنے مضمون میں خاصا نام پیدا کیا۔ تفریحِ طبع کے طور پر شاعری بھی کرتے تھے۔ بعد میں یہ ڈاکٹر ظفرالحسن صدر شعبۂ فلسفہ کے بہت قریب ہو گئے اور مسلم لیگ کے پُرجوش کارکن بن گئے۔ انھوں نے اور ڈاکٹر ظفرالحسن نے ہندوستان کی تقسیم کا ایک خاکہ بھی شائع کیا تھا۔ سیاسی اختلاف کے باوجود ہماری دوستی برابر قایم رہی۔ شعبۂ ریاضیات میں قریشی صاحب کے علاوہ ایک ممتاز استاد، استاد اللہ بخش کے لڑکے رحمت اللہ تھے۔ افسوس ہے انھوں نے جوانی میں خودکشی کر لی۔ شعبۂ تعلیم میں سیدین صاحب کے علاوہ حبیب الرحمٰن اور بشیر احمد ہاشمی تھے۔

حبیب الرحمٰن صاحب بی۔ اے میں ذاکر صاحب کے ساتھی رہے تھے اور بہت اچھے استاد تھے۔ باغبانی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ بشیر احمد لاہور کے تھے اور بعد میں وہاں کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہو کر چلے گئے۔ مگر جب تک علی گڑھ میں رہے یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ انگریزی کے شعبہ میں منظور صاحب کے علاوہ محمود حسین، مختار، حامد علی اور بی۔ اے خان قابلِ ذکر ہیں۔ محمود صاحب انگریزی کے ایک خاص لہجے کی وجہ سے قاری محمود کہلاتے تھے۔ مختار حامد علی کے چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ ہارڈی سے خاص دلچسپی تھی اسی وجہ سے ہارڈی کہلاتے بھی تھے۔ بی۔ اے خان لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر کے آئے تھے۔ انگریزی کا ایک خاص لہجہ اور لباس کے معاملے میں رکھ رکھاؤ اُن کی خصوصیت تھی۔ یہ تینوں اچھے استاد سمجھے جاتے تھے۔ اُردو کے شعبے میں احسن مارہروی اور ان کے بعد محمد عزیر، ظہیر الدین علوی اور ابو اللیث صدیقی آئے۔ عزیر صاحب بہت اچھے استاد تھے۔ علوی صاحب نے بعد میں جامعہ اُردو کے کاموں میں بہت دلچسپی لی۔ ابو اللیث کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ کے دبستانِ شاعری پر پی۔ ایچ۔ ڈی بھی رشید صاحب کی نگرانی میں کر لیا تھا۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ فارسی کے شعبے میں ہادی حسن صدر شعبہ کے بعد سب سے سینیر کیپٹن حمید الدین خاں تھے۔ علمی اور ادبی کاموں سے تو انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر علی گڑھ کی سیاست میں ان کا بہت دخل تھا۔ پہلے ڈاکٹر ضیاء الدین کے مشیروں میں تھے بعد میں ان سے اختلاف ہو گیا۔ حمید الدین خاں صاحب صرف مشورہ دینے پر قانع نہ ہوتے تھے چاہتے تھے کہ ان کی ہر رائے پر عمل بھی کیا جائے۔ حمید الدین خاں صاحب کے یہاں رات کو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے لوگ جمع ہوتے اور یونیورسٹی کے معاملات پر تبصرے ہوتے۔ ان صحبتوں میں رشید صاحب برابر موجود ہوتے۔ کبھی کبھار میں بھی پہنچ جاتا۔ علی گڑھ میں ایک خاص ہستی مولانا سلیمان اشرف کی تھی، یہ شعبۂ دینیات کے صدر تھے۔ بہار کے رہنے والے اور مشہور خطیب تھے۔ مزاج میں ایک خاص طنطنہ تھا۔ نواب صدر یار جنگ قریب قریب روزانہ ان سے ملنے آیا کرتے تھے رشید صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اور رشید صاحب نے ان کے متعلق ایک بڑا دلآویز مضمون لکھا ہے۔ ان سے بہت مختلف ناظم دینیات مولانا ابو بکر شیث فاروقی تھے، یہ جون پور کے رہنے والے تھے۔ جب سرطان کے عارضے میں اُن کا انتقال ہوا تو میں نے ان کے متعلق ایک نظم

لکھی تھی جس کا عنوان تھا "ایک مولانا گئے اور ہاتھ کیا کیا گیا"۔ یونیورسٹی کے دفتر میں عظمت الٰہی زبیری رجسٹرار اور سید عبدالجلیل ڈپٹی رجسٹرار کا ذکر بھی ضروری ہے۔ دونوں سے میرے گھریلو مراسم تھے۔ عظمت الٰہی زبیری مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ جلیل صاحب دوستوں کے دوست تھے۔ رشید صاحب سے ان کی دوستانہ نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ رجسٹرار آفس میں امتحان کے دفتر میں محمد علی بھی تھے۔ اُن کے یہاں بڑے بڑے پروفیسر بیٹھے رہتے تھے۔ ہر ایک کو چائے ضرور پلاتے تھے اُن میں خوبی یہ تھی کہ باقاعدگی نہ ہونے کے باوجود ہر کام وقت پر کر لیتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کا انھیں بہت شوق تھا۔ جغرافیہ کے شعبے میں چند سال ڈاکٹر عبادالرحمٰن صدر رہے۔ یہ بہت ذہین آدمی تھے۔ ایک اسکول ماسٹر سے ترقی کر کے علی گڑھ میں شعبۂ جغرافیہ کے صدر، پھر انسپکٹر آف اسکولز اور آخر میں یوپی کے ڈائرکٹر تعلیم ہو گئے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر پاکستان چلے گئے اور کراچی یونیورسٹی میں کئی سال رجسٹرار بھی رہے وہیں انتقال ہوا۔ جغرافیہ کے شعبے میں میرے ایک خالہ زاد بھائی ابرار حسین قادری بھی تھے۔ برسوں وارڈن رہے۔ انھوں نے گل گشت کے نام سے ہنڈاری کے سفر کا حال بھی لکھا تھا جو میں نے علی گڑھ میگزین میں شایع کیا تھا۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں دو دفعہ پٹنے جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ مولوی عبدالحق کی دعوت پر۔ انھوں نے بہار کی حکومت سے اُردو کے مسائل پر بات کرنے کے لیے ایک اجتماع کیا تھا۔ اس کا نتیجہ عبدالحق ۔ راجندر پرشاد پیکٹ کی صورت میں نکلا۔ اس میں رشید صاحب، سیدین صاحب اور میں علی گڑھ سے گئے تھے۔ دوسری دفعہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پٹنے میں تھا۔ بنیادی تعلیم کی اسکیم جو وردھا اسکیم کے نام سے جانی جاتی تھی زیر بحث تھی۔ یہ اسکیم ذاکر صاحب کی قیادت میں تیار ہوئی تھی۔ اس میں گاندھی جی کے اس تصور کو اپنایا گیا تھا کہ ہاتھ کے کام کو ابتدائی تعلیم میں بنیادی اہمیت دی جائے اور یہ تعلیم آٹھ سال کی ہو۔ گاندھی جی یہ چاہتے تھے کہ طلبا جو کام کریں اور جو چیزیں کتائی، بنائی، چمڑے اور لکڑی کے کام کے ذریعے سے تیار کریں انھیں بازار میں فروخت کر کے تعلیم کا خرچ نکالا جائے۔ مگر ذاکر صاحب نے جس کمیٹی کی قیادت کی تھی اور جو اسکیم بنیادی تعلیم کی تیار کی تھی اس میں ہاتھ کے کام کی مرکزی اہمیت تو ضرور تھی مگر طلبا کی محنت کو بازار کا مال بنانے سے احتراز تھا بلکہ کام سے جو تخلیقی صلاحیت ابھرتی ہے اُسے مقصد بتایا گیا تھا۔

چونکہ اس اسکیم کے شایع ہونے کے بعد سی. پی (اب مدھیہ پردیش) میں ودیا مندر کی اسکیم بھی چلائی گئی تھی اور اس میں بھی ہاتھ کے کام پر زور تھا اس لیے اس نام پر اور واردھا اسکیم پر مسلم لیگ کے حامیوں نے سخت اعتراضات کیے۔ آٹھ سال کی تعلیم میں مادری زبان کے ذریعے سے تعلیم پر اصرار تھا اور مذہبی تعلیم کو سرکاری اداروں سے علاحدہ رکھنے کی سفارش کی گئی تھی اور اس کے لیے ہر مذہبی برادری کو اپنے طور پر مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے کہا گیا تھا اس لیے مسلم لیگ کے حامیوں کو اس میں اُردو کے لیے اور مسلمانوں کے لیے بہت سے خطرے محسوس ہوئے۔ مولوی عبدالحق اس اجتماع میں شریک تھے جیسیں گاندھی جی نے ناگپور میں ہندی اتھوا ہندوستانی (یعنی ہندوستانی دیوناگری رسم خط میں) پر زور دیا تھا اور مولوی صاحب کی ہندوستانی کی تجویز مسترد کردی تھی اس لیے مولوی صاحب بھی واردھا اسکیم کے خلاف ہو گئے تھے۔ ہم علی گڑھ والے اس وقت ذاکر صاحب پر پورے اعتماد کی وجہ سے واردھا اسکیم کی حمایت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین بھی اس جلسے میں موجود تھے اور انھوں نے بھی واردھا اسکیم کی مخالفت کی تھی۔ ذاکر صاحب کسی وجہ سے اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ مگر انھوں نے کانفرنس کے سکریٹری کے نام ایک خط بھیجا تھا جس میں اس اسکیم کے مفید پہلوؤں کی وضاحت کرنے کے بعد اس کے مخالفوں کو اقبال کا یہ شعر یاد دلایا تھا:

تری دعا ہے کہ ہو میری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

۱۹۳۶ء سے ریڈیو پر میری تقریریں نشر ہونے لگی تھیں اور عام طور پر ادبی حلقوں میں انھیں پسند کیا گیا تھا۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں چند منتخب تقریروں کا مجموعہ "تنقیدی اشارے" کے نام سے شایع کیا۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" میں اس پر بہت اچھا ریویو کیا۔ علی گڑھ میں ہی تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ 'نئے اور پرانے چراغ' کے نام سے مرتب کرکے شاہ برادرس آگرے کو دیا گیا تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء میں شایع ہوا۔ مولوی عبدالحق نے عزیز احمد کا نئی اُردو شاعری کا انتخاب 'انتخاب جدید' کے نام سے میری رائے کے لیے بھیجا تھا۔ جب میں نے اس میں کچھ ترمیم اور کچھ اضافے کی تجویز کی تو مولوی صاحب نے پورے انتخاب پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجھ سے کہا اور ۱۹۴۴ء میں یہ انتخاب انجمن سے عزیز احمد اور میرے نام سے شایع ہوا۔ اس میں ۱۹۱۴ء سے چوتھی دہائی تک کی شاعری کا انتخاب آگیا تھا۔

جب میں انگریزی میں ایم۔ اے کر رہا تھا اور علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر ہو گیا تھا تو ۱۹۳۲ء کے اخیر میں انگارے شایع ہوئی۔ یہ سجاد ظہیر، احمد علی، محمود الظفر اور رشید جہاں کے افسانوں کا مجموعہ تھا۔ علی گڑھ میگزین میں اس پر ریویو میں نے لکھا تھا اور رشید صاحب نے اس کی نوک پلک ضرور درست کی تھی چوں کہ اس میں انگارے پر خاصی تنقید تھی۔ اس لیے میگزین کے نگراں اور میرے استاد خواجہ منظور حسین نے اس ریویو کو پسند نہیں کیا مگر انھوں نے اس کو شایع کرنے کی اجازت دے دی۔ رسالہ جامعہ میں بھی اس پر تنقید تھی گو سجاد ظہیر کے افسانوں کی تعریف بھی تھی۔ انگارے میں نئے پن اور بغاوت کا جوش تھا، خاصی عریانی آگئی تھی اس لیے حکومت نے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ رسالہ اردو میں ضرور مولوی عبدالحق نے اس کی تعریف کی تھی۔ اس زمانے میں اختر رائے پوری علی گڑھ میں بی۔ اے کر رہے تھے۔ انھوں نے سنسکرت بھی ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لی تھی۔ کچھ مہینے یہ رشید صاحب کے یہاں بھی قیام پذیر رہے تھے۔ رشید صاحب ذہین اور باصلاحیت طلبا کی بہت مدد کرتے تھے اور انھوں نے کئی طلبا کو اپنے یہاں قیام کی سہولت بھی دی تھی۔ علیم صاحب ۱۹۳۴ء کے اکتوبر میں عربی میں لکچرر ہو کر آئے تو وہ کوئی مکان نہ ملنے تک کئی مہینے رشید صاحب کے یہاں رہے۔ اس زمانے کے ممتاز طلبا میں اختر رائے پوری، حیات اللہ انصاری، مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، سبط حسن کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو بھی چند مہینے کے لیے آئے تھے مگر پھر لاہور واپس چلے گئے۔ غالباً ۱۹۳۴ء کے آخر میں سجاد ظہیر لندن سے آئے اور انھوں نے اس دور کے بحران پر انگریزی میں ایک مقالہ یونیورسٹی یونین میں پڑھا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ان کی تحریک پر علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ قائم کی گئی جس کا سکریٹری میں تھا۔ اس کے جلسے اسٹاف کلب میں ہوتے تھے اور ان میں خواجہ منظور حسین، رشید صاحب، خواجہ غلام السیدین، اختر انصاری، سید بشیر الدین لائبریرین اور یونیورسٹی کے بہت سے استاد شریک ہوتے تھے۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر ختم ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر ازہر قدوائی اس کے سکریٹری ہوئے اور انھوں نے کئی جلسے کیے مگر یہ شاخ زیادہ نہ چل سکی۔ اصغر گونڈوی، حفیظ جالندھری اور مولانا حسرت سے تو ۱۹۳۲ء کے مشاعرے میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اصغر صاحب نے مشاعرے میں میری نظم پسند کی تھی۔ انھوں نے علی گڑھ میگزین کے لیے غزلیں بھی عنایت کی تھیں۔ حفیظ نے جو غزل مشاعرے میں پڑھی تھی وہ بھی مجھے

میگزین میں شائع کر دی تھی۔ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۲ء میں ایک خطبہ ہندوستان میں ہندوستانی کے نام سے دیا تھا جس میں تجویز یہ تھی کہ اُردو کو ہندوستانی کہا جائے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ نام اس زبان کے لیے اُردو سے پہلے استعمال ہوا ہے۔ یہ مضمون بھی میں نے ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ میگزین کے سالنامے میں شائع کیا تھا۔ اس میں اقبال کی نظم "دین اور سیاست" بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم بعد میں "بالِ جبریل" میں شائع ہوئی۔ جب ۱۹۲۵ء میں رسالہ سہیل کے لیے میں نے مضامین جمع کیے تو خاص طور سے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے مصوری کے جدید میلانات پر مضمون لکھا تھا جس میں جدید یورپی مصوروں کی تصویروں کے عکس بھی تھے۔ جگر صاحب کو سب سے پہلے غالباً ۱۹۲۲ء میں ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت آئے جب مشاعرہ شروع ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور بہت سے لوگ اپنا کلام سنا چکے تھے۔ جگر صاحب اسٹیج کے پیچھے سے اس حالت میں نمودار ہوئے کہ نشہ میں دھت تھے۔ کرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ آکر اسٹیج پر بیٹھ گئے اور نواب اسمٰعیل خاں صدر کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پینا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انھیں پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ انھوں نے جھوم جھوم کر نہایت دلکش ترنم میں دو غزلیں سنائیں جو شعر اب تک یاد ہیں وہ یہ ہیں:

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

گئے تھے ہم بھی جگر بارگاہِ جاناں میں
وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات ہی نہ ہوئی

اس کے کچھ دن بعد جامعہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ اس زمانے میں قرول باغ میں تھی۔ جامعہ کا مشاعرہ تھا اس میں مولانا حسرت، جگر، ثاقب لکھنوی بھی شریک تھے۔ مولانا حسرت نے جو غزل پڑھی وہ تو اب یاد نہیں مگر یہ یاد ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں وہ اشعار نوٹ کر رہے تھے جو انھیں پسند آئے تھے۔ ثاقب نے جو غزل سنائی تھی اس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا تھا:

مکاں منعم کا سونے سے، یہ خونِ دل سے بنتا ہے
خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

جگر صاحب نے غزل پڑھی تو وہ مشاعرے پر چھا گئے۔ یہ اشعار اب تک یاد ہیں ۔

دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا
کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا

در حقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں

اسی زمانے میں جوش اور جگر علی گڑھ آئے اور رشید صاحب کے یہاں مقیم ہوئے۔ جوش کے ساتھ ل۔ احمد اکبر آبادی بھی تھے۔ یونیورسٹی کی شعری نشست سے پہلے رشید صاحب کے یہاں ان حضرات نے اپنا کلام سنایا۔ رشید صاحب نوجوان شعرا کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اس زمانے میں مجاز نے ایک نظم 'انقلاب' کے نام سے لکھی تھی۔ نظم میں اس زمانے کے باغیانہ خیالات تھے۔ مجاز کا انقلاب کا رومانی تصور نمایاں تھا۔ لوگوں نے تعریف کی مگر جگر صاحب نے یہ ضرور کہا کہ انقلاب کیسا بھیانک تصور ہے۔ دوسرے دن یونین میں جوش اور جگر نے اپنا کلام سنایا۔ جوش جگر کے سامنے بالکل نہ جمے۔ جگر اس دن واقعی فارم پر تھے۔

جگر صاحب سے میری قربت اس وقت سے شروع ہوئی جب وہ توبہ کے بعد علی گڑھ آئے۔ شراب ترک کر دی تھی اور اصغر صاحب کی بیوی سے جو پہلے ان کی بیوی رہ چکی تھیں دوبارہ شادی کر لی تھی۔ رشید صاحب کے یہاں قیام تھا۔ اس زمانے میں وہ تجدید ملاقات کے نام سے ایک مسلسل غزل لکھ رہے تھے۔ دو یا تین شعر روز کہتے اور سناتے۔ تین چار دن میں یہ غزل مکمل ہوئی۔ چند شعر یہ ہیں ؎

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
معصوم اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

وہ حسن کی بربادیٔ زندہ کا مرقع
وہ عشق کی پایندہ کرامات کا عالم

عالم مری نظروں میں مگر اور ہی کچھ ہے
عالم ہے اگر یہ وہی دن رات کا عالم

جگر صاحب سے جب راہ و رسم بڑھی تو معلوم ہوا کہ بڑے مخلص اور بے ریا آدمی ہیں۔ زندگی میں کوئی ضبط و نظم نہیں۔ چائے بہت پیتے ہیں کوئی ملنے والا آئے تو بڑی خاطر کرتے ہیں۔ گفتگو مرتب نہیں ہوتی۔ خاصے بدصورت آدمی ہیں مگر خلوص کی کرنوں کی وجہ سے بدصورت نہیں معلوم ہوتے۔ رشید صاحب کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ نوجوانوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ دوسروں کے اچھے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ آئے تو مجروح سلطان پوری کو ساتھ لائے اور ان

کی بڑی تعریف کی۔ مجروح اس زمانے میں رومانی نظمیں کہتے تھے۔ پڑھنے کا طرز بہت اچھا تھا۔ ایک طور سے علی گڑھ سے مجروح کا تعارف جگر صاحب نے ہی کرایا۔ پھر مجروح کئی مہینے رشید صاحب کے یہاں رہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے لیے رشید صاحب کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

اس زمانے میں خالدہ ادیب خانم علی گڑھ آئیں۔ ڈاکٹر صاحب ساتھ تھے۔ دراصل یہ جامعہ ملیہ میں کچھ لکچر دینے آئی تھیں۔ یونین میں ان کے اعزاز میں جلسہ ہوا۔ جلیل قدوائی اور مجاز نے ان کے اعزاز میں جو نظمیں لکھی تھیں وہ سنائیں۔ مجاز کی نظم بہت پسند کی گئی۔ سجاد حیدر یلدرم اس جلسے کے صدر تھے۔ انھوں نے ترکی کے بہت سے ادیبوں کے تراجم اردو میں کیے تھے۔ خالدہ خانم کے ایک افسانے کی انھوں نے بڑی تعریف کی۔ اپنی تقریر میں خالدہ خانم نے کہا "یہ میرے ابتدائی دور کا افسانہ ہے" مگر صدارتی کلمات میں سجاد حیدر نے پھر اسے سراہا۔ خالدہ خانم کے علاوہ رؤف بے بھی علی گڑھ آئے تھے۔ یہ دونوں ترکی کی جنگ میں کمال اتاترک کے ساتھ تھے۔ بعد میں اختلاف ہو گیا تھا۔ یہیں ملک راج آنند کو پہلی دفعہ دیکھا۔ یہ اسپین کی سول وار کے زمانے میں کچھ دن کے لیے وہاں تھے۔ انگلستان سے بھی بہت سے ادیب فرانکو کے خلاف اور اسپین کی جمہوری حکومت کی حمایت میں لڑنے کے لیے گئے تھے۔ کرسٹوفر کاڈول جس کی کتاب فریب اور حقیقت ILLUSION AND REALITY کافی مشہور ہوئی، جارج آرویل اور آرتھر کوسلر بھی اس لڑائی میں شریک تھے۔ اس لڑائی میں اسپین کا مشہور شاعر اور ڈراما نویس لورکا بھی مارا گیا تھا۔ ملک راج کے لبوں سے الفاظ کا آبشار بہتا ہے۔ بعض اوقات ان کی پوری بات سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُن کے خلوص اور اُن کی نفاست کا بہرحال قائل ہونا پڑتا ہے۔ فراق گورکھپوری سے پہلی ملاقات غالباً ۱۹۳۸ء کے شروع میں ہوئی وہ کسی مشاعرے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور مولانا احسن مارہروی کے مہمان تھے۔ میں اور عشرت حسین زبیری جو الٰہ آباد میں رہ چکے تھے ان سے ملنے گئے۔ بہت دلچسپ انداز میں فراق باتیں کرتے رہے۔ بہت سے لطیفے بھی سنائے۔ مشاعرہ شہر میں لائل لائبریری میں تھا جو اب مالویہ پستکالیہ کہلاتی ہے۔ مشاعرے سے پہلے ہم سب مولانا احسن کے یہاں سے روانہ ہوئے فراق نے چلتے وقت کہا "آج قتل کی رات ہے" وہاں پہنچے تو چند شعرا نے ہی اپنا کلام سنایا تھا کہ مشاعرے میں ہڑبونگ ہو گئی۔ حاضرین جس میں طلبا زیادہ تھے شور مچا رہے تھے اور کسی کو سننے

کے بے اختیار نہ تھے۔ فراق کی ذہانت کا میں قائل ہو گیا جب ان کے پڑھنے کے وقت گھٹی گھٹی ہنسیوں کی آوازیں آنے لگیں تو وہ خفا ہونے کے بجائے ہنس دیے اور پھر کچھ شعر سنائے۔ جو لوگوں نے سن لیے مطلع اب تک یاد ہے ؎

اے ساکنانِ دہر یہ کیا اضطراب ہے
اتنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے

فراق اس کے بعد کئی دفعہ علی گڑھ آئے۔ ان کے اشعار پڑھنے کا انداز اور لطیفے سب مقبول ہوئے مگر ایک بات میں نے اس وقت بھی محسوس کی تھی۔ وہ اکثر اپنے اشعار پڑھنے سے پہلے انگریزی شعرا کے یا اردو فارسی شعرا کے مشہور شعر سناتے اور پھر اپنا شعر۔ اس طرح ان کے شعر کا تاثر خاصا گہرا ہو جاتا تھا۔

حفیظ جالندھری جب ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ آئے تھے تو وہ اپنے گیتوں اور شاہنامۂ اسلام کی وجہ سے خاصے مقبول ہو گئے تھے۔ دوبارہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں آئے۔ اس وقت وہ حکومتِ ہند میں سانگ پبلسٹی آرگنائزر تھے اور ہٹلر کے خلاف نظمیں لکھواتے تھے۔ اپنے ایک گانے کا اکثر ذکر کرتے تھے ؎

میں تو چھورے کو بھرتی کرائی آئی رے
میں تو ہٹلر کو آگ لگائی آئی رے

اس وقت یونین میں انھوں نے نئی تازہ نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ مگر ماحول کچھ سرد رہا۔ بعد میں کہنے لگے "یا تو میں بدل گیا ہوں یا علی گڑھ بدل گیا ہے"۔ کسی نے بے تکلفی سے کہا "نہیں حفیظ صاحب آپ نہیں بدلے ہاں علی گڑھ ضرور بدل گیا ہے۔"

روش صدیقی تو اکثر علی گڑھ آتے رہتے تھے۔ سب سے پہلے میں نے انھیں ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا۔ ان کی رومانی نظمیں اور فطرت نگاری خاصی مقبول تھی۔ غزلیں کہنا انھوں نے بہت بعد میں شروع کیا۔ آزادی کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ایگزیکیوٹو بھی ہو گئے تھے۔ ساغر بھی وہیں تھے۔ ساغر تو ریڈیو میں خوب جمے مگر روش کی ریڈیو کے حکام سے نہ بنی۔

فانی ایک زمانے میں علی گڑھ کے مشاعروں میں پابندی سے آتے تھے اور ان کی غزلیں بہت

بہت مقبول تھیں۔ مگر میرے علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں وہ نہیں آئے۔ میں نے انھیں آگرے کے مشاعرے میں سُنا تھا اور ایک دفعہ اُن سے ملا بھی تھا۔ اصغر گونڈوی کئی دفعہ آئے۔ وہ صرف خاص صحبتوں ہی میں اپنا کلام سُناتے تھے۔ مشاعروں میں کوئی نوجوان شاعر ان کا کلام پڑھتا تھا۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ کے میرے شاگردوں میں تین اس زمانے کے یاد آتے ہیں جب میں انگریزی کے شعبے میں لکچرر تھا۔ ایک خواجہ منظر حسن جو سدید صاحب کے عزیز تھے۔ دوسرے عشرت عثمانی جو بعد میں آئی۔ سی۔ ایس میں آگئے اور پھر پاکستان چلے گئے۔ اُن کی شہرت فزکس کے ایک ماہر کی حیثیت سے ہوئی۔ پاکستان سے یو۔ این۔ او چلے گئے اور آج کل بی۔ سی۔ سی۔ آئی لندن کے سائنسی مشیر ہیں۔ تیسرے عبدالرحمٰن ٹونکی جو سید محمد ٹونکی کے بھتیجے تھے۔ بعد میں یہ S I R میں ایک ممتاز عہدے پر رہے اور سائنس کی تاریخ پر انھوں نے خاصا کام کیا۔ ان کے یہاں صرف ٹیوٹوریل لینا تھا۔

اُردو کے شاگردوں میں پہلے حسن عبداللہ تھے جنھوں نے ۱۹۳۶ء میں اُردو ایم۔ اے۔ میں داخلہ لیا۔ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے مگر میرا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ غالب کے عاشق تھے۔ بعد میں یہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے تھے۔ انتقال کے وقت عمر مشکل سے پچاس سال کی رہی ہوگی۔ دوسرے مبشر علی صدیقی تھے جو میرے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ نہایت محنتی اور پڑھنے لکھنے کے شائق۔ بعد میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے۔ انھوں نے برابر لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور خاصی تصانیف چھوڑیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بدایوں میں لڑکیوں کا ایک مثالی اسکول بڑی کامیابی سے چلایا اور اس کے لیے اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ وقف کر دیا۔ مسعود حسین خاں بھی ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ ایم۔ اے میں انھوں نے پریم چند پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ کچھ دنوں ریڈیو میں رہے مگر وہاں کا ماحول پسند نہ آیا۔ پھر اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے علی گڑھ آ گئے۔ رشید صاحب نے ان کے کام کی نگرانی میرے سپرد کی۔ انھوں نے جلد اپنا کام مکمل کر لیا۔ اُن کے وائیوا کے لیے میں علی گڑھ رام پور سے آیا تھا۔ جب میں لکھنؤ میں تھا تو یہ انگلستان چلے گئے تھے۔ پہلے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (SOAS) میں لسانیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لیے داخلہ لیا مگر وہاں پروفیسر فرتھ سے نہ بنی تو پیرس چلے گئے اور وہاں "لفظ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ واپس

آگر کچھ دن بعد ریڈر ہو گئے۔ سلکشن کمیٹی میں اکسپرٹ کی حیثیت سے میں لکھنؤ آیا تھا۔ ریڈر اور صدرِ شعبہ ہونے کے بعد ریاک فیلر فاؤنڈیشن کے وظیفے پر امریکہ چلے گئے اور دو سال بعد واپس آئے۔ پھر ان کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر اردو اور صدرِ شعبہ کی حیثیت سے ہو گیا۔ حیدرآباد میں یہ خاصے مقبول تھے مگر علی گڑھ آنا چاہتے تھے۔ ادھر میں نے اردو کے شعبے میں لسانیات کا مضمون شروع کرا دیا اور بعد میں اس میں پروفیسری بھی مل گئی اور شعبہ بھی الگ ہو گیا۔ جون ۱۹۶۸ء میں میری کوشش سے ان کا تقرر لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ہوا۔ سنیتی کمار چٹرجی اکسپرٹ تھے۔ اگست میں یہ علی گڑھ آ گئے۔ مسعود علی ذوقی علی گڑھ میں مجھ سے سینیر تھے۔ گونڈے میں ایک اسکول میں استاد ہو گئے تھے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت طالب علمی میں ہی ہو گئی تھی۔ فطرت نگاری ان کا محبوب موضوع تھا۔ جگر صاحب سے خاص مراسم تھے۔ انھوں نے پہلے ایم۔ اے پرائیویٹ کیا اور پھر کچھ وقفے سے فائنل۔ ایک زمانے میں فلموں کے چکر میں بمبئی بھی گئے تھے۔ بہت اچھے اداکار تھے۔ بعد میں [illegible]ال یونیورسٹی اسکول کے پرنسپل رہے اور پھر میرے زمانے میں شعبۂ اردو میں لیے گئے۔ وہ ہر دلعزیز استاد تھے۔ تہذیبی سرگرمیوں میں ان کا رول نمایاں رہتا تھا۔ سبکدوش ہونے کے بعد کئی سال ترقی اردو بورڈ کی اردو لغت کی ایک جلد کی تیاری میں میرے اسسٹنٹ رہے۔ جاں نثار اختر اور نور الحسن ہاشمی دونوں نے ایک ہی سال ایم۔ اے کیا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے جاں نثار اس وقت بھی شہرت رکھتے تھے۔ لاابالی مزاج کے باوجود ان کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ اچھا تھا۔ نور الحسن ہاشمی لکھنؤ سے انگریزی میں ایم۔ اے کر کے آئے تھے۔ بڑی مرتب شخصیت تھی اور مطالعہ بھی بہت اچھا تھا۔ میری نگرانی میں انھوں نے دلی کے دبستانِ شاعری پر پی۔ ایچ ڈی کیا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے اور وہیں سے پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ تحقیق و تنقید دونوں میں بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے۔ جذبی مطالعے پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے مگر شعر اچھے کہتے تھے۔ ایم۔ اے کے لیے انھوں نے ترقی پسند ادب پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ یہ بھی بعد میں شعبۂ اردو میں آ گئے۔ ان کے پہلے مجموعے "فروزاں" پر مقدمہ میں نے ہی لکھا تھا۔ ایک دلچسپ آدمی رشید مودودی تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی خاصے باثر تھے۔ حلیم صاحب سے انھوں نے کسی طرح خاصا قرب حاصل کر لیا تھا۔ ایک اچھے طالب علم عبدالرؤف تھے۔ یہ جے پور کے رہنے والے تھے اور ان کے یہاں ہیروں کا کاروبار ہوتا تھا۔ بعد میں رؤف روحی

کے نام سے انھوں نے بہت سے مضامین لکھے اور شعر کہے۔ ایک شاگرد نور محمد تھے ان کا خط بہت خراب تھا۔ چوں کہ ایک سال کسی ممتحن سے ان کی تحریر پڑھی ہی نہیں گئی اس لیے فیل ہو گئے۔ دوسرے سال فرسٹ ڈویژن لائے۔ صدیق احمد صدیقی آنرس تو پہلے ہی کر چکے تھے۔ مگر ایم۔ اے انھوں نے میرے زمانے میں کیا۔ بڑے اچھے مقرر تھے۔ یونین کے سکریٹری بھی ہو گئے تھے۔ چوں کہ طلبا کی تحریکوں میں پُر جوش حصہ لیا تھا اس لیے حلیم صاحب ان سے ناراض تھے۔ رشید صاحب کی اور میری پُر زور سفارش کے باوجود حلیم صاحب نے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ نہ دیا۔ ساجد علی خاں راز جگر صاحب کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ پڑھتے بہت اچھا تھے۔ بعد میں ریڈیو میں ملازم ہو گئے تھے۔ دو طالبات کے نام یاد آتے ہیں۔ ایک سلیمہ سلطانی دوسری سلمیٰ سلام الحق۔ غالباً ۱۹۴۲ء میں انگریزی، جغرافیہ اور اُردو میں ایم۔ اے کی طالبات کے لیے بھی انتظام کیا گیا تھا۔ کلاس روم میں گوشے میں ایک پردہ پڑا رہتا تھا جس کے پیچھے سے طالبات لکچر سنا کرتی تھیں۔ استادوں سے پردہ نہ تھا۔ سلمیٰ سلام الحق نے سلیمہ سلطانی کے ایک سال بعد ایم۔ اے کیا تھا۔ سلمیٰ کی شادی بعد میں اُن کے چچازاد بھائی شان الحق حقی سے ہوئی۔ اُسی زمانے میں ویمنز کالج میں اُردو کے ایک لکچرر کی جگہ نکلی۔ دونوں لڑکیوں نے درخواست دی۔ سلیمہ سلطانی ڈاکٹر ضیاء الدین کے کسی دوست کی صاحبزادی تھیں اور ان کا قیام کچھ دنوں ڈاکٹر صاحب کے گھر پر بھی رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ اُن کا تقرر ہو جائے۔ رشید صاحب اور میں سلمیٰ کے حق میں تھے جن کے نمبر سلیمہ سے زیادہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے انٹرویو میں دونوں سے یہ سوال کیا کہ اُردو میں سب سے اچھا شاعر کون ہے؟ سلیمہ سلطانی نے غالب کا نام لیا اور سلمیٰ سلام الحق نے اقبال کا۔ بس ڈاکٹر صاحب کو موقع مل گیا کہنے لگے کہ "غالب ٹھیک ہے۔ اقبال کو پنجابیوں نے بڑھا دیا ہے۔" مگر چوں کہ رشید صاحب نے سلمیٰ کے لیے اصرار کیا اس لیے دونوں کا تقرر ہو گیا اور اُردو کے علاوہ دینیات کے کچھ کلاس بھی شروع میں ان کو دیے گئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کا ایک اور لطیفہ بھی اس زمانے میں خاصا مشہور ہوا تھا۔ ایم۔ اے انگریزی کے ایک طالب علم حسن الدین احمد تھے۔ یہ میگزین کے ایڈیٹر بھی ہو گئے تھے۔ انھوں نے پاکستان پر کچھ مضامین بھی چھاپے جن میں سید صاحب اور خواجہ احمد عباس کے مضامین پاکستان کی مخالفت میں تھے۔ خیال یہ تھا کہ حسن الدین احمد بعد میں انگریزی میں لکچرر ہو جائیں گے کیوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست کے لڑکے تھے۔

مگر اس میگزین کی اشاعت کے بعد انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اُن کے والد ڈاکٹر صاحب یہ میگزین کی ایک کاپی لے کر اور پوچھا کہ اس میں آپ کو کون سی بات قابلِ اعتراض نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے مزے کا جواب دیا اس کا ATMOSPHERE خراب ہے۔" باوجود عجیب انگریزی کے ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات واضح کر دی تھی۔

ایم۔اے کے نصاب میں مقالات کے پرچے میں ہم لوگوں نے سجاد انصاری کی "محشرِ خیال" بھی رکھی تھی۔ رسالہ سہیل میں ۱۹۳۶ء میں ان کا ڈرامہ "روزِ جزا" بھی شایع ہو چکا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو یہ بات پسند نہ آئی۔ سجاد انصاری اُن کے عزیز تھے۔ مگر دونوں میں چشمک رہتی تھی۔ سجاد انصاری قول محال کے بادشاہ تھے۔ خواجہ منظور حسین اُن کے بہت قایل تھے اور اُن کی اوارت کے زمانے میں اُن کے کئی مضامین علی گڑھ میگزین میں شایع ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کا مجموعہ "محشرِ خیال" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شایع بھی کر دیا تھا۔ رشید صاحب بھی سجاد انصاری کے بہت مدّاح تھے۔ مجھے تو ان کی تحریروں میں آسکر وائلڈ، چسٹرٹن اور برناڈ شا تینوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ اُن کے یہ جملے آج تک یاد ہیں۔ "فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے"۔ "وہ مجھے عقبیٰ سے کوئی دلچسپی نہیں میں تو صرف قرۃ العین کے قاتلوں کا حشر دیکھنا چاہتا ہوں"۔ پہلے مولانا ماجد نے رشید صاحب کو کئی خط لکھے کہ یہ کتاب کورس سے نکال دی جائے۔ رشید صاحب نے یہ خط مجھے دکھائے اور ہم لوگوں نے طے کیا کہ اُن کے جواب میں خاموش رہے۔ ماجد صاحب کہاں خاموش بیٹھنے والے تھے انھوں نے پرو وائس چانسلر حلیم صاحب کو اور نواب صدر یار جنگ ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کو لکھا اور اصرار کیا کہ کتاب ملحدانہ خیالات کی وجہ سے نصاب سے نکال دی جائے۔ حلیم صاحب نے بورڈ آف اسٹڈیز کی میٹنگ بلائی۔ شعبے سے رشید صاحب کے علاوہ میں بھی شریک تھا۔ ایک ممبر خواجہ منظور حسین صاحب بھی تھے۔ حلیم صاحب نے صدارت کی اور کہا کہ کتاب نصاب سے خارج کر دی جائے۔ میرا خیال تھا کہ خواجہ صاحب اور رشید صاحب دونوں اس کی پرزور مخالفت کریں گے۔ مگر دونوں خاموش رہے ہاں میں نے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور کہا کہ ادب کے نصاب میں اسالیب کے مختلف نمونے رکھے جاتے ہیں۔ خیالات سے ہمیں سروکار نہیں ہوتا۔ سجاد انصاری ایک انشا پرداز ہیں اور ان کا اسلوب اہمیت رکھتا ہے۔ اگر خیالات سے سروکار ہوتا تو فلسفے میں مادیت کا فلسفہ

کیوں پڑھایا جاتا مگر حلیم صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رشید صاحب نے ضرور یہ کہا، رو سرور صاحب کتاب نکالتی ہی ہے تو بحث کرنے سے کیا فائدہ۔ میں نے پھر کہا کہ اگر اگزیکیوٹو کونسل یونیورسٹی کے مصالح کی بنا پر اس کتاب کو خارج کردے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن شعبے کا بورڈ ایسا نہیں کرسکتا میری بات سنی ان سنی کردی گئی۔ خواجہ صاحب بالکل خاموش رہے۔ کتاب خارج کردی گئی۔ مجھے اس کا بڑا رنج ہوا۔ ہاں ماجد صاحب کی ضرور فتح ہوگئی۔

میں اس زمانے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لیتا تھا اور اس کی مجلسِ منتظمہ کا ممبر تھا۔ کانفرنس کے ایک اجلاس میں طے ہوا کہ کمال یار جنگ کی قیادت میں ایک کمیٹی بنادی جائے جو مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں ایک مرتب اسکیم پیش کرے۔ کچھ عرصے تک اس کمیٹی کے ممبر ہندوستان کے مختلف تعلیمی مرکزوں میں جاتے رہے مگر کوئی باقاعدہ رپورٹ شایع نہ ہوئی۔ دوسرے سال یہ طے ہوا کہ اس کمیٹی کے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک اور کمیٹی بنائی جائے۔ کانفرنس کے اجلاس میں بہادر یار جنگ بھی موجود تھے۔ غالباً ۴۴-۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ بہادر یار جنگ حیدرآباد کے مشہور لیڈر اور مسلمانوں کے قاید تھے۔ اقبالؔ سے انھیں خاص شغف تھا۔ سیّد سلیمان ندوی نے ان کی خطابت کی بڑی تعریف کی تھی۔ چنانچہ میں خاص طور سے اُن کی تقریر سننے گیا۔ اس سے پہلے عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت کے جوہر دیکھ چکا تھا مگر ان کی تقریر سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ خطابت میں یہ بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریریں طویل ہوتی تھیں۔ تین چار گھنٹے کی تقریر تو معمولی بات تھی۔ بہادر یار جنگ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کرتے تھے۔ خاصی مرتب اور مدلل تقریر ہوتی تھی اور آواز کے اتار چڑھاؤ اور اقبالؔ کے برمحل اشعار سے مجمع کو مسحور کرلیتے تھے۔ اس جلسے میں میں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کمیٹی میں ذاکر صاحب اور سیدین صاحب کو بھی رکھا جائے جو ہندوستان کے ماہرینِ تعلیم میں ممتاز تھے۔ بہادر یار جنگ نے کہا کہ ذاکر صاحب اور سیدین صاحب میں سے ایک کو لیا جائے اور کچھ اور نام بھی پیش کیے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کا نام کمیٹی کی صدارت کے لیے پیش کیا گیا۔ وہ ذاکر صاحب کو شامل کرنے کے حق میں نہ تھے مگر بہادر یار جنگ کی تائید سے ہم لوگوں کی تجویز منظور ہوگئی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی صدارت کی وجہ سے کمیٹی کوئی کام نہ کرسکے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اس کا شاید ایک بھی جلسہ نہ ہوسکا۔

اوپر میں نے کہیں لکھا ہے کہ ڈاکٹر ضیاءالدین کے امیدوار ہونے کے باوجود ۱۹۳۸ء میں جناح صاحب سے غلام محمد اور ذاکر صاحب کے رجوع کرنے پر انھوں نے سر شاہ سلیمان کو وائس چانسلر نامزد کیا تھا اور ان کی رائے کے احترام میں ڈاکٹر ضیاءالدین مقابلے پر نہیں آئے تھے۔ سر شاہ کا ۱۹۴۱ء میں انتقال ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب پھر وائس چانسلر ہو گئے۔ اس زمانے میں جناح صاحب کے علی گڑھ کے کئی پھیرے ہوئے تھے۔ جب ان کا ٹرم ۱۹۴۴ء میں ختم ہونے لگا تو نئے وائس چانسلر کے لیے پھر گھوڑے دوڑنے لگے۔ اب کے حلیم صاحب چاہتے تھے کہ انھیں موقع ملے۔ ضیاءالدین صاحب نے اپنی اکثریت سے فائدہ اٹھا کر کورٹ میں پرو وائس چانسلر کی جگہ ہی حذف کرا دی تھی۔ قدرتی طور پر حلیم صاحب ڈاکٹر صاحب کے خلاف ہو گئے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مسلم لیگ جنگی کوششوں میں حکومت کی مدد کرنے کے خلاف تھی۔ ڈاکٹر ضیاءالدین پھر بھی حکومت کی کوششوں کی حمایت کر رہے تھے اور ان کے اثر سے علی گڑھ میں ایک ہوائی اڈہ بھی بنا دیا گیا تھا اور ہوا بازی کی تربیت شروع ہو گئی تھی۔ میں نے بھی دوسرے ساتھیوں کی طرح دس منٹ کے لیے ہوائی جہاز سے علی گڑھ کے اوپر پرواز کی۔ چھوٹا سا ہوائی جہاز تھا۔ ایک پائلٹ اور ایک پسنجر۔ جب ہوائی جہاز سطح زمین سے بلند ہوا تو میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پائلٹ جو مجھے جانتا تھا اور کئی دفعہ اسٹاف کلب میں ساتھ ٹینس کھیل چکا تھا مجھے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ بہر حال ایسا لگا کہ دس منٹ میں ایک گھنٹہ گذر چکا ہے۔ جب ہم لوگ علی گڑھ کے آس پاس کا چکر لگا کر ہوائی اڈے پر اترے تو جان میں جان آئی۔ چند ماہ بعد یہ ہوائی جہاز ایک حادثے کا شکار ہو گیا تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر ضیاءالدین جنگی تیاریوں میں حکومت کی حمایت کر رہے تھے اور لارڈ آکن لیک کمانڈر ان چیف علی گڑھ آ چکے تھے۔ حلیم صاحب نے مجھے اس بات کے لیے تیار کیا کہ میں جناح صاحب سے ملوں اور پہلے تو کمال یار جنگ کمیٹی کے حشر کے متعلق انھیں بتاؤں پھر ڈاکٹر صاحب کی جنگی سرگرمیوں میں حکومت کی تائید ان کے علم میں لاؤں جو لیگ کی پالیسی کے خلاف تھی۔ بہر حال حلیم صاحب نے ہی انتظام کیا کہ جناح صاحب سے جو نواب صدر یار جنگ کے یہاں قیام کرتے تھے ملاقات کے روز سب سے پہلے میں ملوں۔ میں ان سے ملا تو میں نے کمال یار جنگ کمیٹی کا ذکر کرتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ آئندہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے لیگ کی تجاویز کیا ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اس وقت لیگ نے

لیاقت علی خاں کی صدارت میں ان مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ آپ کو اگر ان مسائل سے دلچسپی ہے تو اُن سے رابطہ قائم کریں میں تو اس وقت سیاسی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں پاکستان بن جائے تو ان مسایل پر بھی توجہ ہوگی۔ مجھے اُن کے جواب سے بہت مایوسی ہوئی اور پھر میں نے مزید کوئی بات نہ چھیڑی۔ یہ ملاقات کوئی دس منٹ کی رہی ہوگی۔ یہ اندازہ ضرور ہوا کہ جناح صاحب سے کوئی بحث نہیں ہوسکتی۔ وہ چند مختصر جملوں میں اپنی بات کہہ دیتے ہیں اور بس۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ضیاءالدین کے سلسلے میں اب کچھ کہنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اب یہ ضرور یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۴ء کے شروع میں جب میں طلبا کی یونین کا نائب صدر تھا اور جناح صاحب ہندوستان آئے ہوئے تھے تو میں نے ان کو علی گڑھ آکر طلبا کو خطاب کرنے کی دعوت دی تھی اور انھوں نے میری دعوت منظور بھی کرلی تھی مگر پھر اُن کا پروگرام بدل گیا اور وہ واپس انگلستان چلے گئے جہاں اس وقت مستقل قیام کا اُن کا ارادہ تھا۔ چنانچہ میری یاد دہانی پر انھوں نے اپنے پروگرام کی تبدیلی اور واپس انگلستان جانے کی اطلاع دی تھی۔ یہ دونوں خط جو ان کے دولت خانے واقع مالابار ہل سے لکھے گئے تھے اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

سید بشیرالدین گوڈپٹی لائبریرین تھے اور ڈاکٹر ہادی حسن اعزازی لائبریرین۔ مگر بشیر صاحب ہی دراصل سارے کام کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اُن کے یہاں اپنے کلاسوں سے فارغ ہوکر اکثر خواجہ منظور حسین، رشید صاحب، ڈاکٹر ہادی حسن، خواجہ غلام السیدین، مولانا عبدالعزیز میمن، محمود حسین اور مختار حامد علی آجاتے تھے۔ چائے کا دور چلتا اور زیادہ تر نئی کتابوں کی باتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار یونیورسٹی کے معاملات بھی زیر بحث آتے۔ میں بھی اکثر جایا کرتا تھا۔ مجھے ان ملاقاتوں سے بڑا فایدہ ہوا۔ خواجہ منظور حسین کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ نئی کتابیں ان کی ذاتی لائبریری سے پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ پھر کوئی اچھی ناول یا تنقید کی کتاب آتی تو سب اسے باری باری پڑھتے اور اس پر رائے زنی کرتے۔ یاد پڑتا ہے کہ جرمن ناول نگار ایک زمانے میں ہمارے حلقے میں بہت مقبول تھے۔ ٹامس مان، واسرمان، اسٹیفان زویگ، فحت وانگر اس وقت یاد آتے ہیں۔ فرانس کے کئی ناول نگاروں کا مطالعہ بھی اسی زمانے میں کیا۔ غرض کئی سال تک یورپی ادب کے ترجموں، روسی ناول، انگریزی تنقید کا بھی کچھ علم ہوگیا۔

غالباً ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں اخباروں سے معلوم ہوا کہ مشہور انقلابی مولانا عبیداللہ سندھی کو ایک طویل عرصے کے بعد ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی ہے۔ ۱۹۱۹ء کی ہجرت کی تحریک میں مولانا سندھی کا بہت اہم رول رہا تھا۔ انھوں نے مہاراجہ مہندر پرتاپ کے ساتھ مل کر آزاد ہند حکومت افغانستان میں قائم کی تھی۔ جب تحریک ناکام ہوگئی تو یہ لوگ روس چلے گئے۔ انگریزوں نے ان کے ہندوستان آنے پر پابندی عاید کر دی تھی۔ جب اُن کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا تو انھیں آنے کی اجازت ملی۔ مولانا سندھی کا جامعہ میں قیام تھا اور وہ وہاں ایک بیت الحکمت قایم کرنا چاہتے تھے تاکہ اسلامیات، فلسفہ اور تاریخ پر تحقیق کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر میں شاہ ولی اللہ رح پر اُن کے مضمون نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اُن کی ہندوستان کو مختلف منطقوں میں تقسیم کرنے اور سارے منطقوں کی ایک فیڈریشن بنانے کی اسکیم بھی منظرِ عام پر آچکی تھی۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب ہندوستان سے باہر گئے ہوئے تھے لیکن اُن کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین جو ڈھاکہ یونیورسٹی میں تاریخ کے ریڈر تھے دلی آئے ہوئے تھے اُن کو ساتھ لے کر میں مولانا سندھی سے ملا۔ یاد آتا ہے وہاں ایک صاحب اور بھی موجود تھے جن سے کسی تفسیر کے نکتے پر بات ہو رہی تھی۔ مولانا بڑی شفقت اور محبت سے ملے۔ مجھے اُن کی پُرجوش باتوں نے تو متاثر کیا ہی لیکن سب سے زیادہ اُن کی آنکھوں کی چمک سے متاثر ہوا۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں چمک سے خوف محسوس ہوتا ہے مگر مولانا سے خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ ہاں اُن کی طرف دل کھنچتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان آنکھوں نے برسوں خواب دیکھے ہیں اور یہ خواب اُن کی آنکھوں میں روشنی بن کر جگمگا رہے ہیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ بیت الحکمت میں شاہ ولی اللہ رح کے انقلابی پیغام کو خاص طور سے اُجاگر کیا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا سندھ چلے گئے اور اپنی ہندوستان کی کچھ منطقوں کے ساتھ فیڈریشن بنانے کی اسکیم کا پروپگنڈا کرنے لگے۔ مگر ان کا جلد ہی وہاں انتقال ہوگیا۔ بہر حال مولانا سے یہ گھنٹے بھر کی ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کا علی گڑھ آج بھی آنکھوں میں پھرتا ہے۔ ۱۹۲۸ء تک علی گڑھ میں قوم پرستی غالب تھی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کا زور رہا۔ راس مسعود اور اسمٰعیل خاں کے دور میں یہاں ایک ولولہ تھا، ایک امنگ تھی، ادبی، علمی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی ہر طرح کے افکار و میلانات

پر آزادی سے گفتگو ہوتی تھی۔ طلبا کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اساتذہ تو سوا سو کے قریب ہی ہوں گے۔ سرحد پنجاب، سندھ، حیدرآباد، آسام، بنگال کے طلبا خاصی تعداد میں آتے تھے۔ اقامتی زندگی کا ایک خاص رنگ تھا کھیلوں میں بھی خاصی دلچسپی تھی۔ یونین کے الکشن، سالانہ مباحثے، عام مباحثے باقاعدہ ہوتے تھے۔ عام طور پر اچھے مقرر یونین کے عہدہ دار ہوتے تھے۔ ہندوستان کی اکثر اہم شخصیتیں آتی رہتی تھیں۔ ۱۹۳۸ء کے بعد مسلم لیگ کا زور بڑھا۔ اب جناح صاحب اور لیگ کے دوسرے لیڈر علی گڑھ کا اکثر پھیرا کرتے۔ خوب گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ جامعہ کے کسی خاص جلسے میں یا کسی ادبی تقریب میں دہلی ضرور جاتا۔ ایک دفعہ چارلی چپلن کی تصویر GREAT DICTATOR دیکھنے بھی گیا تھا۔ میں چارلی چپلن کو صرف ایک اداکار ہی نہیں ایک بڑا فن کار بھی مانتا ہوں اس کی بہت سی فلمیں دیکھ چکا ہوں اور اس کی خود نوشت بھی پڑھی ہے۔

اوپر لکھا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں میری شادی ہوئی تھی۔ میری بیوی ماں کی طرف سے میری عزیز بھی ہوتی تھیں۔ میرے خسر میرے رشتے کے ماموں ہوتے تھے۔ رحمان بخش قادری صاحب نے سینٹ جانس کالج میں تعلیم پائی تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ نہایت نیک نام اور منتظم افسر تھے۔ جہاں رہے مقبول رہے۔ حکومت کے ایک فرد ہونے کے باوجود وہ حکومت کے پٹھو نہ تھے۔ جب سہارن پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے تو بھگت سنگھ کو پولس نے گرفتار کر لیا۔ جیسا کہ پولس کا قاعدہ ہے اُس نے اُن کے پاس سے کچھ اسلحہ بھی برآمد کر لیے جو واقعی موجود نہ تھے۔ قادری صاحب نے پولس کے بیان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ جیل میں سرکاری وزیٹر بھی تھے۔ جب بھگت سنگھ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ ہمارے ہمدرد ہیں اُن سے ایک خط باہر لے جانے کو کہا خط لے جانے سے انھوں نے انکار کر دیا مگر بھگت سنگھ کی شکایت نہ کی۔ بعد میں جب الٰہ آباد میں تھے تو چندر شیکھر آزاد ہیوٹ پارک میں پولس سے ایک مقابلے میں مارے گئے۔ کانگریس نے کریاکرم کے لیے اُن کی لاش مانگی۔ کانگریس کے لیڈر پرشوتم داس ٹنڈن اور لال بہادر شاستری چاہتے تھے کہ جلوس نکالیں اور اس کے بعد اُن کی یاد میں ایک جلسہ کریں۔ کلکٹر نے انکار کر دیا۔ اب کچہری کے گرد ایک بڑا مجمع تھا اور کلکٹر تیار تھا کہ یہ لوگ بڑھیں تو گولی چلائے۔ قادری صاحب نے کلکٹر سے کہا کہ اگر یہ لوگ وعدہ کریں کہ لاش جلوس میں نہیں لے جائی جائے گی بلکہ صرف چند آدمی کریاکرم کر دیں

گے تو بعد میں تعزیت کے جلسے کی اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں۔ کلکٹر نہ مانا۔ انھوں نے حالات بگڑتے دیکھ کر کمشنر سے بات کی۔ اُس نے قادری صاحب کی رائے کی تائید کی۔ چناں چہ انھوں نے شاستری جی سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ مجمع کو منتشر کرا دیجیے اور چند آدمی لاش کا کریاکرم کر دیں کوئی بڑا مجمع نہ ہو۔ بعد میں آپ جلسہ کر لیجیے۔ شاستری مان گئے۔ اس طرح سارا معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں یہ ریاست ٹونک کے دیوان تھے۔ نواب صاحب پاکستان سے الحاق چاہتے تھے۔ انھوں نے سمجھایا کہ آپ کی ریاست ہر طرف دوسری ریاستوں سے گھری ہوئی ہے۔ اس کا ایک حصّہ ایک دیسی ریاست کے اندر ہے اور دوسرا دوسری کے۔ پاکستان کی سرحد تو کئی سو میل کے فاصلے پر ہے آپ پاکستان سے الحاق کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ نہیں مانے تو انھوں نے کہا اچھا جناح صاحب سے مشورہ کر لیجیے۔ چنانچہ دونوں دہلی گئے اور جناح صاحب سے وقت طے ہوا۔ انھوں نے نواب صاحب کی بات سن کر قادری صاحب سے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو صورتِ حال ہے اس میں یہ کسی طرح پاکستان سے الحاق نہیں کر سکتے۔ جناح صاحب نے نواب صاحب سے کہا آپ کے دیوان نے آپ کو مناسب رائے دی ہے ان کی رائے پر عمل کیجیے۔ جب قادری صاحب الٰہ آباد میں تھے تو ان کے مکان کے قریب ہی فیروز گاندھی کا خاندان تھا۔ جواہر لال نہرو سے بھی خاصی ملاقات تھی مگر آزادی کے بعد انھوں نے کبھی ان تعلقات کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بنارس میں جب یہ کلکٹر تھے تو مشہور کانگریسی رہنما سری پرکاش سے بہت مراسم ہو گئے تھے۔ حالاں کہ دوسری جنگِ عظیم اور جنگی سرگرمیوں کا زمانہ تھا مگر قادری صاحب سب ممتاز شہریوں سے ملتے تھے اور جس کا جو کام جائز طریقے سے ہو سکتا تھا کر دیتے تھے۔ جب ۱۹۵۲ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے کراچی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے میرا تقرر کرایا تو میں نے اپنے والد اور اپنے خسر سے رائے لی۔ دونوں کی یہی رائے تھی کہ مجھے ہندوستان میں ہی رہنا چاہیے۔ قادری صاحب کا انتقال ۱۹۶۶ میں تقریباً ستّر سال کی عمر میں ہوا۔ میری بیوی اُن کی سب سے بڑی اولاد تھیں اس لیے اُن سے بہت محبت کرتے تھے اور نام تک نہیں لیتے تھے۔ بوبو کہتے تھے۔ انھوں نے تین شادیاں کیں۔ میری بیوی اور ایک سالی پہلی بیوی سے تھیں۔ دوسری سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تیسری بیوی سے دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ یہ لوگ پاکستان میں ہیں۔

۱۹۲۷ء میں میرا بڑا لڑکا پیدا ہوا۔ میرے والد نے صدیق احمد صدیقی نام رکھا۔ ۱۹۳۸ء میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ والد نے عائشہ نام تجویز کیا، میں نے مہ جبین۔ غرض عائشہ مہ جبین نام رکھا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسرا لڑکا ہوا جس کا نام جاوید احمد صدیقی ہے۔ پھر ۱۹۴۲ء میں ایک لڑکی مردہ پیدا ہوئی۔ اس کے بعد میں نے احتیاط کی کیوں کہ بیوی کی صحت پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ رشید صاحب کا مکان چونکہ قریب تھا اور ہم سب وہاں جاتے رہتے تھے اس لیے وہ ان بچوں سے بہت مانوس تھے۔ ایک دفعہ جب صدیق کوئی پانچ سال کے ہوں گے تو عید کا چاند دیکھ کر رشید صاحب کو بتانے گئے۔ انھوں نے ہنس کر کہا ہمارے یہاں تو چاند نہیں نکلا۔ صدیق نے کہا کہ چلیے ہمارے یہاں چل کر دیکھیے وہاں تو نکلا ہوا ہے۔ میں جب گھر سے نکلتا تو یہ ضرور پوچھتے کہ ابا کہاں جا رہے ہیں؟ ایک دفعہ میں نے جھلا کر کہہ دیا "جہنم میں" اس کے بعد کچھ لوگ ملنے آئے تو اُن کے دریافت کرنے پر کہ تمہارے ابا کہاں گئے ہیں انھوں نے سادگی سے کہا جہنم میں۔ یہ لطیفہ بہت دن تک دوستوں میں گشت کرتا رہا۔ رشید صاحب خاص طور سے محظوظ ہوئے تھے۔ چھوٹے لڑکے جاوید کا نام انھوں نے بگڑے دل بدایونی رکھا تھا۔ یہ حضرت کسی کے چھیڑنے پر بغیر نوٹس دیے خفا ہو جاتے تھے اور جوتا، ٹوپی، قمیص، پاجامہ اتار کر زمین پر برہنہ لوٹ لگانے لگتے تھے۔ رشید صاحب کے بچوں میں سلمیٰ میری بیوی سے بہت مانوس تھی اور اکثر آتی رہتی تھی۔ ان کی بیگم تو ہمارے گھر میں اس قدر مقبول تھیں کہ جب ایک دفعہ مہ جبین کو ٹائفائڈ ہوا تو دوا صرف بیگم رشید کے ہاتھ سے پیتی تھی۔ سامنے کے مکان میں قیصر زیدی رہتے تھے جو پرانے ساتھی اور دوست تھے۔ بعد میں یہ شعبہ تعلیم میں پروفیسر ہوئے۔ کینسر کے عارضے میں ۱۹۷۴ء میں انتقال کیا۔ میری لڑکی کی آواز بچپن میں کچھ بھاری تھی۔ جب قیصر گھر سے نکلتے تھے تو پوچھتی تھی قیصر صاحب آپ کہاں جا رہے ہیں؟ وہ اس کے ایسے سوالوں سے تنگ رہتے تھے۔ جب ۱۹۵۹ء میں مہ جبین کی شادی ہونے والی تھی تو نکاح سے پہلے قیصر نے کہا کہ میں بٹو سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری بیوی ان کو بٹو کے پاس لے گئیں۔ جا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا بٹو صاحبہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟ جب سب نے پوچھا کہ یہ کیا تو فرمایا کہ بچپن میں یہی سوال کر کے یہ مجھے پریشان کیا کرتی تھی۔ اب میری باری ہے۔ سب ہنسنے لگے۔

صدیق کو شروع سے ادب اور ادیبوں سے دلچسپی تھی۔ کرکٹ کا بھی شوق تھا۔ اس نے علی گڑھ سے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ناگپور کے ہیسلوپ کالج سے جرنلزم میں ڈپلوما کیا اور کچھ دن بعد انڈین ایکسپریس میں کام کرنے لگا۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں اس نے وہاں کے پریس کلب میں جان ڈال دی۔ جب انڈین ایکسپریس کے ایڈیٹر نے اس کی خدمات کی قدر نہ کی تو اس نے استعفا دیدیا۔ مشہور نوجوان لیڈر چندر شیکھر سے اس کی دوستی ہوگئی تھی کئی سال ان کے ہفتہ وار اخبار ینگ انڈین میں کام کیا۔ پھر چیلاپتی راؤ نے اسے نیشنل ہیرالڈ میں لے لیا۔ یہیں اس نے کانپور کے ایک مشہور لیڈر کے کارخانے میں ناقص گلوکوز کے انجکشنوں کے کاروبار کا راز فاش کیا۔ لیڈر تو ہیرالڈ پر مقدمہ چلانا چاہتے تھے مگر چیلاپتی راؤ نے اپنے نمائندے کی حمایت کی اور پھر ان کی ہمت نہ پڑی۔ کئی سال ہیرالڈ میں کام کرنے کے بعد اسے انڈین ایکسپریس میں پھر ملازمت مل گئی اور دو سال میں جب ارون شوری نے اس کی رپورٹوں کو نظرانداز کرنا شروع کیا تو پھر وہ ایکسپریس سے علیحدہ ہوگیا۔ اب اچھے اچھے اخبارات میں بھی سیاست اور گروہ بندی آگئی ہے۔ حقائق کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ ہر چیز یا سیاہ ہے یا سفید۔ سچ وہی ہے جو کچھ لوگ چاہتے ہیں یا کسی طاقتور لابی کی مصلحتوں کے مطابق ہے وہ نہیں جو واقعی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں بیوی بچوں کے ساتھ دو مہینے مسوری میں گذارے تھے۔ پھر ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں ایرانی کیمپ گیا تھا۔ جب ۱۹۷۴ء میں شملے جانا ہوا تو صدیق اور بٹو ماما اپنے بچوں کے گرمی کی چھٹی میں آجاتے تھے۔ کشمیر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ جاوید ۱۹۶۱ء کے دسمبر میں جرمنی چلا گیا تھا۔ پہلے سات برس کے بعد آیا۔ اس کے بعد تیسرے چوتھے سال پھر آکر جاتا ہے۔ جرمنی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کہتا ہے وہاں کا ضبط و نظم، کام کی لگن اور صاف ستھری زندگی اسے پسند ہے۔

علی گڑھ میں ایک اہم شخصیت شیخ عبداللہ کی تھی جو مسلم گرلس کالج کے بانی تھے۔ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ یہ کشمیری النسل تھے اور علی گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں انھوں نے مسلم گرلس اسکول کی بنیاد ڈالی۔ ان کی بیگم نے اس کام میں ان کی بڑی مدد کی تھی۔ شیخ صاحب مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ سرسید کے اثر سے ان میں بھی قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کے زمانے میں اسکول انٹر کالج اور پھر ڈگری کالج ہوگیا تھا۔ اس کی پرنسپل پہلے ان کی دوسری لڑکی خاتون عبداللہ تھیں۔ ان کی شادی ہوگئی تو ممتاز جہاں پرنسپل ہوئیں۔ ان کی شادی شعبۂ کیمسٹری کے کرنل حیدر خاں سے ہوئی تھی۔ مجھ سے ان کے خاص مراسم تھے۔ ایک دفعہ اردو کی طالبات کو کچھ لکچر دینے کے لیے انھوں نے

مجھے اپنے کالج بلایا تھا۔ صورت یہ تھی کہ میرے سامنے ایک پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے لڑکیاں تھیں۔ میں نے ممتاز جہاں سے کہا کہ اس طرح اکیلے میں لکچر کیسے دوں گا۔ کم سے کم آپ میری طرف بیٹھیے تاکہ معلوم ہو کہ میں کسی کے سامنے تو لکچر دے رہا ہوں۔ بہر حال اس طرح دو یا تین لکچر ہوئے۔ پھر شیخ صاحب کی برسی کے موقع پر میں نے اور حیدر خاں نے اسی طرح تقریریں کیں۔ آزادی کے بعد پردے کا سلسلہ ختم ہوا۔

راس مسعود صاحب کی پہلی شادی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی صاحبزادی زہرہ سے ہوئی تھی۔ شادی کے موقع پر محمد علی نے یہ مشہور مصرع دہرایا تھا: "یا پوٹش میں لگائی کرن آفتاب کی" ان سے دو لڑکے انور اور اکبر تھے۔ میاں بیوی کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں راس مسعود نے ان کو طلاق دے دی۔ کئی سال بعد ۱۹۳۳ء میں ان کی شادی کرنل عبدالرشید کی بیٹی امۃ الرشید سے ہوئی۔ یہ راس مسعود سے بہت چھوٹی تھیں۔ ۱۹۳۷ء میں راس مسعود کا انتقال ہو گیا اور بھوپال سے اُن کی لاش تدفین کے لیے علی گڑھ لائی گئی۔ امۃ الرشید جو اب امۃ المسعود تھیں کچھ عرصے بعد اپنی ساس بیگم محمود کے پاس آکر بیلی کوٹھی میں رہنے لگیں جو سرسید ہاؤس کے قریب ہے۔ یہ بہت دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ انگریزی کے علاوہ فرنچ بھی بہت اچھی جانتی تھیں۔ چناں چہ پروفیسر ایل۔ کے حیدر اکثر اپنی فرنچ کی مشق کرنے اُن کے یہاں جایا کرتے تھے۔ رشید صاحب کے یہاں بھی ان کا جانا ہوتا پھر مجھ سے بھی ملاقات ہوئی اور بہت جلد ہم دونوں کا اکثر ان کے یہاں پھیرا ہوتا۔ وہ بھی آتی رہتی تھیں۔ کچھ دن بعد راحت سعید جو نواب چھتاری کے بڑے صاحبزادے تھے ان کی طرف مائل ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں ان کی راحت سعید سے شادی ہو گئی۔ انھیں کے اثر سے راحت سعید دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فوج میں چلے گئے اور لفٹننٹ کرنل ہو گئے۔ بعد میں وہ پاکستان سدھار گئے اور وہاں کے سفیر کی خدمات بھی کئی ملکوں میں انجام دیں۔ پہلے بیوی اور پھر میاں کا پاکستان میں انتقال ہوا۔ نواب صدر یار جنگ جن کے نام مولانا آزاد کے خطوط غبارِ خاطر کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شایع ہوئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اعزازی سکریٹری تھے۔ یہ عربی فارسی کے ممتاز عالم تھے اور انھوں نے اپنے ذاتی شوق سے نادر مخطوطات کا ایک بہت اچھا ذخیرہ اپنے مستقر حبیب گنج میں جمع کیا تھا۔ شبلی سے اُن کے گہرے مراسم رہے تھے۔ یونیورسٹی

میں ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی اور اگزیکیوٹو کونسل کے ممبر بھی تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے اور حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ ذخیرہ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند ارجمند خاں بہادر عبید الرحمن خاں شروانی نے مولانا آزاد لائبریری کو دے دیا۔ کئی اہم کتابیں نواب صدر یار جنگ سے یادگار ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کا لباس نہایت خوش رنگ ہوتا تھا۔ شام کو یہ اکثر مولانا سلیمان اشرف سے ملنے اپنی فٹن میں جایا کرتے تھے۔ حبیب منزل میں اکثر ملک کے عمائدین کا قیام رہتا تھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سپرنٹنڈنٹ سید الطاف علی نے ایک ادارہ مصنف کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کے جلسے باقاعدگی سے ہر ممبر کے گھر پر ہوتے اور کوئی نہ کوئی ممبر اس میں ایک مقالہ پڑھتا جس پر بحث ہوتی۔ میں نے اس ادارے کے ایک جلسے میں اکبر اور سرسید کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ سرسید کے حرکی پیام کی اکبر نے مخالفت کی کیوں کہ وہ مشرقیت کے قدیم تصور کے دل دادہ تھے مگر اُن کی مخالفت کی وجہ سے جو طنز وظرافت کے پردے میں کی گئی تھی مغربی تعلیم، مغربی معاشرت اور مغربی سیاست میں جو خطرات تھے اُن کا احساس بھی ہوا۔ اس ادارے کی طرف سے ایک رسالہ بھی اسی نام سے نکلتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا پھر ختم ہو گیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک اکثر ریڈیو پر تقریر کے سلسلے میں دہلی جانا ہوتا تھا۔ شروع میں ریڈیو کا دفتر علی پور روڈ پر تھا۔ کئی سال بعد پارلیمنٹ اسٹریٹ پر جب نئی عمارت بن گئی تو ادھر آ گیا۔ یاد آتا ہے کہ اس زمانے میں ریڈیو پر تقریر کے تیس روپے ملتے تھے اور میں اُن روپوں میں دہلی سے بہت سے پھل، بیوی کے لیے ساری اور متفرق چیزیں لے آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے ریڈیو اسٹیشن پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ دروازے پر پہنچا تو رشید احمد اسٹیشن ڈائرکٹر نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم لوگ تقریباً دوڑتے ہوئے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے تو میرا نام اور تقریر کا عنوان نشر ہو رہا تھا۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ رشید احمد نے اشارے سے دم لینے کو کہا۔ چند سکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے بہت آہستہ تقریر شروع کی۔ دو ایک منٹ کے بعد عام رفتار سے بولنے لگا۔ شکر ہے کہ کسی کو اس کا احساس نہیں ہوا۔

میری ایک کمزوری یہ ہے کہ کبھی کبھار دبغیر نوٹس دیے) کچھ کھو جاتا ہوں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ریڈیو پر تقریر کر کے اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے انٹر کلاس میں سامان رکھا

ڈبے میں ایک شناسا ڈاکٹر شریف جو زوالوجی کے شعبے میں ریڈر تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سمجھ کر گاڑی چھوٹنے میں کچھ دیر ہے میں پلیٹ فارم پر آ گیا اور اس کے کنارے کتابوں کی دکان میں کتابیں اور رسالے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد نظر اُٹھائی تو گاڑی روانہ ہو چکی تھی اور اُس کی آخری لال بتّی دور سے نظر آ رہی تھی۔ بقول جوشؔ ؎

پٹری چمک رہی تھی گاڑی گذر چکی تھی

اب گھبرایا کہ سامان کا کیا ہوگا۔ بھاگا بھاگا اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں گیا اور اُن سے درخواست کی کہ میرا سامان انٹر کلاس میں رکھا ہوا ہے وہ علی گڑھ اسٹیشن پر اتار لیا جائے میں دوسری گاڑی سے آؤں گا۔ انھوں نے ٹال مٹول کی۔ کسی نے کہا کہ گاڑی غازی آباد آدھے گھنٹے میں پہنچے گی۔ اس عرصے میں آپ ٹیکسی یا بس سے وہاں پہنچ جائیے۔ چناں چہ باہر آ گیا اور ٹیکسی تلاش کی۔ ٹیکسی تو نہ ملی ایک خالی بس کھڑی ہوئی تھی اُس کے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے پچیس منٹ میں غازی آباد پہنچنا ہے جو کہو گے دے دوں گا۔ وہ تیار ہو گیا اور بس جس میں صرف ایک ڈرائیور اور ایک میں دو آدمی تھے غازی آباد کے لیے تیزی سے روانہ ہو گئی۔ راستے میں میں اُس سے تیز چلانے کی تاکید کرتا جاتا تھا۔ خیر، میں شہر والے پلیٹ فارم کے قریب پہنچا تو ریل گاڑی رینگنا شروع ہو گئی تھی۔ دوڑ کر جو ڈبہ سامنے آیا اُسی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو شاید پچیس روپے دیے تھے۔ اتفاق سے یہ میرا ہی ڈبہ تھا۔

رام پور

میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو رام پور پہنچا۔ دوسرے دن سیّدین صاحب کے ساتھ انٹر کالج گیا اور وہاں پرنسپل کے عہدے کا چارج لیا۔ سیّدین صاحب چند روز پہلے ہی کشمیر سے رام پور آئے تھے اور منسٹر تعلیم کے عہدے پر فائز تھے۔ میرے افسر وہی تھے۔ چارج لینے کے کچھ دن بعد کالج کے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان شروع ہوئے جو یوپی بورڈ کے تحت تھے۔ کالج کے وائس پرنسپل سید

نصیر الحسن تھے۔ میں نے اس وقت مناسب سمجھا کہ امتحانات کی ساری نگرانی کا کام انھیں کرنے دوں اور خود ہر چیز کو دیکھتا رہوں۔ شروع اپریل میں امتحانات ختم ہوئے تو میں نے ۲۱ اپریل کو یوم اقبال منانے کا فیصلہ کیا۔ ذاکر صاحب سے افتتاح کی درخواست کی جو انھوں نے قبول کرلی۔ رشید صاحب کو صدارت کے لیے لکھا اور مسعود حسین خاں سے مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ دونوں تشریف لائے۔ یوم اقبال سے ایک دن پہلے میں نے مشہور آرٹسٹ سیداوباما اور رام پور کے ایک آرٹسٹ عظمت کی تصویروں کی نمائش کا بھی انتظام کیا۔ سیداوباما نے جو ٹیگور کا پنسل اسکیچ بنایا تھا وہ غالباً لاہور میں دیکھ چکا تھا۔ رام پور میں وہ کسی معمولی سے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ جب میں نے اُن سے تصویروں کی نمائش کی فرمائش کی تو بڑے خوش ہوئے اور مختلف جگہوں سے اپنی تصویریں جمع کرکے بڑے سلیقے سے انھیں ہال میں لگایا۔ نمائش بہت پسند کی گئی۔ دو چار تصویریں فروخت بھی ہوئیں۔ یوم اقبال بھی اچھا ہوگیا۔ ذاکر صاحب نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ رشید صاحب کا خطبہ بھی دلچسپ اور پُرمغز تھا۔ میں نے اقبال کے خطوط پر مقالہ پڑھا تھا۔ اس تقریب میں مولوی عبدالسلام خاں نے بھی اقبال کے فلسفے پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ یہ مدرسہ عالیہ میں استاد تھے اور اقبال کے فلسفے پر اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ نئے تعلیمی سال میں میں نے کالج کو ایک علمی و ادبی مرکز بنانے کے لیے ہر ہفتے لکچروں کا انتظام کیا۔ سید صاحب نے اس سال ایک عوامی کالج بھی قایم کیا تھا جس کا مقصد بالغوں کی تعلیم کے علاوہ ان کے لیے تہذیبی سرگرمیوں کا انتظام کرنا اور ایک لائبریری اور ایک ریڈنگ روم قایم کرنا بھی تھا۔ میں اس کا جز وقتی ڈائرکٹر بھی تھا۔ ۱۹۴۵ء میں جے پور میں پی۔ ای۔ این کانفرنس تھی۔ میں پی۔ ای۔ این کا ممبر تھا۔ کانفرنس میں اُردو ادب کے نئے میلانات پر مقالہ پڑھنے کے لیے مجھ سے اور رشید صاحب سے علاحدہ علاحدہ فرمائش کی گئی۔ انھوں نے اپنی منظوری بھیج دی اور مجھے لکھا کہ مقالہ آپ لکھ دیں تو میں جے پور میں پڑھ دوں۔ چناں چہ میں نے اُن کے لیے مقالہ لکھا اور کانفرنس سے ایک دن پہلے جے پور کے لیے روانہ ہوگیا۔ دہلی اسٹیشن پر رشید صاحب ملے اور کہنے لگے کہ اگر آپ مقالہ لکھ کر نہ لاتے تو میں دہلی سے ہی علی گڑھ واپس چلا جاتا۔ میں نے کہا جب میں نے آپ سے وعدہ کرلیا تھا تو پھر نہ لکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ کانفرنس بڑی شاندار تھی۔ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو جو چند ماہ پہلے احمد نگر جیل سے رہا ہوئے تھے شریک تھے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور مسز نائڈو بھی

موجود تھیں۔ انگلستان سے انگریزی کے مشہور ناول نگار ای۔ ایم۔ فارسٹر بھی تشریف لائے تھے۔ مسٹر فارسٹر سے حیدرآباد میں مل چکا تھا۔ اب کے جو ملا تو میں نے انھیں بتایا کہ یوپی میں پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند اُردو کے خلاف پروپگنڈا کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تم جواہر لال نہرو کو صورتِ حال سے آگاہ کردو۔ چنانچہ اُن کے ذریعے دوسرے دن جواہر لال نہرو سے ملنے کے لیے وقت مقرر ہوا۔ رات کو مرزا اسمٰعیل دیوان ریاست جے پور اور صدر استقبالیہ کمیٹی کے یہاں دعوت تھی۔ جواہر لال نہرو کی شہر میں تقریر تھی وہ وہاں سے سیدھے کھانے پر آئے اور باتوں باتوں میں جے پور کے مجمع کی بڑی تعریف کی۔ جواہر لال نہرو نے اس جلسے میں مہارانا پرتاب کے جذبۂ آزادی کی بڑی تعریف کی تھی اور ذات پات کے امتیاز کو دور کرنے پر زور دیا تھا۔ دوسرے دن کانفرنس کے دوران پنڈت جی اٹھے اور ایک کمرے میں تشریف لے گئے۔ میں بھی گیا اور ابھی اپنا تعارف بھی نہ کرایا تھا کہ ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا کہ پنڈت جی رات کے بھاشن میں آپ نے جات بھید کی برائی کی تھی۔ وہ اپنا جملہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ پنڈت جی کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا اور انھوں نے کھڑے ہو کر اس کو ایک دھکا دیا۔ پھر بولے کیا ذات پات کی رٹ لگا رکھی ہے۔ وہ لڑکا تو ڈر کر فرار ہوگیا۔ مگر میں بہت گھبرایا کہ اس عالم میں ان سے بات کیسے ہوگی۔ مگر دیکھا تو تھوڑی دیر میں اُن کا غصہ کافور ہوگیا تھا اور وہ مسکرا رہے تھے۔ خیر میں نے یوپی میں اُردو کی صورتِ حال بیان کرنے سے پہلے اُن سے ایک سوال کیا۔ میں نے کہا سُنا ہے رات کی تقریر میں آپ نے مہارانا پرتاب کی بڑی تعریف کی تھی۔ میں بھی اُن کے جذبۂ آزادی کی بڑی قدر کرتا ہوں مگر آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ اکبر بڑا تھا یا مہارانا پرتاب۔ اکبر بہر حال ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت عطا کرنا چاہتا تھا۔ پنڈت جی تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اکبر زیادہ بڑا تھا۔ اس کے بعد میں نے چند برس سے یوپی میں اُردو کے خلاف جو مہم چلائی جا رہی تھی اس کا ذکر کیا اور کہا کہ سمپورنانند جو کانگریس کے ایک ممتاز رہنما ہیں اُردو کو "قورمے اور کباب کا آرٹ" کہتے ہیں۔ پنڈت جی اس پر بہت چونکے اور انھوں نے کہا کہ ادھر تین سال سے میں جیل میں ہوں۔ مجھے لسانی صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہے۔ بہر حال میں اپنے طور پر حالات معلوم کروں گا اور اُردو کے خلاف جو پروپگنڈہ ہو رہا ہے اُس کا جواب دوں گا۔ کانفرنس میں پروفیسر احمد شاہ

بخاری کا مقالہ "اُردو کا ادب ہمارے دور میں" بہت پسند کیا گیا۔ دوسرے مقالے جو پڑھے گئے اُن پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں کلکتے سے یوم حالی کی صدارت کی دعوت آئی۔ میں نے کلکتہ اب تک نہ دیکھا تھا۔ میرے یونیورسٹی کے ساتھی اور دوست عثمان احمد انصاری اس وقت کلکتے کے روزنامے MORNING STAR کے ایڈیٹر تھے۔ یہ عبدالرحمان صدیقی کا اخبار تھا اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا تھا۔ میں کلکتے میں عثمان احمد انصاری کا مہمان ہوا۔ اُن سے اور علی گڑھ کے محامد افضل اور احمد علی سے ملاقاتیں رہیں۔ یوم حالی کا صدارتی خطبہ میں رام پور سے چھپوا کر لے گیا تھا۔ یہ "تنقید کیا ہے" میں شامل ہے۔ کلکتے میں ایک الوداعی ڈنر میں ایک ناچ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بنگال کے مشہور رقاصوں کا تھا۔ ٹینگ کے ناچ کو خاص طور سے پسند کیا گیا تھا۔ بعد میں ان رقاصوں کو میں نے اودے شنکر کے گروپ کے ناچ میں بھی دیکھا تھا۔

واپسی میں کچھ دن پٹنے بھی ٹھہرا۔ یہاں بھی میرا لکچر تھا۔ قیام ایک دن کلیم الدین احمد کے یہاں تھا۔ پھر اختر اورینوی ملنے آئے اور انھوں نے دیکھا کہ ہم دونوں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں تو مجھے اپنے یہاں لے گئے۔ بعد میں جب بھی پٹنے جانا ہوا تو اختر اورینوی کے یہاں ہی ٹھہرا۔ اختر اورینوی پٹنہ کالج اور بعد کو پٹنہ یونیورسٹی میں اُردو کے استاد تھے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی اُن کی خاصی شہرت تھی۔ بہت اچھے خطیب بھی تھے۔ ان کی بیوی شکیلہ اختر بھی ایک ممتاز افسانہ نگار تھیں۔ دونوں میاں بیوی ہر وقت میری خاطر میں لگے رہتے تھے۔ اختر اورینوی کی وساطت سے جمیل مظہری، سید حسن اور محمد ایوب ایڈوکیٹ سے ملاقات ہوئی۔

اس سفر میں لکھنؤ سے گذرا تو اسٹیشن پر نورالحسن ہاشمی ملنے آئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے ایک ریڈر کی جگہ نکلی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس کے لیے درخواست دوں۔ کچھ دنوں بعد مولوی عبدالحق صاحب کا خط آیا کہ دلّی آکر مجھ سے مل لو۔ میں گیا تو انھوں نے کہا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر کے لیے درخواست دے دو۔ وہاں فارسی اور اُردو کا مشترک شعبہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُردو کا شعبہ الگ ہو جائے۔ لکھنؤ اُردو کا مرکز رہا ہے تم وہاں پہنچ جاؤ تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔ بہرحال میں نے درخواست دے دی۔ رام پور کا

ایک واقعہ اس موقع پر یاد آتا ہے۔ کالج میں کوئی تقریب تھی۔ شاید یوم اقبال کی۔ میں کالج سے کوئی دو میل دور مصطفےٰ لاج میں رہتا تھا۔ سائیکل پر آتا جاتا تھا۔ کالج کے لان پر شامیانہ لگ گیا تھا۔ دس بجے سے تقریب کا آغاز ہونے والا تھا۔ میں ایک گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ امید تھی کہ اس وقت تک شامیانے میں کرسیاں وغیرہ لگ چکی ہوں گی۔ جا کر دیکھا تو کرسیاں باہر ڈھیر ہیں۔ پاس ہی ہیڈ کلرک اور دو استاد کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک بھی کرسی شامیانے میں نہیں لگی ہے۔ میں نے کہا کہ اب صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے اب تک تو کرسیاں لگ جانی چاہیے تھیں۔ یہ لوگ کہنے لگے صاحب ابھی تک چپراسی نہیں آئے اسی وجہ سے کرسیاں نہیں لگیں۔ میں نے ان سے تو کچھ نہیں کہا۔ ڈھیر میں سے دو کرسیاں نکالیں اور انھیں ہاتھ میں لے کر شامیانے کے اندر لگانے چلا۔ ابھی شامیانے میں داخل ہی ہوا تھا کہ سب نے بڑھ کر میرے ہاتھ سے کرسیاں لے لیں اور دوڑ دوڑ کر لگانے لگے۔ پھر چپراسی بھی آ گئے۔ چناں چہ دس منٹ پہلے ساری کرسیاں لگ گئیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ استاد ہوں یا طالب علم یا کلرک، چپراسیوں کے انتظار میں کھڑے نہ رہتے تھے۔ خود کام کرنے لگے تھے۔

کالج میں جب ہر ہفتے لیکچر ہونے لگے، ریڈنگ روم بن گیا، طلبا کی سوسائٹی کے الکشن ہوئے، مشاعرے منعقد ہونے لگے تو شہر میں میری مقبولیت بڑھی۔ اُس زمانے میں میرے ایک دوست سجاد (آرٹسٹ) رام پور آئے ہوئے تھے۔ پورٹریٹ بہت اچھے بناتے تھے۔ میں نے ان سے کالج کے لیے اقبال کا ایک پورٹریٹ بنوایا۔ اس لیے ان کو ایسی تصویر فراہم کی گئی جس میں میرا منشا تھی کہ حلوائی کے ٹھاٹھ سے آرٹ اسکول کا جلوس ... لیا گیا تھا اور سامنے ... دیا تھا۔ عوامی کالج میں ... اقبال کو ... نے ہزاروں کے مجمع میں ... کا مظاہرہ کیا۔ عوامی کالج میں ہر ہفتے کسی نہ کسی موضوع پر لیکچر کا انتظام کیا گیا۔ یہ لیکچر رام پور کے ادیبوں اور استادوں کے ہوتے تھے۔

•

میرا معمول تھا کہ شام کو کالج سے واپس آ کر ٹہلتا ہوا زبیری صاحب یا سیدین صاحب کے یہاں چلا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے رام پور کے کئی پھیرے ہوئے۔ ایک شام کو میں نکلنے کی تیاری کر چکا تھا کہ دیکھا ڈاکٹر صاحب چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا: میں تو آپ ہی کی

طرف آ رہا تھا۔ کہنے لگے میں گھبرا کر سید بن صاحب کے یہاں سے نکل بھاگا ہوں۔ زیدی صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ بھابھی (بیگم قدسیہ زیدی) بھی موجود نہیں۔ سید بن صاحب کے یہاں اور تو ہر طرح کا آرام ہے مگر بات صرف افلاک کی ہوتی ہے۔ سوچا آپ کے یہاں چل کر ذرا گپ شپ ہوگی۔ رام پور میں امتیاز علی خاں عرشی سے اکثر ملنا ہوتا۔ یہ بہت اچھے اسکالر تو ہیں ہی مگر لائبریری سے اُن کا عشق بھی بہت گہرا ہے۔ شاعری بھی کبھی کبھار کر لیتے ہیں مگر مشاعروں میں نہیں جاتے۔ کالج میں خلیل اللہ فریدی جغرافیہ کے، حسن عادل اکنامکس کے، کیلاش چندر سکسینہ سنگیت کے استاد یاد آتے ہیں۔ کیلاش چندر بعد میں آل انڈیا ریڈیو چلے گئے اور برہسپتی کے نام سے مشہور ہوئے۔ موسیقی کے ماہر تھے۔ قرآن شریف کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

جب ۱۹۴۶ء میں سالانہ امتحان قریب آئے تو میں نے نقل کے امکانات ختم کرنے کے لیے خاص انتظامات کیے۔ احمد رضا خاں فزکس کے استاد کو پراکٹر مقرر کیا۔ شہر کے لوگوں کا کالج کے دروازے پر کوئی ہجوم نہ ہونے دیا۔ پہلے ہی دن کوئی ایک گھنٹہ بعد ایک استاد گھبرائے ہوئے آئے کہ ایک کمرے میں میجر فاروق نقل کر رہے ہیں۔ یہ نواب صاحب کے اے۔ ڈی۔ سی تھے۔ نواب صاحب کی ہدایت پر ہائی اسکول کا امتحان دے رہے تھے۔ دو مہینے پہلے مجھ سے ملے تھے اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ سائنس کی تعلیم کے لیے ٹیوشن کا انتظام کرا دوں۔ میں نے کرا دیا تھا۔ اب اس کمرے میں جاتے ہوئے میں نے استاد سے پوچھا کہ تم نے انھیں نقل کرنے سے منع کیوں نہیں کیا؟ کہنے لگے میں نے منع کیا مگر وہ میری سنتے نہیں۔ میں نے کہا تو پھر ان کی کاپی چھین کر رپورٹ کی ہوتی۔ بولے کہ حضور میں رام پور کا ہوں۔ نواب صاحب میرا گھر کھدوا دیں گے۔ خیر! میں کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ حضرت میجر کی یونیفارم میں تھے۔ میں نے اُن کی ٹوپی اٹھائی تو اس میں ایک کاغذ تھا۔ انھوں نے کاغذ نہایت پھرتی سے میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے کہا کاغذ میرے حوالے کر دو ورنہ تمھاری خیر نہیں۔ انھوں نے کہا میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر میں نے اُن سے امتحان کی کاپی لے کر دوسری کاپی دے دی اور دونوں نگرانوں کو بلا کر ان سے رپورٹ لی۔ رپورٹ میں دونوں نے علیحدہ علیحدہ یہی لکھا تھا کہ یہ ایک کاغذ سے نقل کر رہے تھے اور منع کرنے کے باوجود انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بہرحال میں تو اپنے کمرے میں آ گیا۔ امتحان

ختم ہونے کے بعد جب میں سارے امتحان کی کاپیوں کا حساب کر رہا تھا تو یہ بغیر اجازت میرے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھ سے ناشائستگی سے پوچھا کہ میری کاپی کیوں چھین لی گئی۔ میں نے اُن سے کہا آپ کمرے سے تشریف لے جائیں اور مجھ سے ملنا ہو تو وقت لے کر ملیں۔ آپ کے خلاف ضابطے کے مطابق کارروائی ہوگی۔ یہ چلے گئے۔ دوپہر کو میں کھانا کھانے ایک گھنٹے کے لیے گھر آتا تھا اور دوسرے دور کے امتحان کے لیے آدھے گھنٹے پہلے کالج پہنچ جاتا تھا۔ میں جانے والا ہی تھا کہ سیدین صاحب آئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ نواب صاحب نے اپنے ہی محکمۂ تعلیم کے خلاف چارہ جوئی کی دھمکی دی ہے کیوں کہ اُن کے اے۔ڈی۔سی پر پرنسپل نے بے جا الزام نقل کرنے کا لگایا ہے۔ میں نے کہا کہ سیدین صاحب اس وقت تو مجھے جا کر امتحان کرانا ہے آپ سے شام کو بات ہوگی لیکن میں ایسی جگہ ہرگز نہ رہوں گا جہاں صاحبِ اقتدار حضرات قانون کی زد سے باہر ہوں اور اس کا اطلاق صرف غریب اور کم حیثیت طلبا پر ہی ہو۔ انھوں نے کہا: آپ کے جانے کا کیا سوال ہے۔ اگر یہ سوال اٹھا تو پہلے میں جاؤں گا۔ اچھا شام کو بات ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ تو اپنی کار میں روانہ ہو گئے اور میں کالج روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد زیدی صاحب کا فون آیا اور انھوں نے صورتِ حال دریافت کی۔ میں نے اُن سے بھی یہی عرض کیا کہ شام کو آؤں گا تو بات ہوگی۔ کچھ دیر بعد بھابی قدسیہ نے فون کیا اور کہا کہ آپ کب آ رہے ہیں یہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ غرض امتحان سے فراغت کے بعد میں زیدی صاحب کے یہاں پہنچا۔ وہاں زیدی صاحب، سیدین صاحب اور بھابی قدسیہ کے علاوہ نواب صاحب کے بھائی جو منجھلے صاحب کہلاتے تھے موجود تھے۔ میں نے بے کم و کاست پوری حقیقت بیان کی۔ پھر زیدی صاحب سے کہا کہ نواب صاحب کو یہ بتا دیجیے کہ ریاست میں تعلیم کا فروغ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ سب کے ساتھ ایک سا سلوک ہو۔ زیدی صاحب مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے نواب صاحب کو سمجھایا کہ سرور صاحب نے جو کیا ہے وہ درست ہے۔ اُن سے باز پرس کرنے کے بجائے اُن کی اور تعریف کرنی چاہیے۔ شہر میں کوئی دن تک اس واقعے کا چرچا رہا۔ غرض نواب صاحب ناخوش ہو گئے۔ پھر فاروق کو میری رپورٹ پر مزید دو سال تک امتحان دینے سے روک دیا گیا۔

رام پور میں ہز ہائی نس سے ملنے کے لیے وہاں کی رسم کے مطابق دستار باندھنی پڑتی تھی۔

جب دربار ہوتا تو ہر افسر اور کارکن کو نذر بھی پیش کرنی ہوتی تھی۔ نواب صاحب صرف اشرفی پر ہاتھ رکھ دیتے تھے گویا نذر قبول ہو گئی۔ محرّم بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ سب افسروں اور کارکنوں کو قلعے میں جانا پڑتا اور جب تک ماتمی جلوس قلعے سے نہ نکلتا ساتھ رہنا پڑتا تھا۔

نواب رضا علی خاں کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی، خود ماہرِ فن تھے اور ماہرینِ فن کی بڑی قدر کرتے تھے، سلیم اختر کے بہت قائل تھے۔ ان کے والد نواب حامد علی خاں کے بہت سے قصے مشہور تھے۔ ان کے اوقات، مہمان نوازی، اُن کی فیاضی، اُن کی حسن پرستی، اُن کی سخت گیری سب کے چرچے عام تھے۔ زیدی صاحب نے اُن کا ایک قصہ سنایا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈا پانی پیتے تھے۔ اس کے لیے برف کا خاص اہتمام سے ذخیرہ کیا جاتا۔ پانی مانگتے تو ایک ملازم جو حضوری میں ہوتا، دوسرے کو اشارہ کرتا، دوسرا تیسرے کو، اس طرح کئی مرحلوں سے گذرنے کے بعد آبِ خاصہ میسر آتا۔ تربوز کے بہت شوقین تھے۔ دربار رات کو ہوتا تھا۔ صبح سے دوپہر تک آرام کرتے تھے۔ ریاست میں تعلیم اور صنعت و حرفت کی طرف توجہ زیدی صاحب کے اثر سے، رضا علی خاں کے زمانے میں شروع ہوئی۔

رام پور کے پٹھان بڑے مخلص ہوتے ہیں۔ میرا قیام رام پور میں بہت مختصر رہا مگر وہاں میری بڑی پذیرائی ہوئی۔ یہ لوگ خلوص کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ مزاج میں کچھ اکھڑپن ہے مگر بڑی محبت کرنے والے، بڑے مہمان نواز اور بڑے دل والے لوگ ہیں۔ بدقسمتی سے یہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ شہر سے باہر ایک چھوٹا سا طبقہ جدید خیالات والوں کا تھا۔ ان لوگوں کے یہاں پردے کا رواج نہ تھا مگر شہر میں وہی پرانا ڈھرا تھا۔ عورتوں کی تعلیم کی طرف حکومت نے توجہ کی تھی مگر عورتوں میں شرحِ خواندگی خاصی کم تھی۔ زیدی صاحب نے رام پور کی شکل بدل دی تھی۔ اسٹیشن کے سامنے کا علاقہ بڑا خوبصورت تھا۔ بڑی سڑکیں کشادہ اور ہموار تھیں۔ شہر میں یہ بات نہ تھی۔ ریاست چھوٹی سی تھی۔ زندگی کا محور نواب صاحب اور ان کا دربار تھا۔ زیدی صاحب کی کوشش سے کئی صنعتی ادارے بھی قائم ہو گئے تھے جن کی وجہ سے ریاست کی آمدنی بھی بڑھی تھی اور کچھ لوگوں کو روزگار بھی ملا تھا۔ میری ملاقات زیادہ تر عرشی صاحب، واجد علی خاں رشک، مولوی عبدالسلام کرنل عطاء الرحمٰن (جو اقبال کے شاگرد رہے تھے) سے رہتی تھیں۔ زیدی صاحب اور سید حسن صاحب

کے یہاں تو اکثر پھیرا ہوتا۔ بیگم قدسیہ زیدی بڑی دل نواز شخصیت کی مالک تھیں۔ انھیں ادب سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ سنسکرت کے کلاسکس کا اردو میں ترجمہ انھوں نے رام پور میں ہی شروع کردیا تھا۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے ایک دوست محمد سجاد آرٹسٹ بھی رام پور میں تھے۔ یہ پورٹریٹ بہت اچھے بناتے تھے۔ سوز خوانی بھی سیکھ رہے تھے۔ شام کو میں کچھ دوستوں کے ساتھ کئی میل ٹہلا کرتا تھا۔ دن کا وقت زیادہ تر کالج ہی میں گذرتا تھا۔ طلبا کے لیے میں نے جو ریڈنگ روم قایم کیا تھا اس میں اخبار اور رسالے خاصی تعداد میں آتے تھے۔ لائبریرین کو تاکید تھی کہ طلبا کسی رسالے سے کوئی تصویر نہ کاٹیں۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے کوئی تصویر کاٹ لی۔ لائبریرین نے دیکھ لیا اور ذرا درشت لہجے میں باز پرس کی۔ رام پور میں طبقاتی شعور بہت بڑھا ہوا تھا۔ طالب علم اس بات پر برافروختہ ہوگیا کہ ایک کلرک اس کی توہین کر رہا ہے۔ اس نے اسے ایک چانٹا (رام پور میں اسے چانٹا کہتے ہیں) رسید کیا۔ اس نے آکر مجھ سے شکایت کی۔ میں نے اس طالب علم کو بلایا تو شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے لائبریرین کی شکایت کی کہ اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی۔ اس پر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے پوری تحقیقات کرنے کے بعد اس طالب علم کو بلایا اور اس سے کہا یا تو تمھارا نام تین مہینے کے لیے خارج کیا جائے گا یا پچاس روپے جرمانہ ہوگا (میں نے یہ حساب لگا لیا تھا کہ تین مہینے کے اخراج کے باوجود وہ امتحان میں بیٹھ سکے گا) اب تم خود فیصلہ کرو کہ تمھیں کیا سزا دی جائے۔ اب اس کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چونکہ طالب علم غریب تھا اور جرمانے کی رقم ادا کرنا اس کے والدین کے لیے مشکل ہوتا اس لیے میں نے اس کا نام تین مہینے کے لیے رجسٹر سے کاٹ دیا۔ جب میں رام پور سے جانے لگا تو یہی طالب علم طلبا کے اس جلوس کا لیڈر تھا جو مجھے الوداع کہنے آیا تھا اور اس نے میری تعریف میں بڑا جذباتی قسم کا سپاس نامہ پڑھا تھا۔ اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ میں نظم و ضبط پر اصرار کرنے کے ساتھ اس کا ہمدرد بھی ہوں۔

اس زمانے میں جامعہ کی جوبلی کی تیاری کے سلسلے میں ذاکر صاحب کئی دفعہ رام پور آئے۔ جوبلی کے لیے چندہ کی ایک مہم چلائی گئی۔ ذاکر صاحب کی کئی تقریریں اس سلسلے میں ہوئیں۔ میں نے خاص بات یہ دیکھی کہ ذاکر صاحب جامعہ کے مقاصد کا ذکر زیادہ کرتے تھے چندے پر اتنا زور نہ دیتے

سکتے بلکہ اصرار اس بات پر تھا کہ رام پور کے لوگوں کا اس کام میں تعاون ہونا چاہیے خواہ کسی صورت میں ہو۔ جلسوں اور تقریروں کے بعد مل بیٹھتے تو دنیا جہان کی باتیں ہوتیں۔ کچھ لوگ ایسے موقعوں پر خود ہی انداز گل افشانیِ گفتار دکھاتے ہیں۔ دوسروں کی حیثیت صرف سامعین کی ہوتی ہے۔ ان صحبتوں میں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ذاکر صاحب ہی مرکز توجہ رہنا چاہتے ہیں۔ بات چیت میں سبھی شریک ہوتے۔ لطیفے بھی سنائے جاتے، سنجیدہ علمی گفتگو بھی ہوتی، اسی کے ساتھ مزاح المومنین کا بھی سلسلہ جاری رہتا۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ ذاکر صاحب کے ساتھ ٹہلنے کا موقع بھی مل جاتا۔ ایسی ہی ایک صحبت میں میں نے ان سے کہا کہ رام پور میں دراصل میرے قدرداں زیدی صاحب اور سیدین صاحب ہیں۔ سیدین صاحب تو ابھی سے باہر جانے کے لیے پر تول رہے ہیں، زیدی صاحب بیماری کے بعد کشمیر چلے گئے افواہ یہ ہے کہ شاید وہ واپس نہ آئیں۔ اس صورت میں میرا رام پور میں مزید قیام شاید مناسب نہ ہو۔ بہر حال یہ ایک ریاست ہے اور ریاستوں میں سازشیں بہت ہوتی ہیں۔ سوچتا ہوں علی گڑھ واپس چلا جاؤں۔ ذاکر صاحب نے بے ساختہ کہا، سرور صاحب کسی کی مدد پر تکیہ نہ کیجیے اپنے لیے سازگار ماحول خود پیدا کیجیے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ یہاں اچھا کام کر رہے ہیں اور آپ کے کام کی رام پور والے قدر کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے آپ کو انتظامی کاموں کا بھی تجربہ ہو جائے گا اور قدر کرنے والے بھی نکل آئیں گے۔ آپ کے ذوق کی کوئی جگہ نکلے تو وہاں چلے جائیے گا مگر فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہوا یہ کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر کے عہدے پر میرا انتخاب ہوگیا۔ شروع اگست میں اطلاع ملی اور میں نے ۲۰/ اگست کو رام پور سے روانگی کی ٹھان لی۔ زیدی صاحب نے اصرار کیا کہ نواب صاحب سے مل کر جاؤ۔ چنانچہ نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے تو میجر فاروقی کی وجہ سے مجھ سے بہت خفا تھے مگر اب بہت اصرار کیا کہ مت جاؤ۔ میں انٹر کالج کو ڈگری کالج بنا دوں گا۔ تم جیسے لوگوں کی مجھے ضرورت ہے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ان سے اجازت لی اور دوسرے دن دوپہر کو لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اسٹیشن پر طلبا اور اساتذہ کا بڑا ہجوم تھا۔ کچھ لوگ بریلی تک ساتھ آئے تھے۔

لکھنؤ

(۲۱ اگست ۱۹۴۶ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۵۵ء تک)

لکھنؤ پہنچ کر میں نے دوسرے دن ہی شعبۂ اردو و فارسی میں اردو کے ریڈر کا چارج لے لیا۔ مسعود حسن رضوی صدر شعبہ تھے وہ میرے آنے سے کچھ خوش نہیں معلوم ہوئے۔ احتشام حسین بھی اسی جگہ کے امیدوار تھے۔ ان سے پہلے سے ملاقات تھی۔ وہ اچھی طرح ملے۔ نورالحسن ہاشمی تو میرے آنے سے بہت خوش تھے۔ شعبہ میں اس وقت عبدالقوی فانی اور یوسف حسین موسوی فارسی میں لکچرر تھے۔ احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی، اور محمد تقی اردو میں لکچرر تھے۔ محمد تقی نیک آدمی تھے جوانی میں انتقال کر گئے۔ یہ سابق لکچرر سید محمد حسین کے صاحبزادے تھے۔ مسعود صاحب کا کمرہ الگ تھا۔ ایک دوسرے کمرے میں ہم سب بیٹھتے تھے۔ پہلے چند روز فانی صاحب اور موسوی صاحب دونوں مسعود حسن رضوی صاحب کو میرے سامنے برا بھلا کہتے رہے وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح میں ان کے قریب ہو جاؤں گا مگر دو تین دن ان کی کتھا سننے کے بعد میں نے کہہ دیا کہ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ مجھے مسعود صاحب کے خلاف کوئی محاذ بنانا ہے وہ جو صحیح بات کریں گے میں اس کی تائید کروں گا۔ غلط بات ہوگی تو ضرور اختلاف کروں گا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

اس زمانے میں ایم۔ اے اردو میں چھ سات طالب علم تھے۔ ہاں بی۔ اے کے ہر کلاس میں سو سے اوپر طلبا ہوتے تھے اور ان میں غیر مسلم طلبا کی تعداد بھی قابل لحاظ ہوتی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد غیر مسلم طلبا بہت کم ہو گئے مگر بی۔ اے میں کچھ پھر بھی آجاتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں اس وقت ممتاز اساتذہ کی خاصی تعداد تھی۔ شعبۂ عربی میں وحید مرزا اور ڈاکٹر عبدالعلیم تھے۔ مسعود حسن رضوی صاحب اردو کے مشہور محقق اور ادیب کی حیثیت سے اردو دنیا میں ایک جانی مانی شخصیت تھے۔ اکنامکس میں ڈی۔ پی مکرجی تھے۔ انتھروپالوجی میں ڈی۔ این مجمدار تھے۔ انگریزی میں

پروفیسر سعادت اور سرشتیت تھے۔ بوٹنی میں بیربل ساہنی، فزکس میں ولی محمد، زوالوجی میں بہل، جیالوجی میں مصرا، ریاضی میں اے۔ این۔ سنگھ اور رام دھر مصرا، لا میں آریوسنگھ اور وسیم صاحب کے صاحبزادے محمد نسیم، فلاسفی میں احمد شاہ اور کالی پرشاد۔ وائس چانسلر ایک تعلقہ دار بشیشر دیال سیٹھ تھے۔ استاد عام طور پر اُن کے مخالف تھے۔ طلبا میں محمد حسن اس سال ایم۔ اے فائنل میں تھے۔ بی۔ اے میں آل حسن بھی تھے جو بعد میں ریڈیو کے اناؤنسر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور بی۔ بی سی میں بہت مقبول رہے۔ حنیف فوق جواب کراچی یونیورسٹی میں ہیں بی۔ اے فائنل میں تھے۔ اساتذہ میں عربی اور اسلامک اسٹڈیز میں شمشیر بہادر صمدی تھے۔ میرے آنے کے کچھ دن بعد احسن فاروقی کا بھی تقرر شعبہ انگریزی میں ہوا تھا۔ میں بیئررڈ پر رہتا تھا یہ لال باغ میں ہے۔ اُس زمانے میں شام کو بلاناغہ ٹہلنے جایا کرتا تھا اکثر فاروقی اور صمدی بھی ساتھ ہوتے۔ چند ماہ بعد جامعہ کی جوبلی ہوئی۔ اس میں لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالعلیم، نورالحسن ہاشمی اور میں نے شرکت کی تھی۔ میں نے "تنقید کیا ہے" کے عنوان سے مجلس مقالات میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔ جوبلی بڑی شاندار ہوئی تھی۔ اس میں جواہر لال نہرو، محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، راج گوپال اچاری نے بھی شرکت کی تھی، نواب بھوپال صدرِ جلسہ تھے۔ ذاکر صاحب نے جو رپورٹ پڑھی تھی وہ خاصے کی چیز تھی۔ اسے سن کر حاضرین میں سے بہت سوں کی آنکھیں پرنم ہوگئی تھیں۔ شیخ عبدالقادر، بطرس بخاری، محمد دین تاثیر کو بھی اس جلسے میں دیکھا۔ میں جلسے کے دوسرے دن مولانا آزاد سے ملنے عبدالشاہد شروانی کے ساتھ اُن کے دولت کدے پر گیا تھا۔ اس دن مولانا میری طرف زیادہ ملتفت نہ ہوئے، شاہد خاں شروانی سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے اُن سے یہ دریافت کیا کہ آپ نے غلام رسول مہر کی کتاب 'غالب' پر جو حواشی لکھے ہیں ان میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ سرسید کے انتقال سے چند روز پہلے بمبئی اخبار کو ایک خط ان کے خلاف بھیجا گیا تھا جس پر حالی کے بھی دستخط تھے۔ خط شایع ہونے سے پہلے ہی سرسید کا انتقال ہوگیا اس لیے اس کی اشاعت روک دی گئی اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ یہ بات اُس زمانے کے اخباروں میں آئی تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے ہم لوگ مولانا کے پاس بیٹھے رہے۔ یاد آتا ہے کہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کے متعلق دریافت کیا تھا کہ وہ آئے یا نہیں۔ دہلی میں جوبلی سے چند روز

پہلے فسادات ہو گئے تھے مگر جامعہ کی جوبلی کی ساری تقریبات بخیر وخوبی انجام پائیں۔

لکھنؤ آکر میں نے یہاں کے ادیبوں سے ملاقات کی۔ اثر صاحب سے تو پہلے ہی ملاقات ہو چکی تھی۔ آنند نرائن ملا سے ملا اور جلد ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ وہ اکثر میرے یہاں آجاتے تھے۔ ان کے ساتھ میرزا احسن عسکری سے ملنے گیا اور انھیں کے یہاں حضرت صفی لکھنوی سے بھی ملا اور ان کا کلام سنا۔ میرے پڑوس میں ڈاکٹر رشید جہاں بھی رہتی تھیں۔ ان سے اور محمود الظفر سے اکثر ملنا ہوتا۔ رشید جہاں بھی بے تکلفی سے گھر پر آجاتی تھیں۔ محمود الظفر سنجیدہ آدمی تھے۔ کچھ انگریزوں کی سی کم گوئی بھی ان میں تھی۔ مگر رشید جہاں کی شخصیت میں بڑی کشش تھی نہایت صاف گو مگر بڑی محبت کرنے والی۔ ان سے سیاسی مسائل پر اکثر بحث ہوتی مگر تعلقات کبھی مجروح نہیں ہوئے۔ نسیم بھی ڈاکٹر تھے اور شعر وادب کے دلدادہ۔ وحید الدین سلیم ان کے والد کے دوست تھے۔ نسیم، سلیم صاحب کے قصے بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں شام کی چہل قدمی کے بعد میں کافی ہاؤس اکثر جاتا تھا۔ وہاں یونیورسٹی کے استاد، ہندی اردو کے ادیب، ممتاز طلبا، سیاسی کارکن سبھی آیا کرتے تھے۔ یہیں بھگوتی چرن ورما، یشپال اور امرت لال ناگر سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب ہندی کے ممتاز ادیب تھے۔ احتشام کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ وہ شام کو دانش محل میں بیٹھتے تھے۔ ہاں مجاز اور سلام مچھلی شہری کافی ہاؤس آتے۔ ڈاکٹر علیم تو اس قدر پابندی سے آتے تھے کہ اگر بارش ہوتی تو چھتری لے کر آتے۔

میں نے آنے کے چند ماہ بعد فیکلٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ اردو کا شعبہ فارسی سے الگ کر دیا جائے۔ مسعود صاحب اس کے مخالف تھے۔ مگر فیکلٹی اور پھر اکیڈمک کونسل میں یہ تجویز منظور ہو گئی۔ اکیڈمک کونسل نے اردو کا الگ بورڈ آف اسٹڈیز بھی بنا دیا۔ جس کے لیے باہر سے میں نے رشید صاحب اور قاضی عبد الغفار کا نام تجویز کیا۔ مگر شعبہ کی علیحدگی ناسازگار حالات کی وجہ سے اگزیکیوٹو کونسل سے منظور نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۷ء آ گیا تھا اور فضا مکدر تھی۔

اس زمانے میں کافی ہاؤس میں چیلاپتی راؤ سے ملاقات ہوئی۔ یہ نیشنل ہیرالڈ کے اڈیٹر تھے۔ گلا مستقل خراب رہتا تھا اس لیے ان کی بات کم سمجھ میں آتی۔ ان کے اداریے بڑے شاندار ہوتے تھے۔ ڈی۔ پی۔ مکرجی اور علیم صاحب سے ان کے بڑے مراسم تھے۔ رفتہ رفتہ مجھ سے بھی ربط ضبط

بڑھ گیا۔ نوجوان اُستادوں میں انگریزی کے شیام کرشن نرائن اور جوہری اکنامکس کے ویر بہادر اور نصیر احمد خاں، "تاریخ کے گشن" چندسری واستو، سیاسیات کے نوبہار سے اکثر ملنا ہوتا۔ کافی ہاؤس میں ایک سینئر ڈاکٹر مصرا پابندی سے آتے یگردی کرتے تھے۔ ان سے جلد ربط ضبط ہو گیا۔ حضرت گنج میں انگریزی کی کتابوں کی دو اچھی دکانیں تھیں۔ کافی ہاؤس جاتے ہوئے ان میں جھانک لیتا اور کوئی کتاب پسند آتی تو خرید لیتا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میرے گھر پر ہونے لگے تھے۔ یہ ہر اتوار کو پابندی سے ہوتے تھے اور ان کا سلسلہ پانچ چھ برس جاری رہا۔ ان جلسوں میں اُردو اور ہندی کے ادیبوں کے علاوہ اکثر باہر سے کوئی نہ کوئی ادیب بھی شریک ہوتا۔ عام طور پر پچیس، تیس کی تعداد میں لوگ شرکت کرتے تھے۔ ایک مقالہ پڑھا جاتا پھر اس پر بحث ہوتی۔ شوکت صدیقی، رضیہ سجاد ظہیر، محمد حسن، منظر سلیم، ویر بہادر، احتشام حسین، علیم صاحب، رشید جہاں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ کبھی کبھار افسانے بھی پڑھے جاتے اور نظمیں بھی۔ اس زمانے میں رام بلاس شرما انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے۔ وہ بھی کئی دفعہ آئے۔ عجیب زمانہ تھا۔ کیا کیا بحثیں ہوتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا انقلاب آنے ہی والا ہے۔

۱۹۴۷ء کی گرمی کی تعطیل میں، میں بدایوں آیا۔ صدیق کو ملیریا ہو گیا تھا۔ کئی ہفتے اس کی تیمارداری میں گذرے۔ بدایوں میں دیہات میں فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ ۳ر جون کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہو گیا تھا۔ جواہر لال نہرو اور جناح صاحب کی تقریریں ریڈیو پر سنیں۔ شروع جولائی میں چند روز کے لیے دلی گیا۔ قیام علی گڑھ کے دوست قیصر حسین زیدی کے یہاں قرول باغ میں تھا۔ یہ علی گڑھ سے چھٹی لے کر کتابی دنیا کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ چلا رہے تھے۔ حسب معمول ذاکر صاحب سے ملنے جامعہ گیا۔ میں پہنچا تو اس وقت گاندھی جی واپس جا رہے تھے۔ ذاکر صاحب اور شفیق الرحمٰن قدوائی سے ملاقات ہوئی۔ انھیں میں نے وہ اشعار سنائے جو پاکستان کے متعلق لکھے تھے اور جو "ذوقِ جنوں" میں "ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں" کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں۔ شام کو بس سے فوّارہ پہنچا تاکہ وہاں قرول باغ کے لیے دوسری بس لے لوں۔ فوّارہ پر بہت ہجوم تھا۔ دلی میں پنجاب سے بہت شرنارتھی آ گئے تھے۔ سب غیظ و غضب کے عالم میں تھے۔ ذرا سی بات پر لڑنے کو تیار۔ میں بش شرٹ اور پتلون پہنے

ہوئے تھا اس لیے یہ مجھے ہندو سمجھے۔ مسلمانوں کو خوب برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ایک پولس والا دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ٹکٹ نہیں لیا تھا بس اس پر ان لوگوں نے شور مچایا کہ اسے نکالو ورنہ بس نہیں چلنے دیں گے۔ میں نے اتنا کہا تھا کہ بھائی جھگڑا نہ کرو۔ اس پر وہ لوگ میرے سر ہو گئے کہنے لگے تم کون ہوتے ہو ہمیں سمجھانے والے ہم تمھاری بھی خبر لیں گے۔ میں خاموش ہو گیا۔ کسی طرح بس قرول باغ پہنچی۔ قیصر پریشان باہر ٹہل رہے تھے۔ دوسرے دن میں بدایوں واپس آگیا اور وہاں سے چند روز بعد لکھنؤ۔ قیصر بے چارے پر بعد میں بہت بری گذری۔ قرول باغ پر حملہ ہوا۔ یہ لوگ وہاں سے رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی پر پناہ لینے پہنچے۔ کچھ دن وہاں قیام کرنے کے بعد اظہر عباس کے یہاں گئے جو دہلی میں ملازم تھے۔ جب لوٹ مار اور مارکاٹ کا سلسلہ بڑھا تو سب لوگ ایک پڑوسی سکھ کے یہاں منتقل ہو گئے۔ اس بھلے آدمی نے اپنی جان پر کھیل کر ان کی حفاظت کی مگر اظہر عباس کا گھر لٹ گیا۔

لکھنؤ میں میرے قریب غلام حسن بٹ رہتے تھے جو لکھنؤ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ یہ مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ لکھنؤ میں جب شرنارتھی آئے تو گو عام طور پر گڑبڑ نہیں ہوئی مگر اکا دکا واقعات پرانے شہر میں ہو گئے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے مکان پر ایک خاص قسم کا نشان بنا ہوا ہے۔ پڑوس میں کئی مسلمانوں کے مکانات تھے ان پر بھی اسی قسم کا نشان تھا۔ مگر اس علاقے میں ہندوؤں اور عیسائیوں کے مکانوں پر نہ تھا۔ میں بٹ صاحب کے پاس گیا۔ ان کے مکان پر بھی یہ نشان تھا۔ انھوں نے فوراً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے رابطہ قایم کیا اور رات کو ہمارے علاقے میں پولس لاریوں میں ہر گھنٹے دو گھنٹے کے وقفے سے گذرنے لگی۔ جو لوگ پنجاب سے لٹ لٹا کر آئے تھے وہ غصے میں تھے۔ ان میں سے بعض نے شہر کے ہندوؤں کو اکسایا مگر لکھنؤ والے اپنی روایتی صلح پسندی پر قایم رہے۔ ایک مورتی رأتوں رات دریافت بھی ہوئی اور کئی دن اس کے گرد خاصا مجمع ہوا مگر پولس نے سخت کارروائی کر کے لوگوں کو منتشر کر دیا۔

اُس زمانے میں میرے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہر اتوار کو ہوتے ہی تھے۔ فساد کے خطرے کی وجہ سے طے ہوا کہ مختلف علاقوں میں ہمارے والنٹیر بھی جا کر لوگوں کو رواداری قایم رکھنے کی تلقین کریں۔ ایسا ہی ایک جلسہ ہو رہا تھا کہ پڑوس میں کچھ شور ہوا۔ میرا لڑکا صدیق جو اس

وقت دس برس کا ہوگا دیکھنے گیا۔ معلوم ہوا ہمارے مکان کی طرف سے کسی نے ایک اینٹ اُس گھر میں پھینکی تھی۔ مکان میں ایک سردار جی رہتے تھے۔ اُن کے کئی لڑکے پنجاب میں مارے گئے تھے۔ ایک بچا تھا جو بخار میں مبتلا تھا اسی کے قریب اینٹ آ کر گری تھی۔ سردار جی بہت برافروختہ تھے۔ صدیق چونکہ وہاں جاتا رہتا تھا اس لیے اس نے بتایا کہ اینٹ کسی لڑکے نے ضرور پھینکی ہے مگر وہ ہمارے یہاں کا نہیں ہے۔ ایک جلسہ ہو رہا ہے اس میں کچھ لوگ باہر سے آئے ہیں اور اُن کے ساتھ بچے بھی ہیں انھیں کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ صدیق کے کہنے سے سردار جی مان گئے اور انھوں نے صرف اتنا کہا: بیٹے ایسے لڑکوں کو اپنے گھر آنے دیا کرو۔ چونکہ صدیق ان سے برابر ملتا رہتا تھا اس لیے سردار جی کو اس کی بات پر یقین آگیا اور معاملہ یہیں ختم ہو گیا ورنہ نہ معلوم کیا صورت اختیار کرتا۔ بہرحال صدیق کا ہر خطرے کا مقابلہ کر کے فضا کو ہموار کرنا یاد رہے گا۔

اخبارات سے دہلی اور پنجاب میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کی خبریں آرہی تھیں۔ لکھنؤ والے اپنی وضع پر قایم رہے۔ ایک پرانے وثیقہ دار جو نواب صاحب کہلاتے تھے اور شاید دس بیس روپیہ وثیقہ پاتے تھے دودھ لینے گئے۔ حلوائی نے ان سے پوچھا نواب صاحب تم پاکستان نہیں گئے۔ مفلوک الحال نواب صاحب بہت خفا ہوئے۔ کہنے لگے یہ تم اپنا ہندوستان، پاکستان الگ رکھو۔ یہ لکھنؤ ہے لکھنؤ۔ یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ جو شرنارتھی پنجاب سے آئے تھے ان میں سے کسی کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ ان کے بچے شیشے کی نلکیوں میں لیمن ڈراپ ایک ایک دو دو آنے میں بیچتے تھے۔ بڑوں نے امین آباد کے فٹ پاتھ پر کپڑوں کی دوکانیں لگائی تھیں۔ ان کی محنت اور جاں فشانی کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُن کا کاروبار چل نکلا اور چند سال میں یہ لکھنؤ کی تجارتی زندگی پر حاوی ہو گئے۔ اس زمانے میں سیکڑوں کی تعداد میں مرمت کی دوکانیں کھل گئیں۔ پیسہ کسی ہندو کا ہوتا منیجر عام طور پر کوئی سکھ ہوتا۔ کاریگر زیادہ تر مسلمان۔ لکھنؤ کی خاموش، نرم رو، پر تکلف فضا میں کچھ تبدیلی آئی، شور بڑھ گیا اور ہجوم بھی۔

اکتوبر میں جب حالات بہتر ہونے لگے تو کچھ لوگوں نے طے کیا کہ پناہ گزینوں کی امداد کے لیے ایک مشاعرہ کیا جائے۔ اس کے لیے کچھ لڑکوں اور لڑکیوں نے بڑا کام کیا۔ قرۃ العین حیدر پیش پیش تھیں۔ یہ اسی سال انگریزی میں ایم۔اے کر چکی تھیں۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت

ـ سے ان کی شہرت بھی ہو گئی تھی۔ شعبۂ اردو میں جب کوئی تقریب ہوتی تو یہ ضرور شرکت کرتیں۔ یاد آتا ہے کہ انھوں نے یونیورسٹی کے قریب قریب سبھی استادوں سے مشاعرے کے لیے چندہ لیا تھا مگر مشاعرے سے چند روز پہلے اُن کی والدہ انھیں پاکستان لے گئیں۔ مشاعرے کے سلسلے میں میں نے بھی مدد کی تھی۔ فراق الٰہ آباد سے آ گئے تھے، لکھنؤ کے بیشتر شعرا شریک تھے۔ اچھی خاصی آمدنی ہو گئی تھی جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حوالے کی گئی۔

اس زمانے میں سردار جعفری لکھنؤ آئے۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس دسمبر میں کی جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ استقبالیہ کمیٹی کا سکریٹری میں ہوں۔ مجھے پس و پیش یہ تھا کہ لکھنؤ آئے مجھے ایک سال ہی گذرا تھا اور ابھی لکھنؤ والے مجھ سے زیادہ واقف نہیں ہوئے تھے۔ احتشام حسین کو چھوڑا وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر مجھے یہ کام اپنے ذمے لینا پڑا۔ کانفرنس بہت اچھی ہوئی۔ سجاد ظہیر پاکستان سے آئے تھے۔ نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار، فراق نے مختلف جلسوں کی صدارت کی۔ ایک مشاعرہ بھی ہوا جس کے صدر اثر صاحب تھے۔ جگر صاحب نے بھی شرکت کی تھی اور اپنی وہ مشہور غزل پڑھی تھی جس کا مطلع ہے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل　　　شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

جگر صاحب مشاعرے پر چھا گئے تھے۔ سجاد ظہیر نے بعد میں اس طرح داد دی: "بڑے میاں نے کمال کر دیا۔ ان کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلا۔" سردار جعفری نے نئی دنیا کو سلام کے کچھ حصّے سنائے۔ بھلا لکھنؤ والے اس تجربے کی کیا داد دیتے۔ شعرا میں سے کسی کو کرایہ نہیں دیا گیا تھا سب اپنے خرچ سے آئے تھے۔ اثر صاحب اور جگر صاحب نے تو چندہ بھی دیا تھا۔ اُس زمانے میں جگر صاحب اکثر لکھنؤ آتے تھے۔ قیام تو وضع داری کے تحت بھوپال ہاؤس میں ہی ہوتا تھا۔ مگر قیام و طعام کے علاوہ مہمانوں کی تواضع کا سارا خرچ خود برداشت کرتے تھے۔ میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ کیا اور جگر صاحب کو بلایا۔ رشید جہاں کو انھیں لینے کو بھیج دیا۔ بعد میں رشید جہاں نے بتایا کہ جگر صاحب ان کے آنے پر خوش نہیں ہوئے تھے مگر رشید جہاں نے انھیں شیشے میں اتار لیا اور انھوں نے مجھ سے رشید جہاں کے خلوص اور ذوق کی تعریف کی۔ جگر صاحب کے ایک پرانے دوست تسکین قریشی بھی اکثر آتے تھے۔ یہ عزیز لکھنوی کے شاگرد اور خود ایک اچھے شاعر تھے۔ جگر صاحب

سے بڑی محبت کرتے تھے اور جگر صاحب بھی انھیں اتنا عزیز رکھتے تھے کہ اکثر مشاعروں میں اُن کی غزلیں بھی پڑھا کرتے تھے۔ تسکین صاحب کی زبان اور فن پر بھی گہری نظر تھی۔ جگر صاحب کے کلام میں کچھ فنی لغزشیں تھیں جن کا ذکر نیاز صاحب نے بہت بڑھا چڑھا کر نگار میں کیا تھا۔ تسکین صاحب نے ان اغلاط کی ایک فہرست بنائی اور جگر صاحب سے بحث کی۔ وہ ان کی اصلاح پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ بالآخر تسکین صاحب نے انھیں اس پر آمادہ کر لیا کہ مجھ سے مشورہ کیا جائے۔ جگر کی غزل کا ایک مصرع تھا ؎

دیر تک ایک ایک گُل کا رنگ گہرا ہو گیا

ظاہر ہے یہ غلط تھا۔ اس میں ترمیم جگر صاحب نے منظور کر لی۔

دفعتاً ایک ایک گُل کا رنگ گہرا ہو گیا

ایسی ہی چند اور ترمیمیں انھوں نے مان لیں مگر زیادہ تر کے متعلق کہا کہ میرا ذوقِ شعر انھیں گوارا کرتا ہے۔

تسکین صاحب کے دو شعر جو جگر صاحب کو بھی پسند تھے یاد آتے ہیں ؎

کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیالِ یار	لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھیے
وہ کیا کریں گے مداوائے دردِ دل تسکینؔ	جو اک نگاہ محبت کی تاب لا نہ سکے

جگر صاحب کے کلام کا دوسرا مجموعہ "آتشِ گل" کے نام سے اسی زمانے میں چھپا تھا اس پر رشید صاحب کا پیش لفظ اور میرا دیباچہ تھا۔ کتاب کی کتابت میں صدیق حسن صاحب نے بڑی مدد کی تھی یہ جگر صاحب کے بڑے مداح تھے۔ آئی۔ سی۔ ایس کے سینیئر افسر تھے۔ شعر و شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ تقسیمِ ہند کے بعد انھوں نے ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا۔

لکھنؤ میں اُس زمانے میں آئی۔ اے۔ ایس کے ایک افسر حبیب احمد صدیقی مقیم تھے جو بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے علی گڑھ سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ بڑے نستعلیق آدمی تھے۔ اپنے فرائضِ منصبی کے علاوہ سارا وقت شعر و ادب کے مطالعہ میں یا شاعری میں صرف کرتے تھے۔ غزل کہتے تھے اور بڑی صاف ستھری کلام میں تازہ کاری اور للہ کاری ملتی ہے۔

رضی الحسن چشتی جو سینٹ جانس کالج میں میرے ہم عصر تھے اُس زمانے میں لکھنؤ آ گئے تھے اور کئی

مہینے میرے یہاں مقیم رہے۔ محبوب عالم سُنّی وقف بورڈ کے سکریٹری کو مشاعروں سے بڑی دلچسپی تھی
میں بھی وقف بورڈ کے کئی مشاعروں میں شریک ہوا ہوں۔ ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا اور داد تو ملتی تھی
مگر بیداد سے سابقہ نہ تھا۔ اس زمانے میں ادبی کانفرنسیں اور مشاعرے گنگا پرشاد میموریل ہال میں
ہی ہوتے تھے جس کے نگراں کشن پرشاد کول تھے۔ کول صاحب اُردو کے ممتاز ادیب تھے اور
اُردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے ہر کوشش میں پیش پیش رہتے تھے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کی صوبائی
شاخ کے صدر بھی تھے۔ اس کے سکریٹری حیات اللہ انصاری تھے جو قومی آواز کے اڈیٹر بھی تھے
قومی آواز میں مفتی رضا انصاری بھی کام کرتے تھے۔ رضا انصاری، سبط حسن اور سردار جعفری کے
نیا ادب کی اشاعت میں معاون بھی رہے تھے۔ لکھنؤ میں اکثر مولانا عبدالماجد دریابادی بھی آتے
رہتے تھے۔ اُن کا ہفتہ وار اخبار پہلے سچ اور پھر صدق کے نام سے شایع ہوتا تھا۔ مولانا عبدالماجد
کے شذرات بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کی کتاب "محمد علی ایک ذاتی ڈایری"
پر ریڈیو کے لیے میں نے ریویو لکھا۔ پہلا جملہ یہ تھا: "مولانا ماجد پرستار ہیں یار کے ہیں"۔ ڈائرکٹر
نے اس پر اعتراض کیا۔ مولانا ماجد اس وقت ریڈیو کی مشاورتی کمیٹی کے ممبر تھے اور ڈائرکٹر انھیں
ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا یہ ایک ادبی تبصرہ ہے یہ رہے گا ورنہ تقریر نہ ہوگی۔ بہرحال جملہ
رہا اور تقریر بھی ہوئی۔

قاضی عبدالغفار حیدرآباد سے آکر سال ڈیڑھ سال لکھنؤ میں مقیم رہے۔ ایک دفعہ انھوں نے
اپنے داماد چودھری سلطان کے گھر پر جگر صاحب، فراق، مجاز اور کچھ شعرا کی دعوت کی۔ جگر صاحب تو نہ گئے
اور لوگ آ گئے۔ میں کھانے کے بعد کسی ضرورت سے چلا آیا تھا۔ دوسرے دن فراق آئے اور پوچھا کہ
کیا بزمِ چراغاں کی ترکیب غلط ہے؟ میں نے کہا بالکل غلط مگر مسئلہ کیا ہے؟ بولے "رات آپ تو چلے آئے
پھر قاضی صاحب کے یہاں شعر و شاعری کا سلسلہ رہا۔ میں نے ایک غزل پڑھی جس میں بزمِ چراغاں کی
ترکیب تھی۔ سردار جعفری نے اس پر اعتراض کیا۔ میں نے غالب کا حوالہ دیا۔ سردار نے کہا وہاں جوش
قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے ہے۔ بزمِ چراغاں کی ترکیب نہیں۔ چراغاں خود چراغوں کی بزم
کے لیے آتا ہے۔ میں ابھی نیاز صاحب کے پاس سے ہو کر آرہا ہوں وہ بھی اسے غلط کہتے ہیں۔ اب
آپ کی اور نیاز صاحب کی رائے کے بعد اس مصرع کو بدل دوں گا۔" فراق کے یہاں ایسی غلطیاں راہ

پا جاتی تھیں۔ ناموزوں اشعار تو اُن کے یہاں خاصی تعداد میں ہیں۔ بعض بحریں ان سے برتی نہیں جاتی تھیں۔

چودھری محمد علی ردولوی سے بھی زیادہ تر کافی ہاؤس میں ہی ملنا ہوتا تھا وہ آتے تو ان کی باغ و بہار شخصیت کی وجہ سے ان کے گرد ایک ہجوم ہو جاتا۔ وہ مزے لے کر حالاتِ حاضرہ، زمینداری اور اپنی جوانی کے موضوع پر گہر افشانی کرتے اور مہذب ظرافت کے دریا بہاتے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے اوپر ہنس سکتے ہیں وہی سب سے زیادہ باعثِ کشش ہوتے ہیں۔ چودھری صاحب نہ اپنے کو بخشتے تھے۔ کسی اور ہدف کو۔ میں نے ایسے شاندار اور دلچسپ بوڑھے کم دیکھے ہیں جو سن و سال کے باوجود ایسی جوان اور چلبلی طبیعت رکھتے ہوں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "گناہ کا خوف" اور متفرقات کا ایک ادبی مجموعہ "کشکول فقیر محمد علی شاہ" میرے نزدیک اُن کے شاہ کار ہیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی کے نام جو خط لکھے ہیں، وہ ہمارے مکاتیب کے سرمایے میں غالب کے اور رشید احمد صدیقی کے خطوط کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں۔

بیرورو ڈیر میں ۱۹۵۲ء کے شروع تک رہا۔ اس زمانے میں آنند نرائن ملّا صاحب سے بڑے قریبی مراسم ہو گئے۔ ملّا صاحب ان دنوں کسی ٹربیونل کے ممبر تھے۔ روزانہ ملاقات ہوتی۔ اُن کے ساتھ اکثر کافی ہاؤس بھی گیا۔ وہ ہماری مشترکہ تہذیب کے بڑے اچھے نمایندے ہیں۔ اردو زبان کے عاشق تھیں کا یہ قول ہے کہ "میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا" ان کے مجموعۂ کلام "جوئے شیر" پر میں نے مقدمہ بھی لکھا تھا اس میں ان کا یہ شعر بھی ہے:۔

لبِ مادر سے مُلّا لوریاں جس نے سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

مُلّا صاحب نے منوہر لال زتشی کی فرمایش پر پیامِ مشرق میں لالہ طور کے نام سے جو رُباعیاں ہیں اُن کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان کے کلام میں غالب، اقبال اور چکبست تینوں کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے۔ مضامینِ نہرو کے نام سے جواہر لال نہرو کے کئی انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کے

پڑھنے کا انداز منفرد ہے۔ ہر لفظ کو کھینچ کر پڑھتے ہیں اور ترنم پر بھی اصرار ہے۔ اس وجہ سے اچھے شاعر ہونے کے باوجود مشاعروں میں بعض اوقات ہوٹ ہو جاتے ہیں۔ ایک مشاعرے میں جگر صاحب نے اُن سے کہا کہ اجازت ہو تو آپ کی غزل میں مشاعرے میں سناؤں، مگر ملّا صاحب کو یہ گوارا نہ ہوا اپنے مخصوص انداز میں غزل پڑھی اور داد کے ساتھ بے داد کے بھی شکار ہوئے۔

لکھنؤ کی اہم شخصیتوں میں ڈاکٹر فریدی بھی تھے۔ یہ ایک ممتاز ڈاکٹر ہی نہیں تھے قومی فلاح کے کاموں میں بھی سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔ بعد میں یہ مسلم مجلس کے روح رواں رہے۔

مسعود حسن رضوی صاحب تو یونیورسٹی کے جلسوں میں کم جاتے تھے۔ اُستادوں کی انجمن اور طلبا کی یونین سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔ احتشام طلبا کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ضرور معاون رہتے تھے اور میں نے ۱۹۴۲ء میں بزم اقبال کی بنیاد ڈالی۔ اس کے لیے جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عابد حسین سے پیام منگوائے تھے۔ اس کے پہلے جلسے کی اثر صاحب نے صدارت کی تھی۔ احسن فاروقی، حنیف فوق اور میں نے بھی مقالے پڑھے تھے۔ ممتاز حسین اُس زمانے میں کانون کالج میں اُردو کے لکچرر تھے انھوں نے بھی ایک جلسہ میں مقالہ پڑھا تھا۔ جب اچاریہ نرندر دیو وائس چانسلر ہوئے تو میں نے انھیں بھی بزم اقبال کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے بہت اچھی اُردو میں تقریر کی۔ اچاریہ جی پالی کے مانے ہوئے اسکالر تھے۔ بدھ مت کے قائل۔ ویسے مارکسسٹ اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے بانی۔ بعد میں کانگریس سے الگ ہو گئے تھے۔ وہ ہندی کے بھی جانے مانے ادیب تھے۔ ہندستانی کے علمبردار تھے۔ مگر ہندی کے مجمع میں ادبی ہندی میں اور اُردو کے مجمع میں فصیح اُردو میں تقریر کرتے۔ میں نے ایک دفعہ اُن سے دریافت کیا اچاریہ جی آپ ہندوستانی کے علمبردار ہیں مگر ہندی یا اُردو میں تقریر کرتے ہیں تو ملی جلی اُردو ہندی بولنے کے بجائے یا خالص اُردو بولتے ہیں یا خالص ہندی۔ کہنے لگے زبان کی خصوصیات کو کیسے نظر انداز کردوں۔ میں نے اُن سے پوچھا: آپ نے اتنی اچھی اُردو کہاں سے سیکھی؟ کہنے لگے میں گلاب باڑی فیض آباد کا رہنے والا ہوں۔ بچپن میں میری دادی زنانی مجلسوں میں مجھے اکثر لے جایا کرتی تھیں وہاں سوزخوانی کے علاوہ انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیے سننے کی وجہ سے مجھے اُردو آگئی۔ واقعی ان مجلسوں کا زبان کی اشاعت میں بڑا اہم رول رہا ہے۔ اچاریہ جی کے چندر بھان گپتا سے بڑے مراسم تھے۔ چندر بھان گپتا کانگریس کے ایک اہم ممبر تھے۔ یونیورسٹی

میں اُن کا بڑا اثر تھا۔ جب وزیر ہو گئے تو یونیورسٹی والوں نے انھیں اعزازی خازن بنا لیا۔ میں نے اُن کے حامیوں سے کہا کہ یہ آپ نے غلطی کی۔ اب چندر بھان جی کے سامنے وائس چانسلر کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ اس وقت تو میری بات کو یار لوگوں نے کوئی اہمیت نہ دی مگر بعد میں مانا کہ میں ٹھیک کہتا تھا۔ گپتا جی یونیورسٹی کی سیاست پر اتنے حاوی ہو گئے کہ پتہ بھی اُن کی مرضی کے بغیر اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا تھا۔ یونیورسٹی میں اُس زمانے میں ڈاکٹر اے۔ این۔ سنگھ، کالی پرشاد، ڈاکٹر چٹرجی (کیمسٹری) اور آر۔ یو۔ سنگھ (لا) کا طوطی بولتا تھا۔ بیربل ساہنی اور سدھانت جیسے استادوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ شروع ہی میں میرا ان سے تصادم ہو گیا۔ ان لوگوں نے شعبۂ اُردو کو فارسی سے علیحدہ کرانے کی میری تجویز کی مخالفت کی۔ شعبہ تو الگ نہ ہوا ہاں اُردو کا الگ بورڈ آف اسٹڈیز بن گیا۔ پھر جب لکھنؤ اور الٰہ آباد کی یونیورسٹیوں کی اسٹاف ایسوسی ایشن کی مشترک کانفرنس ہوئی تو متفقہ طور پر مجھے اس کا کنوینر بنایا گیا۔ کانفرنس بہت اچھی ہوئی۔ میں نے بہرحال اسٹاف کے مسائل اور طلبا کے مسائل میں بھی دلچسپی لی۔ اس کی وجہ سے چندر بھان گپتا کی مخالفت بھی کرنی پڑی۔ ۱۹۵۲ء میں جب میں بیر ورڈ سے نعمت اللہ روڈ آ گیا تھا یونیورسٹی میں ایک اسٹرائک ہوئی طلبا اور پولس میں تصادم ہوا۔ اس کے نتیجے میں گولی چلی اور ایک بے قصور ڈاکٹر جس کا نام گینڈر تھا اور ایک رکشہ والا مارا گیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اس زمانے میں اچاریہ نریندر دیو کے جانشین جگل کشور وائس چانسلر تھے۔ چانسلر یو پی کے گورنر کے ایم منشی تھے۔ اچاریہ گوبند بلبھ پنت جیسے گھاگ چیف منسٹر کے سامنے اُن کی انتظامیہ میں دخل دینے کی کوششیں ناکام ہوئیں تو انھوں نے یونیورسٹیوں میں اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کی اور شرم دان (ہاتھ سے کام) کی تحریک چلا دی۔ یونیورسٹی کے استادوں نے اس کا نوٹس نہ لیا۔ طلبا نے سخت مخالفت کی۔ کچھ طلبا نے بھوک ہڑتال کر دی۔ یونیورسٹی نے اس کو ختم کرانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔ بالآخر اس کے نتیجے میں طلبا اور پولس میں تصادم ہوا۔ فائرنگ ہوئی اور کرفیو لگا۔ اُس زمانے میں شہر لکھنؤ کی سڑکوں پر یہ نعرہ اکثر سنا جاتا تھا:

لکھنؤ کے تین چور۔ منشی، گپتا، جگل کشور

کرفیو کے خاتمے پر گپتا جی کے مکان واقع پان دریبہ میں کئی دن تک میٹنگ ہوئی۔ پہلے دن

پروفیسروں کو بلا کر گپتا جی نے فہمائش کی کہ وہ اسٹرائک کیوں نہیں ختم کراتے ۔ دوسرے دن ریڈروں کو بلایا۔ میں خاموشی سے گپتا جی اور جگل کشور کا بھاشن سنتا رہا۔ مگر گپتا جی کے حامیوں کو میری خاموشی بھی گوارا نہ تھی۔ اُن میں سے ایک نے کہا کہ سرور صاحب نے کوئی رائے نہیں دی ۔ جب گپتا جی نے مجھ سے رائے پوچھی تو میں نے صاف کہا کہ دراصل یہ معاملہ بال ہٹ اور راج ہٹ کا ہے ۔ لڑکے اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور حکومت اپنی ضد پر۔ ایسے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم اس معاملہ میں تصفیہ کرا دیں تو ہمیں یہ اختیار دیجیے کہ اُن کی جائز مانگوں کو قبول کر لیں پھر ہم اُن کی اسٹرائک ختم کرا سکتے ہیں ۔ مگر ہم استاد ہیں ۔ حکومت یا انتظامیہ کے نمایندے نہیں ہیں۔ ہمیں ایسی پوزیشن میں نہ ڈالیے کہ ہم طلبا کے ہمدرد کے بجائے حکومت کے پٹھو کہلائیں۔ میری اس تقریر کا گپتا جی پر تو اچھا اثر ہوا مگر اُن کے حامی اور ناراض ہو گئے ۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں میرا معمول یہ تھا کہ کلاسوں سے فارغ ہونے کے بعد احتشام صاحب اور نورالحسن ہاشمی کے ساتھ گھنٹہ دو گھنٹہ اسٹاف کلب میں گذارتا ۔ یہاں ہم لوگ پنگ پانگ کھیلتے۔ دوسرے تیسرے روز لائبریری کا پھیرا ہوتا ۔ شام کو اکثر کافی ہاؤس جاتا ۔ کافی ہاؤس میں اس زمانے میں یونیورسٹی کے استادوں اور اُردو ہندی کے ادیبوں کا مجمع لگا رہتا ۔ ایک میز پر ڈی ۔ پی مکرجی اور کالی پرشاد بیٹھے ہوتے ہیں ۔ دوسری میز پر بھگوتی چرن ورما اور یشپال ۔ ایک کونے میں علیم صاحب ہیں، مجاز ہیں، سلام مچھلی شہری ہیں، ریڈیو کے کچھ کارکن ہیں ۔ یہاں رام منوہر لوہیا، فیروز گاندھی، اچاریہ نریندر دیو بھی آتے اور چیلاپتی راؤ اور وحید احمد (پارلی منٹری سکرٹری) اور ملا صاحب اور نسیم معصومی بھی ۔ عالمی سیاست، ہندوستانی سیاست، ادب کی صورت حال، یونیورسٹی کی سیاست نئی کتابوں اور نئے رسالوں پر بات ہوتی ۔ ایسے ہی ایک موقع پر فیروز گاندھی سے جو اس زمانے میں ایسوسی ایٹڈ جرنلس کے منیجنگ ڈائرکٹر تھے کسی نے کہا کہ چیلاپتی راؤ سے ان کی سفارش کر دیں۔ فیروز گاندھی نے جواب دیا کہ ہمارے ایڈیٹر اپنا اسٹاف خود رکھتے ہیں کسی کی سفارش نہیں سنتے۔ سلام مچھلی شہری سے کافی ہاؤس میں اکثر ملاقات ہوتی تھی ۔ اُن کی شخصیت میں بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ ایک فن کار کی انا بھی تھی ۔ پایل کے نام سے اُن کے گیتوں کا ایک مجموعہ خاصا مقبول ہوا تھا ۔ ایک زمانے میں انھیں دوستوں کو منظوم خط لکھنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ بہت سے منظوم

خط اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئے۔ کافی ہاؤس میں اگر کوئی قبول صورت خاتون نظر آتیں تو کسی طرح سلام بھی اُن کے قریب پہنچ جاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحبہ کی موجودگی میں سلام منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے پوچھا سلام صاحب طبیعت تو ٹھیک ہے کیوں اس طرح خاموش بیٹھے ہیں۔ میں نے تفریحاً کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں، ان کی صورت ہی ایسی ہے۔ اکثر اس طرح گم سم بیٹھے رہتے ہیں۔ بات آئی گئی ہوئی۔ مگر بعد میں سلام نے مجھ سے شکایت کی کہ آپ نے صنفِ نازک کی نظر میں میرا وقار کیوں گرادیا۔ بڑی مشکل سے اُن کو منایا۔

سلام مشاعروں میں اکثر بہک جاتے تھے۔ سامعین سے خوب چونچیں رہتی تھیں۔ ایک دفعہ سامعین خاموش تھے۔ سلام نے چھیڑا کہ آج یہ قبرستان کا سا سنّاٹا کیوں ہے؟ بس پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ لوگوں نے دل کھول کر سلام کو ہوٹ کیا۔

اس زمانے میں رضیہ سجاد ظہیر کرامت حسین ڈگری کالج میں لکچرر تھیں۔ سجاد ظہیر اس زمانے میں راول پنڈی سازش کیس کی وجہ سے حیدر آباد سندھ کے سنٹرل جیل میں قید تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں محمد نقی کے انتقال کی وجہ سے لکچرر کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ اس کے لیے سجاد ظہیر نے جیل سے مجھے لکھا۔ پھر جوش ملیح آبادی کا بھی خط آیا۔ یونیورسٹی کے استادوں میں ڈی۔ پی مکرجی نے بھی کہا کہ میں رضیہ سجاد ظہیر کے لیے کوشش کروں۔ سلکشن کمیٹی کا میں تو ممبر نہ تھا۔ مسعود حسن رضوی صدر شعبہ کی حیثیت سے ممبر تھے۔ میں نے احتشام سے مشورہ کیا اور ہم دونوں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ ڈاکٹر محمد حسن اس جگہ کے لیے زیادہ موزوں ہوں گے۔ چناں چہ مسعود حسن رضوی سے ہم لوگوں نے کہا کہ محمد حسن کو لیا جائے۔ خود اُن کی بھی یہی رائے تھی مگر ہوا یہ کہ سلکشن کمیٹی نے عبدالاحد خاں خلیل کو منتخب کرلیا جو اُردو اور فارسی دونوں میں ایم۔ اے تھے اور کالون کالج لکھنؤ میں اُردو پڑھاتے تھے۔ خلیل صاحب بھی اچھے استاد ثابت ہوئے۔ بعد میں انھوں نے اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کرلیا۔

اُس زمانے میں جوش اکثر لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ رشید جہاں میرے یہاں آئیں اور کہا کہ چلو جوش سے مل آئیں۔ رشید جہاں نے شاید کسی موقع پر جوش پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ بہت پینے لگے ہیں۔ جوش نے انھیں ایک رباعی لکھ بھیجی تھی جس کے آخری دو مصرعے

یہ تھے ؎

اس درد کا تو گواہ رہنا اے جوشؔ　　　میں اپنے وطن میں اجنبی ہوں اب تک

بہر حال رشید جہاں کے ساتھ میں جوشؔ سے ملنے بارود خانے گیا جہاں وہ ایک دوست کے یہاں مقیم تھے۔ جوشؔ کا شغل جاری تھا۔ مانی جائسی، بسمل شاہ جہاں پوری، مرزا جعفر حسین بھی موجود تھے۔ جوشؔ نے رشید جہاں کا اور میرا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ رشید جہاں کے کہنے پر انھوں نے اپنا تازہ کلام بھی سنایا کوئی ایک گھنٹے بعد رشید جہاں یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں کہ میرے کلنک کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے جوشؔ صاحب نے روک لیا۔ جیسے ہی رشید جہاں باہر نکلیں جوشؔ نے کہا: چلو اب مردانہ ہو گیا۔ پھر مانی جائسی سے نوک جھونک ہونے لگی یعنی جوشؔ مستی میں بھی جب چاہتے تھے سنجیدہ ہو جاتے تھے اور جب چاہتے تھے پھکڑ باز۔ ایک دفعہ میرے یہاں آئے کچھ دیر کے بعد میرے گھر پر انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ　　ہونے والا تھا۔ میں نے کہا: جلسے میں شرکت بھی کر لیجیے۔ انھوں نے عذر کیا کہ حکومتِ ہند نے سرکاری ملازمین پر پابندی لگا دی ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شرکت نہ کریں میں مجبور ہوں۔ وہ اُس زمانے میں 'آج کل' کے ایڈیٹر تھے۔ پھر میں نے انھیں فیضؔ کے یہ اشعار سنائے جو سجاد ظہیر نے حیدر آباد سندھ کے جیل سے لکھ کر بھیجے تھے ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　　کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے　　　ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

میں نے ان اشعار کی بہت تعریف کی مگر جوشؔ کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ ۱۹۵۲ء کے شروع میں لکھنؤ ریڈیو پر ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں شرکت کے لیے بعض شعرا کو ریڈیو والوں نے مجھ سے بھی خط لکھوائے تھے چنانچہ جوشؔ اور جگرؔ کو میں نے لکھا تھا۔ جوشؔ نے مشاعرے میں شرکت کے لیے حامی بھر لی مگر چاہتے تھے کہ بسمل سعیدی کو بھی دعوت نامہ مل جائے۔ ریڈیو والوں نے کہا کہ اب ان کے بجٹ میں گنجائش نہیں ہے۔ جوشؔ صاحب نے میری بات پر یقین نہیں کیا اور کہا کہ آپ نے سعیِ بلیغ نہیں کی ورنہ ریڈیو والے آپ کی بات کیسے ٹال سکتے تھے۔ بہر حال وہ خود آئے۔ جگرؔ، فشورؔ، مجازؔ اور دوسرے ممتاز شعرا بھی موجود تھے۔ لطیفہ یہ ہوا کہ جوشؔ نے ایک ایسی نظم پڑھ دی جس میں حکومتِ ہند کی ہندی نوازی اور اُردو سے تغافل کی شکایت تھی۔ اس نظم کے دو شعر یہ

تک یاد ہیں ؎

جس کے ہر لفظ سے سو پھول مہک اٹھتے تھے کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی
ٹھیکرے بیچنے والوں کے پرائے گاہک بند کرتے ہیں جواہر کی دکاں اے ساقی

اسٹیشن ڈائرکٹر بہت پریشان تھا وہ سمجھتا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ میں نے اُسے دلاسا دیا کہ جوشؔ خود سرکاری ملازم ہیں جواب طلب ہوگا تو اُن سے ہوگا تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔

جوشؔ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ مسعود حسن رضوی صاحب کے متعلق ایک صحبت میں کہا۔ "اُن کی گھڑی تو عرصہ ہوا بند ہو چکی"۔ ریڈیو کے مشاعرے سے جب لوگ اٹھنے لگے تو جگرؔ صاحب ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے جائے پی رہے تھے۔ جوشؔ صاحب نے برجستہ کہا: شیر کھانس رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں رشید صاحب اور میں اُردو کے پروفیسر کی سلکشن کمیٹی میں شرکت کے لیے میسور گئے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ میں صبح لکھنؤ سے دلی پہنچا۔ رشید صاحب دوپہر کو علی گڑھ سے آنے والے تھے۔ چنانچہ میں جوشؔ صاحب سے ملنے آج کل کے دفتر چلا گیا۔ وہاں دربار لگا ہوا تھا کئی شعرا موجود تھے۔ جوشؔ ملسیانی اور جگن ناتھ آزادؔ تو خیر آج کل میں تھے ہی دلی کے اور بھی کئی شعرا تھے۔ جوشؔ کو میں نے یاد دلایا کہ ان کی فرمائش پر میں نے آج کل کے لیے مضمون بھیج دیا تھا۔ جوشؔ کو اس کے پہنچ جانے کی خبر بھی نہ تھی۔ پھر عرشؔ ملسیانی نے یاد دلایا کہ وہ نہ صرف موصول ہو گیا تھا بلکہ چھپ بھی گیا تھا۔ غرض جوشؔ کا "آج کل" میں زیادہ تر کام یہ تھا کہ وہ مضمون نگاروں سے مقالات کی اور شعرا سے کلام کی فرمائش کریں۔ جوشؔ میں مروّت بہت تھی وہ ہر ایک کی سفارش کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ناؤنوش میں بھی وہ ایک حد سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ انھیں سرخوشی کے عالم میں تو اکثر دیکھا مگر بدمست کبھی نہ دیکھا۔ ایک دفعہ انھوں نے مجازؔ سے کہا کہ دیکھو میں گھڑی رکھ کر پیتا ہوں۔ اس پر مجازؔ نے کہا میں گھڑا رکھ کر پیتا ہوں۔

آزادی کے بعد مسز نائیڈو یوپی کی گورنر مقرر ہوئی تھیں۔ ہم لوگ کبھی کبھار اُن سے ملنے جاتے۔ پھر جب تک ہم موجود رہتے سرکاری کام سب ملتوی رہتے۔ بیچارا سکریٹری خوشامد کرتا تھا کہ مجھے ضروری کاغذوں پر دستخط کرانے ہیں۔ ہم لوگ اٹھنا چاہتے مگر وہ پھر بٹھا لیتی تھیں۔ جب مشہور انگریزی شاعر لوی میک نیس لکھنؤ آیا تو راج بھون میں اس کے استقبال میں جلسہ ہوا۔ اس نے اپنی کئی نظمیں

سنائیں۔ پڑھنے کا انداز نہایت دلکش تھا ایک نظم کا عنوان تھا " میں ابھی پیدا نہیں ہوا (I AM NOT YET BORN) اس نظم کو شروع میں اس نے آہستہ سے پڑھا اور جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی گئی اس کی آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ آخری بند تو اس نے اس جوش و خروش سے پڑھا کہ سننے والے مسحور ہو گئے۔ اچاریہ نریندر دیو نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور بڑی اچھی تقریر کی تھی۔ بعد میں مسز نائڈو نے میک نیس سے مجاز کو ملایا اور کہا کہ اب ہمارے شاعر سے ملو۔ (NOW MEET OUR POET) جب ہم لوگوں نے ۱۹۴۷ء کے دسمبر میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی تھی تو مسز نائڈو نے کانفرنس کے کچھ مندوبین اور شعرا کو راج بھون میں چائے پر بلایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب حیدرآباد میں پولس ایکشن ہوا اور جنرل چودھری فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے تو سکریٹری نے فوراً مسز نائڈو کو یہ خبر سنائی وہ ایک جگہ موسیقی کا ایک پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ بجائے خوش ہونے کے ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ بہت ممتاز قومی رہنما تھیں مگر حیدرآباد کی بھی تھیں۔ آفاقیت کی علمبردار مگر مقامی فضا اور ماحول کی عاشق اور عارف۔

لکھنؤ میں ایک دفعہ آئی۔ اے رچرڈس مشہور انگریزی نقاد تشریف لائے۔ شعبۂ انگریزی میں انھوں نے (ODE TO WEST WIND) پر ایک تقریر کی۔ پہلے انھوں نے نظم پڑھی اور اس طرح پڑھی کہ نظم کے بہت سے مطالب ذہن نشین ہو گئے۔ پھر اس نظم پر تنقید کی۔ مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ عملی تنقید کیا ہوتی ہے؟ مشہور شاعر اسٹیفن اسپنڈر بھی لکھنؤ آئے تھے۔ انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا تھا اور ہم لوگوں کی شاعری کے انگریزی ترجمے بھی سنے تھے۔ ایک بات کا اندازہ ہوا کہ شروع میں یہ انگریزی شعرا تمہید کے طور پر جدید انگریزی شاعری کے متعلق چند عمومی باتیں چند منٹ میں کہہ دیتے تھے۔ ان میں کوئی خاص گہرائی نہ ہوتی تھی۔ ہاں اپنا کلام ایک خاص انداز میں سناتے تھے جس سے سامعین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ میرا اب بھی احساس یہ ہے کہ ترنم کی مقبولیت نے دراصل ہمارے سامعین کو شعر سے زیادہ موسیقی کا دلدادہ بنا دیا ہے۔ پرانے سخت اللفظ اسلوب سے شعر کی خصوصیات زیادہ واضح ہوتی ہیں۔

اس زمانے میں وحید احمد جو شیخوپور بدایوں کے ایک رئیس تھے اور خلافت اور ترکِ موالات

کے زمانے میں بدایوں سے رسالہ نقیب نکال چکے تھے پارلی منٹری سکریٹری تھے۔ یہ بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کی وجہ سے اکثر سکریٹریٹ جانا ہوتا۔ حافظ ابراہیم وزیر تھے یہ مشاعروں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ رات کو دیر تک ان کے یہاں دوستوں کی محفل جمتی۔ صدیق حسن سکریٹری تھے اور ہر ادبی کام میں اُن کی سرپرستی ضرور ہوتی تھی۔ ہندی کے ادیبوں میں یش پال اپنا رسالہ 'وپلو' نکالتے تھے اور اپنے پریس سے اپنی کتابیں چھاپتے تھے۔ ترقی پسند ہونے کے باوجود یہ اتر پردیش میں اُردو کو سرکاری زبان تسلیم کرنے کے خلاف تھے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کا درجہ ہندی افسانوی ادب میں خاصا اونچا ہے۔ امرت لال ناگر چوک میں رہتے تھے اور وہاں کی زندگی کی انھوں نے بڑی جاندار تصویریں اپنے ناولوں میں پیش کی ہیں۔ بھگوتی چرن ورما شاعر بھی تھے اور ناول نگار بھی۔ کافی ہاؤس میں اُن سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ لکھنؤ ریڈیو پر آزادی سے پہلے کچھ ماہ ن۔ م راشد بھی رہے ہیں۔ میراجی بھی آگئے تھے۔ راشد تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ میراجی نے بمبئی کی راہ لی۔ میراجی کو ایک پیروڈی کانفرنس میں دیکھا تھا۔ ہاتھ میں دو گولے تھے۔ بال بڑھے ہوئے، چہرے پر وحشت مگر آنکھوں میں ذہانت۔ ساجد علی خاں آرزو بھی کچھ دن رہے۔ پھر عباد انصاری آگئے۔ یہ بہت اچھے اداکار بھی تھے۔

اسی زمانے میں بیگم اختر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے جب سے اشتیاق حسین عباسی سے شادی کی تھی سوا ریڈیو کے کہیں گانے نہ جاتی تھیں۔ چند سال بعد موسیقی کی کانفرنس میں بھی جانے لگیں۔ اس زمانے میں میرے کئی فیچر سودا، میر، غالب اقبال پر ریڈیو سے نشر ہوئے۔ اس میں جب گانے کی ضرورت ہوتی تو بیگم اختر آجاتیں۔ ایک دفعہ نظیر اکبرآبادی پر آدھے گھنٹے کا پروگرام تھا۔ پہلے میری تقریر تھی جس کا عنوان تھا "نظیر اور عوام" اس کے لیے پندرہ منٹ مقرر تھے۔ باقی پندرہ منٹ میں بیگم اختر کو نظیر اکبرآبادی کی ایک نظم اور ایک غزل گانی تھی۔ میں نے اپنے تقریر کے وقت کا پہلے سے اندازہ نہیں کیا تھا یہ لمبی ہوگئی اور صرف پانچ منٹ بیگم اختر کے لیے بچے۔ مگر اللہ ری تہذیب۔ اس فن کار کے چہرے پر شکن بھی نہیں آئی اور باقی چند منٹ ایک نظم کے چند بند گاکر پورے کر دیے۔ بیگم اختر غزل اس طرح گاتی تھیں کہ غزل کا پورا جادو آشکار ہو جاتا تھا۔ لکھنؤ کی شائستگی اور رعنائی ان کے دم سے تھی۔

یاس یگانہ کو پہلے میں نے آگرے کی ایک شعری نشست میں دیکھا تھا۔ لکھنؤ میں ان سے ادھر اُدھر ملنا ہو جاتا۔ ان کے مالی حالات خراب تھے مگر مزاج میں جو طنطنہ تھا وہ آخر تک نہ گیا۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ مگر خدا جانے کیوں کبھی کبھار ان پر اپنی ہمہ دانی کا دورہ پڑتا۔ اپنے کو ہندوستان کا شاعر اعظم سمجھتے تھے۔ غالب شکن کہلانے کا خبط تھا۔ غالب پر اعتراضات کرتے کرتے اور اقبال پر ہاتھ صاف کرتے کرتے نہ معلوم اُن کے سر میں کیا سمائی کہ رسول اللہ کی شان میں کچھ گستاخیاں کیں۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ انھوں نے کچھ رباعیاں نیاز فتحپوری کو ڈاک سے بھیجیں۔ وہ تو موقع کی تاک میں تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی تک پہنچا دیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے صدق میں اور پھر سیاست جدید میں اُن کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نوجوانوں نے انھیں اُن کے گھر پر گھیر لیا۔ اُن کو جوتوں کا ہار پہنایا اور کشاں کشاں پرانے لکھنؤ سے امین آباد تک لائے۔ یہاں پولس پہنچ گئی اور ان کو ان نوجوانوں کے حلقے سے چھڑا لیا گیا۔ دراصل بیماری، افلاس اور ناقدری نے ان کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ اس واقعے کے شاید چھ مہینے پہلے لکھنؤ ریڈیو کے ایک مشاعرے میں ملے تو میں نے خیریت دریافت کی۔ اس زمانے میں پاکستان سے واپس آئے تھے۔ بیوی وہیں رہ گئی تھیں۔ کہنے لگے سرور صاحب کچھ نہ پوچھیے جہنم سے کسی طرح نکل آیا ہوں۔ پھر کچھ دن بعد اُن کا خط آیا کہ مجھ سے مل لیجیے۔ میں تو نہ جا سکا مگر احتشام صاحب سے جو ان کی جائے قیام کے قریب تھے کہا کہ ان کی خیریت دریافت کریں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھیں مکان چھوڑنا پڑا اور پھر مسعود حسن رضوی صاحب نے انھیں اپنے مکان کے باہر ایک کوٹھری میں جگہ دے دی۔ کچھ دن وہاں رہے پھر واپس چلے گئے۔ مسعود صاحب بھی ان کی نازک مزاجی کی وجہ سے زیادہ مدد نہ کر سکے۔ ان کا یہ شعر ان کے المیہ کو ظاہر کرتا ہے۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

رشید صاحب نے کسی جگہ اس پر اصرار کیا ہے کہ اچھا شاعر اچھا آدمی بھی ہوتا ہے۔ یہ لازمی نہیں۔ خود یگانہ کی مثال سامنے ہے۔ وہ واقعی بہت اچھے شاعر تھے۔ ان میں ایک انفرادیت تھی۔ ان کا رنگ ہم عصروں سے الگ ہے۔ اس میں ایک مردانگی، ایک تیور، ایک ولولہ ایک آن بان نظر آتی ہے

مگر ان کی شخصیت میں کوئی کجی ضرور تھی تبھی تو انھیں لوگوں کے چڑانے میں لطف آنے لگا تھا میں انھیں معذور سمجھتا تھا۔ ایک زمانے میں فانی سے بڑے گہرے مراسم تھے بعد میں کشیدگی ہوگئی۔ میکش اکبرآبادی ناقل ہیں کہ جے پور کے ایک مشاعرے میں فانی حیدرآباد سے شرکت کرنے آئے تھے۔ یگانہ بھی تھے۔ فانی میکش کے پاس گئے اور کہا چلو یاس سے مل آئیں وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ صلح ہو جائے جب دونوں یگانہ کے کمرے میں پہنچے تو انھوں نے صرف میکش سے بات کی۔ فانی کی طرف قطعاً توجہ نہ کی میکش صاحب کو یہ بات ناگوار گذری۔ کچھ دیر بعد وہ بدحظ ہو کر وہاں سے اٹھ آئے۔ فانی کا ظرف دیکھیے کسی نے ان کی اس غزل کی بڑی تعریف کی جس کا مطلع یہ ہے ؎

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

اس میں بیت الغزل یہ شعر تھا ؎

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

ان صاحب نے کہا تھا۔ فانی صاحب آپ نے قافیے کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے کہا نہیں بھائی یہ قافیہ تو یاس نے (اس وقت یگانہ، یاس تخلص کرتے تھے) کمال کا باندھا ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو ظالم پر سادگی برستی ہے

اب دیکھیے یگانہ نے فانی اور جگر کے متعلق کیا کہا ہے۔ خطاب جگر سے ہے ؎

ناقہموں کا انداز فلاطونی کیا میرے آگے غرور موزونی کیا
شکل انوار دالے کالے کوّے تو کیا وہ کمودیا، بدایونی لیا

پہلے مصرعے میں جگر کی سیاہ رنگت کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے میں کمودیا بدایونی سے فانی مراد ہیں۔ یہاں پر احسن فاروقی سے متعلق چند باتیں کہتا چلوں۔ لکھنؤ میں میرا ان کا کئی برس ساتھ رہا۔ میرے لکھنؤ آنے کے دو ایک مہینے بعد اُن کا شعبۂ انگریزی میں تقرر ہوا تھا۔ مجھے اس زمانے میں شام کو ٹہلنے کا بہت شوق تھا۔ یہ اکثر ساتھ ہوتے۔ خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ زیادہ تر ادب کی ہی باتیں ہوتیں۔ ایک خاص بات یہ تھی

کہ یہ ترقی پسند ادب کے بہت خلاف تھے۔ میرے یہاں اکثر ترقی پسند ادیب آتے رہتے تھے ان سے ضرور بحث ہوتی جو اکثر تلخی اختیار کر لیتی۔ بعض ترقی پسندوں میں کٹھ ملائیت تھی وہ تحریک کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ اس سے بات بڑھ جاتی۔ فاروقی کا انگریزی اور اُردو کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ انھوں نے تنقید، ناول، افسانے بھی لکھے۔ ان کا ناول "شامِ اودھ" اسی زمانے میں لکھا گیا۔ بعد میں ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اُردو میں ناول نگاری اور اُردو میں تنقید ان کی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔ وہ اچھے دوست تھے اور دوستوں کے ہر کام کے لیے حاضر۔ انھوں نے ایک موٹر بھی خریدی تھی جو اکثر دوستوں کے کاموں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ بعد میں پاکستان چلے گئے۔ چند سال بعد واپس آئے تو پاکستان سے بہت خفا تھے مگر یہاں اپنی کشتیاں جلا چکے تھے اس لیے پھر انھیں واپس جانا پڑا۔ کہتے ہیں کراچی یونیورسٹی سے کسی سازش کی بنا پر انھیں سبکدوش ہونا پڑا۔ بعد میں کوئٹہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ میں جب ۱۹۷۷ء میں کراچی گیا تو اُن سے ادارہ غالب اور پھر جمیل جالبی کے یہاں کھانے پر ملاقات ہوئی تھی۔ شروع ۱۹۸۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے رسالہ "نیا دور" کی ادارت میں جمیل جالبی کی بڑی مدد کی تھی۔ پہلے ساقی اور پھر نیا دور میں انھوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے۔

مسعود حسن رضوی صاحب شروع میں کچھ الگ تھلگ رہے۔ رفتہ رفتہ اُن سے اچھے مراسم ہو گئے۔ اُن کے پاس قلمی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا جو انھوں نے برسوں کی تلاش اور جستجو سے جمع کیا تھا۔ انیس، واجد علی شاہ اور مراثی ان کے خاص موضوعات تھے۔ وہ بڑی شگفتہ زبان میں گفتگو کرتے۔ گیارہ بجے کے قریب ایک تانگے میں یونیورسٹی آتے۔ تین بجے کے قریب گھر واپس جاتے۔ یونیورسٹی کے جلسوں اور لکچروں میں انھیں کم ہی دیکھا گیا۔ اُن کے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے گہرے مراسم تھے۔ ماڈرنیشن اور وائیوا میں اکثر وہی آتے۔ دونوں کی علمی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ مسعود صاحب کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ بہت گہرا تھا، گو لکھنؤ کے دبستان پر توجہ زیادہ تھی۔ بات چیت کی طرح ان کی تحریر میں بھی ایک شائستگی اور ٹھہراؤ ہوتا تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ انھیں درد سر کی شکایت اکثر رہتی۔ کبھی کبھار لکھنؤ کے شعرا کا ذکر بڑے لطف سے کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے بڑی تعریف کے ساتھ ثاقب لکھنوی کا یہ شعر سنایا۔

آپ کا تھا گناہ گار، ہیں، نہ کہ برق و باد کا
جس پہ مزار تھا مرا، اب وہ زمین صاف ہے

مجھے اس شعر میں روانیٔ رنگ نظر آیا۔ پھر میں نے اس زمین میں غزل کہی اور انھیں سنائی۔ اس غزل کا مطلع اور ایک شعر لکھتا ہوں ؎

مجھ کو گلہ نہیں اگر، سارا جہاں خلاف ہے
آپ تو مہرباں ہیں، آپ کا دل تو صاف ہے
سود و زیاں کا ذکر کیا جب ہو جنوں کا کاروبار
آج ہیں سب کو الجھنیں، میرا حساب صاف ہے

مسعود صاحب نے بھی ان اشعار کی تعریف کی تھی۔

انیس کا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے اور اکثر پڑھتا ہوں ؎

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

پھر میں نے اس کا پہلا مصرع بدل دیا اور دوسرے میں ایک لفظ۔ میرا شعر یہ ہے (مجھے پسند بھی ہے)

جنوں کا ساری خدائی سے معرکہ ٹھہرا
چراغ لے کے مگر سامنے ہوا کے چلے

مسعود صاحب محرم کی آٹھویں تاریخ کو اپنے یہاں مجلس کرایا کرتے تھے۔ اس میں بیان سید علی نقی صاحب کا ہوتا تھا۔ ان جیسے عالم اور خطیب کم دیکھے ہیں۔ جب ان کی کتاب "شہید انسانیت" پر شیعوں کے ایک حلقے میں اعتراضات ہوئے تو مسعود صاحب کے یہاں مجلس میں ان کی تقریر پر بھی کچھ لوگوں نے احتجاج کیا۔ مسعود صاحب نے اس کے بعد مجلسوں کا یہ سلسلہ موقوف کر دیا مگر سید علی نقی صاحب کی شان میں کوئی گستاخی گوارا نہ کی۔

جون ۱۹۵۴ء میں جب مسعود صاحب سبکدوش ہوئے تو چونکہ شعبے میں میں سینیر ریڈر تھا اس لیے شعبے کا چارج مجھے دیا گیا۔ میں فروری ۱۹۵۵ء تک صدر رہا۔ اس کے بعد وائس چانسلر راد ھا کمل مکر جی نے ایک آرڈر کے ذریعے سید یوسف حسین موسوی کو جو فارسی میں ریڈر تھے۔ مجھ سے بہت جونیر تھے

اور اسی سال ریڈر ہوئے تھے صدر بنا دیا۔ میں نے اس پر استعفا دے دیا۔ اس استعفے کی داستان آگے آئے گی۔

سیّد احتشام حسین سے ملاقات ۱۹۳۸ء سے تھی جب میں ۱۹۴۶ء میں شعبے میں آیا تو وہ لکچرر تھے۔ ان سے شروع سے اچھے مراسم رہے۔ وہ نہایت سنجیدہ اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ بہت اچھے استاد تھے۔ طلبا سے گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ اُردو تنقید میں اُن کی بڑی اہمیت ہے۔ کچھ عرصے بعد جب میں نے یہ تجویز پیش کی کہ بی۔اے میں اُردو کا نام اُردو مع فارسی غلط ہے، یہ صرف اُردو ہونا چاہیے اور فارسی کے پرچے کو لازمی رکھنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس میں پاس ہونے کی شرط کو مضمون میں پاس ہونے کی شرط قرار دینا غلط ہے تو احتشام گو اس کے حق میں تھے مگر مسعود صاحب کی وجہ سے خاموش رہے اور میری تائید نہ کی۔ مسعود صاحب صورتِ حال کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جو بورڈ آف اسٹڈیز کے بیرونی ممبر تھے مسعود صاحب کی تائید کی چنانچہ میری تجویز منظور نہ ہو سکی۔ مجھے احتشام سے شکایت ہوئی اور کچھ عرصہ ہم کھنچے کھنچے رہے مگر پھر احتشام خود میرے پاس آئے اور میرا دل صاف ہو گیا۔ بعد میں جب میری تجویز پر اکیڈمک کونسل نے اُردو کا علیحدہ بورڈ آف اسٹڈیز بنا دیا تو اس کے بیرونی ممبر قاضی عبدالغفار اور رشید احمد صدیقی مقرر ہوئے۔ رشید صاحب نے بورڈ کے پہلے جلسے میں شرکت بھی کی۔ اس میں مسعود صاحب نے خود مضمون کا نام اُردو رکھنے اور مضمون میں پاس ہونے کے لیے فارسی کے پرچے میں پاس ہونے کی شرط نکال دینے کی تجویز کی۔ احتشام حسین کو اس زمانے میں بھی پیچش کی اکثر شکایت رہتی تھی مگر وہ برابر لکھتے رہتے تھے۔ شہر کی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے اور طلبا کے دُکھ درد میں بھی۔ وہ بہت اچھے مقرر بھی تھے۔ شعر بھی کہتے تھے مگر مشاعروں میں کم ہی شرکت کرتے تھے۔ اُن کا یہ شعر ہم لوگوں کو بہت پسند تھا ؎

کل تو خیر اُن کی یاد آئی تھی
آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں احتشام سے قرب بڑھتا ہی گیا۔ "آج کل" میں انھوں نے میری شاعری پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ پھر جب اعجاز حسین کے سبکدوش ہونے پر الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر کی جگہ شعبۂ اُردو میں خالی ہوئی تو میں ایک اکسپرٹ تھا۔ دوسرے محی الدین قادری زور اور

تیسرے عبدالقادر سروری تھے۔ گیان چند جین اور خورشید الاسلام بھی امیدوار تھے۔ میں نے احتشام کا نام پیش کیا اور سروری نے میری تائید کی۔ زور کسی وجہ سے احتشام کو پسند نہ کرتے تھے۔ بہر حال اکثریت سے احتشام صاحب پروفیسر ہو گئے۔ وہاں وہ اساتذہ اور طلبا میں بہت مقبول رہے۔ افسوس ہے کہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اُن چند لوگوں میں سے تھے جن کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔

سید نور الحسن ہاشمی علی گڑھ میں میرے شاگرد رہے تھے۔ لکھنؤ میں ساتھی رہے۔ ہاشمی صاحب بڑے اچھے محقق ہیں۔ انھوں نے فارسی میں بھی ایم۔ اے کر لیا تھا۔ میں، احتشام اور ہاشمی اکثر کلاس سے فارغ ہونے کے بعد اسٹاف کلب جاتے تھے اور کچھ وقت وہاں ٹیبل ٹینس کھیلنے میں صرف کرتے تھے۔ اکثر عبدالاحد خاں خلیل بھی ساتھ ہوتے تھے۔ غرض شعبے میں ہم لوگوں کا میل جول مشہور تھا۔ شعبے کے ہر کام میں سارے ساتھیوں سے مشورہ رہتا تھا۔ کبھی کبھار ہم لوگ کسی مصرع طرح پر طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ اس زمانے کے ایم۔ اے کے شاگردوں میں چودھری محمد نعیم، قاضی عبدالستار، نادر علی خاں، امیر احمد صدیقی، مسعود عالم، محمد احمد، عالیہ عسکری یاد آتے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں میرے مضامین کا چوتھا مجموعہ "ادب اور نظریہ" ادارہ فروغ اُردو سے شایع ہوا تھا۔ اس زمانے میں شاعری زوروں پر تھی۔ قیام ۱۹۵۳ء سے بجائے بیرورڈ کے نعمت اللہ روڈ پر نعمت اللہ بلڈنگ میں تھا۔ امین آباد میں ڈاکٹر زین العابدین قدوائی (ہومیوپیتھک ڈاکٹر) سے اکثر ملاقات رہتی۔ نعمت اللہ روڈ آنے سے پہلے ان کے مکان میں تین مہینے رہا بھی تھا۔ یہ شاعر بھی تھے اور خاصے پختہ شعر کہتے تھے۔

اثر صاحب کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لکھنؤ میں ان سے خاصی قربت ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ ہم دونوں حبیب احمد صدیقی کی دعوت پر اُناؤ بھی گئے تھے جہاں صدیقی کلکٹر تھے۔ زیادہ وقت میر اور غالب پر تبادلہ خیالات میں گذرا۔ اثر، میر کے زیادہ قایل تھے۔ میں اور حبیب احمد صدیقی اُن کو چھیڑنے کے لیے غالب کی تعریف کرتے رہے۔ انھوں نے اس پر بہت سے ایسے اشعار میر کے سنائے جن کا اثر غالب پر صاف نمایاں ہے۔

دو شعر لکھتا ہوں۔ میر کہتے ہیں ؎

اُٹھتی نہیں پلک سے تاہم تلک کبھی آویں
پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

غالب کا یہ شعر ان کی نازک خیالی کو ظاہر کرتا ہے مگر یہ واضح ہے کہ میر کا شعر اُن کی نظر میں تھا ؎

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

غالب کے اس مشہور شعر کا خیال بھی میر سے لیا گیا ہے۔ غالب کا شعر ہے ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

میر نے بہت پہلے کہا تھا ؎

عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رخصت
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

اثر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ میر کی جو غزل "عشق ہے" ردیف میں ہے وہاں عشق ہے کے معنی آفریں کے ہیں۔ میں اس نکتے سے اُس وقت تک بے خبر تھا۔

میر کی سادگی سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اثر صاحب نے مجھ سے اور حبیب احمد صدیقی سے میر کے اس شعر کے معنی پوچھے اور جب ہم لوگ نہ بتا سکے تو انھوں نے اس کا مطلب بتایا۔ شعر یہ ہے ؎

اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم
صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

یہاں دستِ بلبل سے مراد وہ ہری پتیاں ہیں جو پھول کے نچلے حصے پر ہوتی ہیں اور چونکہ پانچ ہوتی ہیں اس لیے پنجے سے مشابہ ہیں۔ دامانِ گل سے مراد گلابی یا سرخ پنکھڑیاں ہیں۔ اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ بلبل کے پنجے میں (یا ہاتھ میں) گل کا دامن ہے۔ بلبل گل کی بے اعتنائی اور بے نیازی پر فریاد کر رہی ہے۔ اور جس طرح حشر میں مظلوم ظالم کا دامن پکڑ کر فریاد کرے گا۔ اسی طرح بلبل کی فریاد سے بھی روزِ حشر کا منظر سامنے آجاتا ہے۔

اثر صاحب نے اس موقع پر کئی غزلیں بھی سنائی تھیں اور میری ایک غزل کی تعریف کرتے

ہوئے ایک جگہ دو ایک لفظ بدلنے کا بھی مشورہ دیا تھا۔ اس کے بعد میری کچھ غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اور چند اشعار کی داد دیتے ہوئے کئی الفاظ بدلنے کی بھی رائے دی تھی۔ میرا ایک مصرعہ تھا ؎

چراغ یوں تو جو جلتا ہے بجھ بھی جاتا ہے

اثر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ یہاں دو جیم بہت قریب آ گئے ہیں اور تنافر پیدا ہو گیا ہے۔ یہ مصرعہ بعد میں میں نے بدل دیا۔ اثر نے میری کئی غزلوں کے متعلق بہت مفید مشورے دیے۔ ان کے علاوہ کسی اور بزرگ سے اس طرح میں نے استفادہ نہیں کیا۔ وہ واقعی استاد تھے اور زبان و بیان اور فکر وفن کے اسرار و رموز جس طرح اُن پر روشن تھے میں نے کم اشخاص میں دیکھے ہیں۔

یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے اُن چند ہستیوں کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جن سے میرا خاصا ربط ضبط رہا۔ ایک پروفیسر وحید مرزا تھے۔ یہ عربی اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبے کے صدر تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ عربی کے ممتاز استاد اور فارسی ادب کے رمز شناس۔ ہمیشہ انگریزی لباس میں نظر آئے۔ اُن کی آنکھوں میں وہ کم آمیزی دیکھی جو کہا جاتا ہے کہ مومن کی خصوصیت ہے۔ کبھی کبھی سیرت کے جلسوں میں اُن کی تقریریں بھی سنیں۔ یہ یونیورسٹی کے قریب رائے بہاری لال روڈ پر رہتے تھے۔ مجاز ان کے پڑوسی تھے۔ جب لاہور میں یہ طے ہوا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا اردو میں ترجمہ ہو اور اس میں ضروری اضافے بھی ہوں تو اس منصوبے کے انچارج تو پروفیسر محمد شفیع تھے مگر ہندوستان کے اسکالروں سے رابطہ قائم کرنے اور ان سے مختلف اندراجات کا ترجمہ کرانے کے لیے وحید مرزا کو نگراں مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے مجھے بھی کچھ کام دیا تھا مگر اپنے لاابالی پن کی وجہ سے نہ کر سکا۔ ان دنوں شاعری کا دورہ بہت شدید تھا۔ وہ یونیورسٹی میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کسی گروپ سے ان کا تعلق نہ تھا۔ سبکدوش ہونے کے بعد لاہور چلے گئے اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے کام میں بہت مدد کی۔

ایک اور پروفیسر ڈی۔ این۔ مجمدار تھے جو مشرقی بنگال کے رہنے والے تھے اور بشریات ANTHROPOLOGY کے پروفیسر تھے۔ یہ مشہور کیمبرج کے پروفیسر مالنوسکی کے شاگرد تھے۔ ویرر ایلون (VERIER ELVIN) سے شمالی مشرقی ہندوستان کے آدی باسیوں کے متعلق ان کا اختلاف رہتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ایک جھیل روپ کنڈ تک گئے تھے جو غالباً ۱۵ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور وہاں سے

کچھ انسانی کھوپڑیاں بھی لائے تھے جو کہا جاتا ہے کہ مشہور جرنل زور آور سنگھ کے سپاہیوں کی تھیں۔ وہ لوگ سردی کی وجہ سے وہیں تک جا سکے تھے۔ تبّت کو فتح کرنے کا ان کا ارادہ پورا نہ ہوسکا تھا۔ ان کی وجہ سے مجھے نسلیات سے دلچسپی بھی ہوگئی تھی۔

شعبۂ انگریزی میں ایک استاد شیام کشن نرائن بھی تھے جو وزیر گنج میں رہتے تھے۔ ان کے بزرگ واجد علی شاہ کے زمانے میں ممتاز عہدوں پر تھے۔ شیام کشن اُردو شاعری کے دلدادہ تھے اور لکھنوٴ کی تہذیب کے بہت اچھے نمایندے تھے۔ پان اور شراب کے رسیا تھے۔ جیلاپتی راؤ اور ڈی۔ پی مکرجی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اپنی کار میں بیٹھ کر کسی پارک تک جاتے اور وہاں دیر تک ٹہلا کرتے کبھی کبھار انگریزی میں کوئی دلچسپ مضمون بھی لکھتے تھے۔

اُس زمانے میں اکنامکس کے شعبے کے ساتھ سوشیالوجی بھی تھی اس کے ایک نوجوان استاد اودھ کشور سرن تھے۔ سیاہ فام اور دیکھنے میں کم رو مگر بلا کے ذہین۔ اس زمانے میں بھی ان کے مضامین مشہور رسالہ MIND میں شایع ہوا کرتے۔ جب کے ایم منشی نے جو یوپی کے گورنر تھے چانسلر کی حیثیت سے استادوں سے خطاب کیا اور انھیں شرم دان (ہاتھ کا کام) کرنے کو کہا تو بھرے مجمع میں انھوں نے کہے۔ ایم منشی سے کہا کہ ہم اصولاً آپ کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ برہم ہوگئے اور انھوں نے ڈی۔ پی مکرجی صدر شعبہ سے کہا کہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی ہونی چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ جو بات انھوں نے کہی وہی ہم سب کہنا چاہتے تھے مگر سرن میں یہ جرأت تھی ہم میں نہ تھی۔ بہر حال اس پر بات رفع دفع ہوگئی۔ اچاریہ نرندر دیو کے بعد اچاریہ جگل کشور وائس چانسلر ہوئے تھے۔ یہ سی۔ بی گپتا کے اشارے پر چلتے تھے جو اعزازی ٹریژرار تھے۔ اچاریہ نرندر دیو کے زمانے میں اساتذہ گروہ بندی کے شکار نہ تھے لیکن اچاریہ جگل کشور کے زمانے میں گپتا جی کے ساتھیوں اور مخالفوں کی رسہ کشی کافی بڑھ گئی تھی۔ اچاریہ جگل کشور کے زمانے میں اساتذہ پر کئی کمیشن بیٹھے۔ اس پر ہری کشن اوستھی نے یہ مصرع کہا اور سرن نے اس پر دوسرا مصرع لگانے کی فرمائش کی ؎

اس واسطے جگلو کو بھی اُلّو نہیں کہتے

میرا مصرع یہ تھا ؎

اس پر بھی نہ بیٹھے کہیں ایک اور کمیشن

احتشام نے اور بھی مرے کا مصرع لگایا تھا ؎

اُلّو کبھی نہ کر دے کہیں تو ہبلن کا دعوا
اس واسطے جگلو کو سبھی اُلّو نہیں کہتے

سرن بعد میں راجستھان چلے گئے تھے۔ اب سبکدوش ہو گئے ہیں۔ اپنی انانیت کی وجہ سے ان کی لوگوں سے کم ہی بنتی تھی۔

ہری کشن اوستھی ہندی کے استاد تھے۔ یونیورسٹی کی سیاست میں سرگرمی سے حصّہ لیتے تھے۔ بعد میں ایم۔ایل۔سی بھی ہو گئے۔ جب میری لڑکی نہ جبیں ایف۔اے کا امتحان دینے والی تھی تو خیال ہوا کہ اس کی ہندی کی صلاحیت کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ میں نے اوستھی سے کہا کہ ایک دن گھر آکر ذرا لڑکی کی صلاحیت کی جانچ کر لو۔ اور اس سے پڑھوا اور لکھوا کر دیکھ لو کہ تیاری کیسی ہے۔ مجھے اتفاق سے کہیں جانا تھا، شام کو گھر واپس آیا تو میں نے لڑکی سے پوچھا کہ اوستھی صاحب آئے تھے؟ کیا رہا؟ اُس نے کہا انھیں تو ہندی آتی ہی نہیں۔ ہماری دیدی کہتی ہیں کہ شدھ ہندی بولو اور لکھو مگر وہ تو اُردو بول رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی ہندی کا لفظ آجاتا تھا۔ میں نے دوسرے دن اوستھی سے پوچھا کہ لڑکی کی تیاری کیسی ہے؟ انھوں نے کہا کہ اگر فرسٹ کلاس نمبر نہ آئے تو ۵۵ فی صد تو ضرور آجائیں گے۔ میں نے انھیں لڑکی کا تاثر بتایا تو بہت ہنسے۔ کہنے لگے یہ اسکول کی ٹیچر یں شدھ ہندی پر اصرار کر کے ہندی کو بہت نقصان پہنچا رہی ہیں ہندی جتنی عام فہم ہو اچھا ہے۔

اکنامکس میں ایک استاد ویر بہادر سنگھ تھے۔ یہ بڑے محنتی اور جوشیلے آدمی تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں برابر شرکت کرتے تھے۔ اچاریہ نریندر دیو اور وی۔ وی گری سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ جب میں نے استعفا دیا تو انھوں نے بڑی دوڑ دھوپ کی کہ استعفا منظور نہ ہونے پائے۔ سرن اور ان سے بڑی پُر لطف نوک جھونک ہوتی رہتی تھی مگر دونوں گہرے دوست بھی تھے۔

شعبۂ تاریخ میں ایک کشن چندر سری واستو تھے۔ سب انھیں بھیّا جی کہتے تھے۔ نہایت ذہین مگر لااُبالی۔ ساری عمر کنوارے رہے۔ ہندی اُردو دونوں بہت اچھی جانتے تھے۔ سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ ان کے ایک دوست ناگر تھے۔ دونوں ساتھ رہتے تھے۔ بھیّا جی لکھنؤ کی میانہ روی، ذہانت،

وضعداری اور دوست نوازی کا بہت اچھا نمونہ تھے۔ میرے لکھنؤ چھوڑنے کے بعد میرے لڑکے صدیق سے ان کے گہرے مراسم ہو گئے تھے۔ ان میں ترقی کی کوئی امنگ نہ تھی۔ برسوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ آخر میں صدر شعبہ بھی ہو گئے تھے۔ افسوس ہے کہ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔

مسعود صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد چوں کہ میں شعبۂ اردو اور فارسی میں سینیر ریڈر تھا اس لیے صدر ہو گیا تھا۔ یوسف حسین موسوی جو پرانے لکچرر تھے وہ ۱۹۵۳ء کے آخر میں ریڈر ہو گئے تھے حالاں کہ مسعود حسن رضوی ڈاکٹر نذیر احمد کے حق میں تھے اور اکسپرٹ ڈاکٹر ہادی حسن بھی۔ مگر اچاریہ جگل کشور نے کسی طرح انھیں راضی کر لیا کہ اتنے پرانے لکچرر کو ریڈر کر ہی دینا چاہیے نذیر احمد کو بعد میں مواقع مل جائیں گے۔ یوسف حسین موسوی نے جوڑ توڑ کر کے اچاریہ جگل کشور کے بعد آنے والے وائس چانسلر پروفیسر رادھا کمل مکرجی کو ہموار کر لیا اور انھوں نے فروری ۱۹۵۴ء میں یہ آرڈر نکالا کہ صدر شعبہ موسوی صاحب ہوں گے۔ وائس چانسلر کو اس کا اختیار ضرور تھا کہ ریڈروں میں سے کسی کو صدر نامزد کر دے مگر دستور یہ چلا آرہا تھا کہ سینیر ریڈر ہی صدر ہو۔ میرے پاس جب یہ آرڈر پہنچا تو میں نے اس کھلی ہوئی بے انصافی پر چار سطر کا استعفا لکھ کر ڈین کو دے دیا۔ انھوں نے وائس چانسلر کے پاس بھیج دیا۔ جب میں استعفا لکھ رہا تھا تو احتشام اور ہاشمی دونوں نے کہا کہ سرور صاحب اتنی جلدی نہ کیجیے۔ ذرا سوچ لیجیے۔ مگر میں نہ مانا اور ڈین کے پاس جا کر استعفا اُن کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے یہ ضرور کہا کہ اگر آپ پہلے مجھے اپنے جذبات سے آگاہ کر دیتے تو میں وائس چانسلر سے بات کرتا مگر اب آپ نے استعفا دے دیا ہے تو میں مجبوراً اسے وائس چانسلر کے پاس بھیج دوں گا۔ میں نے گھر آکر اپنی بیوی سے سارا قصہ بیان کیا اور ان سے کہا میں نے تم سے رائے لیے بغیر یہ اقدام کیا ہے کیونکہ میں یہ بے انصافی برداشت نہیں کر سکتا امید ہے کہ تم اس کڑے وقت میں میرا ساتھ ضرور دوگی ظاہر ہے کہ انھیں بہت صدمہ ہوا مگر انھوں نے ہمت سے کام لیا اور کہا کہ تم نے جو مناسب سمجھا کیا۔ میں ہر حال میں تمھاری تائید کروں گی۔

جب استعفے کی خبر عام ہوئی تو لکھنؤ یونیورسٹی میں تہلکہ مچ گیا۔ پانیر اور نیشنل ہیرالڈ دونوں اخباروں میں یہ خبر چھپی اور میری تائید میں خطوط شائع ہونے لگے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ عام طور پر چاہتے تھے کہ یہ استعفا منظور نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ اچاریہ نریندر دیو، سابق وائس چانسلر

نے جو اس زمانے میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں زیرِ علاج تھے نیشنل ہیرالڈ میں دو خط لکھے جس میں یونیورسٹی کے اربابِ اختیار کو توجہ دلائی گئی تھی کہ میرا استعفا منظور نہ کیا جائے اور اُردو کا ایک الگ شعبہ قائم کیا جائے۔ چیلاپتی راؤ ایڈیٹر نیشنل ہیرالڈ نے ایک اداریہ بھی اس سلسلے میں لکھا۔ جب یونیورسٹی کونسل کی میٹنگ ہوئی تو وایس چانسلر نے تحریک کی کہ میرا استعفا منظور کر لیا جائے۔ مگر چندر بھان گپتا ٹریژرار نے جو میرے مخالف کہے جاتے تھے یہ کہا کہ استعفا منظور نہ کیا جائے اور وایس چانسلر سرور صاحب کو بلا کر ان سے استعفا واپس لینے کو کہیں۔ کونسل کے بیشتر ممبران نے اس تجویز کی تائید کی۔ پھر پروفیسر ایر ڈین مجھے اپنے ساتھ لے کر وایس چانسلر سے ملے اور ان کے کہنے سے میں نے اپنا استعفا واپس لے لیا۔ گپتا جی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ یونیورسٹی کے قواعد میں یہ ترمیم کرا دیں گے کہ سینیر ریڈر ہی شعبے کا صدر رہو۔

استعفا دینے کے بعد میں نے یہ چند اشعار کہے تھے ؎

زنداں میں یوں تو کہنے کو تھی عافیت بہت
تیرے غلام قید سے خوگر نہ ہو سکے
برسوں جو پھونک پھونک کے رکھے گئے قدم
اک لغزشِ جنوں کے برابر نہ ہو سکے
ذرّوں کا مہر و ماہ سے تھا سلسلہ ضرور
کہنے کو مہر و ماہ کے ہمسر نہ ہو سکے
زندہ ہیں ہم سے ایسے کچھ آدابِ سرکشی
جو تیری زلف کو بھی میسّر نہ ہو سکے
دامن یہ ان کے ہاتھ حریفانہ پڑ گیا
عجز و نیاز اپنا مقدّر نہ ہو سکے

استعفا دینے کے چند روز بعد میں علی گڑھ آیا اور ذاکر صاحب کو یہ ساری روداد سنائی۔ دو ڈھائی سال پہلے کراچی یونیورسٹی سے مجھے یہ پیش کش ہوئی تھی کہ میں وہاں اُردو کی پروفیسری پر آجاؤں مجھے پس و پیش تھا کیوں کہ میں ہندوستان میں رہنا چاہتا تھا مگر اُردو کی خدمت کے موقع کی وجہ سے

اسے آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میری بیوی تو اصرار کر رہی تھیں کہ میں اس پیش کش کو قبول کروں۔ میں نے اپنے والد اور اپنے خسر سے رائے لی۔ دونوں کی رائے یہ تھی کہ مجھے پاکستان نہ جانا چاہیے۔ پھر ذاکر صاحب سے مفصل بات ہوئی۔ انھوں نے یہ کہا کہ "آپ جانا چاہیں تو آپ کو روکوں گا نہیں مگر مجھے یہ محسوس ہوگا کہ میرا دایاں بازو ٹوٹ گیا"۔ بہر حال میں نے اس کے بعد یہ فیصلہ کر لیا کہ نہ جاؤں گا اور جیسے بھی حالات ہوں ان کا مقابلہ کروں گا۔ دراصل یہ آفر مولوی عبدالحق صاحب نے بھجوایا تھا۔ وہ میری بڑی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے ہی لکھنؤ یونیورسٹی میں مجھے ریڈر بنوایا تھا اور عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسری کے لیے ڈاکٹر ولی محمد سے جو وہاں کے وائس چانسلر ہو گئے تھے میری سفارش کی تھی۔ کراچی یونیورسٹی میں جب اُردو کی پروفیسری نکلی تو مولوی صاحب سے مشورہ کیا گیا۔ انھوں نے میرا نام تجویز کیا اور مجھے بھی خط لکھا۔ خط میں یہ بات بھی تھی کہ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بعد انجمن ترقی اُردو پاکستان کا کام سنبھالو اس لیے تمھیں یہ آفر بھجوایا ہے۔ بہر حال میں نہ گیا۔ اب استعفے کے بعد ذاکر صاحب کے مشورے سے آیندہ کی کسی صورت پر غور بھی کرنا تھا۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں کوئی صورت جلد نکالوں گا اور یہ بھی کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی مل لو۔ مولانا آزاد اس وقت وزیر تعلیم تھے۔ جب ۱۹۵۳ء میں ساہتیہ اکادمی قایم ہوئی تھی تو میں اس کا ممبر مقرر ہوا تھا اور اُردو کے مشاورتی بورڈ کا کنوینر۔ مولانا اس کے صدر تھے۔ بورڈ کے دو اور ممبر قاضی عبدالغفار اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ مولانا سے اکیڈمی کے جلسوں میں ملاقات ہوتی تھی اور وہ خاصے مہربان تھے۔ چنانچہ میں دلی جاکر مولانا آزاد سے ملا۔ مولانا نے کہا کہ "میرے بھائی! آپ استعفا دینے سے پہلے مجھ سے مل لیتے" میں نے کہا: آپ کے نزدیک میں نے استعفا دے کر غلطی کی۔ کہنے لگے نہیں میرے بھائی غلطی نہیں کی جلدی کی۔ بہر حال میں غور کروں گا۔ کہ آپ کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا کی ہدایت پر پروفیسر ہمایوں کبیر نے چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی کو اس سلسلے میں خط لکھا تھا۔

میں نے استعفا واپس لیا تھا تو یہ طے ہو گیا تھا کہ جلد قواعد میں اس بات کی صراحت کی جائے گی کہ پروفیسر کی عدم موجودگی میں سینیئر ریڈر شعبے کا صدر رہے گا۔ اس میں کئی مہینے لگ گئے۔ جولائی میں ذاکر صاحب لکھنؤ آئے تو انھوں نے کہا کہ اُن کے ایک دوست عطاء اللہ دُرّانی نے جو امریکہ میں ہیں

ایک عطیہ اس لیے دیا ہے کہ غالب کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے اور نول کشور پر ایک کتاب لکھی جائے۔ اس غرض سے سید حسین ریسرچ پروفیسر کی ایک جگہ علی گڑھ میں جلد قایم ہوگی آپ اس جگہ پر آجائیے۔ دوڈھائی برس کے بعد رشید صاحب ریٹائر ہونے والے ہیں اس کے بعد آپ پروفیسر اور صدر شعبہ ہوجائیں گے۔ میں نے ان سے فوراً کہا کہ غالباً رشید صاحب کو آپ توسیع ضرور دیں گے آپ کی تو ان سے پرانی دوستی ہے۔ میرے بھی عرصے سے بہت گہرے مراسم ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے انھیں توسیع نہ ملے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ ان کی توسیع کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میں تو عام طور پر توسیع کے خلاف ہوں۔ ابھی حال میں پروفیسر حبیب اور پروفیسر ہادی حسن کی جگہیں خالی ہوئی تھیں میں نے ان کے لیے اشتہار دلوایا جب کوئی موزوں آدمی نہ ملا تو سلکشن کمیٹی کی سفارش پر ان دونوں کو چار چار سال کے لیے دوبارہ مقرر کیا ہے۔ اب یہ موقع اچھا ہے۔ آہی جائیے۔ میں نے ان کے کہنے پر اقرار کرلیا۔

جب ۱۹۴۹ء میں ذاکر صاحب انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر مقرر ہوئے تھے تو انھوں نے مجھ کو لکھا تھا کہ آپ اس کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر آجائیے۔ اس وقت میں نے انھیں جواب دیا تھا کہ میں انجمن کا کل وقتی کارکن ہونا پسند نہیں کرتا اگر کبھی علی گڑھ آنا ہوا تو اعزازی خدمت کروں گا۔ اس کے بعد مولانا آزاد کے کہنے پر ذاکر صاحب نے قاضی عبدالغفار کو سکریٹری مقرر کیا تھا۔ مجھے انجمن کا لائف ممبر اور اُردو ادب کا ایڈیٹر۔ اردو ادب لکھنؤ سے جولائی ۱۹۵۰ء سے نکلنا شروع ہوگیا تھا یہ حسب سابق سہ ماہی تھا۔

۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی اُردو ہند کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ حیات اللہ انصاری کی کوشش سے ۲۰ لاکھ دستخط اس غرض سے جمع کیے گئے تھے کہ صدر جمہوریہ اُردو کو بھی دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اُترپردیش، بہار اور دہلی میں سرکاری زبان تسلیم کرنے کا اعلان کرے۔ ذاکر صاحب نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ہندی کے کچھ نادان دوستوں نے ہال کے باہر مظاہرہ کیا اور کسی نے حیات اللہ انصاری کو چاقو ماردیا۔ اس پر خاصی سنسنی پھیل گئی اور جب حیات اللہ اس حالت میں ہال میں داخل ہوئے کہ ان کی پشت پر خون کا خاصا بڑا دھبہ تھا تو لوگ مشتعل ہوگئے مگر پنڈت سندر لال نے مجمع کو سمجھایا اور ان کو کوئی بے جا حرکت

کرنے سے باز رکھا۔ کانفرنس بہرحال بہت اچھی ہوئی تھی۔

اسی دوران ایک سہ پہر کو ذاکر صاحب میرے گھر نعمت اللہ روڈ پر آئے۔ بیوی نے ان کے لیے میٹھے کی مٹھائی اور کچھ سموسے منگوا لیے تھے۔ جب ذاکر صاحب نے میٹھے کی مٹھائی دیکھی تو پلیٹ ہاتھ میں لے کر بڑے شوق سے کھانے لگے۔ مجھے چوں کہ معلوم تھا کہ یہ ذیابیطس کے مریض ہیں اس لیے پلیٹ اُن کے ہاتھ سے لے لی اور دوسری چیزیں سامنے رکھ دیں۔ ذاکر صاحب نے سخت احتجاج کیا کہ حضرت آپ مہمان نوازی کے سارے آداب بھول گئے۔ میں نے ہنس کر جواب دیا کہ کچھ بھی ہو جو چیز آپ کے لیے مضر ہے وہ میں آپ کو کھانے نہیں دوں گا۔ وہ بھی ہنس کر چپ ہو گئے اور میری بیوی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے پھر پلیٹ اُن کی طرف بڑھا دی مگر اب ذاکر صاحب نے بدپرہیزی نہ کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو سب سے پہلے میں نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں کان پور میں دیکھا تھا جب وہ خلافت کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے۔ میں اس وقت آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا مگر تقریر کی روانی کا احساس ہے۔ الہلال کے کچھ شمارے اور مولانا محمد علی کے کامریڈ کے کچھ شمارے میرے چھوٹے چچا نے مجھے بچپن میں دکھائے تھے۔ مولانا کے مضامین کا ایک انتخاب جو میرٹھ سے شایع ہوا تھا، پڑھ چکا تھا۔ علی گڑھ کے کچھ طلبا نے لیگ کے عروج کے زمانے میں اُن کے خلاف ایک مظاہرہ بھی کیا تھا وہ کلکتے جا رہے تھے۔ جب ریل علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی تو کچھ طلبا مولانا کے ڈبے میں گھس گئے اور اُن کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اُن کی طرف بڑھے۔ ہمایوں کبیر نے انھیں روکا تو کشمکش میں اُن کی قمیص تار تار ہو گئی۔ میں نے یہ افسوسناک واقعہ کچھ لوگوں سے سُنا تھا۔ اس کے بعد مولانا کو ۱۹۴۷ء کے دسمبر میں لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع میں دیکھا جو حافظ ابراہیم کی دعوت پر ہوا تھا۔ آزادی کے بعد مولانا کی یہ دوسری تقریر تھی۔ اس میں خطابت نہ تھی۔ کچھ سنجیدہ باتیں سنجیدگی سے اور ٹھہر ٹھہر کر بیان کی گئی تھیں۔ مسلمانوں کو فرقہ پرست سیاست ترک کرنے اور قوم پرست سیاست اپنانے کا مشورہ دیا گیا تھا اور یہ رائے بھی دی گئی تھی کہ وہ کانگریس میں شمولیت کریں تو بہتر ہے۔ پھر شاید چند ماہ بعد مولانا ایک دفعہ اور لکھنؤ آئے اور انھوں نے علومِ عربیہ کی تعلیم کی اصلاح کے موضوع پر خاصی لمبی تقریر کی۔ مولانا نے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے اس مسئلے پر ایک کمیٹی بنانے کا بھی اعلان کیا تھا۔ مولانا

کی یہ تقریر دو نشستوں میں ختم ہوئی۔ پہلی نشست کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی تھی، پھر کھانے کے لیے وقفہ ہوا۔ سہ پہر میں پھر کوئی پون گھنٹے مولانا نے تقریر کی۔ اس میں عربی اور علومِ اسلامیہ کی تعلیم اور اس کی تاریخ پر نہایت سیر حاصل بحث کی اور اس کی تدریس کی اصلاح پر خاص زور دیا۔ مولانا کی ایک اور تقریر میں نے دہلی میں ۱۹۵۲ء میں یومِ غالب کے موقع پر سنی۔ یہ تقریر کوئی دس پندرہ منٹ کی رہی ہوگی۔ اس میں مولانا نے کہا تھا کہ کسی زبان کی شاعری کی عظمت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ اس کا کتنا حصہ عالمی ادب کا جز کہا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا تھا کہ انیس کے مرثیے اور غالب کی کچھ غزلیں یقیناً اردو کی عالمی ادب کو دین ہیں۔ انھوں نے غالب کے اس شعر کا بھی حوالہ دیا تھا ؎

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

مولانا کی چوتھی اور آخری تقریر ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو انجمن ترقی اردو ہند کی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق ہے جس جگہ سے مولانا نے تقریر کی تھی وہیں ایک ہفتے بعد وہ دفن ہوئے۔ انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے میں چند روز پہلے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ تشریف لائیں۔ انھوں نے یہ درخواست منظور کر لی تھی۔ اُس وقت تک مولانا سے ساہتیہ اکیڈمی کی رکنیت کی وجہ سے کئی دفعہ بات ہو چکی تھی۔ انھیں کے کہنے پر ہم لوگوں نے انجمن کی قرارداد میں اُتر پردیش، بہار اور دہلی کے علاوہ پنجاب میں بھی اُردو کو سرکاری زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ مولانا کانفرنس میں سب مہمانوں کے بعد آئے تھے۔ جواہر لال نہرو جو افتتاح کرنے والے تھے کچھ پہلے آگئے تھے اور میں نے انھیں ان اردو کتابوں کی نمایش دکھائی تھی جو آزادی کے بعد شایع ہوئی تھیں۔ ان کی تعداد غالباً چھے ہزار سے زیادہ تھی۔ مولانا کی ایک خاص بات یاد آتی ہے۔ جب پنڈت سندر لال کا مولانا کا تعارف ذرا لمبا ہو گیا تو مولانا نے کہا اب تم ہی تقریر کیے جاؤ گے یا مجھے بھی کرنے دو گے۔ اس پر سندر لال بیٹھ گئے اور مولانا نے کوئی دس منٹ تقریر کی۔ ہم لوگ سرکاری پالیسی کے سلسلے میں کسی واضح اعلان کے منتظر تھے۔ یہ اعلان تو نہ ہوا ہاں مولانا نے صاف کہا کہ آزادی کے بعد اُردو کو ایک قومی زبان کی حیثیت سے اس کا حق

ملنا چاہیے اور اب جب کہ وزیر اعظم نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو امید ہے کہ یہ حق اسے ضرور ملے گا۔ مولانا کے انتقال کے وقت میں دلی میں تھا اور میں نے ان کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ کوئی پانچ چھ لاکھ کا مجمع رہا ہوگا۔ سکھ بڑی تعداد میں تھے۔ اس وقت جواہر لال نہرو کا مغموم چہرہ اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ نماز جنازہ کے وقت ہر شخص آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت جواہر لال نہرو اور بخشی غلام محمد نے مجمع کو قابو میں کیا تھا۔

مولانا سے ساہتیہ اکادمی کے جلسوں کے سلسلے میں ملاقات کے علاوہ ایک دفعہ سیّدین صاحب کی لڑکی کی شادی کے موقع پر بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس موقع پر سب لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ بوفے تھا۔ صرف مولانا کے لیے ایک کرسی رکھ دی گئی تھی۔ جواہر لال نہرو بھی تھے وہ بھی لوگوں سے مل رہے تھے مگر مولانا ایک طرف خاموش بیٹھے ہوئے تھے جس کو ملنا ہوتا تھا جا کر چند منٹ ان سے بات کر لیتا تھا۔

ایک واقعے کا ذکر ضروری ہے۔ ایک دفعہ مولانا نے مجھ سے کہا کہ آپ لکھنؤ میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ نول کشور کی اہم اردو مطبوعات EVERYMAN'S LIBRARY کے طرز پر سو جلدوں میں شایع کی جائیں آپ ان لوگوں سے بات کریں کہ وہ وزارت تعلیم کو امداد کے لیے ایک اسکیم بھیجیں۔ میں ایک لاکھ روپیہ اس کے لیے منظور کر دوں گا اس سے کافی کتابیں شایع ہو جائیں گی اور ان کی آمدنی سے یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ میں نے لکھنؤ آکر رام کمار بھارگوا سے بات کی جو اس وقت نول کشور کے کاروبار کے مالک تھے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ اب اردو کی کتابوں کی بازار میں مانگ نہیں رہی اس لیے یہ اسکیم نہ چل سکے گی۔ مولانا نے صرف ایک شرط لگائی تھی کہ کتابوں کے انتخاب کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی ہوگی جس میں مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر زور، قاضی عبدالغفار اور میں ضرور ہوں گے۔ حکومت اتر پردیش کے نمایندے بھی ہوں گے۔ جب ان لوگوں نے کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا تو میں نے مولانا کو مطلع کر دیا۔ انھوں نے بہت افسوس کیا۔ کوئی دس بارہ سال بعد راج کمار بھارگوا کے لڑکے رنجیت کمار بھارگوا نے کاغذات میں میرا خط دیکھا اور مجھ سے ملے۔ میں نے کہا "اب وہ پانی ملتان بہ گیا۔" مولانا ہوتے تو یہ اسکیم فوراً نافذ ہو جاتی۔ اب مجھے امید نہیں کہ کوئی وزیر تعلیم اس میں دلچسپی لے گا۔ پھر میں اب ان میں سے کسی سے اس سلسلے میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا کہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا نے نہ صرف انجمن ترقی

اُردو ہند کو امداد دی۔ وہ اُردو کے لیے ویسے بھی بہت کچھ کرتے رہتے تھے۔ دارالمصنفین کے لیے انھوں نے خاصی امداد دلوائی تھی۔ اس پر پرشوتم داس ٹنڈن نے پارلیمنٹ میں اعتراض کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اُردو کے لیے یہ سب ہو رہا ہے۔ ہندی کے فروغ کے لیے وزارت تعلیم کچھ نہیں کر رہی ہے۔ اسی پر مولانا نے وہ تقریر کی تھی جو پارلیمنٹ کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔

یہاں ایک لطیفہ بھی بیان کرنا ضروری ہے۔ ساہتیہ اکادمی اُس زمانے میں بھارتی کوتیا کے نام سے ہر سال ہندوستانی زبانوں کی نظموں کا ایک انتخاب شایع کیا کرتی تھی۔ اس کے لیے اُردو میں دس بہترین نظموں اور غزلوں کا انتخاب میرے سپرد کیا گیا تھا۔ میں نے جو انتخاب پیش کیا اس میں ایک نظم اخترالایمان کی بھی تھی۔ مولانا نے اس پر کہا کہ ان کی نظم کیسے شامل کریں ان کا تو نام ہی غلط ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اختر فارسی لفظ ہے اور ایمان عربی۔ ان دونوں کو عربی طریقے سے ملایا نہیں جا سکتا۔ میں نے جواب دیا کہ اس نام میں وہی غلطی ہے جو خورشیدالاسلام کے نام میں ہے۔ مولانا، خورشیدالاسلام کے شبلی پر ایک مضمون کی تعریف کر چکے تھے، میں نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہنے لگے آیئے سمجھوتہ کر لیں۔ یہ اپنا نام بدل دیں ہم ان کی نظم شامل کر لیں۔ اس لطیفے کو کسی نے اخترالایمان سے اس طرح بیان کیا کہ انھوں نے جل کر ایک نظم لکھ دی حالاں کہ میرے نزدیک یہ صرف 'مزاح المومنین' تھا۔

مولانا کی مخالفت کی جرات لوگوں کو کم ہی ہوتی تھی۔ جب یہ طے ہوا کہ ہر سال ساہتیہ اکادمی ہر ہندوستانی زبان میں سال کی بہترین کتاب پر پانچ ہزار کا انعام دیا کرے تو اُردو میں پہلے انعام کے لیے مولانا نے ظفر حسن خاں کی چھوٹی سی کتاب "آگ اور مشیت" تجویز کی۔ قاضی عبدالغفار اور ڈاکٹر زور تو خاموش رہے مگر میں نے عرض کیا کہ کچھ اور بھی اہم کتابیں شایع ہوئی ہیں اس لیے انعام میں دو مصنف شریک ہوں۔ مولانا نے کہا میرے بھائی یہ بڑا انعام ہے اسے تقسیم کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے پھر یاد دلایا کہ نوبل انعام بھی تقسیم ہوتا ہے مگر مولانا نہ مانے۔ چنانچہ یہی طے ہوا کہ ظفر حسن خاں کو انعام دیا جائے۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ دوسرا انعام بھی مولانا نے خود طے کیا تھا۔ یہ خواجہ احمد فاروقی کو ان کی کتاب "میر۔ حیات اور شاعری" پر ملا تھا اور مولانا کے انتقال کے چند روز بعد دیا گیا تھا۔ مولانا کے انتقال کے بعد انعام کا طریقہ بدل گیا۔ اب ممتاز ادیبوں سے کتابوں پر ریویو کرایا جاتا ہے اور

رائے اگزیکیوٹو بورڈ میں پیش ہوتی ہے۔ وہاں فیصلہ ہوتا ہے۔ انعام عام طور پر ادبی معیار کے لحاظ سے دیا جاتا ہے اور تخلیقی ادب کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن دوسری ادبی اصناف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ چناں چہ شاعری، ناول، تنقید، سوانح عمری، افسانے سبھی پر انعام دیے جاتے رہے ہیں۔ میں اکیڈمی کا ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۲ء تک تقریباً ۱۸ سال ممبر رہا ہوں۔

لکھنؤ میں مجلسوں کا خاصا رواج تھا۔ کچھ مجلسوں میں مَیں بھی شریک ہوا ہوں۔ ان میں ایک طرف تو خطابت کا خاص رنگ دیکھنے میں آیا۔ دوسرے تحت اللفظ پڑھنے کی روایت سے آشنا ہوا۔ میں نے آل رضا لکھنوی کی مجلس میں راجہ محمود آباد کو سُنا ہے اور ان سے بہتر تحت اللفظ پڑھنے والا کسی کو نہیں پایا۔ مہاراجا صاحب موسیقی کے ماہر تھے اور اُن کی آواز بہت اچھی تھی۔ مجلسوں میں خاص مقامات پر داد دینے کا رواج بھی تھا۔ شاید انیسؔ نے اسی لیے کہا ہے ؎

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقّت بھی ہو، تعریف بھی ہو

میرے نزدیک غزل کا پورا جادو تحت اللفظ میں آتا ہے۔ ترنّم میں الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور اُن کی اپنی کیفیت کا جادو کم ہو جاتا ہے۔

لکھنؤ میں مَیں نے لیڈروں کی تقریریں بھی سُنی ہیں۔ جواہر لال نہرو تو دراصل اُردو بولتے تھے بس کہیں کہیں ہندی کے الفاظ بھی استعمال کر لیتے تھے لیکن سردار پٹیل کی ہندی بھی آج کل کی سی شدھ ہندی نہیں ہوتی تھی۔ گووند بلبھ پنتھ کا لہجہ پہاڑی تھا مگر زبان آسان ہوتی تھی۔ کئی دفعہ ہرین مکرجی کی انگریزی کی تقریریں سنیں۔ یہ اپنے وقت کے مشہور مقرر تھے۔ شیاما پرشاد مکرجی کی بھی بڑی شہرت تھی۔ جب لکھنؤ یونیورسٹی یونین کے طلبا سے انھوں نے خطاب کیا تو طلبا نے انھیں خاصا پریشان کیا۔ انھوں نے اس زمانے میں جن سنگھ کی بنیاد ڈالی تھی۔ طلبا اس بات پر خوش نہ تھے۔ بار بار ان سے سوال کرتے کہ اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے لیے آپ کا پروگرام کیا ہے؟ انھوں نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ ان معاملات میں ہمارے مشیر آپ کے شعبۂ اقتصادیات کے صدر ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی ہیں۔ ہمارا پروگرام ان کے مشورے کے مطابق ہوگا۔ شیاما پرشاد مکرجی بھی بہت اچھے مقرّر تھے۔ ذاکر صاحب جب راجیہ سبھا کے صدر تھے تو میں نے ان سے بہترین مقرروں کے نام

پوچھے۔ انھوں نے کبھی شیاما پرشاد مکرجی اور ہیرین مکرجی کے نام لیے۔ اکبر نے غلط نہیں کہا تھا:

بات بنگالی کی سن، بنگالنوں کے بال دیکھ

خواتین میں جن سے ملاقات رہی اُن میں ڈاکٹر رشید جہاں کے علاوہ رنجنا سدھانتا، دیوکی پانڈے، رضیہ سجاد ظہیر قابلِ ذکر ہیں۔ رنجنا پروفیسر سدھانت کی صاحبزادی تھیں، پولٹیکل سائنس پڑھاتی تھیں۔ دیوکی پانڈے انگریزی کے شعبے میں تھیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کرامت حسین گرلز کالج میں اُردو پڑھاتی تھیں۔ دیوکی پانڈے ڈراموں میں بھی حصہ لیتی تھیں اور اچھی اداکاری کرتی تھیں۔ رضیہ سجاد ظہیر افسانے لکھتی تھیں۔ اُن کے افسانے پڑھنے کا انداز بہت دل کش تھا۔

جب میں رام پور سے آیا تھا تو دونوں لڑکوں، صدیق اور جاوید کو امیر الدولہ اسلامیہ انٹر کالج میں داخل کر دیا تھا۔ صدیق پہلے سال ہائی اسکول میں فیل ہو گیا اور صدیق اور جاوید پھر برابر ہو گئے۔ ہائی اسکول دونوں نے ساتھ پاس کیا۔ صدیق تو وہیں رہے مگر جاوید نے کرسچین کالج میں داخلہ لے لیا۔ لڑکی مہ جبین نے کچھ دن کرامت حسین گرلز کالج میں پڑھا۔ وہاں کی پرنسپل خاصی خوفناک قسم کی تھیں۔ ایک دفعہ لڑکی نے مجھ سے کہا کہ ابا اگرچہ ہم بندروں سے بہت ڈرتے ہیں لیکن اگر میڈم اور بندر دونوں کا سامنا ہو تو ہم بندروں کی طرف جائیں گے۔ پھر اس نے ہائی اسکول کی تعلیم گھر کے سامنے ایک اسکول میں حاصل کی جو پرائیوٹ طور سے علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان دلواتا تھا۔ یہ اسکول کھپریلا کہلاتا تھا کیوں کہ اس کی چھت کھپریل کی تھی۔ قرۃ العین نے بھی ہائی اسکول اسی کھپریلے سے کیا تھا۔ بیوی نے بھی پرائیوٹ طور پر ہائی اسکول کا امتحان دیا مگر پہلے سال انگریزی میں فیل ہو گئیں۔ غیر معمولی ذہانت کے باوجود انگریزی میں کمزور تھیں۔ دوسرے سال انھوں نے بھی ہائی اسکول پاس کر لیا۔ بعد میں انھوں نے پھلوں اور کھانوں کو محفوظ رکھنے کا کورس پاس کیا اور چمڑے کا کام سیکھ کر چمڑے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے پرس شوقیہ بنانے لگیں۔ عملی کاموں میں ان کا خوب دل لگتا ہے۔

عام طور پر لکھنؤ میں ہم لوگ خوش رہے۔ بہت سے اچھے لوگوں سے ملنا رہا۔ تعصب اور تنگ نظری کم نظر آئی۔ لوگوں میں ایک تہذیب اور نفاست دیکھی اور زبان میں ایک خاص لوچ۔ ایک دفعہ بدایوں سے لکھنؤ آ رہا تھا۔ سامان زیادہ تھا۔ میرا چھوٹا لڑکا ایک بکس پر بیٹھا ہوا تھا۔ سیتا پور میں

کوئی صاحب داخل ہوئے۔ انھوں نے لڑکے کو دیکھا تو کہنے لگے بھیا تم تو تختِ طاؤس پر بیٹھے ہوئے ہو۔ ہمارے گھر کی مہترانی سے برآمدہ صاف کرنے کو کہا گیا۔ وہاں کوئی ڈبہ رکھا تھا۔ اس نے کھول کر دیکھا اور کہا "بی بی اس میں تو دنیا بھر کی نعمتیں رکھی ہوئی ہیں"۔ لکھنؤ اب بہت بدلا ہے مگر ابھی پرانی وضع ختم نہیں ہوئی۔ کوئی پرانا آدمی مل جاتا ہے تو ضلع جگت سے باز نہیں آتا۔

لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں کسی نہ کسی ادبی کام کے سلسلے میں باہر بھی جاتا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں میسور میں اُردو کے پروفیسری کے انتخاب کے لیے سلیکشن کمیٹی تھی۔ میں اور رشید صاحب گئے تھے۔ میسور سے ہم لوگ سلطان ٹیپو کے مزار کو دیکھنے سرنگاپٹم بھی گئے تھے اور اوٹی بھی۔ یہ میسور سے کوئی سو میل جنوب میں بڑا پُرفضا پہاڑی مقام ہے۔ میسور سے کچھ فاصلے پر بانڈی پور ہے جہاں ہرن، چیتل، اور جنگلی ہاتھی بکثرت ہیں۔ میسور میں ہمارے ایک شاگرد عبدالقادر اور ان کے ایک دوست عبدالغفار سہیل نے ہماری بڑی خاطر کی تھی۔ سہیل بڑے ذہین اور طباع آدمی تھے۔ رشید صاحب کے بڑے مدّاح تھے۔ بعد میں انھوں نے ایک رسالہ 'ترقی' بھی جاری کیا تھا مگر یہ چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ سہیل کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ بھی آئے تھے اور میرے یہاں قیام کیا تھا۔ اس موقع پر جو ادبی نشست ہوئی تھی اس میں آنند نرائن مُلّا، جعفر علی خاں اثر، احتشام حسین، مجاز اور سلام مچھلی شہری بھی شریک تھے۔

۱۹۵۰ء میں بمبئی میں یومِ اکبر منایا گیا۔ نیاز صاحب اور میں لکھنؤ سے اس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ بمبئی میں کئی دن قیام رہا۔ اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی، شہاب الدین دسنوی، راجندر سنگھ بیدی، اعجاز صدیقی، شکیل بدایونی سے ملاقاتیں رہیں۔ میں نے اکبر کی ظرافت پر مقالہ پڑھا تھا۔ مشاعرے میں شکیل بدایونی سب سے زیادہ مقبول ہوئے تھے۔

چونکہ اس زمانے میں میری شاعری زوروں پر تھی۔ اس لیے ریڈیو کے مشاعروں کے علاوہ دوسرے مشاعروں میں شرکت کے لیے جون پور، بستی اور بارہ بنکی بھی گیا۔ بستی میں وہاں کی ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں قاضی عدیل عباسی تھے۔ یہ اُردو زبان کے فروغ کے لیے اکثر جلسے کیا کرتے تھے۔ ان کانفرنسوں میں میرے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین، فرقت کاکوروی، شمیم کرہانی، وامق جونپوری بھی شریک ہوتے تھے۔ جون پور کے مشاعرے میں بسمل سعیدی اور ہری چند اختر سے ملاقات ہوئی

بسمل بہت سلجھے ہوئے اور نک سک سے درست شعر کہتے تھے مگر مزاج میں کچھ کھردرا پن تھا ہری چند اختر بڑے گڑھے ہوئے آدمی تھے۔ نہایت بذلہ سنج، زبان پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے مشہور فارسی شاعر اور اقبال کے دوست گرامی کے بہت سے لطیفے سنائے۔ ایک یہاں لکھتا ہوں۔ اقبال نے انھیں لاہور بلایا تھا اور علی بخش کو انھیں لینے جالندھر بھیجا تھا۔ مئی کا مہینہ تھا۔ گرامی صاحب نے کہا، علی بخش تانگہ لے آو۔ میں ذرا بیگم سے رخصت ہولوں پھر چلوں گا۔ تانگہ آگیا۔ گرامی کو گھر سے آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ جب تانگے تک پہنچے تو نشست خاصی گرم ہو گئی تھی فوراً اتر پڑے اور کہا: علی بخش اب نہیں جائیں گے جاڑوں میں دیکھا جائے گا۔ ڈاکٹر (اقبال) سے کہہ دینا کہ تانگہ گرم ہو گیا تھا۔

١٩٥٤ء میں اعظم گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ دار المصنفین دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ شبلی کالج والوں نے یوم شبلی میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ میں اور احتشام گئے۔ دار المصنفین کا سادہ علمی ماحول پسند آیا۔ سارے رفیق ناشتا اور کھانا ساتھ کھاتے تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین، صباح الدین عبدالرحمن سے ملاقات ہوئی۔ مولانا عبدالسلام ندوی کو جون پور کے مشاعرے میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ یہ بڑے جید عالم تھے۔ شعر زیادہ تر داغ کے رنگ میں کہتے تھے۔ شبلی کو ان پر فخر تھا اور یہ واقعہ ہے کہ علم میں سید سلیمان ندوی سے کسی طرح کم نہ تھے۔

رشید صاحب سے مولانا اقبال احمد سہیل کا تذکرہ اکثر سنا تھا۔ اُن سے پہلی ملاقات ١٩٤٤ء میں ہوئی تھی جب میں رشید صاحب کے ساتھ بستی کی ایک کانفرنس میں علی گڑھ سے گیا تھا۔ جون کا مہینہ تھا، گرمی بہت تھی۔ گونڈے کے اسٹیشن پر مولانا سہیل آگئے۔ تھوڑی دیر تک رشید صاحب سے اُن سے مزاح المومنین ہوتا رہا۔ پھر انھوں نے اپنے شعر سنانے شروع کیے۔ اس کے بعد بستی تک نہ گرمی کا احساس تھا اور نہ کسی اور بات کا۔ ہم سب مولانا کے اشعار کی کیفیات میں محو تھے۔ چند شعر جو یاد آنے ہیں لکھتا ہوں ؎

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے
بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

پہنچی یہاں بھی شیخ و برہمن کی کش مکش
اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا
ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

مولانا بڑے قادر الکلام شاعر تھے اور کسی صنف میں بندھے نہ تھے۔ انھوں نے کئی معرکے کے قصیدے لکھے ہیں۔ پکے قوم پرست تھے اور آزادی کا انھوں نے بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ مگر بعد کے حالات نے انھیں بھی بہت ملول کیا۔ مولانا سہیل نے نشاطِ روح پر مقدمہ لکھ کر اصغر گونڈوی کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا تھا۔ وہ بڑے کامیاب وکیل بھی تھے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں اُن سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ غزل میں سیاسی موضوعات کو انھوں نے جس شعری کیفیت کے ساتھ سمویا ہے اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ میرے اس شعر کی انھوں نے بڑی تعریف کی تھی اور مجھے اس پر آج تک فخر ہے ؎

فروغِ کعبہ و بت خانہ ہے دو چار سجدوں سے
بڑی مشکل سے لیکن میکدہ آباد ہوتا ہے

خوشی کی بات یہ ہے کہ اب مولانا سہیل کا کلیات شایع ہو گیا ہے۔ اُن کے ادبی مرتبے کے ساتھ اب زیادہ انصاف ہو سکے گا۔ جولائی ۱۹۵۵ء میں سری نگر ریڈیو کی دعوت پر ایک مشاعرے کے سلسلے میں کوئی پندرہ سال بعد پھر سری نگر جانا ہوا۔ عمر انصاری، روش صدیقی، مجاز، قدیر لکھنوی بھی مدعو تھے۔ میرا، روش کا اور عمر انصاری کا حبیب احمد صدیقی کے یہاں قیام رہا۔ مجاز تو اب بجھ چکے تھے۔ سری نگر میں ذوالنورین سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ حضرت لکھنؤ میں ایک سرکاری افسر تو تھے ہی بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ چونکہ سری نگر پہلے گئے تھے اس لیے سارے قابلِ دید مقامات کی سیر کرنے کے باوجود نہایت بور ہو رہے تھے۔ کہتے تھے دو ایک دن میں واپس چلا جاؤں گا۔ پھر ہم لوگوں کا ساتھ ہو گیا۔ یہ ہمارے ساتھ گل مرگ گئے تو چہک رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ فطرت کا نظارہ کافی نہیں کوئی اپنی زبان اور اپنے دل کی بات سمجھنے والا بھی ہونا چاہیے۔ خواجہ غلام محمد صادق اس زمانے میں وزیر تھے۔ وزیرِ اعلیٰ غلام محمد بخشی تھے۔ صادق میرے پرانے ساتھی تھے۔ پڑھے لکھے آدمی مگر اپنے آپ کو لیے دیے رہتے تھے۔ بخشی ان کے مقابلے

ہیں واجبی علم رکھتے تھے مگر بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی اور شعر و ادب کے بڑے دلدادہ تھے۔ بخشی نے شعرا اور فن کاروں کی بڑی مدد کی ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم بھی تھے اور کیسا ہی پیچیدہ معاملہ ہو فوراً سلجھا دیتے تھے۔ کچھ کشمیری تو انھیں بادشاہ ثانی کہا کرتے تھے۔ ان کا ایک قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ایک دفعہ بانہال اور رام بن کے راستے میں ایک تیل کے ٹینکر کی وجہ سے جو پھنس گیا تھا دونوں طرف کار اور بسیں بڑی تعداد میں رک گئیں۔ اس راستے میں رام بن سے بانہال تک چڑھائی ہے۔ نیچے چناب شور کرتا ہوا بہتا ہے۔ بخشی صاحب کو خبر ہوئی فوراً پہنچے۔ پھر حکم دیا کہ تیل کے ٹینکر سے سب تیل نکال لیا جائے اور اسے نیچے چناب میں پھینک دیا جائے۔ اس کے ڈرائیور سے کہا کہ تم دو دن بعد آ کر سکریٹریٹ میں ملو تمھارا ہرجانہ دلوا دیا جائے گا ان کے اقدام کی وجہ سے ٹریفک چند گھنٹوں میں چالو ہو گیا۔

ہائی اسکول کے زمانے ہی سے اقبال سے بہت متاثر تھا۔ مجھے بانگ درا کی بہت سی نظمیں یاد ہو گئی تھیں۔ کالج میں اگرچہ سائنس کا طالب علم رہا مگر اردو اور انگریزی ادب کا بھی مطالعہ کرتا رہا۔ اب تک یاد ہے کہ فرسٹ ایر میں میں نے ہارڈی کے کئی ناول پڑھے اور JUDE THE OBSCURE پڑھ کر تو میں رو دیا تھا۔ مطالعے میں کوئی خاص ترتیب نہ تھی۔ انگریزی فکشن میں ڈکنس، جین آسٹن، اسکاٹ کالج میں پڑھ چکا تھا۔ برنارڈ شا کے بہت سے ڈرامے بھی۔ ایک انگریزی استاد نے ہڈسن کی GREEN MANSIONS بڑی تعریف کے ساتھ عنایت کی کہ اسے پڑھ ڈالو۔ پڑھا تو وادی امیزن کے پراسرار جنگلوں نے مبہوت کر دیا۔ رائیڈر ہیگرڈ کے کئی ناول پڑھ ڈالے۔ فرسٹ ایر میں کالج والے ہر طالب علم کو عہد نامہ جدید NEW TEESTAMENT کا ایک نسخہ عطا کرتے تھے وہ اکثر میرے زیر مطالعہ رہتا خصوصاً SERMON ON THE MOUNT تو یاد ہو گیا تھا۔ میرا اس کتاب سے شغف دیکھ کر کلاس کے کچھ ساتھیوں نے یہ کتاب کہیں چھپا دی۔ یہ پھر کئی مہینے بعد کالج لائبریری کی ایک دراز سے مل گئی تو بڑی خوشی ہوئی۔ سینٹ جانس کالج میں روزانہ عبادت ہوتی اور ہر سنیچر کو ایک بیس منٹ کا لکچر۔ یہ مسیحی مذہب پر ہوتا تھا۔ کالج میں بعض مشہور مسیحی مفکر اور واعظ بھی آتے تھے۔ میں ان کی تقریریں بڑے شوق سے سنتا۔ ایک مشہور واعظ اسٹینلی جونس تھے۔ ان سے ہر کلاس کے کچھ منتخب طلبا کو خاص طور سے ملایا گیا اس کے بعد پرنسپل ہالینڈ نے جو مجھ پر بہت مہربان تھے مجھ سے پوچھا کہ جونس کے لکچر تمھیں کیسے لگے؟ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں تو ان لکچروں کے بعد اپنے مذہب اسلام کا اور زیادہ قائل ہو گیا۔ اس کے

بعد پرنسپل صاحب نے مجھ سے اس طرح کی گفتگو نہ چھیڑی ہاں وہ بدستور مہربان رہے۔ کالج میں حامد حسن قادری اور اُن کے بڑے بھائی عابد حسین فریدی استاد تھے۔ قادری صاحب اُردو اور فریدی صاحب فارسی پڑھاتے تھے۔ میں کالج کے مشاعروں میں شریک ہوتا تھا اور اُردو کی چھوٹی سی لائبریری کی بیشتر کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ نیاز پڑھتا ہے کر لی۔ ایس سی کے پہلے سال تک میں گھر پر کورس کی کتابیں کم ہی پڑھتا تھا۔ انگریزی اور اُردو ادب زیادہ تر زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ علی گڑھ آیا تو خواجہ منظور حسین صاحب نہ صرف کلاس میں مجھے پڑھاتے تھے بلکہ اپنی وسیع لائبریری سے پڑھنے کو کتابیں بھی دیتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ کتابیں زیادہ تر تنقید کی ہوتی تھیں۔ مگر ان کی لائبریری سے میں نے ڈی۔ ایچ لارنس کی بدنام کتاب LADY CHATTERLEY'S LOVER بھی لے کر پڑھی۔ پھر شعبے میں منظور صاحب کے علاوہ محمود حسین صاحب اور مختار حامد علی اور یونیورسٹی میں خواجہ غلام السیدین، رشید صاحب، بشیر احمد ہاشمی، اشفاق حسین سے ملنا ہوتا۔ ان سب کے خیالات نے بھی مجھے متاثر کیا۔ میگزین کا اڈیٹر ہونے کی وجہ سے بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ رشید صاحب کے یہاں ذاکر صاحب، عابد صاحب، اصغر گونڈوی، مولانا عبدالماجد سے ملاقات ہوئی۔ جب "انگارے" ۱۹۳۲ء کے آخر میں شایع ہوئی تو میں نے اس پر اعتراضات تو کیے تھے مگر اس کے فنِ افسانہ نگاری میں تجربات کا اعتراف بھی تھا۔ جب ۱۹۳۴ء میں سجاد ظہیر دوبارہ ہندوستان آئے تو منظور صاحب کے ساتھ میرے یہاں بھی آئے اور انھوں نے مجھے اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ علی گڑھ کا میں سکریٹری ہو جاؤں۔ انجمن کے جلسے کئی سال ہوئے، اس کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ اس کے جلسوں میں ڈاکٹر علیم اور خواجہ منظور حسین بھی ہوتے۔ خواجہ غلام السیدین اور رشید صاحب بھی۔ اختر انصاری بھی اور سید بشیر الدین لائبریرین بھی۔ میں ۱۹۳۶ء کی لکھنؤ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں تو شریک نہ ہوا تھا مگر دوسری میں جو غالباً ۱۹۳۹ء میں ہوئی شرکت کی تھی۔ اس وقت دوسری جنگِ عظیم کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر ازہر قدوائی جب انجمن کے سکریٹری ہوئے تو اکثر جلسوں میں شریک ہوا مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ نہ چلا۔ لکھنؤ پہنچا تو ذہنی طور پر ترقی پسندوں سے خاصا قرب محسوس کرتا تھا۔ سردار جعفری کی تحریک پر آزادی کے بعد آل انڈیا ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس دسمبر کے آخر میں ہوئی تو میں استقبالیہ کمیٹی کا سکریٹری تھا۔ میرے گھر بیرو روڈ پر ہر اتوار

کو پابندی سے جلسے ہونے لگے اور یہ سلسلہ جب میں ۱۹۵۲ء میں نعمت اللہ بلڈنگ میں منتقل ہو گیا تو وہاں بھی جاری رہا۔ اس زمانے میں کمونسٹوں سے بھی خاصی قربت رہی۔ کمونزم کا میں نے ہمدردی سے مطالعہ کیا اور سوشلزم کا قایل ہو گیا مگر کمونزم میرے گلے سے نہ اترا۔ شاید بچپن کے مذہبی ماحول کا یہ اثر تھا۔ میں مذہب کی روحانی طاقت، اس کے اخلاقی مشن اور سیرتِ رسولؐ کے آفاقی پہلوؤں کا ہمیشہ قایل رہا ہوں۔ جب ۱۹۴۸ء میں کمونسٹ پارٹی میں اختلاف ہوا اور پی۔ سی۔ جوشی کے بجائے رنڈیوے سکریٹری جنرل ہوئے تو کمونسٹوں میں شدت پسندی آئی۔ مجھے یاد ہے کہ رشید جہاں سے اکثر اس پر بحث ہوتی۔ میں بھیمڑی کانفرنس کی ان قراردادوں کو جو ادب سے متعلق تھیں انتہا پسند سمجھتا تھا۔ رشید جہاں چونکہ پکی کمونسٹ تھیں اس لیے وہ ان کی تائید کرتی تھیں۔ میں نے کرسٹوفر کاڈویل کی تینوں کتابیں ILLUSION AND REALITY, STUDIES IN A DYING CULTURE, اور FURTHER STUDIES IN A DYIND CULCURE پڑھی تھیں۔ رالف فاکس کی NOVEL AND THE PEOPLE کا اس زمانے میں بہت چرچا تھا وہ بھی پڑھ ڈالی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو میں ایک ایسا مشترکہ ادبی محاذ سمجھتا تھا جو ادب میں زندگی کے حقایق پیش کرے۔ جو مریض روحانیت اور توہم پرستی کی مخالفت کرے۔ جو آزادی اور ایک منصفانہ سماج کے لیے ذہن کو بیدار کرے۔ اس میں اس زمانے میں معروف کمونسٹ ادیبوں کے علاوہ آنند نراین مُلاّ جیسے انسان دوست کانگریسی بھی شرکت کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد فضا بدلی اور یہ بات ظاہر ہوئی کہ کمونسٹ پارٹی انجمن ترقی پسند مصنفین پر اپنی گرفت رکھنا چاہتی ہے۔ ایک کانفرنس میں کچھ والنٹیروں نے یہ نعرے لکھ کر لگائے کہ مارکسزم ہی صحیح ترقی پسندی ہے مگر ڈاکٹر علیم نے نعرے ہٹوا دیے۔ اُن کا یہ جملہ معنی خیز تھا کہ بات تو درست ہے مگر اس کا اظہار اس طرح مناسب نہیں۔ ترقی پسندی اور نئے ادب میں شروع میں فرق نہ تھا اور منٹو کو بھی ترقی پسند سمجھا جاتا تھا۔ منٹو کے افسانے 'بُو' پر جب اعتراضات ہوئے تو سجاد ظہیر نے ۱۹۴۴ء کی اُردو کانگریس حیدر آباد کے ترقی پسند ادب کے شعبے کی صدارت کرتے ہوئے 'بو' کو عریاں اور قابلِ اعتراض قرار دیا۔ اس کی مولانا حسرت موہانی نے مخالفت کی اور کہا کہ عریانی ادب میں جائز ہے۔ ہاں عریانی اور فحاشی میں فرق کرنا چاہیے۔ میں اس زمانے میں یہ مانتا تھا کہ ادب کا کوئی نظریہ ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ ہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جو زندگی

کے زیادہ سے زیادہ امکانات کا احاطہ کرے۔ مگر یہ بھی مانتا تھا کہ بغیر نظریے کے بھی اچھا ادب تخلیق ہو سکتا ہے۔ میری ترقی پسندی انسان دوستی کی علمبردار تھی، کمیونزم کی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں کمیونزم کا کبھی مخالف نہیں رہا۔ سرمایہ داری اور رجعت پسندی کا ہمیشہ مخالف رہا اور اکثر معاملات میں بائیں بازو کی سیاست اور کمیونسٹ فکر کو درست سمجھتا رہا۔ سیکولر ذہن مجھے زیادہ تر کمیونسٹوں میں ہی ملا۔ ہندو فرقہ واریت کی مخالفت کمیونسٹوں نے ہمیشہ کھل کر کی۔ زبان کے معاملے میں بھی کمیونسٹوں کا رویہ عام طور پر صحت مند رہا۔ یہ ضرور ہے کہ ہندی کے بعض مشہور ترقی پسند مثلاً یشپال جب انجمن ترقی اردو ہند کے اُتر پردیش میں اُردو کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے کے مطالبے کی مخالفت میں سامنے آئے تو ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے ان کی مذمت نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندی کے ادیب ہندو احیا پرستی سے خاصے متاثر ہوئے ہیں اور جب اُردو دوست دستور کے مطابق اقلیتوں کے مطالبے پر سرکاری طور پر اُردو کو تسلیم کرانے پر اصرار کرتے ہیں تو ان لوگوں کو ایک اور پاکستان کا ہوّا نظر آتا ہے۔

میرے خیالات شروع سے قوم پرستانہ رہے ہیں۔ علی گڑھ میں بھی جہاں ۱۹۳۸ء کے بعد مسلم لیگ کا بہت زور ہو گیا تھا میں ذاکر صاحب سے قُرب کی وجہ سے لیگ کے پروپگنڈے سے متاثر نہ ہو سکا۔ میں اقبال سے بہت متاثر ہوں مگر اُن کے ۱۹۳۰ء کے خطبے اور جناح کے نام خطوط میں جس طرح دو قوموں کے نظریے کی حمایت جھلکتی ہے اس سے متفق نہیں ہو سکا۔ میرے نزدیک قومیت صرف مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ علاقائی، لسانی، تہذیبی خصوصیات کی بنا پر بھی وجود میں آتی ہے اور اس میں قوم کے افراد میں یک جہتی کا احساس بھی ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مذہب کی اہمیت کو کم کیا جا رہا ہے۔ مذہب کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ میں تو اس معاملے میں مولانا آزاد کے رام گڑھ کے خطبے کا قائل ہوں جس میں صاف کہا گیا ہے کہ اسلام کا تیرہ سو سال کا سرمایہ ہماری وراثت ہے اور ہم اس سے کسی حال میں دستبردار نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ہم ہندوستانی قومیت کا ایک ایسا اہم حصہ ہیں جس کے بغیر اس کا تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ گویا زور اسلامی شناخت اور قومی شناخت دونوں پر ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے میری شناخت میرا مذہب، میری زبان، میرا علاقہ اور اس کے ساتھ ہندوستان کی مشترک تہذیب کا سارا سرمایہ ہے۔ میں مسلمان بھی ہوں،

ہندوستانی بھی ، اردو زبان بولنے والا بھی اور مغربی اتر پردیش کا باسی بھی ۔ مجھے تو ان میں سے کسی پہلو میں کوئی ٹکراؤ نہیں معلوم ہوتا ۔ یہ پہلو ایک دوسرے کو تب و تاب دیتے ہیں اور مل کر اس وجود کو تشکیل دیتے ہیں جو میں ہوں ۔ میرا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں رہا ۔ میں اد کا طالب علم ہوں ۔ کہہ سکتا ہوں کہ دانشوری میرا طریق کار اور ادب میرا عشق ہے ۔ میں صرف ہندو اور مسلمان ، سنّی اور شیعہ کے خطوط پر نہیں سوچتا ۔ مجھے فخر ہے کہ آنند نرائن ملّا اور راجندر سنگھ بیدی جیسے لوگوں سے میری گہری دوستی رہی ہے ۔ بشیر حسین زیدی ، عابد حسین ، غلام السیدین شیعہ تھے مگر میرے لیے بڑی محبوب ہستیاں ہیں ۔ شعبۂ اردو میں مجھ سے پہلے کوئی شیعہ استاد نہ تھا ۔ میرے زمانے میں دو استاد رکھے گئے ۔ کشمیر میں میں نے ایک کشمیری پنڈت کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کا فیلو بنایا ۔ میں صلاحیت دیکھتا ہوں ان نفرتوں کی پروا نہیں کرتا ۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ آزادی کے بعد ملک کی اکثریت میں ہندو احیا پرستی بڑھی ہے اور کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو گوارا نہیں کر سکتے ۔ یہ تنگ نظری اور تعصب ملک کی ترقی کے لیے سم قاتل ہے

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو دلی میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہم دو سو سال کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں ۔ مگر لکھنؤ میں گووند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ یو پی نے کہا تھا کہ ہم ہزار سال کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں ۔ جواہر لال نہرو انگریزوں کی غلامی کی طرف اشارہ کر رہے تھے ۔ پنت جی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ مسلم حکمرانوں کے دور میں بھی ہندوستان غلام تھا ۔ حالانکہ جب یہ مسلمان ہندوستان میں بس گئے تو ہندوستانی ہو گئے ۔ جب ۱۹۶۳ء میں دلی میں جشنِ ظفر منایا گیا تو جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ مغل ہمارے ہیں ۔ وہ مغلوں کی حکومت کو بدیسی نہیں سمجھتے تھے ۔ کیوں کہ گو بابر باہر سے آیا تھا مگر اس کا خاندان یہاں بس گیا اور وہ ہندوستانی ہو گئے ۔ آزادی کے بعد جواہر لال نہرو کی کوششوں کے باوجود ہندو احیا پرستی بڑھی اور ملک کی تقسیم کی وجہ سے اکثریت کے ایک گروہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف برہمی کے جذبات بھی ۔ گاندھی جی کی شہادت سے اس ہندو پرستی کو خاصی ضرب لگی ۔ مگر کچھ عرصے بعد جن سنگھ کے قیام اور آر ۔ ایس ۔ ایس کی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ احیائی قوتیں پھر طاقت پکڑنے لگیں ۔ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے ملک کو صحیح سمت دی ۔ وہ چاہتے تھے کہ نیا ہندوستان سچی جمہوریت بنے اور اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری کی جائے ۔ جواہر لال نہرو کی زندگی

میں ہندو جارحیت کو بہر حال بڑھنے سے روکا گیا۔ اندرا گاندھی بھی شروع میں باپ کے نقشِ قدم پر چلیں مگر بعد میں وہ موقع پرست ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولرزم ہمارا وظیفۂ لب ہے دل کی دھڑکن نہیں۔ دستور میں لسانی اقلیتوں کے لیے خاصا تحفظ ہے۔ مگر ہندی ریاستوں میں اُردو کے چلن پر پابندی لگائی گئی اور اُردو کو پاکستان سے وابستہ کیا گیا تو انجمن ترقی اُردو ہند نے ۲۲ لاکھ دستخطوں سے صدر کو ایک عرضداشت پیش کی کہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ان ریاستوں میں جہاں اُردو بولنے والوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہے اُردو کو بھی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ مگر ہندی والوں نے عام طور پر اس کی مخالفت کی۔ حکومت نے بھی اس معاملے میں تغافل برتا۔

لکھنؤ میں ادب سے دلچسپی خاصے بڑے وسیع حلقے میں دیکھنے میں آتی تھی۔ ادبی جلسوں میں خاصی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ مشاعروں میں عام طور پر شاعروں کا کلام توجہ سے سنا جاتا تھا۔ صرف یونیورسٹی کے مشاعروں میں ہڑبونگ ہوتی تھی کیوں کہ یہاں سامعین میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوتی تھی جو اُردو زبان زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور مشاعروں کو صرف تفریحی چیز سمجھتے تھے۔ ادبی کانفرنسوں میں بھی مجمع اچھا خاصا ہو جاتا تھا۔ یہ جلسے زیادہ تر گنگا پرشاد میموریل ہال میں ہوتے تھے جو امین آباد میں تھا اور پنڈت کشن پرشاد کول اس کے نگراں تھے۔ کول صاحب خود لکھنوی تہذیب کے بڑے اچھے نمایندے تھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔ کئی ناول اُن سے یادگار ہیں۔ انھوں نے متعدد تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے۔ کول صاحب انجمن ترقی اُردو ہند کی ریاستی شاخ کے صدر بھی تھے۔ اُردو کی حمایت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ میرے زمانۂ قیام میں ایک اور ادبی شخصیت مہاراجہ محمود آباد کی تھی۔ انھیں اشعار بہت یاد تھے۔ مرثیہ تحت اللفظ پڑھنے میں اُن کا ثانی نہ تھا۔ ان کی خاندانی لائبریری ان کی ریاست محمود آباد میں تھی اور اس میں ہزاروں مخطوطات اور نادر مطبوعات تھے۔ مہاراجہ صاحب مسلم لیگ کے ممتاز لیڈروں میں سے تھے۔ مگر میں جب بھی اُن سے ملتا تھا تو گفتگو زیادہ تر زبان کے مسائل اور شعرا کی خصوصیات پر ہوتی تھی۔ عربی فارسی کے ان الفاظ کو جو اُردو میں آکر اصل کے مطابق نہیں بولے جاتے وہ اصل کے مطابق ہی بولتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے غالبؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو آج اُس کے حریفانہ کھینچیے

میں نے عین کو کسرہ کے ساتھ پڑھا تھا۔ انھوں نے فوراً ٹوکا۔ حضرت عجز فتحہ کے ساتھ ہے۔ میں نے کہا مگر اُردو میں تو اب کسرہ کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے اور میں اسے جائز سمجھتا ہوں، مگر وہ نہ مانے اور اپنی بات پر جمے رہے۔ مہاراجا محمود آباد بعد میں پاکستان چلے گئے تھے وہاں ان کا دل نہ لگا۔ پھر عراق اور لندن چلے گئے۔ لندن میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ میں نے ۷۰ء۱۹ میں انھیں لندن میں سوٹ میں دیکھا تھا اس وقت وہ اسلامک سنٹر کے ڈائرکٹر تھے۔

مولانا حسرت موہانی سے علی گڑھ میں ملاقات ہو چکی تھی وہ کبھی کبھار لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ آخر میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے مگر اُن کا موقف سب سے الگ تھا۔ ہر جلسے میں ان کی تنہا آواز عام رائے سے مختلف ہوتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے مولانا سے کہا کہ میں آپ کے "انتخاب سخن" کا پورا سیٹ خریدنا چاہتا ہوں کہاں سے ملے گا۔ فرمایا جب کانپور آؤ تو میرے گھر سے لے لینا۔ پھر کسی ادبی سلسلے میں کانپور جانا ہوا تو میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا، فوراً باہر نکلے اور مجھے لے جا کر ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر میں سُتلی سے بندھا ہوا انتخاب سخن کی دس یا گیارہ جلدوں کا سٹ لا کر دیا اور کہا کہ اس کی قیمت ۴۵/- ہے۔ آپ روپے لائے ہیں؟ میں نے فوراً کہا جی ہاں اور مطلوبہ رقم پیش کر دی۔ یہ بیش بہا سلسلہ جو بادامی تیتلی کاغذ پر چھپا ہوا ہے ابھی تک میرے پاس ہے۔ دیوانِ حسرت بھی ہے مگر افسوس ہے میں نے ان کے وہ رسالے حاصل نہیں کیے جن میں محاسن سخن اور معایب سخن خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اب یہ رسالے کم یاب ہیں۔ اُتر پردیش اردو اکیڈمی نے حال میں انتخابِ سخن کا ایک نیا ایڈیشن شایع کر دیا ہے مگر چوں کہ اس میں عکس اسی بادامی کاغذ سے لیا گیا ہے اس لیے حروف خاصے دھندلے آئے ہیں۔ بہر حال یہ محفوظ تو ہو گیا۔

حامد اللہ افسر اور علی عباس حسینی سے بھی لکھنؤ میں ملنا ہوتا تھا۔ افسر صاحب نے بچوں کے لیے بعض بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ میرے نزدیک ان کی یہ نظمیں مولوی اسماعیل میرٹھی کی نظموں کے بعد سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی کے ساتھ ایک کیفیت ہوتی تھی۔ افسر صاحب

چھوٹے قد کے گول مٹول سے آدمی تھے۔ باتوں میں کچھ نعلی جھلکتی تھی۔ ان کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ علی عباس حسینی ہمارے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہیں۔ انھوں نے اردو ناول کی ایک تاریخ بھی لکھی ہے۔ گو اس میں کہیں کہیں تنقید سے زیادہ تقریظ کا رنگ آگیا ہے۔ ایک دفعہ میری اُن سے اس سلسلے میں بات ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہمیں لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ تنقید سے خواہ بجا ہی کیوں نہ ہو ان کی دل شکنی ہوتی ہے۔ میں اُن سے اس سلسلے میں متفق نہ ہو سکا۔ کیوں کہ میرے نزدیک اچھی تنقید نہ صرف خوبیوں اور خامیوں دونوں کی نشان دہی کرتی ہے بلکہ قدروں اور معیاروں کی بھی نشان دہی کرتی ہے۔ حسینی صاحب جب اپنے افسانے کسی محفل میں سناتے تھے تو بالکل مشاعروں کی طرح انھیں اچھے جملوں پر داد ملتی تھی۔ انھوں نے ناول، افسانے، ڈرامے بہت کچھ لکھے۔ مسعود حسن رضوی سے اُن کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ لکھنؤ کی تہذیب اور وضع داری کے وہ بڑے اچھے نمایندے تھے۔ ٹھورو کے والڈن کا انھوں نے ساہتیہ اکیڈمی کے لیے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

اس زمانے میں صفی لکھنوی کے ساتھ اُن کے بھائی ظریف لکھنوی کی بھی بڑی شہرت تھی۔ صفی صاحب سے نوگلا صاحب کی مہربانی سے ملاقات بھی ہوئی تھی، مگر ظریف صاحب کو صرف دو ایک مشاعروں میں دیکھا اور سُنا۔ ظریف صاحب کا کلام اُن کے انتقال کے بعد صفی صاحب کی ترتیب کے مطابق شایع ہوا تھا۔ ان کی غزلوں میں مجھے وہ ظرافت نظر آئی جس میں ایک تکلّف بھی ہے۔ ان کے طنز کا نشانہ زیادہ تر نئی روشنی اور جدید نسل تھی۔ ان کی وہ نظمیں مجھے زیادہ قابلِ قدر نظر آئیں جن میں الکشن، دیہاتی شعرا اور عراق کے ایک سفر کا خاکہ ہے۔ ان کے حسبِ ذیل اشعار سے ان کی ظرافت کے معیار کا کچھ علم ہو سکتا ہے ے

وحشت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے — مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

نئی تہذیب تجھ میں ہے نرالا جذب پنہانی — دھرم ہندو کا غائب اور مسلماں کی مسلمانی
بڑھے گی روشنی جس طرح گھٹتا جائے گا سایہ — نظر آئے گی ہر شے اُف رے جلووں کی فراوانی

ہاتھ میں سگرٹ کا ڈبہ، پاؤں میں ڈاسن کا بوٹ
بلبلاتا آرہا ہے اُشتر بغداد قوم

جس جگہ اُستاد نے دو چار گجلیں جھاڑ دیں
شاعروں نے ہو کے سر مندہ بیاجیں پھاڑ دیں

لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ سیاسیات میں ایک ممتاز اُستاد وی۔پی مینن تھے۔ ہم لوگ اکثر سیاسی مسائل پر اُن سے مستند کتابوں کے سلسلے میں مشورہ کرتے تھے۔ اچاریہ نریندر دیو اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں انھیں پروفیسر بنانا چاہتے تھے مگر یونیورسٹی کی سیاست کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ بعد میں وہ پٹنہ چلے گئے تھے۔ ان کی بیوی مسز لکشمی مینن بعد میں مرکز میں اور اقوام متحدہ میں ممتاز عہدوں پر رہیں۔ ایک اور استاد چودھری محمد سلطان تھے۔ سندیلے کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی سماجی زندگی میں اُن کا خاصا رسوخ تھا۔ انھوں نے کوئی علمی کام تو نہیں کیا مگر اچھے استاد سمجھے جاتے تھے۔ باتیں دلچسپ کرتے تھے۔ ان میں کسی نہ کسی طرح اپنے خاندان اور گھر کے رسم ورواج کا بھی فخریہ انداز میں تذکرہ ہوتا تھا۔ ان کا ایک لطیفہ ایک زمانے میں بہت مشہور تھا۔ انھوں نے کہا تھا ہمارے گھر میں خواتین جو عطر استعمال کرتی ہیں ان کی وجہ سے یہ ہوتا ہے کہ دھوبی جب کپڑے دھونے کے لیے لے جاتا ہے تو چونکہ محلے اور لوگوں کے بھی کپڑے دھوتا ہے اس لیے ان سب کے کپڑوں میں اس عطر کی خوشبو آجاتی ہے۔ رشید صاحب کو جب میں نے یہ لطیفہ سُنایا تھا تو وہ بہت محظوظ ہوئے تھے۔ چودھری صاحب بعد میں علی گڑھ آگئے تھے اور صدر شعبہ بھی ہو گئے تھے۔

سلام سندیلوی نے شروع میں میری نگرانی میں اُردو رباعی پر پی۔ایچ۔ڈی کے لیے کام کیا تھا اور خاصا مواد جمع کر لیا تھا۔ میرے لکھنؤ سے چلے آنے کے بعد احتشام صاحب کی نگرانی میں اسے مکمل کیا۔ بڑے محنتی آدمی تھے۔ پہلے وہ لکھنؤ میں ایک اسکول میں تھے۔ پھر گورکھپور یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے۔ انھوں نے خاصا ادبی کام کیا ہے اور کئی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ بہت اچھے استاد ثابت ہوئے اور اپنے طلبہ کے ادبی ذوق کی انھوں نے خاصی تربیت کی۔

مجھے ہی نہیں میری بیوی کو بھی لکھنؤ پسند تھا۔ وہ تو میرے لکھنؤ چھوڑنے پر خوش نہیں تھیں۔ میری بیوی کو شعر وادب سے بہت دلچسپی ہے۔ اُن کا مطالعہ بھی خاصا وسیع ہے۔ وہ لکھنؤ کے اکثر ادبی جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور مشاعرہ تو شاید ہی انھوں نے کوئی چھوڑا ہو۔ علی گڑھ

اُردو ادب کا ایک بڑا مرکز ہے مگر لکھنؤ میں میرے زمانے میں ادبی سرگرمیاں زیادہ تھیں۔ گھر پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں اور ادیبوں اور شاعروں کے آتے رہنے کی وجہ سے ان کا وقت اچھا گزر جاتا تھا یہ بات علی گڑھ میں نہ ہو سکی۔

میری صرف ایک ملاقات کنھیا لال کپور سے ہوئی ہے۔ وہ عام طور پر سفر کم کرتے تھے، مگر کسی طرح ایک دفعہ لکھنؤ ریڈیو والوں نے انھیں بلا ہی لیا۔ ایک دن میرے یہاں آئے۔ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہ سلیم اور انارکلی کی داستان کا جدید روپ ڈرامے کی شکل میں لکھ رہے تھے۔ اس میں انھوں نے کسی نہ کسی طرح میرا ایک شعر بھی درج کر دیا تھا۔ ملاقات میں اس کا تذکرہ کیا۔ ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا اور نثر ہی نہیں ہم عصر شاعری پر بھی گہری نظر تھی۔ کپور کا خاکہ "غالب ترقی پسند شعرا کی محفل میں" میرے نزدیک اُن کا شاہکار ہے۔ یوں بھی وہ ہمارے اہم مزاح نگاروں میں ہیں اور اُن کا کارنامہ غیر فانی ہے۔ اُردو زبان و ادب سے اُن کی محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

لکھنؤ میں چونکہ علاوہ یونیورسٹی کی مصروفیات اور ادبی کاموں کے اُردو تحریک کے سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا اس لیے مجھے حکومت کی بعض شخصیتوں سے ملنے اور اُن کے طرزِ عمل کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ آزادی کے بعد وزیرِ تعلیم سمپورنانند تھے۔ وہ یوں تو سوشلسٹ خیالات کے حامی کہے جاتے تھے مگر ہندی کے ممتاز ادیب اور اُردو کے مخالف تھے۔ کئی دفعہ کسی نہ کسی وفد کے ساتھ اُن سے ملا اور ہر دفعہ اُن کے طرزِ عمل سے بڑی مایوسی ہوئی۔ پہلی دفعہ جمعیتہ العلمار ہند کے ایک نمائندے کے ساتھ ملا۔ ان سے پہلے ہم گووند بلبھ پنت سے ملے تھے۔ انھوں نے صاف کہا آپ سمپورنا نند سے بات کیجیے۔ دوسرے دن ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہمارے مطالبات دیکھ کر فرمایا کہ پہلے تین مطالبے تو آپ مرکز کے سامنے رکھیے۔ یہ اُن لوگوں سے متعلق ہیں۔ باقی کے متعلق کہا کہ اُتر پردیش میں کچھ شہروں کو چھوڑ کر ساری ریاست کی زبان ہندی ہے۔ اس پر میں نے انھیں یاد دلایا کہ ۱۹۴۷ء تک ہائی اسکول بورڈ کے امتحان میں انگریزی کا تیسرا پرچہ انگریزی میں ترجمے کا ہوتا تھا جس کے لیے طلبہ سے پوچھا جاتا تھا کہ ان کی زبان ہندی ہے یا اُردو۔ اس میں دو تہائی تعداد ہندی والوں کی اور ایک تہائی اُردو والوں کی ہوتی تھی جب کہ مسلمانوں کی آبادی ریاست میں

کبھی دافی صد سے زیادہ نہیں رہی۔ اس پر ارشاد ہوا کہ یہ سب انگریزوں کی کارستانی تھی ورنہ حقیقت وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں، پھر کہنے لگے آپ اُردو والوں کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں اگر لوگ ہندی نہیں پڑھیں گے تو آئندہ انھیں روزگار نہیں ملے گا۔ میں نے عرض کیا کہ ہندی تو لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہے اس کو پڑھنے سے کسی کو انکار نہیں ہم تو چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم اُردو میں ہو اور اعلیٰ تعلیم کی منزل پر بھی اُردو پڑھی جا سکے۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ دوسری دفعہ ملاقات ہوئی تو وفد کے لیڈر مولوی عبدالحق تھے۔ سمپورنانند ایک بنیائن اور دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کا نام ضرور سُنا ہوگا مگر انھوں نے اُن سے بھی ڈھنگ سے بات نہ کی۔ تیسری دفعہ جب وفد اُن سے ملا تو ڈاکٹر صاحب کی سرکردگی میں۔ اس سے پہلے اُن کی طرف سے یہ اعلان ہوا تھا کہ اُتر پردیش میں سب کی مادری زبان ہندی ہے۔ ہم لوگ پہنچے تو ایک چھوٹے سے کمرے میں انھوں نے وفد کو بلایا۔ ہم لوگ سات آٹھ آدمی تھے۔ یہ تو انھوں نے شروع ہی میں کہہ دیا کہ ہمارا وہ سرکلر واپس لیا جا رہا ہے جس میں سب کی مادری زبان ہندی قرار دی گئی ہے۔ باقی سارے مطالبات انھوں نے رد کر دیے۔ اس کے بعد میں نے رشید صاحب کو خط لکھا تھا جس میں سمپورنانند کے طرزِ عمل کی شکایت کی تھی۔ رشید صاحب نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ میں سمپورنانند کی بے حسی کو کیا دیکھوں مجھے تو گاندھی جی کی دردمندی یاد ہے۔ ویسے سمپورنانند میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ یہ وقت کے بہت پابند تھے اور وزیرِ اعلیٰ پنت جی کی طرح ہر جگہ دیر میں آنے کی بجائے یہ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے تھے۔ درباداری بھی انھیں پسند نہ تھی۔ صرف کام کی بات کرتے تھے۔ جب یہ وزیرِ اعلیٰ ہوئے تو ٹھیک نو بجے یومِ آزادی کے موقع پر جھنڈا لہرانے کے لیے آ گئے۔ وہاں دریاں بچھ رہی تھیں اور مائک لگ رہا تھا، ان حضرت نے جا کر جھنڈا لہرایا اور پھر کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ جب یہ جا رہے تھے تو لوگ تقریب میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔

پرشوتم داس ٹنڈن اُتر پردیش میں ہندی تحریک کے رہنما تھے اور کانگریس کے ممتاز رکن۔ ایک زمانے میں صدر بھی ہو گئے تھے۔ جب جغرافیات PALEANTOLOGY کے انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے لیے جواہر لال نہرو لکھنؤ آئے تو ڈائس پر ان کے پاس پرشوتم داس ٹنڈن بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریر کرتے ہوئے پنڈت جی نے ان سے پوچھا کہ PALEANTOLOGY کو

ہندی میں کیا کہیں گے؟ ابھی ٹنڈن جی کوئی جواب نہ دے پائے تھے کہ جواہر لال نہرو نے کہا آپ یقیناً اس کے لیے کوئی سنسکرت کا مشکل لفظ گھڑ لیں گے مگر سوچیے تو سہی کہ انگریزی کی اس اصطلاح کو بعینہٖ لے لینے میں کیا حرج ہے۔ اس دور میں بہت سے نئے الفاظ انگریزی میں دوسری زبانوں سے بے تکلف لیے جا رہے ہیں۔ ہم کچھ ایسے لفظ انگریزی سے کیوں نہ لے لیں جن کے مترادف لفظ ہمارے یہاں نہیں ہیں۔ ایران میں اس زمانے میں یہ روش بڑھ رہی تھی کہ عربی الفاظ کی بجائے خالص فارسی الفاظ استعمال کرنے چاہییں۔ ٹنڈن جی اس سے بہت خوش تھے۔ جب اصغر علی حکمت ایک وفد کے ساتھ لکھنؤ آئے تو اُن کے سکریٹری کے طور پر وائس چانسلر نے مجھے مقرر کیا۔ ایک استقبالیہ میں ٹنڈن جی نے مجھ سے کہا کہ وہ اصغر علی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں اُن کا مطلب سمجھ گیا تھا اس لیے میں نے حکمت کو پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ یہ حضرت آپ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ بعد میں حکمت نے بتایا کہ انھوں نے اسی روش سے متعلق معلومات چاہی تھیں اور میں نے یہ کہہ کر انھیں خاموش کر دیا کہ ہاں ادھر یہ رجحان ضرور بڑھا ہے مگر ادیب اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جو الفاظ صدیوں سے زبان میں استعمال ہوتے ہیں اُن کو ٹاٹ باہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹنڈن جی پر اُن کی باتوں سے کچھ اوس سی پڑ گئی۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند کی وجہ سے اُتر پردیش میں آزادی کے بعد ہندی کو صرف ہر شعبے میں نافذ ہی نہیں کیا گیا بلکہ اُردو کے چلن اور اس کے فروغ میں دشواریاں بھی پیدا کی گئیں۔ جب مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے اس سلسلے میں ہدایات آئیں تو وہ بیشتر نظر انداز کر دی جاتیں۔ سہ لسانی فارمولا کے نفاذ میں بھی یہ ترکیب رکھی گئی کہ تیسری زبان کے طور پر جدید ہندوستانی زبان کے بجائے آٹھویں شیڈول کی کوئی زبان رکھی گئی۔ آٹھویں شیڈول میں سنسکرت بھی شامل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ثانوی اسکولوں میں سنسکرت کا تو عام طور پر انتظام کیا گیا اُردو کا انتظام صرف چند جگہوں پر ہوا اور وہ بھی بہت سے مطالبات اور عرضداشتوں کے بعد۔ ہائی اسکول میں اُردو میں جواب دینے کی اجازت اگرچہ کاغذ پر رہی مگر عملاً معدودے چند کو ہی اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ یہ ایک دلخراش داستان ہے کہ کس طرح آزادی کے بعد پندرہ بیس برس میں اُتر پردیش میں ہندی کا راج ہو گیا اور اُردو کو اپنے گھر میں غیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ جواہر لال نہرو جب لکھنؤ آتے تو وہ اس تنگ نظری پر احتجاج ضرور کرتے تھے مگر چوں کہ تعلیم ریاست کے

دائرہ اختیار میں ہے اس لیے نتیجہ کچھ نہ نکلتا تھا۔ ایک زمانے میں اس سلسلے میں نیشنل ہیرالڈ میں بہت سے مضامین اور خطوط شایع ہوئے تھے۔ جب میں نے ایک خط میں یہ لکھا کہ ایک علاقے میں ایک سے زیادہ علاقائی زبانیں ہو سکتی ہیں اور اس بات کا دستور کے بانیوں کو احساس تھا ورنہ وہ دفعہ ۳۴۷ دستور میں کیوں رکھتے تو چنتامنی کے صاحبزادے نانڈو نے جو ہندی کے ایک ممتاز ادیب تھے جواب دیا کہ "ایورسٹ کی چوٹی پر ایک ہی آدمی کے کھڑے ہونے کی گنجایش ہے۔" اُتر پردیش کی سیکڑوں میل میں پھیلی ہوئی ریاست کے لیے جس کی آبادی دس کرور ہے اور جس میں غازی آباد سے مغل سرائے تک ریل کے سفر میں اُردو کے چلن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ دلیل کتنی مضحکہ خیز ہے۔

میں ۲۰ نومبر ۱۹۵۵ء کو شب کی گاڑی سے نو برس لکھنؤ میں گذارنے کے بعد علی گڑھ کے لیے روانہ ہوا۔ علی گڑھ میں چوں کہ مکان کا اُس وقت تک انتظام نہیں ہوا تھا اس لیے ذاکر صاحب نے اپنے ساتھ قیام کی دعوت دی تھی۔ یہ طے کر کے کہ ایک مہینے بعد بیوی بچوں کو بلالوں گا میں لکھنؤ سے رخصت ہوا۔ اسٹیشن پر بہت سے دوست احباب رخصت کرنے آئے۔ کسی نے کہا کہ آپ جا تو رہے ہیں مگر آپ کو چند ماہ بعد واپس آنا ہے کیوں کہ یونیورسٹی کے قوانین میں تبدیلی ہونے والی ہے اور آپ پھر صدر شعبہ ہوں گے۔ ان سے تو میں نے کچھ نہیں کہا مگر اپنا ایک شعر زیر لب گنگنایا ؎

یوں تو بیٹھے رہے اُس در پہ ہم اک عمر سرور
جب چلے آئے تو پھر رُخ نہ اُدھر ہم نے کیا

علی گڑھ

(دسمبر ۱۹۵۵ء - مارچ ۱۹۷۴ء)

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

میں یکم دسمبر ۱۹۵۵ء کو صبح دس بجے علی گڑھ پہنچا۔ ذاکر صاحب نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ چوں کہ شاہ سعود آنے والے ہیں اس لیے اولڈ بوائز لاج میں جگہ نہیں ہے اور آپ کا قیام فی الحال میرے ساتھ ہوگا۔ چناں چہ ان کے یہاں جا کر سامان رکھا۔ شعبے میں جا کر رشید صاحب سے ملا۔ اور اس کے بعد لائبریری گیا وہاں بہت سے پُرانے ساتھیوں سے ملاقات ہوگئی۔ شاہ سعود ۲ دسمبر کو آنے والے تھے اور اُن کے استقبال کی ہر طرف تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دوسرے دن زیدی صاحب، بیگم زیدی اور پرنس نجم الدین بھی آگئے۔ شاہ سعود کے اعزاز میں بڑا جلسہ ہوا۔ اُس دن جمعہ تھا۔ طے یہ تھا کہ شاہ سعود نماز پڑھائیں گے۔ چناں چہ اُن کے لیے ذاکر صاحب نے مائک کا انتظام کر دیا مگر اُن کے آنے سے پہلے مسجد میں کسی نے وہ مائک امام کی جگہ سے ہٹا کر ایک طرف کونے میں کھڑا کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ مائک کا استعمال نہ ہونے پائے۔ مگر شاہ سعود جب آئے تو انھوں نے مائک کونے سے اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور اُن کی قرأت کو سارے نمازیوں نے سُنا۔ نماز کے بعد کچھ لوگوں نے مائک کے استعمال پر اعتراض بھی کیا مگر شاہ سعود کی موجودگی میں بات آگے نہ بڑھی۔ خیر اب تو مائک کا آزادی سے استعمال ہوتا ہے۔

میں ۱۴ دسمبر تک ذاکر صاحب کے یہاں رہا۔ اُس زمانے میں اُن سے ناشتے اور کھانے پر اور پھر رات میں دیر تک باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے بڑے درد سے کہا کہ سرور صاحب آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے کچھ دوست ہمیں شیعہ اور کمیونسٹ دونوں سمجھتے ہیں۔ میں نے پوچھا آخر کیوں؟ کہنے لگے میں نے انتظامیہ میں ان سب لوگوں کو لیا ہے جو میرے خیال سے اچھے پرووسٹ ہو سکتے ہیں کچھ دوستوں کو اس پر اعتراض ہے۔ میں نے کہا: ذاکر صاحب ان باتوں کا خیال نہ کیجیے آپ یہاں بڑا اچھا کام کر رہے

ہیں۔ ہر شعبے میں نئی جان معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے آپ کو یونیورسٹی کے مفاد کے لیے سبھی کا تعاون حاصل کرنا اور سبھی سے کام لینا ہے۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب کو ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے احتیاط اور پرہیز کی تاکید کی تھی مگر ذاکر صاحب پرہیز نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دن ذاکر صاحب نے ملازم سے کہا کہ بیر سے جو منٹر آیا ہے وہ سرور صاحب کے لیے لاؤ۔ یہ دراصل گائے کا گوشت ہوتا ہے جو قوجیوں کے لیے خاص طور سے تیار کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا ذاکر صاحب مجھے ایسے گوشت کا کوئی خاص شوق نہیں بس کھا لیتا ہوں۔ وہ نہ مانے۔ چناں چہ ایک پلیٹ میں گوشت کے کچھ پارچے لائے گئے۔ سب سے پہلے ذاکر صاحب نے اُن پر ہاتھ صاف کیا۔ ایک ٹکڑا میں نے بھی کھایا۔ ذاکر صاحب نے ملازم سے کہا دیکھو گھر میں کسی کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ میں نے بدپرہیزی کی ہے۔ وفادار ملازم خاموش ہو گیا۔ میں نے ضرور کہا کہ آپ کو" ہر گز نہ کھانا چاہیے۔ کہنے لگے سب چلتا ہے اتنے مزے کی چیز کیسے چھوڑ دوں۔

اُس زمانے میں قاضی عبدالغفار صاحب بہت بیمار تھے انھیں دل کی تکلیف تھی۔ میں انھیں دیکھنے گیا تو اندازہ ہوا کہ مرض خاصا بڑھ گیا ہے۔ وسط جنوری میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ میں کرسمس کی تعطیل کے بعد بال بچوں کو لکھنؤ سے لے آیا تھا ایک مہینہ محمود حسین صاحب کے ساتھ قیام رہا جو اس زمانے میں رجسٹرار تھے اور جن سے میرے خاصے گہرے مراسم تھے۔ پھر تاروالے بنگلے میں سیّد عبدالجلیل صاحب کا مکان مل گیا۔ وہ پاکستان جانے والے تھے قاضی صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر علیم اور مسعود حسین خاں میرے پاس آئے اور انھوں نے تحریک کی کہ میں قاضی صاحب کی جگہ انجمن کا کام سنبھال لوں۔ میں نے کہا کہ اگر ذاکر صاحب کی یہ خواہش ہوگی تو میں ضرور غور کروں گا۔ دوسرے دن ذاکر صاحب کے یہاں گیا تو انھوں نے خود یہ ذکر چھیڑا۔ انھوں نے یاد دلایا کہ انجمن کا صدر ہونے کے فوراً بعد انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں انجمن کا کل وقتی سکریٹری ہو جاؤں اور میں نے اُس وقت یہ کہا تھا کہ میں اگر علی گڑھ میں موجود ہوا تو اعزازی خدمت کے لیے تیار ہوں۔"اب قاضی صاحب کے انتقال کے بعد سکریٹری کی جگہ خالی ہوئی ہے آپ اعزازی طور پر کام سنبھال لیں"۔ میں نے آمادگی ظاہر کر دی اور ۱۹ر جنوری کو ذاکر صاحب نے تقرر کا خط مجھے بھیج دیا۔ چارج لینے کے بعد شام کو ذاکر صاحب کے یہاں پہنچا تو عابد صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس تقرر پر بڑی مسرّت کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سرور صاحب کو ایک جوائنٹ سکریٹری کی بھی ضرورت ہوگی اس کے لیے سردار جعفری موزوں

رہیں گے۔ ذاکر صاحب لیٹے ہوئے تھے اٹھ کر بیٹھ گئے اور جوش میں آکر کہنے لگے کہ عابد صاحب آج ہی سرور صاحب نے چارج لیا ہے وہ جب یہ محسوس کریں گے کہ انھیں ایک جوائنٹ سکریٹری کی ضرورت ہے تو اس مسئلے پر غور کیا جائے گا ابھی سے آپ کو کسی کا نام پیش کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ عابد صاحب فوراً کہنے لگے۔ جانے دیجیے۔ اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر ذاکر صاحب حالاں کہ عابد صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے مگر اُن کے اس طرح کسی کی سفارش کرنے سے دیر تک جز بز رہے۔

ذاکر صاحب صرف وائس چانسلر ہی نہیں تھے وہ علی گڑھ کی ذہنی زندگی کے رہنما تھے۔ اُس زمانے میں کتابیں چھپوانے کے لیے مالیات فراہم کرنا یونیورسٹی کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ذاکر صاحب نے ہر شعبے کے سربراہ سے کہہ رکھا تھا کہ کسی علمی موضوع پر کتاب چھپوانا ہو تو وہ وسائل کہیں نہ کہیں سے مہیا کریں گے۔ ان سے کوئی ملنے جاتا تو اس سے پوچھتے کہ آج کل کیا پڑھ رہے ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں۔ کوئی استاد یا طالب علم ان سے مل کر رخصت ہوتا تو یہ محسوس کرتا کہ کچھ بصیرت لے کر جا رہا ہے۔ ذاکر صاحب کی یہ عادت نہیں تھی کہ خود ہی گل افشانیِ گفتار کے جوہر دکھاتے رہیں وہ دوسروں کی بات بڑے غور سے سنتے تھے، اپنی بات چند جملوں میں کہتے تھے مگر ان جملوں میں علم کا ایک مواج سمندر ہوتا۔ ویسے وہ صرف علمی سطح پر ہی بات نہیں کرتے تھے۔ روزمرہ کی اونچ نیچ، پروگرام، کسی کی علم کی نمائش یا لن ترانی پر ہنس بھی لیا کرتے تھے۔ خود اپنی کسی کمزوری کا بھی پُر لطف انداز میں ذکر کرتے۔ ایک مرتبہ جرمنی کے ایک سفر کا ذکر کیا۔ اُن کو جرمنی سے کسی اور ملک جانا تھا غالباً آسٹریا۔ اب یہ ایک ایجنسی کے دفتر میں گئے وہاں جو خاتون تھیں اُن سے اس طرح بات کی۔ گویا پاسپورٹ، ویزا، ریل کے اوقات، کرنسی کی مشکلات ان سب کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں کوئی اللہ کا بندہ پابندی کی اس سے انھیں نکال لائے تو کیا کہنے۔ ان خاتون نے تھوڑی دیر میں یہ سب کام کر دیے۔ اب صرف یہ رہ گیا تھا کہ انھیں کوئی ریل کے اسٹیشن پہنچا دے۔ انھوں نے کچھ کہا نہیں۔ خاتون کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا۔ وہ اٹھی اور اپنی ایک ساتھی سے کہنے لگی۔ میں انھیں ذرا اسٹیشن تک چھوڑ آؤں "پاپا شا" اکیلے وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے۔ اس لفظ پاپاشا کا مزہ وہی جانتا ہے جو یورپ میں کسی معروف کارکن سے سفر کے سلسلے میں دوچار ہوا ہو۔ یہ لفظ ترکوں کے یورپ پر اثرات کی ایک یادگار ہے۔ رشید صاحب نے دریافت کیا کہ وقتِ رخصت آپ اُن خاتون سے گلے

تو ملے ہوں گے۔ کہنے لگے ہمّت ہی نہیں ہوئی۔

میرا اپنا کام یہ تھا کہ میں غالب کے دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کروں، نیز ایک فیلو کے کام کی نگرانی کروں جسے نول کشور کی خدمات پر کام کرنا تھا۔ پہلے نسیم قریشی کو رشید صاحب کے مشورے سے فیلو مقرر کیا مگر ابھی انھوں نے فہرست سازی کا کام بھی انجام نہیں دیا تھا کہ اُن کا تقرّر عارضی طور پر شعبۂ اُردو میں ہو گیا اس لیے دوسرا انتظام کرنا پڑا۔ اس کے بعد میں نے اپنے لکھنؤ کے ایک شاگرد نادر علی خاں کو مقرر کیا۔ یہ بڑے مخلص اور باصلاحیت آدمی ہیں۔ انھیں مواد جمع کرنے میں کچھ دیر لگی مگر پھر انھوں نے خاصی محنت کر کے تین سال میں اُردو میں نول کشور کی خدمات پر خاصا مواد جمع کر دیا۔ اس مواد کو پھر انگریزی میں منتقل کرنا تھا کیوں کہ عطاءاللہ درّانی صاحب جو معطی تھے چاہتے تھے کہ نول کشور پر کتاب انگریزی میں ہو۔ یہ کام بھی بالآخر انجام پا گیا۔ میں نے ترجمے کا کام شروع کیا ہی تھا کہ کچھ تو انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میری مصروفیات بڑھ گئیں، دوسرے ذاکر صاحب کے مشورے سے وائس چانسلر زیدی صاحب نے مجھے ۱۹۵۶ء کے آخر میں سرسید ہال کا پرووسٹ مقرر کر دیا۔ مجھے اس مزید ذمّہ داری کے لینے میں تامّل تھا مگر ذاکر صاحب اور زیدی صاحب کے اصرار پر اسے بھی قبول کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درّانی صاحب کا کام مکمّل کرنے میں خاصی دیر ہو گئی۔ مگر بالآخر ۱۹۶۱ء میں میں نے دیوانِ غالب اُردو کا پورا ترجمہ اور نول کشور پر انگریزی میں ایک اچھا مقالہ ان کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

مارچ یا اپریل ۱۹۵۶ء میں ذاکر صاحب کو یونسکو کی کمیٹی کے اجلاس کے سلسلے میں ملک سے باہر جانا پڑا۔ انھیں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ مولانا آزاد انھیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیرمین بنانا چاہتے تھے۔ ذاکر صاحب نے اُن کی یہ پیش کش قبول بھی کر لی تھی مگر اس عرصے میں ملک کی سیاست میں ایک خاص لہر آئی۔ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیمِ نو کا اصول کانگریس پہلے ہی منظور کر چکی تھی اس پر عمل بھی ہوا۔ مگر نہ معلوم کیوں مہاراشٹر اور گجرات کو الگ ریاست قرار نہیں دیا گیا بلکہ بمبئی کی ریاست کو جوں کا توں رکھا گیا۔ ہو سکتا ہے یہ اُس وقت کے بمبئی کے وزیرِ اعلیٰ مُرارجی ڈیسائی کی وجہ سے ہوا ہو یا جواہر لال نہرو کا یہ خیال ہو کہ بمبئی کی ریاست کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے۔ اس پر بمبئی میں مظاہرے ہوئے اور کچھ لوگوں کی جانیں گئیں۔ ادھر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ نے جو

مرکزی کابینہ میں وزیر مال تھے اور مہاراشٹر سے تعلق رکھتے تھے وزارت سے احتجاج کے طور پر استعفا دے دیا۔ اُس زمانے میں رسم یہ تھی کہ جب کوئی وزیر استعفا دیتا تو پارلی منٹ میں اس سلسلے میں بیان بھی دیتا۔ دیش مکھ نے اپنے بیان میں جواہر لال نہرو کو ایک آمر ٹھہرایا اور آخر میں احسان دانش کا ایک شعر پڑھا۔ اس شعر کو سن کر جواہر لال نہرو بہت مضطرب ہوئے اور انھوں نے اپنے پارلی منٹری سکریٹری سعادت علی خاں سے جو حیدر آباد سے تعلق رکھتے تھے اور جنھیں بہت شعر یاد تھے تقاضا کیا کہ موقع کی مناسبت سے کوئی شعر بتائیں۔ انھوں نے اکبر کا یہ شعر انھیں لکھوایا اور جواہر لال نہرو نے اپنے جواب میں اپنی پالیسی کا دفاع کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا اور یہ کہہ کر پڑھا کہ دیش مکھ صاحب نے ایک پاکستانی شاعر کا شعر سنایا ہے میں اپنے وطن الٰہ آباد کے ایک شاعر کا یہ شعر ان کی نذر کرتا ہوں ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

غرض ہوا یہ کہ جب دیش مکھ نے وزارت کے بارے رہا ہو کر مہاراشٹر کو الگ ریاست بنانے کے لیے جد و جہد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو مولانا آزاد نے انھیں بلایا۔ دیش مکھ مولانا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مولانا نے یو۔ جی۔ سی کی صدارت کی پیش کش اُن کو کی اور چوں کہ وہ مولانا آزاد کی بات ٹال نہ سکتے تھے اس لیے انھوں نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ ذاکر صاحب کو قدرتی طور پر اس کا رنج ہوا کہ مولانا نے خود ہی اُن سے کہا اور پھر اُن سے بات کیے بغیر دیش مکھ صاحب کو یو۔ جی۔ سی کا صدر بنا دیا۔ اگر مولانا ذاکر صاحب کو بلا کر یہ بات صاف کر دیتے کہ کن حالات میں انھیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا تو ذاکر صاحب کو اتنا رنج نہ ہوتا مگر مولانا خاموش رہے۔ میرے نزدیک مولانا کا یہ قدم غلط نہ تھا۔ انھیں دیش مکھ کی صلاحیت کے علاوہ اس بات کا بھی خیال تھا کہ اس طرح وہ ملک میں کانگریس کی مخالف جماعتوں کے آلۂ کار نہ بنیں گے۔ مگر ذاکر صاحب پر یہ مجبوری واضح کر دینی چاہیے تھی چوں کہ ایسا نہیں ہوا اس لیے ذاکر صاحب مولانا سے کھنچ گئے۔ کچھ عرصے بعد مولانا کو یہ احساس ہوا کہ ذاکر صاحب ان سے ملتے نہیں اور انھوں نے ہمایوں کبیر کو جو ان کے سکریٹری تھے ذاکر صاحب کے پاس بھیجا۔ ہمایوں کبیر نے مولانا کی طرف سے یہ بات کہی کہ اب تو

آپ سے (ذاکر صاحب سے) ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ اس پر ذاکر صاحب کی پٹھانی رگ جوش میں آئی اور انھوں نے ہمایوں کبیر کو یہ جواب دیا کہ جتنا فاصلہ کنگ ایڈورڈ روڈ (مولانا کی قیام گاہ سے) اوکھلے کا ہے اتنا ہی اوکھلے سے کنگ ایڈورڈ روڈ کا ہے۔ اس کے بہت دن بعد کسی طرح دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مولانا نے ذاکر صاحب سے معذرت کی اور ذاکر صاحب کا دل صاف ہو گیا۔ اس بات کا ذکر ذاکر صاحب نے مولانا کے انتقال کے بعد اُن کی یاد میں پہلے پبلک جلسے میں کیا تھا۔ میں اس جلسے میں موجود تھا۔

ذاکر صاحب جولائی ۱۹۵۶ء میں اپنے غیر ملکی دورے سے واپس آ گئے تھے انھوں نے اپنے جانشین کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ پہلے اُن کا خیال یہ تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کو جو جنوبی ہند کے سر سیّد کہلاتے تھے اپنا جانشین بنائیں گے چنانچہ اُن کو پرو وائس چانسلر بنا دیا تھا اور ذاکر صاحب جب ملک سے باہر جاتے تھے تو ڈاکٹر عبدالحق قایم مقام وائس چانسلر بھی ہوتے تھے۔ مگر جب علی گڑھ میں میڈیکل کالج قایم کرنے کا سوال اٹھا تو حکومت ہند اپنے قواعد کے مطابق کالج کے لیے تو امداد دینے کو تیار تھی مگر اسپتال کے لیے امداد صرف وہ ریاست دے سکتی تھی جس میں علی گڑھ واقع ہے یعنی اُتر پردیش کی حکومت۔ اُتر پردیش کی حکومت اسپتال کے لیے امداد دینے کو تو تیار تھی مگر ایک ایسی شرط لگا رہی تھی جو علی گڑھ والوں کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ شرط یہ تھی کہ کالج میں طلبا کا داخلہ مقابلے کے ایک امتحان کے ذریعہ ہوگا جس کی نگرانی ریاستی حکومت کرے گی۔ اس میں اندیشہ یہ تھا کہ علی گڑھ کے بہت کم طلبا مقابلے میں آ پائیں گے۔ چنانچہ اُتر پردیش کی حکومت سے بات کرنے ذاکر صاحب کو بار بار لکھنؤ جانا پڑتا تھا۔ مگر اس وقت کے وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا اپنے موقف پر اڑے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب انھیں کسی طرح شیشے میں نہ اتار پائے۔ ڈاکٹر عبدالحق چوں کہ جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے اس لیے شمالی ہند میں وہ قریب قریب اجنبی تھے ایسے میں ذاکر صاحب کی نگاہ کرنل بشیر حسین زیدی پر پڑی جو رام پور میں چیف منسٹر رہ چکے تھے۔ اس وقت لوک سبھا کے ممبر تھے اور اب دہلی میں اُن کا قیام تھا۔ ذاکر صاحب کو یہ بھی معلوم تھا کہ زیدی صاحب کے چندر بھان گپتا سے اچھے مراسم ہیں۔ چنانچہ انھوں نے زیدی صاحب کو اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے اس ارادے کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ

زیدی صاحب کو تو انھوں نے تیار کر لیا ہے کہ وہ علی گڑھ آجائیں مگر بیگم زیدی اپنے شوہر کے علی گڑھ جانے کے خلاف ہیں۔ انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ تم بھابی (بیگم زیدی) سے بات کرو مجھے امید ہے تم انھیں راضی کر سکو گے۔ چناں چہ میں نے اُن سے بات کی۔ وہ غصے میں آگ ہو گئیں اور کہنے لگیں بشیر جو چاہیں کریں میں تو ہرگز دہلی نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے یہاں ہندوستانی تھیٹر کا کام شروع کر دیا ہے مجھے اس کو جاری رکھنا ہے مگر وہ میرا بڑا خیال کرتی تھیں اور میں نے ان کو بالآخر راضی کر لیا کہ وہ زیدی صاحب کو علی گڑھ جانے سے نہ روکیں خود انھوں نے زیادہ وقت دہلی میں صرف کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ علی گڑھ کچھ دنوں کے لیے جانے کو تیار تھیں۔ ویسے بھابھی قدسیہ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ زیدی صاحب علی گڑھ جانا چاہتے ہیں اس لیے میری بات انھوں نے مان ہی لی۔

بہر حال ذاکر صاحب نے اس طرح معاملات طے کر کے یونیورسٹی سے تین نام وزیٹر کو بھجوائے۔ قاعدے کی رو سے یہ نام وزارت تعلیم کے ذریعے سے جاتے ہیں۔ پہلا نام زیدی صاحب کا تھا، دوسرا نام ڈاکٹر عبدالحق اور تیسرا غالباً پروفیسر حبیب الرحمان کا۔ وزیٹر کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ تین میں سے کوئی مقرر کرے۔ مولانا آزاد کے پاس جب یہ نام پہنچے تو انھوں نے ڈاکٹر عبدالحق کو مدراس سے بلوایا۔ وہ علی گڑھ ہوتے ہوئے اور ذاکر صاحب سے ملتے ہوئے دہلی گئے۔ ذاکر صاحب نے انھیں یہ مشورہ دیا تھا کہ مولانا اگر آپ سے پوچھیں تو آپ یہ کہہ دیجیے کہ میں چوں کہ مدراس کی پبلک سروس کمیشن کا صدر ہونے والا ہوں اس لیے علی گڑھ کی وائس چانسلری کے لیے آمادہ نہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے یہی بات مولانا سے کہہ دی اور مولانا نے پھر زیدی صاحب کے نام کی سفارش کی اور وہ وائس چانسلر ہو گئے۔ یہ اصل حقیقت ہے، جسے بعض لوگوں نے کسی نہ کسی وجہ سے نظر انداز کر کے ذاکر صاحب پر نکتہ چینی کی۔ میرے نزدیک یہ فیصلہ صحیح تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق وہ نہ کر سکتے تھے جو زیدی صاحب نے کر دکھایا۔ انھوں نے حیدر رحمان گپتا کو اس بات پر راضی کر لیا کہ میڈیکل کالج میں نصف طلبا علی گڑھ کے ہوں اور نصف باہر کے۔ یہی طریقہ آج تک چلا آتا ہے۔ ویسے بھی انھوں نے علی گڑھ میں ہر شعبے کو ترقی دی اور خصوصاً تعمیرات کے سلسلے میں تو ایسے کارنامے انجام دیے کہ انھیں علی گڑھ کا شاہ جہاں کہا جانے لگا۔

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی میں تہذیبی سرگرمیوں کو خاص طور پر فروغ دیا۔ ۱۹۵۴ء میں مجاز

کی نظم "نذرِ علی گڑھ" کو یونیورسٹی کا ترانہ قرار دیا گیا۔ ترانے کے لیے چوں کہ نظم ذرا طویل تھی اس لیے اس میں سے کچھ اشعار حذف کیے گئے۔ طلبا کو ساز و آواز دونوں کی موسیقی کی تربیت دی گئی۔ ایک ڈراما کلب بھی وجود میں آیا جس میں طلبا و طالبات نے ڈرامے پیش کیے۔ ڈراما کلب کے ذریعے سے کئی فن کار ابھرے جن میں نصیر الدین شاہ، محبوب عالم راہی معصوم رضا اور خالد سلطان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ کئی سال یونیورسٹی کی ٹیم یوتھ فیسٹول میں شرکت کے لیے گئی۔ ایک حلقے سے ان سرگرمیوں پر اعتراض بھی ہوا۔ مگر ذاکر صاحب نے ان کی پروا کیے بغیر طلبا کو سنجیدہ تہذیبی سرگرمیوں میں مصروف رکھنے پر برابر زور دیا تاکہ ایک طرف فنونِ لطیفہ کے ذریعے سے ان کے جمالیاتی ذوق کی تربیت ہو اور دوسری طرف وہ کھیلوں کے ساتھ ان سرگرمیوں میں بھی حصہ لے کر ایک اکہری اور کھوکھلی شخصیت کے بجائے شاداب اور ہمہ جہت شخصیت پیدا کر سکیں، نیز تجارتی دور کے سستے اور ہیجان انگیز اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔ ذاکر صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک مولوی اُن کے پاس آئے اور تہذیبی سرگرمیوں پر سخت اعتراض کیا۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ یونیورسٹی کا مفتی میں ہوں آپ نہیں اس لیے یہاں میرا فتویٰ چلے گا۔ میرے نزدیک سنجیدہ تہذیبی سرگرمیاں ہر طرح جائز ہیں۔ زیدی صاحب نے اس کام کو جاری رکھا۔ پھر اس کے بعد یہ سلسلہ کمزور پڑ گیا۔ ڈرامے اب بھی ہوتے ہیں مگر ان میں لڑکیاں حصہ نہیں لے سکتیں۔ رقص کا سلسلہ بھی بند ہو گیا ہے۔ ہاں موسیقی اور مصوری کی تربیت دی جا رہی ہے۔

ذاکر صاحب ۱۹۴۸ء کے آخر میں آ گئے تھے۔ انھیں کے زمانے میں ۱۹۵۳ء میں نیا ایکٹ آیا جس کی رو سے کورٹ کے ممبر غیر مسلم بھی ہو سکتے تھے اور دینیات کی تعلیم انھیں کے لیے رکھی گئی تھی جو یہ چاہتے تھے۔ ان تبدیلیوں پر بھی کچھ حلقوں سے اعتراضات ہوئے مگر عام طور پر زیادہ نکتہ چینی نہیں ہوئی۔ میں نے اُس زمانے میں ایک نظم لکھی تھی جس میں ذاکر صاحب سے خطاب کر کے نئے علی گڑھ کے لیے ایک پیام تھا۔

درِ مے خانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے
پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے

ذاکر صاحب کے دور میں وزارت تعلیم کی طرف سے یونیورسٹی کے نام ایک خط میں یہ دریافت

کیا گیا کہ کیا یونیورسٹی اپنے نام میں سے لفظ مسلم نکالنے کو تیار ہے۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ اگر بنارس ہندو یونیورسٹی کے نام سے لفظ ہندو حذف کر دیا جائے تو وہ بھی اپنے یہاں نام کی تبدیلی کے لیے تیار ہوں گے ورنہ نہیں۔ اس کے بعد وزارت تعلیم خاموش ہو گئی۔

میں جب علی گڑھ آیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ اساتذہ کے ایک حلقے میں ذاکر صاحب کی مخالفت شروع ہو گئی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ذاکر صاحب ہر معاملے میں فزکس کے شعبے کے صدر پروفیسر گل کی بات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ دراصل اُن کا نام جواہر لال نہرو نے تجویز کیا تھا۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ پروفیسر کی حیثیت سے ہر شعبے کے ممتاز اشخاص کو علی گڑھ بلائیں۔ ایل کے۔ حیدر صاحب کے جانے سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اس پر پہلے پروفیسر کول آئے۔ جب وہ بھی چلے گئے تو انھوں نے کئی لوگوں سے بات کی۔ ڈاکٹر شنیائے کو ٹٹولا۔ ڈاکٹر گیان چند کو راضی کرنا چاہا اور آخر میں ڈاکٹر گنگولی (دہلی یونیورسٹی) کو آمادہ کر لیا۔ مگر ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ نے انھیں دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر بنا دیا تو پھر پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی کو لکھنؤ سے لائے۔ مکرجی صاحب پانچ سال علی گڑھ میں رہے۔ گل صاحب کا بھی ایسے ہی تقررات کے ذیل میں تقرر ہوا تھا۔ یہ خاصے تیز آدمی تھے مگر ایک تو ہر معاملے میں من مانی کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے شعبے کے نوجوان اور باصلاحیت طلبا کو ترقی کا موقع نہ دیتے تھے۔ اس لیے رفتہ رفتہ اُن کے خلاف ایک محاذ بن گیا۔ ذاکر صاحب کی پالیسی یہ تھی کہ نوجوان اور باصلاحیت استادوں کو اسٹڈی لیو دے کر مزید تحقیق کے لیے یورپ اور امریکہ بھیجا جائے تاکہ وہ وہاں کے قیام کے بعد یونیورسٹی کے شعبوں کے معیار کو بلند کر سکیں۔ چناں چہ بہت سے نوجوان اساتذہ اس طرح باہر گئے اور چند سال وہاں کام کر کے اور اپنی صلاحیت بڑھا کر واپس آئے اور مختلف شعبوں کو نئے معیاروں سے آشنا کیا مگر فزکس کے شعبے میں گل صاحب کی مخالفت کی وجہ سے ایک نوجوان استاد محمد شفیع کو رخصت نہ ملی۔ ذاکر صاحب کو اُن کے دوستوں اور ہمدردوں نے بہت سمجھایا مگر گل صاحب نے ان پر ایسا جادو کر رکھا تھا کہ انھوں نے کسی کی نہ سنی۔ اِس معاملے میں انھوں نے واقعی پٹھان ہونے کا ثبوت دیا۔ ذاکر صاحب کے زمانے میں انھیں باہر جانے کی رخصت نہ مل سکی۔ بعد میں زیدی صاحب نے اجازت دلوائی۔

میں جب لکھنؤ سے علی گڑھ آیا تھا تو میری والدہ بیمار تھیں۔ علی گڑھ آ کر ایک دفعہ انھیں

دیکھنے گیا۔ کوئی افاقہ نہ تھا۔ چاہتا تھا کہ انھیں علاج کے لیے علی گڑھ لے آؤں مگر یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ فروری ۱۹۵۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی عمر اس وقت چونسٹھ پینسٹھ برس کی رہی ہوگی۔ میرے چھوٹے بھائی اولاد احمد نے بدایوں سے ٹیلی فون کیا کہ والدہ ہم سب سے رخصت ہو گئیں۔ میں پہلی گاڑی سے بدایوں پہنچا اور انھیں خاندان کے قبرستان میں دفن کیا۔ اس کا افسوس رہا کہ بیماری میں اُن کی خدمت کرنے اور دیکھ بھال کرنے کا موقع نہ ملا۔ میری والدہ بچوں کے لیے اوپر سے سخت تھیں اندر سے نرم۔ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں پر زیادہ مہربان رہتی تھیں۔ اپنے بھائیوں سے انھیں بڑی محبت تھی۔ گھر وہی چلاتی تھیں۔ والد گھر کے کسی معاملے میں بولتے نہ تھے۔ ملازمت کے زمانے میں تو انھیں فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنا سارا وقت مطالعے میں گزارتے تھے مذہبی اور ادبی کتابوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ دونوں علی گڑھ میں، رام پور میں اور پھر لکھنؤ میں اکثر دو چار مہینے میرے پاس رہ جاتے تھے مگر زیادہ تر گھر پر بدایوں میں رہتے تھے۔ پرانی کوٹھی کے علاوہ انھوں نے مولوی ٹولے میں ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ والد اپنے دونوں بھائیوں مولوی شفیع احمد اور مشفع احمد سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور یہ دونوں بھائی بھی والد صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ہر کام ان دونوں بھائیوں خصوصاً چھوٹے بھائی مولوی مشفع احمد کے مشورے سے ہوتا تھا۔ یہ بدایوں میں وکالت کرتے تھے۔ بڑے چچا محکمہ تعلیم میں ہیڈ کلرک تھے اور ان کی زیادہ عمر بدایوں سے باہر گزری۔ ملازمت کے بعد بدایوں میں کچھ عرصے قیام کیا پھر علی گڑھ آ گئے۔ میرے دونوں چچا مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ والد صاحب کا دستور اس معاملہ میں خاندان کے بزرگوں کا سا تھا۔ وہ بچوں سے محبت ظاہر نہ کرتے تھے۔ میں والد سے زیادہ مانوس تھا۔ بچپن سے میں ان سے اسکول کی، ساتھیوں کی اور کتابوں کی باتیں کرتا تھا۔ والدہ کبھی کبھار خوش ہوتیں تو پرانے قصے اور گیت سناتی تھیں۔ میرے بڑے بھائی مولوی ابن احمد ڈاکخانے میں ملازم ہو گئے تھے، فرشتہ صفت آدمی تھے۔ ان کی صحت زیادہ اچھی نہ تھی اس لیے علی گڑھ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد ملازمت کر لی تھی۔ وہ کم گو تھے۔ دل میں محبت کا اتھاہ سمندر تھا اور ہر بات میں مجھ سے مشورہ ضروری سمجھتے تھے۔ میری بڑی بہن کا نو ۱۹۲۵ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ مجھ سے چھوٹی تصویر فاطمہ اور چھوٹے بھائی اولاد احمد سے چھوٹی تسنیم فاطمہ تھیں۔ تصویر کی شادی ماموں زاد بھائی وصی بخش قادری سے اور تسنیم کی شادی ایک

اور ماموں زاد بھائی فرید بخش قادری سے ہوئی تھی۔ تصویر کا انتقال ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ خدا کے فضل سے مجھ سے چھوٹی بہن کراچی میں ہے اور خوش ہے۔ میں اب تک دو دفعہ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۲ء میں کراچی جا کر اس سے اور اس کے بچوں سے مل چکا ہوں۔ تسنیم کے بچوں میں اسلم فرید سب سے زیادہ ذہین ہے۔ بلا کا حافظہ پایا ہے۔ اشعار ہی نہیں نثر کے پورے پورے جملے یاد ہیں۔ ہمارے خاندان میں عام طور پر سب کو ادب سے دلچسپی ہے اور شعر بھی خاصے یاد ہیں۔ ویسے میرے چھوٹے لڑکے جاوید کو جو پچیس سال سے جرمنی میں ہے اب بھی اشعار بہت یاد ہیں۔ میرا بھتیجا اقبال احمد بہت ذہین ہے رہا ہے۔ اب ٹی میں انجینیر ہے۔

۱۹۵۶ء میں غالب کے ترجمے کا کام شروع کرنے کے علاوہ انجمن ترقی اُردو ہند کے کاموں کو بھی خاصا وقت دینا پڑا۔ میں صبح نو بجے کے قریب شعبہ اُردو پہنچ جاتا وہاں سے دو بجے کے قریب آتا۔ کھانا کھاتے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد تین بجے انجمن کے دفتر جاتا جہاں پانچ چھے بجے تک سارے کام دیکھتا۔ قاضی صاحب کی صحت کئی سال سے اچھی نہ تھی اس لیے انجمن کے سارے کاموں کی نگرانی پوری طرح نہ کر سکتے تھے۔ مجھے ہماری زبان اور اُردو ادب کی باقاعدہ اشاعت، مطبوعات اور اُردو تحریک سب پر توجہ کرنی پڑی۔ اپریل میں ذاکر صاحب کی سفارش پر حفیظ الدین جامعہ سے آئے اور انھیں اسسٹنٹ سکریٹری بنایا گیا۔ انھوں نے جلد کام سنبھال لیا۔ وہ ندوے کے فاضل تھے اور بچوں کے ادب کا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ ذاکر صاحب کی علالت کی وجہ سے نائب صدر عبدالمجید خواجہ صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے مگر وہ خود بیمار تھے اس لیے انجمن کے جلسے ان کے گھر پر ہوتے تھے۔ جب انجمن کی مجلس عاملہ میں میرے تقرر کی توثیق کا مسئلہ آیا تو خواجہ صاحب نے بتایا کہ مولانا آزاد چاہتے ہیں کہ میں اُن سے مل لوں۔ مولانا سے ساہتیہ اکادمی کے جلسوں میں ملاقات ہوتی رہتی تھی میں دہلی گیا اور مولانا سے ملا۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ انجمن کا آئندہ پروگرام کیا ہے اور میں انجمن کے کاموں کے لیے کتنا وقت دے سکوں گا۔ جب میں نے کام کا خاکہ بتایا اور یہ یقین دہانی کی کہ روزانہ دو تین گھنٹے انجمن کو دوں گا تو مولانا نے خواجہ صاحب کو مطلع کر دیا کہ سرور صاحب کا تقرر صحیح ہوا ہے اور اس کی توثیق کر دی جائے۔

مئی میں کسی کام سے لکھنؤ گیا تھا تو بیوی کو ڈاکٹر انجینیر کو دکھایا تھا جو خواتین کے امراض کی ماہر تھیں۔ انھوں نے رحم میں ایک رسولی بڑھنے کا خطرہ ظاہر کیا تھا اور چند ماہ بعد اس کا آپریشن

تجویز کیا تھا۔ اگست میں جب خون زیادہ جاری ہونے لگا تو میں انھیں لکھنؤ لے گیا وہاں آپریشن کے ذریعے رحم نکال دیا گیا۔ کوئی ایک مہینے بعد ستمبر کے آخر میں علی گڑھ واپس آیا۔ لکھنؤ کے سب لوگوں نے اس زمانے میں میری بڑی مدد کی۔ ۷/ اکتوبر کو زیدی صاحب نے وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج لے لیا۔ زیدی صاحب نے پیش کش کی کہ میں پروووسٹ ہو جاؤں۔ مجھے تامل تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تجویز میری نہیں ذاکر صاحب کی ہے۔ میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ اس وقت یونیورسٹی کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے دو سال یہ کام بھی کر لیجیے۔ غرض پہلی نومبر سے میرا تقرر سر سید ہال کے پروووسٹ کی حیثیت سے ہو گیا۔ میں وارڈن کبھی نہیں رہا تھا اس لیے اس کام میں کچھ گھبراہٹ تھی۔ ایس ایس ہال میں اس وقت چار ہوسٹل اور آٹھ سو طلبا تھے۔ بہر حال اب میں نے کام کا وقت دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پانچ بجے تک انجمن اور اس کے بعد ہال۔ سات بجے گھر آتا تھا۔ ۱۹۵۶ء کے آخر میں تار والے بنگلے سے میں بدر باغ آگیا تھا اور مجید الدین صاحب کے مکان رابعہ منزل میں رہتا تھا میرا قیام یہاں اکتوبر ۱۹۵۹ء تک رہا۔

دسمبر ۱۹۵۶ء کے کانووکیشن میں ذاکر صاحب مہمان خصوصی تھے اپنے خطبے میں انھوں نے اپنی علی گڑھ میں آمد کا ذکر بڑے دل کش انداز میں کیا تھا اور پھر یونیورسٹی کے مسائل پر روشنی ڈالی تھی۔ اُس زمانے میں محمود حسین رجسٹرار تھے۔ ذاکر صاحب پر تو ان کا اثر تھا ہی، زیدی صاحب پر بھی وہ اپنا اثر جمانا چاہتے تھے۔ محمود صاحب بڑی صلاحیت کے آدمی تھے مگر چاہتے تھے کہ ہر شخص اُن کے اشاروں پر چلے۔ وہ یونیورسٹی کے ترقی پسند گروپ کی ہر بات میں طرف داری کرتے تھے۔ خواہ وہ غلطی پر ہی کیوں نہ ہو۔ ذاکر صاحب نے جاتے جاتے جنرل ایجوکیشن کی ایک اسکیم یو۔ جی۔ سی کو بھیجی تھی۔ یہ منظور ہوئی تو ڈاکٹر عابد حسین ریڈنگ میٹیریل تیار کرنے کے لیے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی مدد کے لیے مونس رضا اور ابو سالم اور خورشید الاسلام کو ریڈر کے گریڈ میں لیا۔ یہ ٹیم اچھی تھی اس نے عابد صاحب کی نگرانی میں خاصا مواد تیار کیا مگر عابد صاحب چاہتے تھے کہ لازمی زبانوں یعنی انگریزی، اردو اور ہندی کا نصاب جنرل ایجوکیشن کے اصولوں کے مطابق ہو اور اس لیے ان مضامین کی تدریس بھی جنرل ایجوکیشن والے کریں۔ مجھے اس سے اختلاف تھا۔ شعبہ انگریزی کے صدر ڈاکٹر بوس اور شعبہ اردو کے صدر رشید صاحب بھی اس کے خلاف تھے مگر یہ لوگ عابد صاحب کی مخالفت

نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر میں نے زیدی صاحب سے کہا کہ یہ اسکیم ذاکر صاحب کی ہے اور اس معاملے میں اُن سے مشورہ ضروری ہے۔ ذاکر صاحب اس وقت بہار کے گورنر تھے وہاں سے آئے اور ایک میٹنگ ہوئی جس میں ذاکر صاحب، زیدی صاحب، عابد صاحب، رشید صاحب اور میں یہ پانچ آدمی تھے۔ پہلے عابد صاحب نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، پھر میں نے۔ ذاکر صاحب نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ اور یہ طے ہوگیا کہ جنرل ایجوکیشن ایک علاحدہ لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے گا۔ لازمی انگریزی، اُردو ہندی کا نصاب حسبِ سابق اس کے شعبے بنائیں گے اور وہی اس کی تدریس کے ذمے دار ہوں گے۔

جولائی ۱۹۵۷ء میں میں نے علی گڑھ میں ایک آل انڈیا اُردو کانفرنس کی۔ مجیب صاحب کو صدارت کی دعوت دی اور انھوں نے اسے منظور کرلیا۔ اس کا اجلاس تین دن رہا اور انجمن کے کاموں کے جائزے کے ساتھ آئندہ کے کام کا خاکہ بھی مرتب ہوا۔ ایک مشاعرہ بھی ہوا تھا جس میں ممتاز شعرا شریک تھے۔ ہری چند اختر سے پھر اس موقع پر ملاقات ہوئی۔ بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔

انجمن کا ایک وفد ذاکر صاحب کی قیادت میں بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں اس وقت کے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملا تھا اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اب انجمن نے طے کیا کہ ایک اور وفد اُن کے پاس یاددہانی کے لیے جائے۔ وفد کے جانے سے پہلے ریاستوں کی لسانی تنظیم کی وجہ سے لسانی اقلیتوں کے مسائل سامنے آئے۔ حکومت نے ان پر غور کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی بنائی۔ انجمن نے اُردو اقلیت کی طرف سے پارلی منٹ اور حکومت کو توجہ دلانے کے لیے ایک میمورنڈم تیار کیا۔ میں یہ میمورنڈم لے کر دلی گیا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر علیم بھی تھے۔ ہم لوگ بہت سے پارلی منٹ کے ممبروں سے ملے اور آخر میں وزیرِ اعظم سے ملنے کا ارادہ کیا۔ زیدی صاحب نے مشورہ دیا کہ پہلے عظیم حسین سے مشورہ کرلو۔ یہ اس وقت وزارتِ خارجہ کے سکریٹری تھے۔ مشہور پنجابی رہنما فضل حسین کے صاحبزادے۔ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوتے تک یہ ہندوستان میں ہی رہے۔ بعد میں لندن میں سکونت اختیار کرلی۔ انھوں نے کہا کہ پنڈت جی کو جو میمورنڈم دیا جائے اس کا ایک خلاصہ بھی دو صفحے میں تیار کیا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ اسی وقت اسے ضرور دیکھ لیں۔ چناں چہ زیدی صاحب اور میں ان سے ملے۔ اتفاق سے اس وقت نہرو بہت

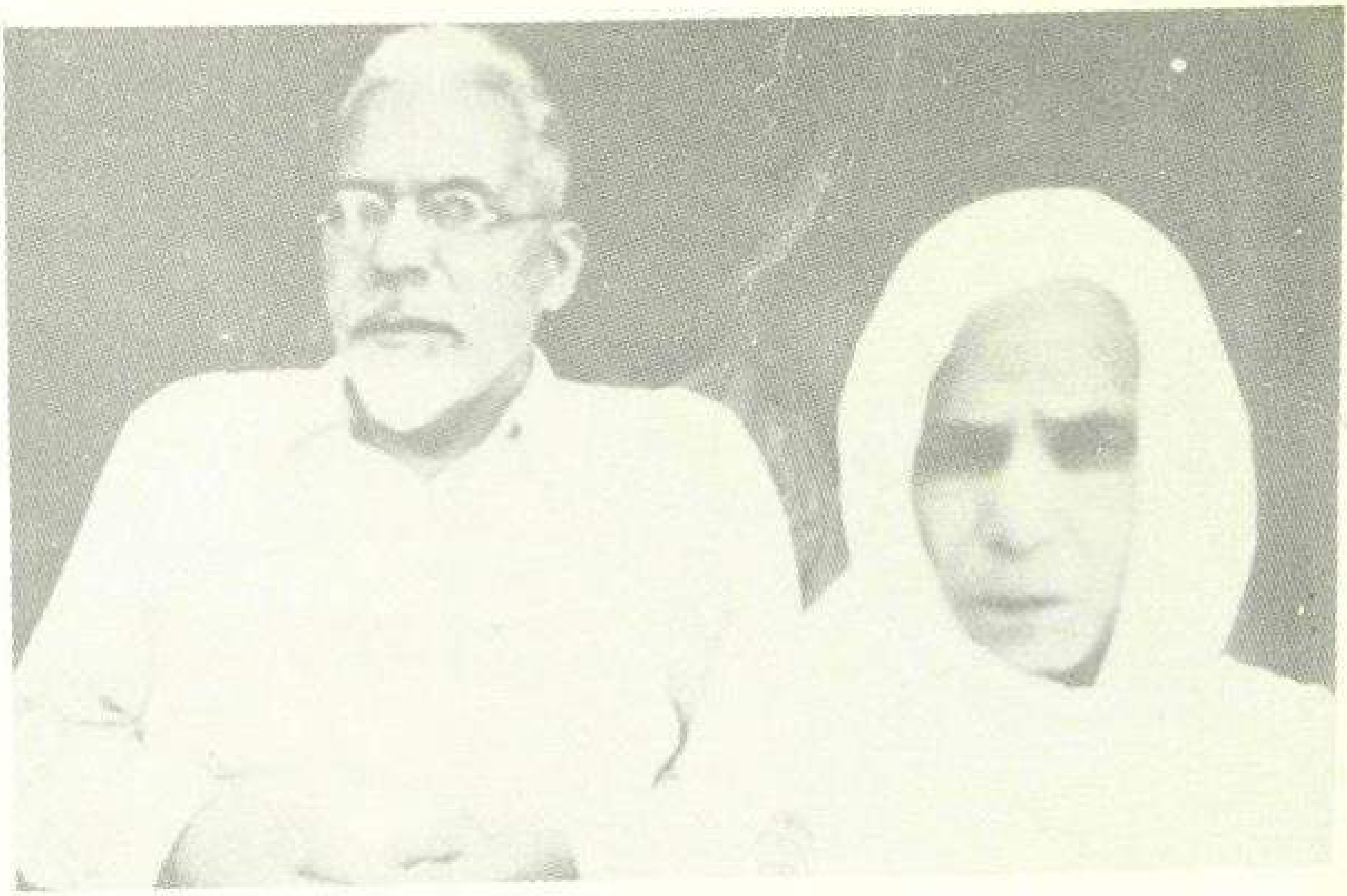

والد اور والدہ

آلِ احمد سرور، زاہدہ سرور

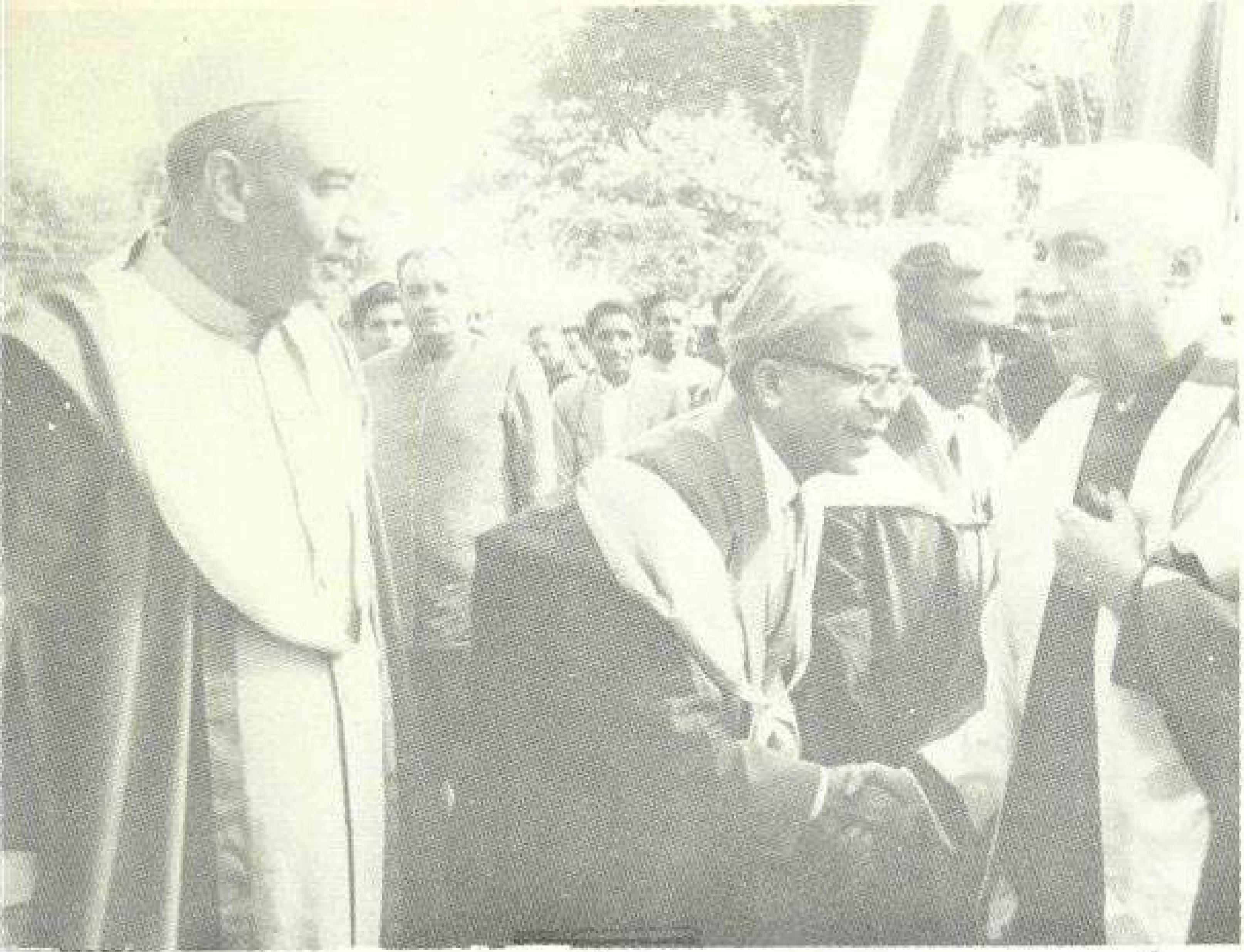

دائیں طرف سے جواہر لال نہرو، ابوسالم، آلِ احمد سرورؔ، پروفیسر حفیظ الرحمان ۱۹۶۰

مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین (سلکٹ کمیٹی)

پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی سے ساہتیہ اکادمی انعام لیتے ہوئے

(ایستادہ) دائیں طرف سے ......، عتیق صدیقی، سجاد ظہیر، غلام ربانی تاباں، جگن ناتھ آزاد، ..... سلیمان اریب، ......، مخدوم محی الدین، سرینواس لاہوتی، جاں نثار اختر، شہریار پرویز۔
(کرسیوں پر بیٹھے ہوئے) فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، عبد المجید سالک، ڈاکٹر عبد العلیم، آلِ احمد سرور، ساغر نظامی۔
(سامنے) راجندر ناتھ شیدا، عبادت بریلوی، قتیل شفائی، پرکاش پنڈت، اعجاز بٹالوی۔

اُردو گھر کا سنگ بنیاد کے موقع پر

(دائیں طرف سے) سکندر علی وجد، پنڈت سندر لال، ہردے ناتھ کنزرد،

حیات اللہ انصاری، اندرا گاندھی، حمیدہ سلطان، آل احمد سرور

دائیں طرف سے (نشست میں) سید احتشام حسین، آنند نرائن مُلّا، آثر لکھنوی،

آلِ احمد سرور، مجاز، عبدالغفار۔

(ایستادہ) اولاد احمد، منظر سلیم، اعیاذ انصاری، لومبا، سہیل میسوری،

..... سلام مچھلی شہری۔ (فرش پر) صدیق، مہ جبیں، جاوید۔

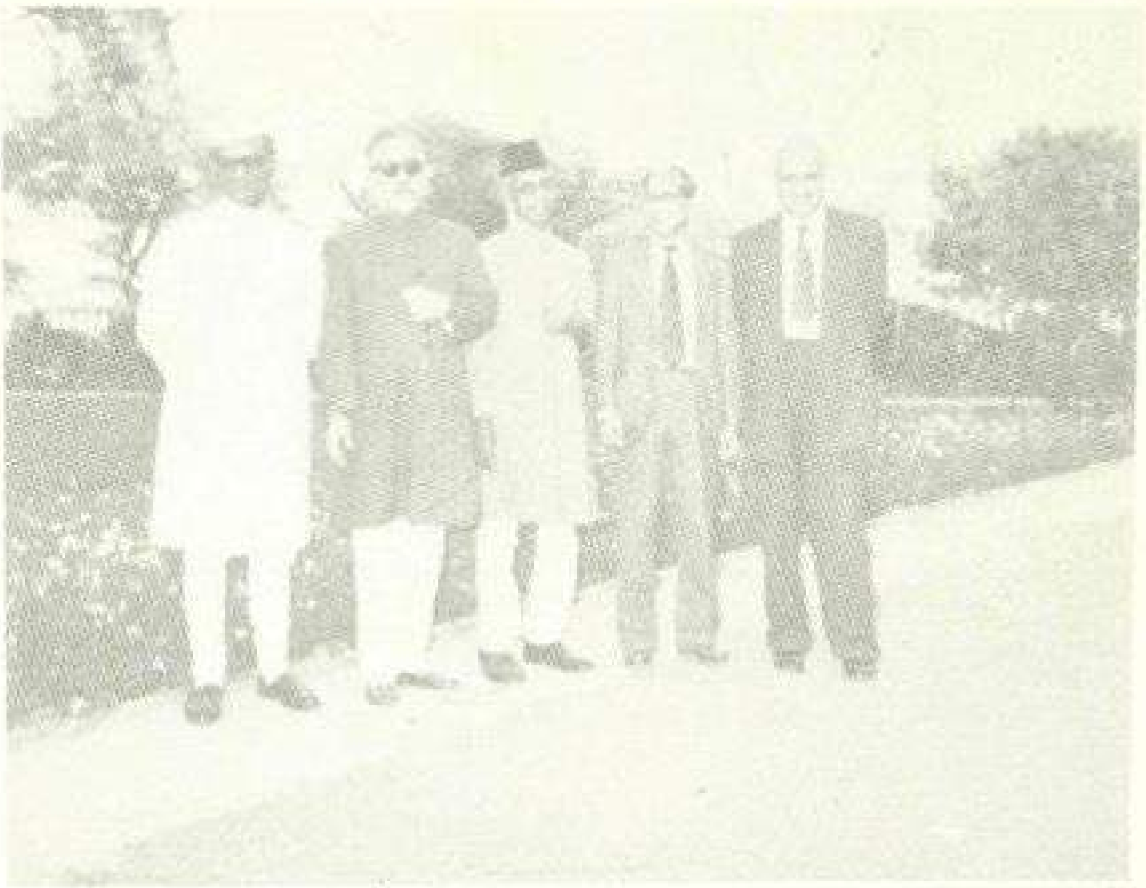

(بائیں طرف سے) کرنل بشیر حسین زیدی، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی،
آل احمد سرور، ڈاکٹر حفیظ الرحمان ۱۹۵۶

(دائیں طرف سے) سردار جعفری، نیاز حیدر، فیض احمد فیض، قدسیہ زیدی،
جنیندر کمار، آل احمد سرور - ۱۹۵۶

چانسلر کشمیر یونیورسٹی جنرل راؤ سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری لیتے ہوئے

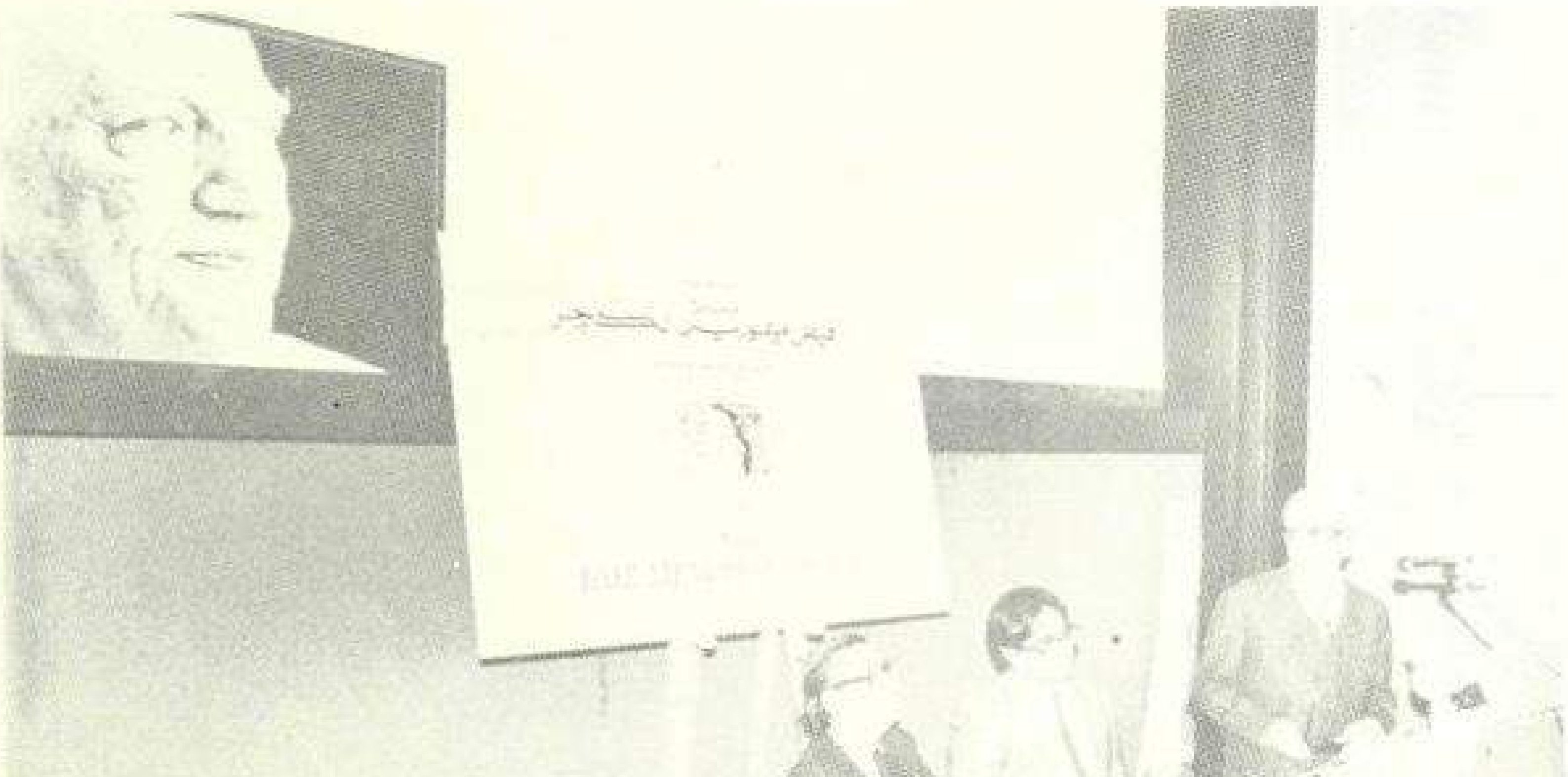

آل احمد سرور، افتخار عارف، الطاف گوہر (اُردو مرکز لندن ۱۹۸۵)

(بائیں سے) اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی، آلِ احمد سرور، سنیل دت، بیگم سرور،
مسز بیدی۔

مہ جبین کی شادی کے موقع پر
(بائیں جانب سے ایستادہ) آل احمد سرور، مولوی کرم احمد (والد) مولوی رحمان بخش
(خسر) اقبال بخش قادری، طارق فاروق، صدیق احمد، اقبال احمد۔
(نشست بائیں سے) نسیم فاطمہ، عبدالجلیل، مہ جبین، بیگم سرور، بیگم رحمان بخش قادری۔
(فرش پر) بائیں سے نجمہ خاتون، عذرا فاروق، زہرا قادری۔

(بائیں سے) رخشندہ، تابندہ، زریں تاج۔

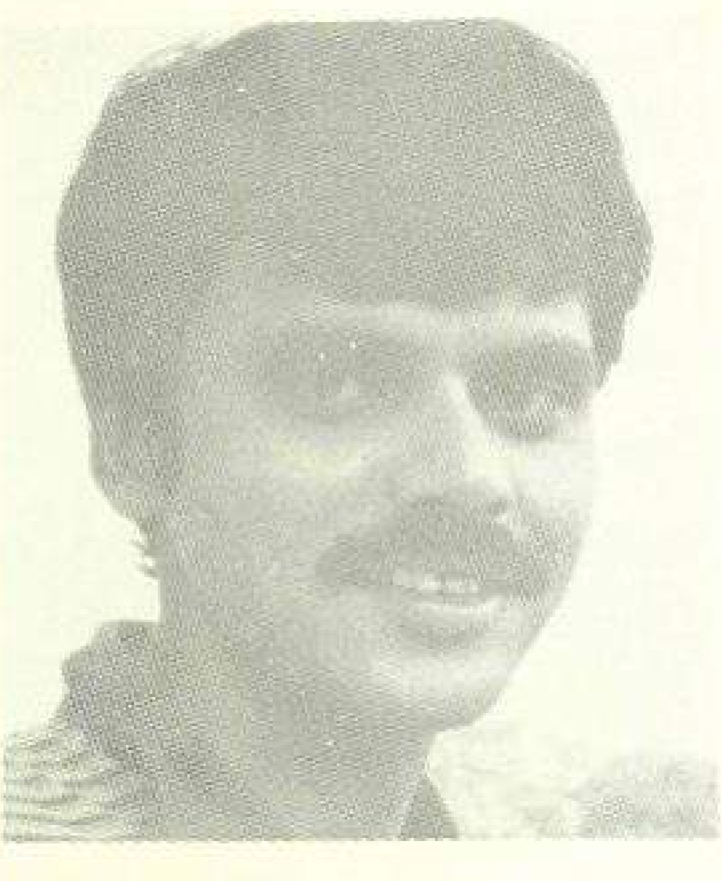

عبدالجمیل عرفی

(بائیں سے) صدیق احمد، جاوید احمد، مہ جبین۔

کا بحران سنگین تھا۔ ہم لوگ جب وقت مقررہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کرشنا مینن پنڈت جی کے پاس بیٹھے ہیں اور کچھ ضروری اُمور پر گفتگو ہو رہی ہے اس لیے انتظار کرنا ہوگا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد کرشنا مینن باہر نکلے اور ہم لوگوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ پنڈت جی نے زیدی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ تو کسی چھوٹے سے معاملے پر توجہ دلانے آئے ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ہم لوگ اُردو کے مسئلے پر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ زیدی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ پنڈت جی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کہنے لگے لعنت ہو اُردو والوں پر اور لعنت ہو ہندی والوں پر۔ تیسری عالم گیر جنگ کا خطرہ ہے اور آپ لوگ اپنی ناک سے آگے دیکھنے کو تیار نہیں۔ زیدی صاحب تو خاموش ہو گئے۔ میں نے ہمت کر کے کہا جناب والا ہم خواہ مخواہ نہیں آئے ہیں پارلی منٹ نے ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے مسائل پر غور کرے۔ اس کے متعلق اجلاس ہو رہے ہیں اور جلد ہی یہ رپورٹ پارلی منٹ میں پیش ہوگی ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس موقع پر اُردو کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ بس اس پر اُن کا غصہ فرو ہو گیا۔ کہنے لگے فرمایئے۔ میں نے وہ میمورنڈم پیش کیا جس میں انجمن کے مطالبات تھے انھوں نے اس کو رکھ لیا اور کہا کہ اس پر غور ہوگا۔ پھر میں نے خلاصہ نکالا اور درخواست کی کہ اسے ابھی دیکھ لیجیے۔ ہم نے اس میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ ایک تو دستور میں ایک دفعہ یہ بڑھائی جائے کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہوگی۔ دوسرے لسانی اقلیتوں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیشن بنایا جائے۔ پنڈت جی نے پہلی بات تو فوراً منظور کر لی۔ دوسری کے متعلق کہا کہ کمیشن کے بجائے کمشنر مقرر ہو سکتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ فی الحال یہی سہی۔ چناں چہ پنڈت جی نے ہمیں فوراً پٹنایک کے پاس بھیجا کہ ان کو میمورنڈم دے دیں۔ دستور کی دفعہ ۳۵۱ میں ۳۵۱ الف اور ب کا اس طرح انجمن کی کوشش سے اضافہ ہوا۔ ۳۵۱ الف میں ہم یہ چاہتے تھے کہ مادری زبان کی تعلیم لازمی ہو۔ دستور میں صرف اتنا آسکا کہ ہر ریاستی حکومت اس کی کوشش کرے گی بہر حال کمشنر جلد مقرر ہو گیا اور اس کی رپورٹیں کئی سال پارلی منٹ میں باقاعدگی سے پیش ہوتی رہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ریاستی حکومتوں کی کوشش اس سلسلے میں برائے نام ہی رہی اور کمشنر کی سفارشوں پر کبھی عملدرآمد نہ ہوا۔ جواہر لال نہرو کے زمانے میں مرکزی حکومت ان مسائل پر کچھ توجہ کرتی تھی اور ریاستی حکومتوں کو اُن کے فرائض بھی یاد دلاتی رہتی تھی۔ بعد میں یہ میلان بھی کمزور ہو گیا۔ اب تو حال یہ ہے کہ

مادری زبان میں تعلیم کا انتظام عام طور پر ساری ہندی ریاستوں میں بہت ہی ناقص ہے۔ سہ لسانی فارمولے کو صحیح طور پر نافذ نہیں کیا گیا۔ اتر پردیش میں تیسری زبان جدید ہندوستانی زبانوں میں سے کوئی زبان رکھنے کے بجائے سنسکرت رکھی گئی۔ اندرا گاندھی کے زمانے میں ۱۹۶۸ء میں جب پارلیمنٹ میں علاقائی زبانوں کے فروغ کے متعلق پالیسی منظور ہوئی تو مرکز کی امداد سے ریاستوں میں علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے بورڈ قایم کیے گئے۔ میں نے اس سلسلے میں خواجہ غلام محمد صادق کو جو اس وقت کشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے لکھا کہ چوں کہ جموں و کشمیر کی ریاست کی سرکاری زبان اردو ہے اس لیے ریاستی حکومت کو مرکز کی پیش کش سے فایدہ اٹھانا چاہیے اور اردو میں بچوں کے ادب، سائنسی ادب، حوالے کی کتابیں اور ہائی ڈگری تک کے لیے درسی کتابیں مہیا کرنے کے لیے اپنا ایک ریاستی بورڈ قایم کرنا چاہیے۔ میں نے یہ بھی یقین دلایا کہ اس کے لیے انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور حیدرآباد کے ماہرین کی خدمات ان کو ضرور ملیں گی۔ مگر صادق صاحب چاہتے تھے کہ ایک کروڑ جو مرکز سے ملے وہ کشمیر کے لیے صرف ہو اس لیے انھوں نے معذرت کر لی۔ بہر حال پروفیسر مجیب اور دوسرے اشخاص کی تحریک پر حکومتِ ہند نے خود ترقی اردو بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۹۶۹ء میں وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ وزیرِ تعلیم کی صدارت میں اس ادارے کی تشکیل ہو گئی۔ پروفیسر مجیب کو اس کا نائب صدر بنایا گیا۔ میں بھی اس کا ممبر مقرر ہوا۔

بورڈ نے اپنا کام شروع کر دیا مگر ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم اردو میں دینے کے اہم مسئلے پر پھر بھی توجہ نہ ہوئی۔ بالآخر ڈاکٹر نورالحسن نے ۱۹۷۲ء میں اردو کے فروغ کے لیے ہر پہلو سے غور کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی جس کے صدر اندر کمار گجرال تھے جو خود بھی مرکزی حکومت میں وزیر مملکت تھے۔ اس میں یوں تو کئی ممتاز ادیب شامل تھے مگر انجمن ترقی اردو ہند کو جان بوجھ کر نمایندگی نہیں دی گئی تھی۔ میں نے جب ڈاکٹر نورالحسن سے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ کام تو انجمن کا ہی ہے اس کی نمایندگی کیا ضرور ہے۔ گجرال کمیٹی نے تمام اہم اردو مراکز کا دورہ کیا۔ اہم شخصیتوں سے ملاقات کی اور دو سال کی محنت کے بعد ایک رپورٹ تیار کی جو گجرال کمیٹی رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انجمن کے اس بنیادی مطالبے پر کہ اردو کو ان ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابلِ لحاظ آبادی ہے دفعہ ۳۴۷ کے تحت سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے، زور

دینے سے گریز کیا۔ مگر مجموعی طور پر اردو کی بقا اور ترقی کے لیے بہت سی مفید سفارشات کی گئیں۔ پھر بھی حکومتِ ہند نے اپنی ہی بنائی ہوئی کمیٹی کی رپورٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ آخر جب ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کی حکومت قایم ہوئی تو اس کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر پرتاپ چندر کی ہدایت کے مطابق ریاستوں کو پھر توجہ دلائی گئی اور مرکز نے اس پر غور کرنے کے لیے ترقی اردو بورڈ کی ایک کمیٹی بنائی۔ اس وقت میں بورڈ کا نائب صدر تھا اس لیے اس کمیٹی نے میری صدارت میں کام شروع کیا۔ کئی سال تک صرف اتنا ہوتا تھا کہ سال میں ایک جلسہ ہوتا تھا جس میں زیادہ تر ریاستی حکومتوں کے جوابات جو زیادہ تر ٹال مٹول پر مبنی ہوتے تھے پیش ہوتے رہتے تھے۔ وزارتِ تعلیم نے پہلے یہ کوشش کی کہ صرف ان سفارشات پر غور کیا جائے جو تعلیم سے متعلق ہیں مگر میرے احتجاج پر ساری سفارشات پر غور شروع ہوا اور کمیٹی نے اپنا کام سال بھر میں ختم کر کے اپنی سفارشات پیش کر دیں۔ یہ رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کی یقین دہانی کی گئی تھی مگر ایسا نہیں ہوا اور ان سفارشات کا بھی وہی حشر ہوا جو گجرال کمیٹی کی رپورٹ کا ہوا تھا۔ دراصل بات اب صاف ہو گئی ہے کہ وزیرِ تعلیم یا وزیرِ اعظم کی زبانی ہمدردی کے باوجود حکومت اردو کی تعلیم اور چلن کے سلسلے میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کو تیار نہیں جس سے کچھ عملی نتائج نکلیں۔ عوامی مہم چلانے میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ ملک کے بعض تنگ نظر عناصر اس کو بہانہ بنا کر فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔ اس لیے حکومت سے اردو کے جائز حقوق کی پاسداری کے مطالبے کے ساتھ اردو دوستوں کو خود اپنے اداروں کے ذریعے سے تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ ہندی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ بھی اردو والوں کے حقوق کی حمایت کریں تاکہ یہ مسئلہ ایک جمہوری اور عوامی مسئلہ رہے اسے فرقہ وارانہ رنگ نہ دیا جا سکے۔

۳۰ اپریل ۱۹۵۸ء کو رشید صاحب سبکدوش ہو گئے اور میں نے شعبے کے صدر کی حیثیت سے پہلی سی کو چارج لے لیا۔ رشید صاحب کی جگہ کا اشتہار ہوا۔ میں نے درخواست نہیں دی۔ پھر جب انٹرویو میں بلایا گیا تو نہ گیا۔ سلکشن کمیٹی نے جس میں سید مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر عابد حسین شامل تھے میرا تقرر کیا اور مجھے دو انکریمنٹ دینے کی بھی سفارش کی۔ غرض پہلی اگست ۱۹۵۸ء سے میں پروفیسر ہو گیا۔ شعبے کی صدارت کے ساتھ علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو کی اسکیم کا ڈائرکٹر بھی بہ اعتبارِ عہدہ

مقرر ہوا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر ڈاکٹر نذیر احمد کا ۱۹۵۰ء میں تقرر ہوا تھا اور انھوں نے مضامین کی فراہمی اور ان پر نظرِ ثانی کے کام میں بڑی محنت کی تھی مگر وہ ۱۹۵۵ء میں شعبۂ فارسی میں ریڈر ہو کر چلے گئے اب اُن کی جگہ پُر کرنے کا سوال تھا۔ احمد صدیق مجنوں گورکھپوری اس جگہ کے خواہش مند تھے۔ وہ گورکھپور چھوڑنا چاہتے تھے۔ تنقید کی دنیا میں اُن کی بڑی شہرت تھی اور وہ اُردو کے ممتاز نقادوں میں شمار ہوتے تھے۔ انگریزی اور اُردو دونوں میں ایم۔ اے تھے اور فلسفے کا بھی خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اُن کا خاصا طویل تجربہ انگریزی اور اُردو کی تدریس کا بھی تھا چناں چہ میری سفارش پر اُن کا تقرر ہو گیا۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد کا سارا مواد تو ڈاکٹر نذیر احمد نے تیار کر ہی دیا تھا صرف شروع کا سماجی پس منظر کا باب جو خلیق احمد نظامی صاحب کے ذمے تھا باقی تھا۔ نظامی صاحب نے اس باب کے لکھنے سے انکار کر دیا تو میں نے پروفیسر حبیب سے درخواست کی اور انھوں نے انگریزی میں یہ باب لکھا جس کا مجنوں صاحب نے ترجمہ کرایا۔ پہلی جلد کی طباعت کا سارا کام ٹائپ میں ہوا تھا۔ اس کے پروف توجہ سے نہ پڑھے گئے چناں چہ طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ اشاریہ بھی بہت ناقص تھا۔ جب ۱۹۶۲ء میں یہ کتاب شایع ہوئی تو طباعت کی اغلاط اور اشاریے کی خامیوں پر رشید حسن خاں نے تحریک میں ایک مضمون لکھا۔ پہلی جلد کے سارے مضامین مستند محققین اور ناقدین سے لکھوائے گئے تھے اور مجموعی طور پر اس میں جو نقشہ پیش کیا گیا تھا وہ خاصا جامع تھا مگر ان اعتراضات سے جو بڑی حد تک طباعت کے اغلاط اور اشاریہ کی خامی اور ترجمے میں بعض اصطلاحوں سے متعلق تھے میں بڑا دل برداشتہ ہوا اور میں نے کتاب کی فروخت روک دی دوسری جلد کے لیے بھی خاصے مضامین فراہم ہو گئے تھے اور تیسری جلد کے لیے بھی کچھ مضامین آ گئے تھے مگر پھر یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ مجنوں صاحب باوجود غیر معمولی ادبی صلاحیت کے اب ایک تیر از کماں جستہ تھے۔ میں نے کچھ نئے لکھنے والوں سے جن میں حنیف نقوی بھی شامل تھے مواد کی فراہمی میں مدد لی تھی۔ مگر شعبے کی صدارت، انجمن ترقی اُردو کے کاموں، آرٹس فیکلٹی کی ڈین شپ کی وجہ سے مجھے تاریخ ادب اُردو کے تمام کاموں پر پوری توجہ دینے کا موقع نہ ملا۔ بہر حال اس سلسلے میں میں اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرتا ہوں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تخریبی تنقید اچھے کاموں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی۔ یو۔ جی۔ سی نے ایک جلد کی طباعت کے بعد مزید رقم نہ دی اور یہ کام نا تمام رہ گیا

جو مضامین فراہم ہوئے تھے وہ اب بھی شعبۂ اُردو میں موجود ہیں۔ اور اب بھی اس کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

زیدی صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ کئی پہلوؤں سے بہت بھرپور تھا۔ کئی شعبوں میں ترقی ہوئی۔ دینیات کی فیکلٹی کے لیے انھوں نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا سیّد علی نقی جیسے ممتاز علما کی خدمات حاصل کیں۔ یونیورسٹی کی لائبریری کی نئی عمارت تیار کرائی۔ یہ لائبریری مولانا آزاد لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔ ذاکر صاحب نے شعبۂ اُردو کے لیے مشہور فنکار ستیش گجرال سے غالب کی تصویر بنوائی تھی جو صدر شعبۂ اُردو کے دفتر میں رکھی گئی ہے۔ زیدی صاحب نے گجرال سے مولانا آزاد کی بھی تصویر بنوائی یہ آزاد لائبریری میں ہے۔ فیکلٹی آف آرٹس کی نئی عمارت بھی انھیں کے زمانے میں تعمیر ہونی شروع ہوئی۔ زیدی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے میڈیکل کالج میں نصف اندرونی اور نصف بیرونی طلبا کا فارمولا بڑی کوشش کے بعد اُتر پردیش کی حکومت سے منظور کرایا۔ وہ لوگ تو یہ چاہتے تھے کہ دوسرے میڈیکل کالجوں کی طرح یہاں بھی داخلہ عام مقابلے سے ہو۔ کالج اور اسپتال کی وسیع عمارتوں کی تعمیر بھی اُن کے زمانے میں شروع ہوئی۔ انھیں بجا طور پر علی گڑھ کا شاہ جہاں کہا جاتا ہے۔ بھابھی قدسیہ نے دہلی میں ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد ڈالی تھی وہ تن من دھن سے اسے چلا رہی تھیں۔ اس کے سلسلے میں وہ بہار کی کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کے لیے ڈرامے کرنے وہاں گئیں۔ وہاں انھوں نے ہندوستانی تھیٹر کے کئی ڈرامے دکھائے تھے۔ ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو وہ علی گڑھ واپس آئیں تو بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں مگر خوش تھیں کہ مزدوروں کی بے کیف زندگی میں انھوں نے کچھ مسرت کا سامان مہیا کیا۔ علی گڑھ میں دو دن بعد انڈین ہسٹری کانگریس کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ ان سے پھر ملاقات ۲۹ کی شام کو اس استقبالیہ میں ہوئی جو وائس چانسلر کی طرف سے کانگریس کے مندوبوں کو دیا گیا تھا۔ اس دن وہ بہت مضمحل معلوم ہوتی تھیں مگر مہمانوں کے استقبال میں انھوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رات کو وی۔ ایم۔ ہال میں ڈنر تھا۔ صبح ۳۰ر دسمبر کو کوئی آٹھ بجے وائس چانسلر کے یہاں میٹنگ تھی جس میں مجھے بھی شریک ہونا تھا مگر کوئی ساڑھے سات بجے وہاں سے ایک آدمی آیا جس نے بتایا کہ ابھی بیگم زیدی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں سنتے ہی سکتے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک یقین ہی نہ آتا تھا کہ شام کو میں نے انھیں دیکھا تھا تو سوائے معمولی اضمحلال کے اور کوئی بات معلوم نہ ہوتی تھی۔ پھر اچانک سب کچھ کیسے

بد گیا۔ پہنچا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے رات کو حسبِ معمول دیر تک اپنے ڈراموں کے سلسلے میں کام کیا۔ پھر گیارہ بجے کے قریب کچھ گرانی محسوس کی۔ زیدی صاحب نے ہاضمے کی دوا دیدی جس سے انھیں نیند آگئی مگر صبح سویرے جب ناشتے کا ارادہ کر رہی تھیں تو قلب میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ اتفاق سے ڈاکٹر موہن لال زیدی صاحب سے ملنے آئے ہوئے تھے وہ فوراً ڈاکٹر سمیع حمید کو لے کر آ گئے۔ بھابی قدسیہ نے سمیع حمید سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب جلدی کوئی انجکشن دیجیے بہت تکلیف ہے۔ انھوں نے PETHEDINE کا انجکشن دیا مگر انجکشن کے بعد ہی ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور تھوڑی دیر میں ختم ہو گئیں۔ دل کا بہت شدید دورہ پڑا تھا۔

بیگم قدسیہ زیدی جیسی حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں کے لحاظ سے ممتاز خواتین کم ہی دیکھیں۔ وہ ایک کشمیری خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ تعلیم لاہور کے ایک مشہور خواتین کے کالج میں ہوئی تھی اُن کی بڑی بہن کی شادی پروفیسر پطرس بخاری سے ہوئی تھی۔ پروفیسر پطرس بخاری کے آصف علی اور ارونا آصف علی سے گہرے مراسم تھے۔ اُن کے ذریعے سے زیدی صاحب سے ان کی ۱۹۳۷ء میں شادی ہوئی تھی۔ میں جب رام پور میں تھا تو زیدی صاحب کے علاوہ بیگم زیدی نے بھی مجھ پر لطف و کرم کی بارش کی۔ شروع سے وہ صرف رام پور کے ایک چیف منسٹر کی بیوی بننے پر قانع نہ تھیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ رام پور ہی میں انھوں نے کچھ انگریزی ڈراموں کے ترجمے شروع کر دیے تھے۔ **بعد میں** کئی سنسکرت ڈراموں کے بھی ترجمے کیے۔ جب زیدی صاحب دہلی آ گئے تو اُن کا گھر ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، فن کاروں کا مرکز بن گیا۔ ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں انھوں نے بہت کام کیا۔ ذاکر صاحب، سیدین صاحب، فیض احمد فیض عابد صاحب سب سے وہ بڑی محبت کرتی تھیں۔ جامعہ کی جوبلی کے لیے انھوں نے زیدی صاحب کے ساتھ چندے کی فراہمی اور انتظامات میں بڑی مدد کی تھی۔ زیدی صاحب کے علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں اُن کے پھیرے علی گڑھ کے ہوتے رہتے تھے مگر زیادہ تر قیام دہلی میں رہتا تھا وہاں ہندوستانی تھیٹر چلا رہی تھیں۔ شنکر پلے نے جب بچوں کے لیے مصوری کے مقابلے بین الاقوامی پیمانے پر شروع کیے تو سب سے زیادہ مدد قدسیہ زیدی نے کی۔ کتنے نوجوان ادیبوں اور فن کاروں کی انھوں نے ہمت افزائی کی۔ ان میں حبیب تنویر کو تو وہ بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

انتقال کے وقت اُن کی عمر ۴۸ سے زیادہ نہ ہوگی۔ کام کی دُھن میں انھوں نے اپنی صحت کی بالکل پروا نہ کی اُن کا خیال آتا ہے تو ورڈس ورتھ کے یہ اشعار یاد آتے ہیں۔

"A PERFECT WOMAN, NOBLY PLANNED
TO WARN, TO COMFORT, AND COMMAND"

اقبال کے الفاظ میں حلقۂ یاراں میں اُن میں ریشم کی سی نرمی تھی اور رزم حق و باطل میں فولاد کی سی صلابت۔

۱۹۵۸ء میں زیدی صاحب نے مجھے یونیورسٹی کی تہذیبی سرگرمیوں کا نگراں بنایا تھا۔ یہ سلسلہ ذاکر صاحب کے زمانے میں شروع ہوا تھا چناں چہ ڈراما، موسیقی، رقص سبھی پر توجہ تھی کچھ لوگوں نے دبی زبان سے اس پر اعتراض بھی کیا مگر ذاکر صاحب نے کہا کہ علی گڑھ کا مفتی میں ہوں۔ سنجیدہ تہذیبی سرگرمیوں سے طلبا کو سستی تفریحات میں پڑنے کا موقع نہیں ملتا۔ جمالیاتی ذوق کی آبیاری سے ان کی شخصیت میں شادابی آتی ہے۔ کئی سال تک یونیورسٹی کی ٹیم ملک کے نوجوانوں کے میلے میں شرکت کے لیے جاتی تھی۔ میری صدارت کے زمانے میں ایک سال مونس رضا اور دوسرے سال خورشید الاسلام سکریٹری تھے۔ مونس رضا کا دور تو خوبی سے گزر گیا۔ دوسرے سال ڈاکٹر منیب الرحمان نے مولیر کے ایک مشہور ڈرامے کو اُردو کے قالب میں ڈھالا تھا اور اس کا نام "شاہ صاحب" رکھا تھا۔ اس ڈرامے پر یونین والوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ اس میں سے بعض حصے نکال دیے جائیں۔ میں نے اس احتساب کو قبول نہ کیا۔ چناں چہ جو ٹیم میسور جانے والی تھی وہ نہ جا سکی بعد میں اعتراضات کی لے اتنی بڑھی کہ طالبات کی ڈرامے میں شمولیت سرے سے ممنوع قرار دے دی گئی۔ میرے نزدیک تہذیبی سرگرمیوں پر اس قدر سخت بندش سے نہ صرف طلبا کی شخصیت کی صحت مند نشوونما پر اثر پڑا بلکہ وہ سستی تفریحات میں پڑ گئے علی گڑھ کی کلچرل کمیٹی نے مجاز کی نظم "نذر علی گڑھ" کو یونیورسٹی کا ترانہ بنایا۔ یہ ترانہ بڑی کیفیت رکھتا ہے اور علی گڑھ کی پُرسوز زندگی کا ایک اشاریہ بن گیا ہے۔ ان تہذیبی سرگرمیوں کی وجہ سے علی گڑھ میں کئی اچھے فن کار ابھرے جن میں نصیر الدین شاہ کا نام قابل ذکر ہے۔ آج انھیں ملک کے چوٹی کے اداکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان سرگرمیوں میں ڈاکٹر منیب الرحمن، خواجہ مسعود علی ذوقی، اور زاہدہ زیدی نے نمایاں رول ادا کیا۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں میری لڑکی مہ جبین کی ڈاکٹر عبدالجلیل سے

شادی ہوئی یہ اس وقت یونیورسٹی کے اسپتال میں اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر تھے۔ میں اس وقت ا۔ شبلی روڈ پر آگیا تھا۔ شادی میں عزیزوں اور ساتھیوں کے علاوہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی ان میں فراق اور جگن ناتھ آزاد کے نام اس وقت یاد آتے ہیں۔ ڈاکٹر جلیل ۱۹۶۶ء میں ہمدرد دواخانے میں چلے گئے۔ کئی سال وہاں جڑی بوٹیوں پر تحقیق کرنے کے بعد پھر اپنا ذاتی کلنک (مطب) کھول لیا AQUAPUNCTURE سیکھنے کے لیے چین اور جاپان بھی گئے۔ اب ان کا ایک کلنک جامع مسجد دہلی کے قریب اور دوسرا اوکھلے میں ہے۔ ان کے چار بچے ہیں۔ بڑا لڑکا عبدالجلیل عرفی ماشاء اللہ زوالوجی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکا ہے اور اب J.N.U. میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہے۔ بڑی لڑکی رخشندہ دہلی یونیورسٹی سے انگریزی میں فرسٹ کلاس میں ایم۔ اے کرکے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے رسالے میں کام کر رہی ہے۔ دوسری تابندہ میڈیکل کا فائنل کر چکی ہے۔ تیسری نے اسی سال بارھواں پاس کیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ سب ترقی کریں اور خاندان اور ملک وقوم کے لیے باعث فخر ہوں۔

زیدی صاحب نے جب اکتوبر ۱۹۵۶ء میں وائس چانسلری کا چارج لیا تھا تو اس وقت سید نوراللہ پرو وائس چانسلر تھے۔ یہ ذاکر صاحب کے ساتھیوں میں تھے۔ پہلے جامعہ میں تھے۔ پھر بمبئی کی تعلیمی سروس میں رہے اور ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ تعلیمی معاملات کا خاصا تجربہ رکھتے تھے مگر مزاج میں کچھ صاحبیت تھی۔ مرارجی ڈیسائی نے ان کا اپنی یادداشتوں میں ذکر بھی کیا ہے۔ جب ان کا ٹرم ختم ہوا تو ان کے جانشیں کے لیے میں نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا نام تجویز کیا۔ زیدی صاحب نے میری رائے مان لی۔ اب یاد آتا ہے کہ عابد صاحب نے ان کے تقرر کی مخالفت کی تھی۔ ذاکر صاحب سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے اجازت دیدی۔ بہرحال جولائی ۱۹۵۸ء میں وہ پرو وائس چانسلر ہو کر آگئے۔ سال بھر کا عرصہ گذرا ہوگا کہ انھوں نے ذاکر صاحب اور زیدی صاحب کی پالیسی سے اختلاف شروع کر دیا۔ منیب الرحمان کے ڈرامے پر انھوں نے طلبا کے اعتراضات کی تائید کی۔ عبدالمجید خواجہ صاحب ذاکر صاحب کے آخری دور میں ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ یوسف صاحب نے ان سے ربط ضبط بڑھایا اور اکزیکٹو کونسل میں زیدی صاحب کی کھلم کھلا مخالفت ہونے لگی۔ میں نے اس بات کی طرف ذاکر صاحب کی توجہ دلائی مگر انھوں نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا کہ آپ ہی نے

تو ان کے تقرر کی سفارش کی تھی۔ یہ بات تو صحیح تھی مگر ذاکر صاحب سے مجھے توقع تھی کہ وہ یوسف صاحب کو سمجھائیں گے۔ یہ توقع پوری نہ ہوئی۔

میں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک ایس ایس ہال کا پرووسٹ رہا تھا۔ ۶۰-۱۹۵۹ء کے تعلیمی سال تک کلچرل کمیٹی کا صدر رہا۔ اگست ۱۹۶۰ء میں ماسکو میں انٹرنیشنل اورینٹلسٹ کانگریس کا اجلاس تھا۔ ہمایوں کبیر صاحب نے میرا نام تجویز کیا اور زیدی صاحب نے اس کی تائید کی۔ چنانچہ میں ۱۵ اگست کو دہلی گیا اور وہاں سے ۱۶ کی صبح کو ماسکو کے لیے روانہ ہوا۔ وزارت تعلیم نے صرف پندرہ سو کی رقم ہوائی جہاز کے کرایے کے لیے دی تھی وہاں کے قیام وطعام کے اخراجات کے لیے یونیورسٹی نے دو ہزار کی رقم دی۔ وفد میں ۱۵ آدمی تھے۔ وفد کے صدر مشہور ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی تھے جو پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میرے ساتھ جو لوگ تھے اُن میں دکن کالج پونا کے ڈنڈے کر، الٰہ آباد کے جیتو پادھیائے، حیدر آباد کے نظام الدین، کلکتے کے کالی داس ناگ اور بنارس کے ڈاکٹر شاستری کے علاوہ سکم کے شہزادے (چوگیال) یاد آتے ہیں۔ کپیلا واتسایاین نے دہلی کے ہوائی اڈے پر وزارت تعلیم کی طرف سے ہمیں رخصت کیا۔ صبح ۶ بجے ہم روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹے کے لیے تاشقند میں جہاز رکا پھر کوئی ساڑھے تین بجے ماسکو کے وقت کے مطابق ماسکو کے ہوائی اڈے پر اترے۔ ہندوستانی سفارت خانے کے کارکن بھی روسی میزبانوں کے علاوہ ہمارے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ وفد کے کچھ ممبر مشہور ہوٹل یوکرائن میں ٹھہرے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے سارے اخراجات ہماری وزارت تعلیم نے دیے تھے۔ میں بھی وہاں ٹھہر سکتا تھا مگر میں نے سوچا کہ اس طرح صرف کانفرنس میں شرکت ہو سکے گی اور ماسکو کے باہر کہیں جانے کا موقع نہ ملے گا۔ میں چاہتا تھا کہ کم از کم لینن گراڈ ضرور دیکھ لوں۔ بہرحال وفد کے باقی ماندہ افراد کے ساتھ میں ماسکو یونیورسٹی چلا گیا۔ جہاں ایک ہوسٹل میں ہم لوگوں کے قیام کا انتظام تھا۔ ہمیں صرف کھانے اور ناشتے کے اخراجات برداشت کرنے ہوتے تھے۔ ماسکو یونیورسٹی بذات خود ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔ لینن ہل پر دریائے ماسکو کے کنارے یہ ایک شاندار عمارت ہے۔ یہاں سے بسوں کے ذریعے ہم کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کے لیے ماسکو کے ایک شاندار اوڈیٹوریم میں گئے تھے۔ کریملن میں بھی ہمارے اعزاز میں ایک شاندار دعوت تھی۔ اس کے علاوہ کانگریس کی استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے بابا جان غفوروف نے جو لنچ دیا تھا اس میں بھی شریک ہوئے تھے کانگریس کے مختلف شعبوں کے اجلاس ماسکو یونیورسٹی میں ہی مختلف کمروں میں ہوتے تھے۔ جس دن ہم پہنچے تھے

اُسی دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ پہلے ظ۔ انصاری کا ٹیلیفون آیا۔ انھیں یونیورسٹی کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ چناں چہ میں اُن سے ملنے یونیورسٹی کے پھاٹک کے پاس ایک کمرے میں گیا وہاں سے واپس آیا تو لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک ساتھی شکلا کا فون آیا۔ یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ہندی کے ریڈر تھے اور ماسکو دو سال کے لیے کسی اسکیم کے تحت آئے تھے۔ میں ان سے ملنے پھر یونیورسٹی کے پھاٹک پر جانے والا تھا کہ الٰہ آباد اور بنارس کے دو اسکالروں جیٹھ پادھیائے اور ساستری نے یہ فرمائش کی کہ میں شکلا کے ذریعے سے کچھ مٹی منگوا دوں تاکہ وہ اپنا کھانا تیار کرنے کے لیے ملحقہ کچن کو لیپ سکیں۔ یہ لوگ اپنے کھانے کے لیے آٹا اور دال اور گھی مسالے اور چائے ساتھ لائے تھے۔ میں بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ بہر حال میں نے شکلا سے کہا کہ وہ کسی طرح ان لوگوں کی مدد کریں ورنہ یہ لوگ بھو کے مر جائیں گے۔ شکلا کہیں سے ایک تھیلے میں کچھ مٹی لے آئے جو انھوں نے مجھے دی اور میں نے ان لوگوں کے حوالے کر دی۔ جو لوگ اس قدر کٹر ہوتے ہیں کہ اپنا کھانا خود تیار کرتے ہیں اور باہر کی کوئی چیز نہیں کھاتے اُن پر بیرونی ممالک میں کیا گذر جاتی ہوگی۔ اس کا احساس تو مجھے بہر حال ہو گیا۔

کانگریس کا افتتاح مشہور روسی لیڈر میکوین نے کیا۔ بابا جان غفوروف کی تقریر ہوئی پھر ہر ملک کے وفد کے سربراہ کی تقریر ہوئی۔ ہماری طرف سے پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی نے تقریر کی۔ کوئی دو گھنٹے میں یہ اجلاس ختم ہوا اور ہم لوگ ماسکو یونیورسٹی میں واپس آ گئے۔ ساری تقریریں روسی میں تھیں مگر چوں کہ انگریزی میں ترجمے کا انتظام تھا اس لیے ہم لوگ اپنے اپنے ہیڈ فون کانوں سے لگائے ساری تقریروں کا انگریزی میں ترجمہ سن رہے تھے۔ مترجم خاصا رواں ترجمہ کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انگریزی میں تقریریں ہو رہی ہیں۔

دوسرے دن سے مختلف شعبوں کے اجلاس شروع ہوئے میں جدید ہندوستانی شعبوں کے سارے اجلاسوں میں شریک ہوا۔ میرا پرچہ جدید اُردو ادب کے میلانات پر انگریزی میں تھا۔ زیادہ تر پرچے انگریزی میں ہی تھے۔ مگر کچھ لوگوں نے ہندی، تامل، اور سنسکرت میں بھی پرچے پڑھے۔ اجلاس میں پچیس تیس سے زیادہ لوگ نہ ہوتے تھے۔ کانگریس میں ڈبلو۔ سی۔ اسمتھ، عزیز احمد اور متین زبیری لندن کے وفد کے ساتھ آئے تھے۔ عزیز احمد سے حیدر آباد میں ملاقات ہو چکی تھی

اور خط و کتابت بھی تھی۔ میں نے یہ دیکھا کہ ان کے ساتھ اکثر کوئی نہ کوئی حسین اسکالر ہوتی تھی۔ کریملن کے ڈنر میں عزیز احمد شریک نہ ہوئے وہ کسی روسی خاتون کے یہاں مدعو تھے۔ انھوں نے بات چیت کے دوران مجھے بتایا کہ وہ پاکستان سے لندن آ گئے ہیں اور ادبیات کے بجائے ہندوستان کے جدید دور کی تاریخ پر کام کر رہے ہیں۔ پاکستان سے وہ خوش نہ تھے اور لندن کے بعد کناڈا جانے کا پروگرام تھا۔ کانگریس آٹھ دن چلی۔ بیچ میں دو دن کا وقفہ تھا۔ کچھ لوگ اس وقفہ میں لینن گراڈ ہو آئے۔ میں نے یہ طے کیا کہ کانگریس کے بعد لینن گراڈ جاؤں گا اور وقفے کے دوران ٹالسٹائے کا مزار اور ٹالسٹائے میوزیم دیکھنے یاسنایا پولیانا جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے ان روسی اسکالروں سے جو ہم لوگوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہا کہ کسی کو ٹالسٹائے کے مزار اور میوزیم تک لے جانے کے لیے تعینات کر دیں۔ جب میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنا پروگرام بتایا تو کالی داس ناگ اور شاستری بھی جانے کو تیار ہو گئے۔ ہم لوگ صبح چھ بجے روانہ ہوئے۔ ماسکو یونیورسٹی کے ایک ٹالسٹائے پر ریسرچ کرنے والے استاد ہمارے رہنما تھے۔ کوئی تین گھنٹے بعد سائنسک کے شہر میں پہنچے جہاں ایک ریستوراں میں ناشتہ کیا۔ ناشتہ ختم کر چکے تھے کہ مچھلی کی ایک پلیٹ آئی۔ میں نے تو معذرت کر لی۔ میں جس مہینے میں آر (R) ہو اس میں مچھلی نہیں کھاتا۔ بچپن میں کہیں پڑھا تھا کہ اس مہینے میں مچھلی نہیں کھانی چاہیے۔ مگر ہمارے بنگالی بابو مچھلی دیکھ کر مچل گئے اور اس پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ ہوٹل سے نکلے ہی تھے کہ برآمدے میں گر کر بے ہوش ہو گئے۔

میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ان پروفیسر صاحب نے جو ہمارے ساتھ تھے کسی طرح انھیں اٹھا کر موٹر میں بٹھایا اور سیدھے اسپتال پہنچے وہاں زیادہ تر خواتین ہی ڈاکٹر تھیں۔ انھوں نے دیکھا بھالا۔ کوئی انجکشن دیا اور کہا کہ یہ کچھ دیر آرام کریں تو ٹھیک ہو جائیں گے ہوش میں تو آ چکے تھے۔ اب ہم لوگوں نے طے کیا کہ انھیں اسپتال میں چھوڑ جائیں پھر شام کو واپسی میں ماسکو یونیورسٹی لے چلیں گے مگر یہ حضرت بھی دھن کے پکے تھے کہنے لگے کہ میں ٹالسٹائے کا مزار ضرور دیکھوں گا۔ چنانچہ پھر ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا اور اس نے کچھ دوائیں ساتھ کر دیں کہ یہ تین تین گھنٹے پر استعمال کرتے رہیے مگر زیادہ چلیے نہیں۔ دوپہر کے وقت ہم یاسنایا پولیانا پہنچ گئے۔ یہ ماسکو سے کوئی دو سو میل ہو گا۔ پہلے ایک گاؤں سے گذرے پھر ایک وسیع احاطے میں داخل ہو گئے جس کے

ایک طرف ٹالسٹائے کا مزار ہے۔ مزار پر تازہ گلاب کے پھول پڑے ہوئے تھے اور کچھ زائرین بھی موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں روز سیکڑوں آدمی آتے ہیں اور اُن میں سے بیشتر مزار پر گلاب کے پھول رکھ دیتے ہیں۔ مزار کے بعد ہم ٹالسٹائے کی قیام گاہ گئے جہاں اُس کی ساری چیزیں بالکل ویسی ہی رکھی ہیں جیسی اُس نے مرنے سے کچھ دن پہلے گھر سے نکلتے وقت چھوڑی تھیں۔ اُس کی کتابوں کے مسودے بھی دیکھے اور اُس کے کھانے اور سونے کا کمرہ بھی۔ وہ آخر عمر میں صرف ترکاری پر گزر کرتا تھا۔ مسودوں میں خاص بات یہ تھی کہ وہ مسودے میں اصلاح بہت کرتا تھا۔ اس طرح WAR AND PEACE (جنگ اور امن) اور ANNA KERANINA اینا کرنینا کے کئی صفحوں کے چھ چھ سات سات پروف تھے جن میں سے ہر ایک میں اس کی اصلاحیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ طابع اُس کی اس عادت سے بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ اس کی ہر عمر کے فوٹو بھی بکثرت تھے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ باوجود اس کے فلسفۂ زندگی سے اختلاف کے کمونسٹ روس میں اس کی مقبولیت خاصی تھی۔ پشکن کی شاید زیادہ ہو۔ ویسے ترجنیف اور دوستافیسکی اور چیخوف اور مایاکوسکی بھی ان سے مقبول تھے۔ روس اپنے ادیبوں اور شاعروں کی بڑی قدر کرتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں کمونزم کو روس میں آئے ۴۳ سال ہو چکے تھے مگر انیسویں صدی کے ان دیوتادوں کے مقابلے میں کمونسٹ روس کے ادیب اور شاعر زیادہ تر بونے ہی نظر آئے۔ مایاکوسکی کی شاعری اور شولوخوف کے ناولوں کو بھی ماضی کے ان مشاہیر کے پلّے میں نہیں رکھا جا سکتا۔

کانفرنس کے اختتام پر ہیں لینن گراڈ گیا۔ اس رات کریملین میں ڈنر تھا۔ بلا مبالغہ ڈیڑھ دو ہزار آدمی ہوں گے۔ روس میں سب سے محبوب غذا کاویار ہے۔ یہ ایک مچھلی کے انڈے ہوتے ہیں جو کیسپین کے ساحل پر ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے انڈے جیسے رائی کے دانے توس پر لگا کر کھائے جاتے ہیں۔ مجھے تو کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوئی۔ ہر ملک کی اپنی اپنی پسند ہے۔ کھانے بھی عام طور پر لذیذ نہیں ہوتے مگر میں لذت کام و دہن کی زیادہ پروا نہیں کرتا جو ملے کھا لیتا ہوں۔ کانگریس کے آخری دن باباجان غفوروف صدر استقبالیہ کی طرف سے لنچ تھا۔ روس میں وقت کی پابندی زیادہ نہیں یہ ڈیڑھ بجے کے بجائے ڈھائی بجے شروع ہوا۔ کھانے کے بعد جام صحت نوش کرنے کا سلسلہ دیر تک چلا۔ کوئی آٹھ دس جام صحت روسی میزبانوں، بیرونی ملکوں

کے مہمانوں ، عالمی امن ، آفاقی مذاکرے کے اعزاز میں نوش کیے گئے۔ سامنے چھوٹے چھوٹے گلاسوں کی قطاریں تھیں بار بار اٹھنا ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دھوکے میں ایک چھوٹا گلاس اٹھا کر پی گیا۔ اس میں روس کا مشہور مشروب واڈکا تھا۔ گھونٹ لیتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ حلق سے کوئی چنگاری نیچے جا رہی ہے۔ سارا ہال ناچنے لگا۔ میں چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ میرے برابر کھڑے شبو دھان سنگھ چوہان نے جو ہندی کے ایک مشہور نقاد ہیں میری حالت دیکھ کر میری کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیا۔ تھوڑی دیر میں یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ میں نے پوچھا کہ اس پانی میں کیا تھا؟ انھوں نے کہا یہ پانی نہیں واڈکا ہے اور واقعی بہت تیز ہوتی ہے۔ روس کا محبوب ترین مشروب ہے۔

لینن گراڈ کے لیے میری برتھ پہلے سے ریزرو تھی۔ کریملن سے سیدھا ماسکو کے ریلوے اسٹیشن آیا۔ کوئی گیارہ بجے ریل چلی۔ ایک کونے میں میری برتھ تھی۔ میرے پاس صرف شب خوابی کے کپڑے تھے اور ہاتھ منہ دھونے اور شیو کرنے کا سامان۔ برتھ پر دو کمبل تھے۔ سونے سے پہلے گرم گرم چائے کا ایک پیالہ دیا گیا۔ اتفاق سے عزیز احمد اسی گاڑی سے سفر کر رہے تھے اور اسی بوگی میں تھے کچھ دیر کے لیے آ گئے اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کریملن کے ڈنر میں نظر نہیں آئے تو بولے میری ایک حسینہ کے یہاں دعوت تھی۔ میری طرح انھیں بھی لینن گراڈ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

دوسرے دن صبح کوئی دس بجے ہم لینن گراڈ پہنچے۔ یہ ماسکو کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ ماسکو کی کوئی نئی عمارت خوبصورت نہیں۔ لینن گراڈ کے گرجا گھر اور محل بڑے خوبصورت ہیں۔ شہر کے بیچوں بیچ دریائے نیوا ہے۔ لینن گراڈ بالٹک BALTIC کے کنارے واقع ہے۔ ہوٹل سے ہم لوگ سیدھے HERMITAGE یا آرٹ پیلیس دیکھنے گئے اور وہاں کئی گھنٹے صرف کیے۔ اللہ اللہ یہ کیسا عظیم الشان نگار خانہ ہے۔ مصوری، بت تراشی، ظروف اور دنیا بھر کے نوادر کا بے مثال خزانہ۔ میں نے یورپ کی مصوری کے بہت سے شاہکار یہاں دیکھے۔ پھر سوچا لاؤ ایرانی اور ہندوستانی فن کے نمونے بھی دیکھ لوں چناں چہ یہ بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یہاں سے نکلا تو دو بج چکے تھے۔ میں روسی مستشرق زگیروف کو تلاش کرتے ہوئے اُن کے دفتر پہنچا۔ ان سے پہلے خط و کتابت تھی۔ بڑی محبت سے ملے۔ میں

نے سوچا اب لینن گراڈ میں ٹھہرنا بے کار ہے اس لیے ایک دن اور یہاں صرف کرنے کے بجائے ماسکو رات کو ہی روانہ ہو جاؤں مگر گیردوت نے مجھے جانے نہ دیا۔ اس وقت تو مجھے ہوٹل پہنچا گئے۔ پھر شام ہوتے ہی آئے اور مجھے ساتھ لے کر لینن گراڈ کی سیر کو نکلے۔ دریائے نیوا میں ایک کشتی میں دور تک گئے۔ بالٹک کے ساحل پر ایک اسٹیڈیم دکھایا جس میں ہزاروں آدمی بیک وقت آسکتے ہیں۔ اب رات ہو چکی تھی لیکن ایک ہلکا سا اجالا، ایک روشن شام دس بجے تک دیکھی۔ دن نہ تھا اور رات بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ایک نرم اجالا، ایک خنک شام، میں لینن گراڈ کے جادو میں کھو گیا۔ وہاں سے واپس آتے ہی ایک نظم لکھی جو بعد میں ماسکو ریڈیو سے نشر ہوئی اور سوویت دیس میں چھپی۔

پلیٹس کی مشہور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری کئی سال سے نایاب تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے نیا ایڈیشن شایع نہیں کیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ روس میں اس کا عکس شایع ہوا ہے۔ ماسکو یونیورسٹی میں جا بجا کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔ ایک جگہ یہ ایک سو بیس روبل میں مل گئی اور میں نے خرید لی اس وقت سو روبل سو روپے کے برابر تھے۔ بعد میں روس کے ہندی اُردو کے اسکالروں نے مجھے اپنی اکیڈمی میں مدعو کیا۔ وہاں اُردو اور ہندی کی تعلیم کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا۔ ان اسکالروں کے سربراہ چیلی شیف نے پلیٹس کی ڈکشنری کا ایک اور سیٹ نذر کیا۔ بعد میں میں نے جو سیٹ خریدا تھا وہ اپنی یونیورسٹی کو فروخت کر دیا۔

ظ۔ انصاری سے اکثر ملاقات ہوتی تھی ان کی وساطت سے اُردو میں ریسرچ کرنے والے اور اُردو سے روسی میں ترجمہ کرنے والے کئی اسکالروں سے ملاقات ہوئی۔ لکھنؤ کے حبیب الرحمٰن ماسکو میں بس گئے تھے۔ اور کرغیزیہ (KIRGHIZIA) کی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔ انھوں نے میری دعوت کی اور بہت سے ہندوستانیوں سے جو روس میں مقیم تھے ملایا۔ انور عظیم اور خدیجہ عظیم بھی وہاں تھے۔ اُن کے یہاں بھی ایک رات کھانا کھایا۔ لینن گراڈ سے واپس آکر ماسکو یونیورسٹی کے بجائے بابا جان غفوروف کی اکیڈمی کا مہمان ہوا۔ کوئی ایک ہفتہ قیام رہا۔ ایک دن بابا جان نے بلایا۔ پروفیسر دیاکوف جو ہندوستان آچکے تھے مجھے اُن کے پاس لے گئے۔ بابا جان اُردو نہیں بول سکتے تھے مگر سمجھ لیتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ اُردو سمجھ لیتے ہیں تو فرمایا 'می فہمیدم' اس کے بعد اُردو میں ہی بات ہوئی۔ انھوں نے ازبکستان کے علاقے کی ایک قبا اور وہاں کی ٹوپی مجھے

اپنے ہاتھ سے پہنائی۔ مجھے اس اعزاز سے بہت خوشی ہوئی۔

ماسکو میں میں نے کئی قابلِ دید مقامات دیکھے۔ حبیب الرحمان روسی ریاستوں کے ایک پویلین (PAVILION) میں لے گئے جہاں ہر ریاست کی مصنوعات دیکھنے کو ملیں۔ ہندوستانی سفارت خانے میں گیا۔ پشکن، واستافیسکی اور ماپاکوسکی کے میوزیم دیکھے۔ ماسکو کی میٹرو (زیرِ زمین ریل) مجھے بہت پسند آئی۔ ہر اسٹیشن کی عمارت شاندار تھی۔ یہ اسٹالن کے زمانے کی یادگار ہے۔ ویسے اسٹالن کی بنائی ہوئی بہت سی عمارتیں خوبصورت نہیں ہیں مگر میٹرو کے اسٹیشن سب خوبصورت اور آراستہ ہیں۔ ایک خاص بات یہ دیکھی کہ میٹرو میں خواتین کے لیے کوئی کھڑا نہیں ہوتا۔ ہاں بوڑھوں اور بچوں کے لیے لوگ اپنی نشست خالی کر دیتے ہیں۔

مجھے لینن کا مزار اور اس کی ممی دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ہمارے روسی میزبان ہمیں وہاں بھی لے گئے۔ جب ایک میدان میں پہنچے جس کے ایک سرے پر لینن کا مزار ہے تو شائقین کی قطار بڑی لمبی تھی۔ میں بہت گھبرایا کہ اب کئی گھنٹے لگ جائیں گے مگر غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ یہ رعایت ہے کہ وہ قطار میں کھڑے نہ ہوں۔ چنانچہ ہماری پارٹی کو بہت جلد اندر جانے کا موقع مل گیا۔ داخل ہوئے تو دیکھا کہ مسالے سے لینن کی لاش کو اس طرح رکھا ہے جس طرح وفات کے دن تھی چہرہ کچھ سکڑا ہوا ضرور تھا۔ مزار کے باہر روس کے ممتاز رہنماؤں کی یاد میں کتبے نصب ہیں۔ یہیں اسٹالن کا کتبہ بھی ہے۔

اس زمانے میں خروشچیف (KHRUSCHEVE) کمونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری اور روس کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ انھیں کے زمانے میں اسٹالن کے مظالم کا پردہ فاش کیا گیا۔ روسی دوستوں نے بتایا کہ اب بعض معاملات میں اختلاف بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اسٹالن کے زمانے میں لوگ سب کچھ خاموشی سے سنتے رہتے تھے کہ نہ معلوم کب کس پر عتاب نازل ہو جائے۔

ماسکو میں مجسمہ سازی کے میں نے کئی شاہکار دیکھے۔ لینن کے مجسمے تو جا بجا نظر آئے۔ ماسکو کے قیام کے زمانے میں کچھ کتابیں خریدیں۔ بہت سی کتابیں تحفے میں ملیں۔ دکانوں پر دیکھا کہ ہر چیز کے لیے علیحدہ کاؤنٹر ہے اور دام دینے کے لیے علیحدہ۔ اس طرح دیر تو ہوتی ہے مگر بھیڑ زیادہ نہیں ہوتی ہوائی جہاز سے زیادہ سامان نہ لا سکتا تھا اس لیے کتابوں کے دو بڑے بنڈل بنا کر خط۔ انصاری کے ساتھ ایک ڈاکخانے چلا گیا۔ انھوں نے کتابوں کے پارسل بھی بنائے اور معمولی محصول لے کر سمندر کے

راستے نے یہ پارسل روانہ بھی کر دیے جو مجھے تین مہینے میں مل گئے۔ روس میں عام طور پر ہندوستان سے دوستی کے جذبات دیکھے۔ جواہر لال نہرو کا نام تو ہر ایک کی زبان پر تھا مگر تعجب ہوا کہ راج کپور اور اس کی فلم آوارہ کی مقبولیت جواہر لال نہرو سے کم نہ تھی۔ ماسکو میں مکانوں کی قلت ہے۔ مشکل سے لوگوں کو فلیٹ ملتے ہیں۔ تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ روس کے شہری کام سے تو ماسکو آ سکتے ہیں مگر یہاں مستقل قیام کے لیے انھیں پرمٹ لینا پڑتا ہے۔ تعلیم عام ہے۔ کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ادیب اور مصنف بہت مزے میں ہیں۔ اُن کی رائلٹی اتنی ہوتی ہے کہ بہت سوں نے شہر کے باہر ڈاچا (DACHA) خرید لیا ہے۔ یہ گویا خوش حالی کی نشانی ہے۔ واڈ کا محبوب مشروب ہے۔ مجھے ماسکو یونیورسٹی کے سامنے ٹہلتے ہوئے دو ایک بدمست بھی ملے اور انھوں نے مجھ سے پیسے بھی مانگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مریض ہو گئے ہیں۔ انھیں اسپتال علاج کے لیے لے جایا جاتا ہے تو وہاں سے بھاگ نکلتے ہیں اور شراب کے لیے پیسے مانگتے ہیں۔ پھر بھی ایسی مثالیں خال خال ہی ہوں گی۔ ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں۔ ہر چیز حکومت کی ہے۔ آمدنی میں تفاوت خاصا ہے۔ ضروریات کی قیمتیں کم رکھی گئی ہیں، تعیشات کی زیادہ۔ لوگوں کو اس کی اجازت ہے کہ خالی وقت میں کہیں اور کام کریں اور اس کا معاوضہ لیں۔ سائنس والوں کی بڑی عزت ہے۔ دوسری زبانوں کے خاص خاص کلاسکس مل جاتے ہیں مگر بعض کتابوں پر احتساب ضرور ہے۔ مغرب کی سرمایہ دار حکومتوں کی مذمت عام ہے۔ لوگوں کے ذہن کی اس طرح تربیت کی گئی ہے کہ ہر چیز یا سفید ہے یا سیاہ۔ میری بہت سے ہندوستانی نوجوانوں سے ملاقات ہوئی وہ روس کے طرزِ زندگی سے اتنے متاثر تھے کہ ہماری جمہوریت کی شست روی کے شاکی تھے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ آمریت میں منصوبے ضرور جلد پورے ہوتے ہیں مگر جمہوریت دلوں کو بدلتی ہے اور اس کا کام دیر میں ہوتا ہے مگر پائدار زیادہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ قایل نہ ہوئے۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ مشترک فارم چلانے کے لیے اسٹالن نے کتنے مظالم کیے تھے۔

کوئی تین ہفتے کی روس کی یہ سیر نہایت خوش گوار تجربہ ثابت ہوئی۔ ۲۵ر اگست ۱۹۶۰ء کو تیز بارش میں آٹھ بجے شب اکیڈمی کے ہوسٹل سے ایرپورٹ پہنچا۔ میرے ترجمان کچھ دیر بعد چلے گئے۔ مگر پھر ظ۔ انصاری آ گئے اور ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ ساڑھے دس بجے آخری گاڑی سے

وہ گئے۔ رات کے بارہ بجے ہوائی جہاز کی پرواز تھی۔ ساڑھے تین گھنٹے میں تاشقند پہنچے اور وہاں سے ڈھائی گھنٹے میں دلی آ گئے۔ یہاں اس وقت دوپہر تھی۔

دسمبر ۱۹۶۰ء میں مجھے آفتاب ہال کا پرووسٹ مقرر کیا گیا۔ پھر شروع ۱۹۶۱ء میں یونیورسٹی اگزیکٹو کونسل کا ممبر بھی ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی کے خلاف ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی گئی تھی۔ الزام یہ تھا کہ ستیدین صاحب کا مکان اور عبدالمجید خواجہ کی زمین زیدی صاحب نے یونیورسٹی کے لیے زیادہ رقم دے کر خریدی ہے۔ دراصل اس کارروائی میں اس وقت کے وزیر تعلیم کے۔ ایل شریمالی کا ہاتھ تھا۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ داخلے میں مسلمان طلبا کو ترجیح دی جاتی ہے۔ صلاحیت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس کمیٹی کے سربراہ پروفیسر اے۔ سی۔ چٹرجی تھے اور ایک ممبر ہندو اور ایک سکھ تھے۔ کوئی مسلمان ممبر نہیں رکھا گیا تھا۔ جب اس پر احتجاج ہوا تو بعد میں پی۔ این سپرو اور جسٹس شاہ بیگ کو بھی شامل کیا گیا۔ تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں سارے الزامات کو غلط بتایا اور یونیورسٹی میں مسلمانوں کے دو تہائی تناسب کو جائز قرار دیا۔

۱۹۶۰ء میں مجھے اسٹاف ایسوسی ایشن کا اتفاق رائے سے صدر منتخب کیا گیا۔ اس زمانے میں اساتذہ کے گریڈ پر نظر ثانی کا مسئلہ اہم تھا۔ اس سلسلے میں ہم نے یو۔ جی۔ سی کو ایک میمورنڈم پیش کیا اور ہمارا ایک وفد یو۔ جی۔ سی کے صدر ڈاکٹر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ سے ملا۔ دیش مکھ صاحب سے پہلے کئی دفعہ ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ سنسکرت کے عالم تھے اور فارسی اردو بھی جانتے تھے۔ پہلے مرکزی کابینہ میں وزیر رہ چکے تھے۔ مگر ریاستوں کی لسانی تنظیم نو کے مسئلے پر جواہر لال نہرو سے اختلاف ہو گیا تھا۔ دیش مکھ زیدی صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں کئی دفعہ علی گڑھ آئے۔ قیام زیدی صاحب کے یہاں ہوتا تھا۔ ان کی خاطر تواضع درگاہ ای سے ہوتی تھی۔ ایک دفعہ صبح کو زیدی صاحب ان کی خیریت دریافت کرنے مہمانوں کے کمرے میں آ گئے تو دیکھا [illegible] حیران بیٹھے تھے۔ کہنے لگے رات پھر نیند نہیں آئی۔ کوئی جانور رات میں چھت سے گرا اور چھت کا ایک حصہ بھی اسی کے ساتھ گر گیا۔ چھت پھوس کا تھا اور اندر کنوس کی چھت تھی۔ ہوا یہ تھا اس مکان میں بجو بہت تھے۔ ان میں سے ایک کسی طرح ان کے کمرے میں گر گیا۔ پھر تو بندوق سے دس بارہ بجو مارے گئے اور وائس چانسلر کے مکان کی چھت بدلی گئی۔

دیش مکھ کے زمانے میں یو۔ جی۔ سی نے اعلیٰ تعلیم کے فروغ اور اس کا معیار بلند کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ جب ہمارا وفد ان سے ملا اور یہ مطالبہ کیا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی تنخواہیں حکومت

کے اوّل درجے کے کارکنوں کے گریڈ کے مطابق ہونی چاہئیں تو دیش مکھ نے فوراً اسے مان لیا۔ سکریٹری منقالی نے ہرچند چاہا کہ پہلے اس کے مالی مضمرات پر غور کر لیا جائے مگر دیش مکھ نے کہا کہ اس میں دیر ہوگی۔ یہ مطالبہ بہرحال مانا جانا ہے۔ مگر ہمارا یہ مطالبہ انھوں نے نہیں مانا کہ سارے استادوں کا ایک گریڈ ہو۔ اور ریڈر کا گریڈ ختم کر دیا جائے۔ بہت جلد نئے گریڈ نافذ ہو گئے۔

شروع اکتوبر ۱۹۶۱ء میں یونیورسٹی میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا جس کے نتیجے میں علی گڑھ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ یونین کے الکشن کے بعد ضیاء الدین ہوسٹل میں ایک ہندو طالب علم اقبال سنگھ اور ایک مسلمان طالب علم بدر الاسلام میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں کے حامیوں کی وجہ سے معاملہ فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر گیا۔ شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ایک ہندو طالب علم مر گیا ہے اور اس کی لاش غائب کر دی گئی ہے۔ چناں چہ شہر سے ایک خاصا بڑا جلوس یونیورسٹی کی طرف آیا۔ میں دوپہر کو شعبۂ اردو سے اپنا کلاس لے کر نکل رہا تھا کہ آفتاب ہال کے سینیئر ہال نے مجھے اطلاع دی کہ شہر سے ایک بڑا مجمع کرکٹ لان تک پہنچ چکا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سر سید ہال اور آفتاب ہال کے طلبا مچھر دانی کے بانس لے کر نکلے ہیں۔ میں سید ھا زیدی صاحب کے پاس پہنچا اور ان کو لے کر ماریس روڈ آیا۔ دیکھا تو ایس ایس ہال کے دروازے بند کیے جا چکے ہیں تاکہ طلبا باہر نہ جا سکیں۔ مگر آفتاب ہال کے ہر ہوسٹل سے طلبا سڑک پر آ گئے ہیں۔ میں نے اور میرے وارڈن محمد انس نے انھیں میکڈانل ہوسٹل کے پاس روکا اور سمجھایا کہ اب شہر روڈ پر جائیں ورنہ پولس گولی چلائے گی ہاں اگر ان کی طرف ماریس روڈ پر ہجوم آئے تو وہ اپنا دفاع ضرور کریں۔ اس اثنا میں خبر ملی کہ ویمنس کالج پر حملہ ہوا ہے۔ زیدی صاحب فوراً وہاں چلے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ کوئی ایک ہزار طلبا کا مجمع میرے کہنے سے میکڈانل ہوسٹل سے آگے نہ بڑھا مگر اس عرصے میں ہم نے شمشاد مارکیٹ میں دھواں دیکھا اور معلوم ہوا کہ شہر کے مجمع نے پولس کے آنے سے قبل کئی مکانوں اور دوکانوں کو آگ لگا دی تھی۔ اس کے بعد باوجود میرے روکنے کے کچھ طلبا شمشاد مارکیٹ پہنچ گئے۔ شہر کا مجمع فرار ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے انتقاماً کچھ ہندوؤں کی دکانوں کو آگ لگا دی۔ شہر میں تو رسل گنج اور اس کے اطراف میں ایک بڑے مجمع نے کئی مسلمانوں کو مار ڈالا۔ حکام نے کرفیو نافذ کر دیا۔ یہ کرفیو یونیورسٹی کے علاقے میں بھی تھا۔

کرفیو ایک ہفتے تک نافذ رہا۔ زیدی صاحب نے اس زمانے میں سب سے پہلے طلبا سے ہوسٹل خالی

کرائے اور غیر مسلم طلبا کو حفاظت سے گھر بھجوایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ہندو طالب علم کے والدین اسے لینے آئے۔ وہ اپنے کمرے پر نہ تھا اور کچھ مسلمان دوستوں کے ساتھ گھومنے گیا ہوا تھا۔ جب وہ آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تم فوراً اپنے گھر چلے جاؤ۔ تمھارے والدین پریشان ہو کر تمھیں لینے آئے ہیں۔ وہ جانا نہ چاہتا تھا کیوں کہ اسے کوئی خطرہ نہ تھا مگر شہر میں چوں کہ یہ افواہ پھیلائی گئی تھی کہ ہندو طلبا غیر محفوظ ہیں اس لیے میں نے اسے گھر روانہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ زیدی صاحب نے اس کے بعد شہر کی فضا کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے شہر میں کئی جلسوں سے خطاب کیا اور شہریوں کو اطمینان دلایا کہ سب غیر مسلم طلبا مسلم طلبا کے ساتھ مل کر رہتے ہیں اس لیے انھیں کوئی پریشانی نہ ہونی چاہیے۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد حالات نارمل ہونا شروع ہوئے اور دس پندرہ دن کے بعد یہ بھی نظر نہ آتا تھا کہ کہیں کوئی کشیدگی رہی ہوگی۔ دراصل یونیورسٹی میں طلبا میں مارپیٹ کا واقعہ ایک ہوسٹل تک محدود رہا تھا باقی ہوسٹلوں میں حالات نارمل تھے مگر شہر کی افواہیں اور کچھ غیر ذمہ دار اور تنگ نظر حضرات کی وجہ سے یہ معاملہ اتنا بڑھ گیا۔

میرے دوسرے لڑکے جاوید نے اس سال ایم اے سائکالوجی کا امتحان دیا تھا۔ وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان جانا چاہتا تھا اور وہاں اس کا داخلہ بھی ہو گیا تھا مگر گزشتہ فسادات کی وجہ سے اسے ریزرو بینک سے ایکسچینج (EXCHANGE) وقت پر نہ ملا۔ انگلستان میں تعلیم کے لیے پہلی اکتوبر تک ہر حال میں وہاں کے اداروں میں داخلہ لے لینا چاہیے۔ اس نے اس کے بعد بھی ہمت نہ ہاری اور جرمنی کے ایک پروفیسر سے رجوع کیا۔ ان کا نام البرٹ ویلیک تھا جو مشہور انگریزی پروفیسر رینی ویلیک (RENE WELLEK) کے بھائی تھے۔ انھوں نے اسے اپنے یہاں لینے پر آمادگی ظاہر کی مگر جرمن زبان جاننے کی شرط لگائی۔ لڑکے نے وعدہ کیا کہ وہ تین مہینے کے اندر اتنی زبان سیکھ لے گا کہ اپنا کام چلا سکے چنانچہ دسمبر ۱۹۶۱ء میں وہ جرمنی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کا داخلہ ماینس (MAINZ) یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ وہ رات میں ہوائی جہاز سے فرینکفورٹ پہنچا۔ وہاں سے پروفیسر کو ماینس ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے اسے ریل سے سفر کرنے کی ہدایات دیں اور ماینس اسٹیشن پر اپنے ایک طالب علم کو اسے لینے کے لیے بھیجا۔ ایک ہفتے وہ ایک ہوسٹل میں رہا۔ پھر ٹروس میں ایک کمرہ اسے دلوا دیا۔ اسے تین مہینے کے لیے میونخ (MUNICH) جرمن

سیکھنے بڑا پڑا۔ کہا سوا جرمن کے کسی اور زبان میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ واقعی تین مہینے میں اس نے اچھی خاصی جرمن زبان سیکھ لی اور اپنی ریسرچ شروع کر دی۔ میں نے اسے کوئی چار سال تک چار سو روپے ماہوار اخراجات کے لیے بھیجے۔ اس کے بعد وہ خود کفیل ہو گیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اس نے چار سال میں مکمل کر لیا اور یونیورسٹی میں تدریس شروع کر دی اب بھی وہیں ہے۔ اس نے PSYCHO THERAPY کی ایک ٹیکنیک بھی ڈھونڈ لی ہے۔ جرمن طریقۂ تعلیم اور وہاں کے پروفیسروں کا بڑا قائل ہے۔ وہ لوگ طالب علموں سے بڑی ہمدردی رکھتے ہیں مگر سخت محنت کراتے ہیں۔ وقت کی پابندی پر زور دیتے ہیں۔ جب کوئی کام چاہتے ہیں تو پھر اس سلسلے میں کوئی عذر یا تاخیر برداشت نہیں کرتے۔ اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے۔ اسکالر کو اپنے راستے پر چلنے کا موقع دیتے ہیں۔ اختلاف رائے کی قدر کرتے ہیں۔ پروفیسر ویک جاوید کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ ۱۹۷۲ء میں کینسر کے عارضے میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

میرے بڑے لڑکے صدیق کو صحافت سے دلچسپی تھی وہ ناگپور کے HISLQP COLLEGE میں چلے گئے اور سال بھر میں صحافت میں ڈپلوما لے لیا۔ ۱۹۶۳ء میں وہ واپس آئے اور انڈین اکسپریس میں کام کرنے لگے۔ انڈین اکسپریس سے انھوں نے ۱۹۶۹ء میں استعفا دے دیا کئی سال مشہور لیڈر چندر شیکھر کے ساتھ YOUNG INDIAN کی ادارت کی، پھر چلپتی راؤ نے انھیں نیشنل ہیرالڈ میں لے لیا وہاں چند سال رہے اور پھر انڈین اکسپریس میں آگئے۔ صدیق بہت مخلص اور بااصول نوجوان ہیں۔ کسی چیز کی ہوس نہیں، بالکل سادہ آدمی ہیں۔ شادی نہ صدیق نے کی نہ جاوید نے، مجھے اس کا بڑا افسوس رہے گا۔

اگست ۱۹۶۲ء میں پی۔ ای۔ این (P. E. N) کانفرنس کے سلسلے میں میسور گیا ہوا تھا۔ وہاں اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ مولانا حفظ الرحمان کا انتقال ہو گیا۔ بہت رنج ہوا۔ مولانا کو کینسر ہو گیا تھا، علاج کے لیے امریکہ بھی گئے تھے مگر مرض بہت بڑھ گیا تھا کوئی فایدہ نہ ہوا۔ میں اُن کی بیماری کے زمانے میں کئی دفعہ ان سے ملنے گیا۔ اتنی موذی بیماری میں بھی وہ بالکل پریشان نہ تھے اور دوستوں اور ساتھیوں سے اُن کے رویے میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا۔ مولانا جمعیۃ العلما کے بہت ممتاز رہنما تھے۔ وہ ساری عمر قوم پرست رہے۔ ۱۹۴۶ء میں لیاقت علی خاں کے خلاف الکشن میں

کھڑے ہوئے گو کامیاب نہ ہوئے مگر ان کے ووٹ بھی خاصی تعداد میں تھے۔ بعد میں پارلی منٹ کے ممبر بھی ہو گئے تھے۔ نہایت بے خوفی اور جرات سے حق بات کہتے تھے۔ اگر کہیں فساد ہوتا تو سب سے پہلے مظلوموں کی امداد کے لیے جاتے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کی مجلسِ عام اور مجلسِ عاملہ کے رکن تھے اور اُردو تحریک میں بھی انھوں نے گراں قدر حصہ لیا۔ فروری ۱۹۵۸ء میں دہلی میں جو آل انڈیا اُردو کانفرنس ہوئی اُس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ان کی ان تھک کوشش کی وجہ سے یہ کانفرنس کامیاب ہوئی۔ جواہر لال نہرو نے اس کا افتتاح کیا۔ مولانا آزاد مہمانِ خصوصی تھے۔ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر تاراچند تھے۔ مولانا آزاد کی یہ آخری تقریر تھی۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد ۲۲ فروری کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

علما میں مجھے مولانا حفظ الرحمان ہی ایسے نظر آئے جو ایک طرف علومِ دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور دوسری طرف جدید دور کے تقاضوں کو بھی سمجھتے تھے۔ آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور آزادی کے بعد خدمت کی راہ اختیار کی۔ ایک دفعہ مولانا کے یہاں ضرورت مندوں کا ہجوم دیکھ کر میں نے مولانا سے کہا کہ آپ کا سارا وقت چند لوگوں کی شکایتیں دور کرنے اور سفارشات میں صرف ہوتا ہے حالاں کہ آپ کو آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی اور خوش حالی کے لیے اور ملک کی فلاح کے لیے کام کرنا ہے۔ کہنے لگے آپ درست کہتے ہیں مگر کیا کروں جب کوئی ضرورت مند میرے پاس آتا ہے تو مجھ سے انکار نہیں ہوتا۔ میں نے کہا چند افراد کو ملازمتیں دلوانے یا اُن کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے اُسے دور کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ میں ان چیزوں کی جڑ تک جا کر ایسے ادارے بناتے ہوں گے جو مجموعی طور پر پس ماندہ طبقے کو اوپر اٹھا سکیں۔ مولانا نے وعدہ کیا کہ وہ اب اپنے وقت کا بہتر استعمال کریں گے مگر پھر وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور سارے کام دھرے رہ گئے۔

زیدی صاحب کی وائس چانسلری ۱۹۶۲ء میں ختم ہوئی۔ ان کے بعد بدرالدین طیب جی آئے۔ ان سے اس طرح ملاقات ہو چکی تھی کہ وہ اگزیکیوٹیو کونسل میں وزیر کے نمایندے تھے اور اس کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ میں بھی ۱۹۶۱ء سے کونسل کا ممبر ہو گیا تھا۔ طیب جی زیدی صاحب سے بالکل مختلف تھے۔ وہ آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ پھر وزارتِ خارجہ میں آ گئے اور

ایران اور جرمنی میں ہندوستان کے سفیر بھی رہے تھے۔ ان کے مزاج میں صاحبیت تھی۔ اپنی رائے پر اعتماد کچھ زیادہ ہی تھا۔ آدمی پڑھے لکھے تھے۔ ایک مجموعہ مضامین بھی شایع ہو چکا تھا۔ ان سے کوئی ملنا چاہتا تو اس کے لیے پہلے سے وقت مقرر کرنا ہوتا تھا۔ اسٹاف کلب کبھی نہ گئے کیوں کہ اساتذہ سے میل ملاپ انھیں پسند نہ تھا۔ ویسے وہ منتظم اچھے تھے۔ ان سے ایک غلطی میرے نزدیک یہ ہوئی کہ انھوں نے داخلوں میں مقامی عنصر کو پچاس سے پچھتّر فیصدی تک بڑھا دیا۔ ان کا یہ اقدام مقبول تو ہوا مگر اس کی وجہ سے باہر سے اچھے مسلمان طلبا کا داخلہ اور بھی مشکل ہو گیا۔ وہ علی گڑھ میں زیادہ نہیں رہے۔ کوئی ڈھائی سال کے بعد جاپان کے سفیر ہو کر چلے گئے۔ یکم اپریل ۱۹۶۵ء کو علی یاور جنگ نے ان سے چارج لیا۔

علی یاور جنگ عمادالملک کے نواسے تھے۔ ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ پولس ایکشن کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور فرانس اور مصر میں ہندوستان کے سفیر بھی رہ چکے تھے۔ ان کی صلاحیت، معاملہ فہمی، اور مردم شناسی کی خاصی شہرت تھی۔ علی یاور جنگ نے شروع اپریل ۱۹۶۵ء میں چارج لیا اور ۲۵ اپریل کو کورٹ کی میٹنگ میں اُن کے خلاف بڑے پیمانے پر مظاہرہ ہوا۔ اس ہنگامے میں طلبا نے پتھراؤ کرنے پر یونین ہال کے سارے شیشے ٹوٹ گئے اور پھر وائس چانسلر پر بھی پتھراؤ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے آتے ہی کچھ اصحاب نے ان کے خلاف یہ مہم شروع کر دی کہ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں مسلمانوں کو نظر انداز کرتے تھے حالاں کہ واقعہ اس کے برعکس تھا۔ پولس ایکشن کے بعد حیدر آباد میں جو فضا تھی اُسے دیکھتے ہوئے علی یاور جنگ نے بڑی ہمت و جرات سے حالات کا مقابلہ کیا تھا اور یونیورسٹی کی ساکھ کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر چوں کہ وہ قوم پرست تھے اس لیے ایک حلقہ انھیں ناپسند کرتا تھا۔ علی گڑھ میں آتے ہی انھوں نے طب جی کا فارمولا رد کر دیا جس کی رو سے یونیورسٹی میں ۷۵ فی صدی نشستیں مقامی طلبا کے لیے وقف ہو گئی تھیں اور پچھلا فارمولا جو نصف بیرونی اور نصف اندرونی نشستوں کو مناسب قرار دیتا تھا، نافذ کرنا چاہا۔ اس کی اکیڈمک کونسل اور ایگزیکیوٹو کونسل میں ایک حلقے کی طرف سے مخالفت ہوئی مگر اکثریت سے یہ تجویز منظور ہو گئی۔ ایگزیکیوٹو کونسل کی نشست میں بھی یونین کے طلبا نے جن کے سرغنہ بصیر احمد خاں تھے مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر

وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ۲۵ کو گیارہ بجے کورٹ کی میٹنگ شروع ہوئی۔ رسمی کارروائی کے بعد اعزازی خازن کا انتخاب ہوا۔ یہ انتخاب ختم ہوا ہی تھا اور اس کے نتیجے کا اعلان بھی نہ ہو پایا تھا کہ طلبا کا ایک بڑا ہجوم یونین ہال کے برآمدے میں آگیا اور اس نے پتھراؤ شروع کر دیا جس کی وجہ سے ہال کے سارے شیشے ٹوٹ گئے اور کچھ لوگوں کو جو شروع کی صف میں بیٹھے ہوئے تھے چوٹیں بھی آئیں اُن میں پروفیسر مجیب بھی تھے جو شعبۂ تعلیم کے صدر تھے ان کے سر میں زخم آیا۔ میں درمیانی صفوں میں تھا۔ جہاں تک پتھر اور ٹوٹے ہوئے شیشے نہ پہنچے۔ اب میں نے بشیر احمد سعید اور دوسرے ممبران کورٹ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ پولس بلائی جائے۔ پتھراؤ کی وجہ سے جلسہ درہم برہم ہو گیا اور لوگ پیچھے کی نشستوں میں چھپنے لگے۔ میں بھی وہیں پہنچا اور دیکھا کہ علی یاور جنگ کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے پھر وہ اور یوسف حسین خاں پرووائس چانسلر ہال کی پیچھے کی نشستوں سے بازو کے ایک کمرے کی طرف پہنچے۔ یہاں خلیق احمد نظامی، نورالحسن، اخلاق الرحمان قدوائی، رئیس احمد، نذیر احمد، اور بہت سے اساتذہ تھے۔ کمرہ چھوٹا تھا اور اس میں بہت سے لوگ بھرے ہوئے تھے۔ نظامی صاحب دروازے پر تھے میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ اس خیال سے کہ کمرے پر بھی طلبا کا حملہ ہوگا پتھروں کی بوچھار کے باوجود باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ میں بھی کمرے سے نکلا اور ہال عبور کر کے ایس ایس ہال کے سامنے برآمدے میں پہنچا۔ ایک پتھر میرے بھی لگ گیا جس کی وجہ سے سر سے خون نکلنے لگا مگر یہ زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔ کسی طرح میں سڑک پار کر کے ایس ایس ہال ڈائننگ ہال میں پہنچ گیا جہاں کچھ اور کورٹ کے ممبر موجود تھے۔ وہاں کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرا رہا اور جب خیال ہوا کہ سکون ہو گیا ہے تو باہر نکلا۔ ڈائننگ ہال ہی میں میں نے سنا کہ کچھ طلبا نے علی یاور جنگ کو گھیر لیا اور اُن پر ڈنڈے اور سوڈے کی بوتلیں برسائیں جس کی وجہ سے اُن کے سر میں کئی زخم آئے۔ پھر سنا کہ کچھ طلبا انھیں پکڑے ہوئے ایس ایس ہال لائے اور ایس ایس ایسٹ کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ جب ہنگامہ شروع ہوا تھا تو علی یاور جنگ نے ایک اسسٹنٹ پراکٹر کو باہر بھیجا تھا کہ پولس کو اطلاع کر دے۔ طلبا نے یونین کا ٹیلی فون کاٹ دیا تھا۔ اُس نے غالباً اولڈ بوائز لاج سے مسٹر شانگو سپرنٹنڈنٹ پولس کو ٹیلی فون کیا۔ یہ ایک نوجوان افسر تھے اور یونیورسٹی میں خاصے مقبول تھے۔ اسٹاف کلب بھی آتے رہتے تھے۔ انھوں نے یہ کیا کہ گھر پر جو گارڈ تھا اُسے لے کر یونین ہال پہنچے۔ گارڈ میں غالباً آٹھ دس آدمی تھے

اور صرف تین چار کے پاس رائفلیں ... جب یہ یونین کے پاس پہنچے تو مجتبیٰ صدیقی رجسٹرار اور پروفیسر بصیر خاں پراکٹر نے انھیں روکا۔ بصیر خاں اُس وقت ایم۔ ایل۔ اے بھی تھے انھیں غالباً اس کا علم نہ تھا کہ وائس چانسلر نے پولس بلوائی ہے۔ طلبا نے پولس کو دیکھا تو اس کے خلاف نعرے لگائے اور ایک ہاکی کے کھلاڑی نے بڑھ کر ایک پولس والے کی رائفل چھیننی چاہی۔ پولس والے نے اس پر فائر کیا جس کی وجہ سے تین طلبا کی ٹانگوں میں چھرّے لگے۔ تانگلو نے غلطی یہ کی کہ وہ رجسٹرار اور پراکٹر کے کہنے پر اپنے آدمیوں کو لے کر واپس چلے گئے اور طلبا نے مشہور کر دیا کہ تین طلبا گولی سے مر گئے ہیں۔ اس کے بعد غصّے میں آ کر انھوں نے علی یاور جنگ کو زدوکوب کیا۔ یوسف حسین خاں کچھ دیر وائس چانسلر کے ساتھ رہے۔ پھر طلبا علی یاور جنگ کو ڈنڈے برساتے ہوئے ایس ایس ہال لے گئے۔ لیکن جارج جیک اسسٹنٹ رجسٹرار ان کے ساتھ رہا۔ اس نے مجھ سے بیان کیا کہ جب کچھ طلبا نے وی سی کو کمرے میں بند کر دیا تو اندر جو طلبا تھے انھوں نے ان سے ہمدردی کی۔ کمرے کی سلاخیں توڑیں اور باہر نکال کر انھیں سڑک پر لائے۔ یہاں اتفاق سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مل گئے جو ہنگامے کی خبر سن کر اسی وقت آئے تھے انھوں نے علی یاور جنگ کو وی سی لاج پہنچایا۔ ڈاکٹر بلائے گئے اور اُن کے ٹانکے لگائے گئے۔ نسیم انصاری نے مجھے بتایا کہ ۲۷ ٹانکے لگائے گئے تھے۔

کوئی تین بجے کے قریب میں ڈائننگ ہال سے باہر آیا۔ اس وقت جنرل حبیب اللہ جو اگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی تھے ملے وہ ایک طالب علم کا جوش ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ہمارے تین ساتھی مارے گئے۔ میں نے سامنے دیکھا تو مجمع کم تھا۔ کچھ لوگ مختلف ٹولیوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف میں نے پروفیسر حفیظ الرحمان صدر شعبۂ قانون کو دیکھا۔ پھر ہاشم قدوائی نظر آئے۔ اتنے میں کوئی آٹھ دس طلبا کی ٹولی نے مجھے گھیر لیا۔ ایک سے میری ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ اس نے میری اُلٹے ہاتھ کی چھنگلیا مروڑ دی۔ پھر پیچھے سے کسی نے پتھر پھینکا جو میرے سر میں لگا۔ اب صورت یہ تھی کہ میرے ماتھے سے بھی خون بہ رہا تھا اور پیچھے سر سے بھی۔ چنانچہ میری عینک دھندلی ہو گئی۔ اور مجھے کسی کا چہرہ صاف نظر نہ آیا۔ ہاشم قدوائی نے مجھے طلبا کی ٹولی میں گھرا ہوا دیکھا تو میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے نکالنا چاہا۔ پھر نہ معلوم کیسے انھیں کسی نے الگ کھینچ لیا اور میں پھر گھر گیا۔ اب میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ اتنے میں میرے ایک طالب علم نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچ کر اس گھیرے

نکالا۔ اب ہم لوگ یونین کے سامنے ایک پیڑ کے قریب پہنچ چکے تھے وہاں بہت سی سائکلیں پڑی تھیں اس نے ایک سائکل اٹھائی اور مجھ سے کہا کہ کسی طرح اس پر بیٹھ کر نکل جائیے۔ کئی دفعہ کوشش کرنے کے بعد میں سائکل چلانے میں کامیاب ہوا اور مارین کورٹ سے ہوتا ہوا اسٹاف کلب کے عقب تک پہنچا۔ وہاں سڑک پر میرے داماد ڈاکٹر عبدالجلیل اور میرے ایک ساتھی ڈاکٹر انس کھڑے ہوئے تھے اور یہ سن کر کہ میں طلبا میں گھرا ہوا ہوں سوچ رہے تھے کہ کس طرح مجھ تک پہنچیں انھوں نے مجھے سائکل سے اتارا اور سہارا دے کر مکان (۱۔ شبلی روڈ) تک لائے جو قریب ہی تھا۔ پھر ڈاکٹر جلیل نے میری مرہم پٹی کی اور کہا کہ چوٹ میں گھنٹے کا خطرہ ہے۔ ماتھے کی چوٹ تو گہری نہیں تھی مگر سر کے پیچھے کی چوٹ کوئی پون انچ گہری تھی اسے سِیل کر دیا۔ کئی دن مکمل آرام کیا۔ پھر ٹھیک ہو گیا مگر اعصاب کا یہ حال تھا کہ کوئی مجمع دیکھتا تو سخت وحشت ہوتی تھی اور دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اس پر کئی مہینے قابو نہیں پا سکا۔ انگلی ٹیڑھی ہوئی پھر سیدھی نہ ہو سکی۔ اگرچہ تیسرے دن کارٹی زون کا انجکشن بھی دیا گیا تھا۔

علی یاور جنگ کو اسی وقت دہلی لے جایا گیا جہاں انھیں سین نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا۔ انھیں بہت چوٹ آئی تھی۔ وائس چانسلر پر حملے کے علاوہ میرے سر میں چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر نورالحسن پر ڈنڈے برسائے گئے تھے۔ یوسف صاحب اور خلیق احمد نظامی کے بھی وی۔ سی کو بچانے کی کوشش میں کچھ خراشیں آئی تھیں۔ پروفیسر مجیب تو شروع ہی میں شیشہ لگنے سے زخمی ہو گئے تھے۔ رات میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یونین کی الیکشن کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کرنے کے لیے ہوسٹلوں میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ نواب چھتاری کے کہنے سے پولس اس بات پر تیار ہو گئی کہ طلبا خود اپنے کو پولس کے حوالے کر دیں تو وہ ہوسٹلوں میں داخل نہ ہو گی۔ چنانچہ دوسرے دن کوئی بیس طلبا نے جو الیکشن کمیٹی کے ممبر تھے اپنے کو پولس کے حوالے کر دیا اور انھیں ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔

وزیر تعلیم چھاگلا نے اس ہنگامے کا سخت نوٹس لیا۔ وائس چانسلر کی رپورٹ جب انھیں ملی تو انھوں نے رجسٹرار، پراکٹر بصیر خاں اور بشیر احمد سعید کے خلاف کارروائی کا حکم دیا۔ رجسٹرار اور پراکٹر پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے پولس کو وائس چانسلر تک پہنچنے نہ دیا۔ بشیر احمد سعید پر

طلبا سے ساز باز کا الزام تھا۔ وہ طلبا کے مطالبے سے ہمدردی ضرور رکھتے تھے مگر میرا خیال یہ ہے کہ ہنگامے میں ان کا ہاتھ نہ تھا۔ رجسٹرار اور ریکٹر کی یہ غلطی تھی کہ انھوں نے پولس والوں کو وائس چانسلر تک پہنچنے سے روکا۔ غالباً انھیں اس کا علم نہ تھا کہ پولس وائس چانسلر نے بلائی ہے۔ پھر انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ پولس کی عدم موجودگی میں طلبا وائس چانسلر کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ بہر حال یہ تینوں حضرات یکے بعد دیگرے گرفتار ہوئے اور ایک دن جیل میں رہنے کے بعد ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔ طلبا پر وائس چانسلر پر حملہ کرنے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ جیل میں مقدمہ شروع ہوا تو گواہی کے لیے میں بھی بلایا گیا۔ میں واقعی اپنے حملہ آوروں کو پہچانتا نہ تھا۔ میری عینک کے شیشے دھندلے تھے اور کوئی صورت صاف نہیں دکھائی دیتی تھی۔ یہ لڑکے چھوٹے قد کے تھے اور بڑی پھرتی سے ادھر ادھر جا رہے تھے ان میں سے کچھ کے ہاتھ میں ڈنڈے بھی تھے۔ مجسٹریٹ سے میں نے کہا کہ میں اپنے حملہ آوروں کو نہیں پہچانتا۔ انھیں یقین نہ آیا۔ انھوں نے کہا کہ دو ایک کو تو آپ پہچانتے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کے سر سے خون بہ رہا ہوتا اور عینک کے شیشے دھندلے ہوتے تو آپ بھی کسی کو نہ پہچان سکتے۔ بہر حال کسی طالب علم کو سزا نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ وائس چانسلر نے خود اس کی سفارش کی تھی۔

یونیورسٹی کی فضا پر اس ہنگامے کا اثر بہت دن تک رہا۔ یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل اور کورٹ کو معطل کر دیا گیا۔ ایک آرڈی نینس کے ذریعے وائس چانسلر کو خاص اختیارات دیے گئے۔ جب دو مہینے کے بعد علی یاور جنگ صحت یاب ہو کر آئے تو وی سی کے مکان پر پولس کے پہرے کا انتظام کیا گیا۔ وہ کہیں باہر جاتے تو ان کی حفاظت کا پورا انتظام ہوتا۔ یونیورسٹی بہر حال آہستہ آہستہ معمول پر آگئی۔

ملت نے اس ہنگامے پر غور کرنے کے بجائے آرڈی نینس کی مخالفت شروع کر دی اور علی یاور جنگ اور چھاگلا کے خلاف اخباروں میں مضامین نکلنا شروع ہو گئے۔ حالاں کہ یہ آرڈی نینس عارضی چیز تھا۔ علی یاور جنگ جب واپس آئے تو انھوں نے کوئی انتقامی کارروائی نہ کی۔ یوسف صاحب کا ٹرم ختم ہو چکا تھا۔ ان کے متعلق یہ خیال عام تھا کہ ان کو ہنگامہ کرنے والے طلبا سے ہمدردی تھی گو علی یاور جنگ سے ذاتی مراسم کی وجہ سے انھوں نے انھیں بچانے کی کوشش ضرور کی۔ ان کی

بنگ حیدر آباد سے علی یاور جنگ فضل الرحمان صاحب کو لائے۔ جو وہاں کے نشریات کے شعبے کے ڈائرکٹر رہ چکے تھے۔ اگست کے شروع میں انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔

ہنگامے کے بعد تو حکومت کا اقدام غلط نہ تھا مگر آرڈی ننس کی جگہ یونیورسٹی چلانے کے لیے نیا بل لایا جانا چاہیے تھا ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ سے تدریجی طور پر بددلی پھیلی۔ ویسے علی یاور جنگ نے اپنی حکمت عملی سے یونیورسٹی کی عام زندگی جلد بحال کر دی اور کچھ عرصے کے بعد پولس کا پہرہ بھی ہٹا لیا گیا۔ وہ بڑے معاملہ فہم آدمی تھے اُن میں فراخدلی بھی تھی وہ معاف کر سکتے تھے اور سب کچھ بھولنے کو بھی تیار تھے مگر اُن کی بیگم جنھوں نے اُن کا زخمی ہو کر آنا دیکھا تھا اور اس بحران کو بھگتا تھا کسی طرح علی گڑھ میں مزید قیام کے لیے راضی نہ ہوئیں۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کے آخر میں علی یاور جنگ واشنگٹن میں ہندوستان کے سفیر ہو کر چلے گئے، اُن کی جگہ ڈاکٹر عبدالعلیم کا تقرر ہوا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک علی گڑھ میں عربی کے لکچرر رہے تھے، پھر لکھنؤ یونیورسٹی چلے گئے وہاں سے ۱۹۵۰ء میں ذاکر صاحب کے زمانے میں ریڈر ہو کر پھر علی گڑھ آئے۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر ہوئے اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی رہے۔ علیم صاحب کی شہرت ایک با اصول استاد کی تھی۔ وہ اگرچہ اسکالر نہیں تھے مگر عربی انھوں نے مولانا سورتی سے پڑھی تھی جو مولانا میمن کے ساتھ عربی کے مانے ہوئے اُستادوں میں تھے۔ جامعہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد وہ جرمنی چلے گئے جہاں انھوں نے عقیدۂ اعجاز قرآن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ وہاں سے واپس آئے تو چند سال جامعہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور رسالہ جامعہ کی ادارت میں ڈاکٹر عابد حسین کی مدد کی۔ وہیں سے علی گڑھ نواب اسماعیل خاں کے زمانے میں آئے تھے۔

وائس چانسلر کی حیثیت سے علیم صاحب پہلے سے مختلف ثابت ہوئے۔ اُن کی شرافت اور ذاتی دیانت مسلّم تھی مگر ایک تو ان کے دور میں اُن کے اقربا کو بڑا عروج ہوا۔ دوسرے انھوں نے نیا ایکٹ لانے کے لیے کوئی جدّ و جہد نہ کی۔ تیسرے انھوں نے بغیر طلبا اور اساتذہ سے مشورہ کیے یونیورسٹی کی جوبلی کی تیاری شروع کر دی۔ ظاہر ہے طلبا نے جب مظاہرے کی دھمکی دی تو یہ تقریبات ملتوی ہو گئیں۔ میں کچھ سینیئر استادوں کا وفد لے کر وزیر تعلیم اور وزیر اعظم سے ملا اور زور دیا کہ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کو ضروری ترمیموں کے ساتھ دوبارہ نافذ کیا جائے۔ اس سلسلے میں میں نے نیشنل ہیرالڈ میں ایک مضمون

بھی لکھا۔ اگر علیم صاحب اس وقت اس تجویز کی حمایت کرتے تو حالات بہت جلد سدھر جاتے مگر انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ ہاں ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی ایک مدت کے لیے بند کر دی گئی۔ علیم صاحب کے زمانے میں یونیورسٹی کا ڈسپلن بھی کچھ اچھا نہ رہا۔

علیم صاحب کے زمانے کے دو اور واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر فخرالدین احمد فیکلٹی آف سائنس کے ڈین اور گیمس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ طلبا کو اُن سے شکایات تھیں اور انھوں نے اُن کے خلاف مظاہرہ کیا۔ ہم لوگوں نے مظاہرہ ختم کرانے کے لیے اُن سے کہا کہ آپ گیمس کمیٹی سے استعفا دے دیں۔ انھوں نے ہماری بات مان لی۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ دوسرا مظاہرہ پروفیسر رئیس احمد کے خلاف ہوا۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ یونین کے عہدہ داروں کا انتخاب چوں کہ کسی خاص پروگرام کے تحت نہیں ہوا تھا اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے مطالبات سارے طلبا کے مطالبات ہیں۔ اس پر طلبا نے پھر مظاہرہ کیا۔ اس کے خلاف ڈاکٹر نسیم انصاری نے بھوک ہڑتال کی مگر طلبا نے کہا کہ مسئلہ آپ کا نہیں رئیس احمد صاحب کے طرزِ عمل کا ہے۔ خیر اُن کی ہڑتال تو ہم لوگوں نے کہہ سن کر ختم کرا دی مگر رئیس صاحب کے خلاف مظاہرہ میں شدت پیدا ہو گئی اور وائس چانسلر کے گھر کے سامنے لان پر یونین کے عہدہ داروں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بھوک ہڑتال کو ایک دن ہوا تھا کہ میں کچھ سینیر اساتذہ کو لے کر ان سے ملا۔ عارف محمد خاں اس وقت صدر تھے اور عبدالواسع جنرل سکریٹری۔ عارف ہم لوگوں کے ساتھ جس طرح پیش آئے اس کی اُن سے توقع نہ تھی۔ انھوں نے درشتی سے کہا "اب تک آپ لوگ کہاں تھے؟" میں نے کہا ہم لوگ اس لیے آئے ہیں کہ آپ سے تبادلۂ خیال کر کے آپ کے جو جائز مطالبات ہوں انھیں وائس چانسلر سے منوائیں مگر یہ مظاہرہ اور بھوک ہڑتال ختم ہونی چاہیے۔ انھوں نے ہماری ایک نہ سنی۔ چناں چہ ہم لوگ خاموشی سے واپس ہو گئے۔ بعد میں علیم صاحب نے مجھے طعنہ بھی دیا کہ جن لوگوں کو آپ سمجھانے گئے تھے، انھوں نے آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا۔ میں نے کہا ہم استاد ہیں اور استادوں کا طریقہ یہی ہے کہ وہ طلبہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں اور ہمدردی سے انھیں سمجھائیں۔ اس مشن میں ہمیشہ کامیابی نہیں ہوتی مگر یہ مشن تو جاری رہنا چاہیے۔

۱۹۷۱ء کے آخر میں ڈاکٹر نورالحسن وزیرِ مملکت برائے تعلیم ہو گئے۔ وزیرِ تعلیم سدھارتھ شنکر رے

تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی دیکھ بھال نورالحسن ہی کرتے تھے۔ نورالحسن پہلے لکھنؤ یونیورسٹی میں تاریخ کے لکچرر تھے وہاں سے آکسفورڈ گئے اور ڈی فل کی ڈگری لے کر ۱۹۴۷ء کے آخر میں واپس آئے ۱۹۴۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر جواہرلال نہرو، ہومی بھابھا، ذاکرحسین، شیخ عبداللہ کو اعزازی ڈگری دی جانے والی تھی۔ ذاکر صاحب کی آمد کی خبر سن کر نورالحسن مجھ سے ملے علی گڑھ میں تاریخ کے شعبے میں ریڈر کی ایک جگہ خالی ہوئی تھی۔ نورالحسن چاہتے تھے کہ اس کے لیے ذاکر صاحب سے میں اُن کی سفارش کروں۔ عام طور پر میں سفارش کا قایل نہیں مگر جب یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی باصلاحیت آدمی کسی ایسی جگہ کا امیدوار ہے جس کے لیے وہ ہر طرح موزوں ہے تو میں کلمۂ خیر ضرور کہہ دیتا ہوں۔ چناں چہ ذاکر صاحب کو میں نے ان کا BIO-DATA دے دیا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ اچھے نوجوانوں کی ضرور ہمت افزائی کرتے ہیں اور حبیب صاحب سے مشورہ کر کے مناسب کارروائی کریں گے۔ بہر حال تھوڑے دن بعد نورالحسن صاحب کا ریڈر کی حیثیت سے علی گڑھ میں تقرر ہو گیا اور ۱۹۵۰ء میں وہ یہاں آگئے۔ نورالحسن تاریخ میں عبور کے علاوہ بڑی اچھی انتظامی صلاحیت رکھتے تھے۔ ذاکر صاحب نے انھیں دی۔ ایم ہال کا پرووسٹ بنا دیا۔ ۱۹۵۴ء میں وہ ریسرچ پروفیسر ہو گئے۔ شیخ عبدالرشید کے ۱۹۵۸ء میں سبکدوش ہونے کے بعد پروفیسر اور صدر شعبہ بھی ہوئے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر تاراچند راج سبھا میں صدر کے نامزد کردہ تھے۔ رادھا کرشنن کے زمانے تک صدر کو نامزدگی میں خاصا دخل ہوتا تھا۔ ان کے بعد وزیر اعظم جو کہتیں وہی ہوتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۶۴ء میں جب ہردے ناتھ کنزرو کی راج سبھا کی ممبری ختم ہو گئی تو میں رادھا کرشنن کے پاس گیا۔ رادھا کرشنن مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ ساہتیہ اکیڈمی کے وہ نائب صدر تھے اور میں اگزکٹو بورڈ کا ممبر اور اُردو کا نمایندہ۔ اسی وجہ سے اُن سے خاصا ربط ضبط ہو گیا تھا۔ ہمیشہ کمرے سے باہر آکر ملتے اور دروازے تک رخصت کرنے جاتے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ کس طرح ذاکر صاحب نائب صدر ہوئے۔ بڑے مزے لے کر انھوں نے کہا کہ جب صدر کے لیے میرا نام طے ہو گیا تو جواہر لال نہرو لال بہادر شاستری کے ساتھ مجھ سے ملنے آئے اور نائب صدر کے نام کے سلسلے میں میری رائے دریافت کی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ

کے ذہن میں کوئی نام ہے۔ اس پر جواہر لال نہرو تو خاموش رہے مگر لال بہادر شاستری نے سترو جے لکشمی پنڈت کا نام پیش کیا۔ رادھا کرشنن نے بتایا کہ میں نے اس نام کی سختی سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ وزیر اعظم کی بہن کو نائب صدر بنانا کسی طرح مناسب نہیں ہے لوگ کہیں گے ہندوستان ایک خاندان کی جاگیر ہے۔ اس پر لال بہادر شاستری نے کہا کہ وہ خود ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ روس میں ہندوستان کی سفیر رہی ہیں اور اقوام متحدہ (U.N.O) کی صدر۔ ان کی قومی خدمات سب پر روشن ہیں۔ رادھا کرشنن نے کہا مگر وہ وزیر اعظم کی بہن ہیں اس لیے یہ نام مناسب نہیں۔ اس پر جواہر لال نہرو نے کہا کہ آپ کے ذہن میں کوئی نام ہے؟۔ رادھا کرشنن نے ذاکر صاحب کا نام لیا اور کہا کہ وہ ملک کے مسلمہ ماہر تعلیم ہیں۔ تعلیمی کمیشن میں میرے ساتھ انھوں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں۔ ان سے بہتر آدمی نائب صدر کے لیے آپ کو نہ ملے گا۔ جواہر لال نے اس نام سے اتفاق کیا۔ اس طرح ذاکر صاحب نائب صدر ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ رادھا کرشنن اپنی بات پر اصرار کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے کہا کہ صدر جن بارہ اشخاص کو نامزد کرتا ہے ان میں سے ایک کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو کنزرو صاحب کو اس پر نامزد کر دیجیے۔ وہ ہمارے بزرگ لبرل رہنماؤں میں سے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر ہیں اور سپرو ہاؤس چلا رہے ہیں۔ وہ فوراً راضی ہو گئے اور مجھ سے کہا کہ تم پہلے کنزرو صاحب سے مل کر معلوم کر لو کہ وہ انکار تو نہ کریں گے اُن کی مرضی معلوم ہو جائے تو میں انھیں نامزد کر دوں گا۔ میں فوراً کنزرو صاحب کے پاس گیا اور اُن سے درخواست کی کہ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیں مگر وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ صدر جسے نامزد کرتا ہے اس کی ایک پابندی ہو جاتی ہے۔ وہ آزادی سے حکومت پر تنقید نہیں کر سکتا۔ میں اپنی آزادی رائے پر کوئی بندش گوارا نہیں کر سکتا۔ میں نے مجبوراً رادھا کرشنن کو مطلع کر دیا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے مجھے اس کا اندیشہ تھا کہ کنزرو صاحب تیار نہ ہوں گے۔ بہرحال میں انھیں نامزد کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ داستان اس لیے سنائی کہ اندرا گاندھی کے دور میں یہ بات ختم ہو گئی۔ ذاکر صاحب کہا کرتے تھے کہ جواہر لال نہرو صدر سے مشورہ کرتے تھے۔ اندرا گاندھی صدر کو بتاتی ہیں کہ یہ کرنا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ذاکر صاحب صدر ہوئے اور کچھ دن بعد ڈاکٹر تارا چند کی راج سبھا کی ممبری ختم ہو گئی۔ تو پی این سپرو نے تارا چند کی دوبارہ نامزدگی کی سفارش

کی اور یہ بھی کہا کہ اگر تارا چند نہ ہو سکیں تو سرور کو نامزد کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے مجھے یہ واقعہ سنایا انھوں نے اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا مگر خود ان کے ذہن میں اپنے پرانے دوست اور ساتھی ڈاکٹر حمید کا نام تھا جو پرانے قوم پرست تھے۔ بمبئی کی سماجی زندگی میں اُن کا خاصا نمایاں رول تھا اور مشہور کمپنی سیلا (CIPLA) چلا رہے تھے۔ خیر اندرا گاندھی ذاکر صاحب سے ملیں اور انھوں نے کہا کہ آپ پروفیسر نورالحسن کو نامزد کر دیجیے۔ ذاکر صاحب نے ڈاکٹر عبدالحمید کا نام لیا۔ انھوں نے کہا کہ اس پر بعد میں غور ہوگا اس وقت آپ نورالحسن کا نام بھیجد یجیے۔ وہ ہمارے آدمی ہیں۔ نورالحسن نے دراصل ہاکسر سے ربط ضبط بڑھا لیا تھا اور ہاکسر اس وقت اندرا گاندھی کی ناک کا بال تھے۔ چناں چہ ۱۹۶۸ء کے شروع میں نورالحسن راج سبھا کے ممبر نامزد ہو گئے پھر ۱۹۷۱ء کے اکتوبر میں تعلیم کے وزیر مملکت۔ یونیورسٹی کا نیا بل، ہی پارلی منٹ میں لائے تھے۔

ایم۔ سی چاگلا نے تعلیم کے شعبے میں کئی اچھے کام انجام دیے مگر انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے نام سے لفظ ہندو اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مسلم نکالنے کی جو کوشش کی وہ کامیاب نہ ہوئی۔ ہندو اکثریت اس کے لیے تیار نہ ہوئی اس لیے علی گڑھ کا نام بدلنے کا سوال ہی نہ اٹھا۔ چاگلا کو احساس نہ تھا کہ ان ناموں کی ایک تاریخ ہے اور دستور ہر مذہب کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے ادارے چلائے اور ان کا خود انتظام کرے۔ علی یاور جنگ کا یہ خیال تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام علی گڑھ نیشنل یونیورسٹی ہونا چاہیے مگر اس تجویز کی بھی مخالفت ہوئی۔ بہر حال یہ تجویز بہت جلد واپس لے لی گئی۔ دراصل نام کی تبدیلی کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔

جون ۱۹۶۶ء میں علی یاور جنگ نے مجھے بلا کر کہا کہ ان کی تحریک پر مجھے کابل کے بین الاقوامی ترجمہ سیمینار میں مشاہد OBSERVER کی حیثیت سے بھیجا جانا طے ہوا ہے۔ دوسرے مشاہد مالک رام تھے۔ یہ سیمینار ادارۂ فرانکلن کی تحریک پر کابل یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ اس میں ایران، تاجکستان، پاکستان، افغانستان سے مندوبین آئے تھے۔ ہندوستان سے صرف مشاہد (OBSERVER) تھے۔ ایران کے مندوبوں میں ممتاز نقاد پروفیسر پرویز ناطل خاں لری، بزرگ مہر احمد آرام، اور اسکندر دریابندری تھے۔ تاجکستان سے عبداللہ غفوروف اور ایک اور مندوب تھے۔ افغانستان سے مندوبین میں عبدالحی حبیبی، رشتی، حبیب اللہ، لری اور سرور گویا تھے۔ پاکستان سے

حامد علی خاں اور عبدالشکور احسن آئے تھے۔ سیمینار کا موضوع فارسی میں تراجم کی صورت حال تھا۔ ہم لوگ انڈین ایرلائنس کے طیارے سے صبح سات بجے دہلی سے چلے اور دو گھنٹے میں کابل پہنچ گئے تھے۔ یہ ہوائی اڈہ روسیوں کا بنوایا ہوا ہے اور خاصا شاندار ہے۔ ہوائی اڈے سے ہم لوگ پشتون ہوٹل پہنچائے گئے جو شہر کے وسط میں واقع ہے۔ پہلے عتیق اللہ شبرواک سے ملے جو سیمینار کے مہتمم تھے۔ لنچ اور ڈنر میں دوسرے مندوبوں سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے دن صبح سیمینار شروع ہوا اور چار دن جاری رہا۔ عبدالحی حبیبی کابل یونیورسٹی کے پشتو کے پروفیسر نے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ افتتاح وزیر تعلیم نے کیا۔ ہندوستان کے سفیر جرنل تھاپر اور دوسرے عمائدین بھی افتتاحی جلسے میں شریک تھے۔ عام طور پر لنچ اور ڈنر کسی پر فضا مقام یا کسی محل میں ہوتے تھے۔ افغانستان میں عام طور پر دری اور پشتو بولی جاتی ہے۔ دری فارسی جدید سے خاصی مختلف ہے۔ افغانیوں کا لہجہ بھی ایرانیوں کے مقابلے میں ہم لوگوں سے ملتا ہے۔ افغانی کہتے ہیں کہ اصل فارسی یہی ہے مگر مقالہ نگاروں اور مقرروں کے یہاں ایرانی لہجے کا اثر بھی نظر آیا۔ میں فارسی پڑھ لیتا ہوں اور کوئی بولے تو سمجھ بھی لیتا ہوں مگر خود بولنے میں حجاب ہوتا ہے۔ سرور گویا اور عبدالحی حبیبی ہندوستان اور پاکستان میں رہ چکے ہیں اور اردو سمجھ لیتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ پرویز ناطل خاں لری سے اقبال کی شاعری پر بات ہوئی وہ اقبال کے کچھ زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ عبدالحی حبیبی سے میں نے دریافت کیا کہ یہ پہاڑ ہندوکش کیوں کہلاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ہندو نہیں سندھو ہے اور کش سے مراد کشتان ہے یعنی درہ۔ یہ پہاڑ سندھ کا درہ ہے۔ اس میں سے ہو کر ہم سندھ کی وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ سندھو کشتان ہندوکش کہلانے لگا۔ احمد اکرام نے کئی سائنسی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان سے اصطلاحات سازی پر بات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ان عربی اصطلاحوں کو جو عرصے سے فارسی میں رائج ہیں کیوں ترک کر دیا۔ مثلاً شعور کی جگہ آگہی، تحت شعور کی جگہ سمت آگہی۔ انھوں نے کہا پہلے تو اس معاملے میں خاصی شدت تھی اور ایرانی قوم پرستی کی وجہ سے تھی۔ اب ہم سب اصطلاحوں کو نہیں بدل رہے ہیں۔ تاجیک ادیبوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں پرویز ناطل خاں لری اور احمد اکرام کے علم و فضل سے متاثر ہوا۔ عبدالحی حبیبی بھی پڑھے لکھے نظر آئے۔ سرور گویا کو شاعری سے

زیادہ دلچسپی تھی۔ نوجوانوں میں حبیب اللہ لری کا سیاسی شعور خاصا گہرا تھا۔ ہم لوگ لنچ پر شہر سے باہر ایک باغ میں مدعو تھے۔ راستے میں نئے مکانوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ لری نے کہا "این رشوت آباد است" ایک دوسرے موقع پر ایک باغ میں ٹہلتے ہوئے قمر رئیس نظر آئے۔ اُن کے ساتھ ایک افغانی تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ببرک کارمل تھے۔ افغانستان میں روسی فوجوں کو انھوں نے ہی دعوت دی تھی۔ قاضی یونس بھی اس زمانے میں یہیں تھے۔ یہ علی گڑھ میں اکنامکس کے شعبے میں لکچرر رہ چکے تھے اور ان سے پرانی ملاقات تھی۔ یہ حضرت حامد علی خاں سے ہند و پاک سیاست پر بحث کرنے لگے۔ سفارت میں ایک تاشی جوہری ملے جو بدایوں کے رہنے والے تھے۔ دیارِ غیر میں ایک ہم وطن سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مالک رام صاحب نے سمینار کی آخری نشست کے لیے ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا۔ میں نے بھی مناسب سمجھا کہ کچھ لکھوں چناں چہ انگریزی میں چند صفحے ترجمے کے اصولوں پر لکھے اور سفارت کے ایک کارکن سے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اتفاق سے آخری سیشن میں صرف مالک رام کا مضمون پڑھا جا سکا۔ میں نے سمینار کے کارکنوں کو اپنا مضمون دے دیا تھا وہ بعد میں سمینار کی روداد میں چھپ گیا۔ اتفاق سے مالک رام صاحب کا مضمون شامل نہ ہو پایا۔ کابل میں جون میں دھوپ میں گرمی نہ تھی اور راتیں خنک تھیں۔ میں بابر کی قبر پر بھی گیا ایک باغ میں چھوٹا سا مقبرہ ہے کابل کے مضافات میں چنار کے درخت نظر آئے۔ یہ کشمیر کے چناروں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ بازاروں میں ہر قسم کا مال افراط سے تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ خان عبدالغفار خاں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں ان سے ملنے گئے۔ وہ پختونستان کے لیے پروپگنڈا کرنے آئے ہوئے تھے۔ ان سے شیخ عبداللہ کا ذکر آیا۔ کہنے لگے۔ شیخ کبھی پاکستان سے الحاق نہ کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ پنجابی کشمیریوں کو کس قدر حقیر سمجھتے ہیں اور انھیں ہاتو کہتے ہیں۔ کانگریس سے بھی وہ خاصے ناراض تھے۔ کہنے لگے ان لوگوں نے ہمیں دھوکا دیا۔ ہاں گاندھی جی کی برابر تعریف کرتے رہے۔ اس زمانے میں کابل میں پھل زیادہ نہ تھے۔ سیب ضرور تھے۔ کابل کا سردہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس وقت انگور ہرے اور کچّے تھے۔ وہاں کے لوگ انگور چٹنی اور ترکاری میں استعمال کر رہے تھے۔ ایک ہفتہ قیام کے بعد ہم لوگ واپس آ گئے۔ ہماری زبان میں میں نے اس سفر کی روداد لکھی تھی۔ چلتے وقت ایرانی وفد نے ہم لوگوں کو کچھ فارسی تراجم تحفے میں دیے اور مشہور رسالہ سخن کے کچھ پرچے۔ ایرپورٹ پر کسٹم والوں نے

پہلے کتابوں کے سلسلے میں تین سو روپے محصول مانگا۔ جب ہم نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ یہ تحفے میں ملی ہیں تو بالآخر انھوں نے بغیر محصول لے جانے کی اجازت دے دی۔ کابل میں پستے بہت اچھے ملے تھوڑے سے ساتھ لیتا آیا تھا۔

۱۹۶۷ء کی تعطیل میں ہم لوگ کشمیر گئے اور ڈمرشا ہوٹل میں ٹھہرے۔ قیام کوئی دو ہفتے رہا۔ اُس زمانے میں وہاں کل ہند اُردو یونیورسٹی اساتذہ کی کانفرنس تھی۔ عبدالقادر سروری صاحب اس کے صدر تھے۔ اس موقع پر احتشام حسین، اختر اورینوی، مسعود حسین خاں، رفیعہ سلطانہ اور بہت سے حضرات آئے ہوئے تھے۔ میں چند روز کے لیے پہلگام گیا۔ بیوی کو وہ جگہ پسند نہ آئی۔ انھیں مناظر سے اور دریا کے کنارے سیر سے دلچسپی نہ تھی۔ جون میں وہاں سردی بھی کافی تھی۔ کیوں کہ یہ ۷۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بہرحال ایک دن اور ایک رات وہاں گذار کر واپس آ گئے۔ ایک شام کانفرنس کے نمایندوں کے ساتھ شالی مار، نشاط، اور چشمہ شاہی میں گذاری۔ شروع جولائی میں علی گڑھ واپس آ گئے۔

جون ۱۹۶۸ء میں لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے مسعود حسین خاں کا تقرر ہوا۔ اس سے پہلے علی یاور جنگ کے زمانے میں بھی پروفیسر کی جگہ کا اشتہار ہوا تھا۔ دکن کالج پونہ سے کھانگے اور اشوک کیلکر اور دہلی سے پنڈت اکسپرٹ ہو کر آئے تھے۔ میں نے کمیٹی میں اس بات پر زور دیا کہ لسانیات کے لیے ایسے پروفیسر کا انتخاب ہونا چاہیے جو اردو لسانیات، فارسی لسانیات اور عربی لسانیات پر بھی کام کر سکے۔ میرے نزدیک ان زبانوں کے ایم۔ اے کے نصاب میں لسانیات کا ایک پرچہ اور زبان کی تدریس کے سلسلے میں لسانیات کا علم ضروری تھا۔ اس لیے میں نے مسعود حسین خاں کا نام پیش کیا مگر کمیٹی اس کے لیے تیار نہ ہوئی اور علی یاور جنگ نے انتخاب ملتوی کر دیا۔ ۱۹۶۸ء میں میں نے پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی سے بات کی جو ہندوستان میں لسانیات کے سب سے بزرگ استاد تھے۔ ساہتیہ اکادمی کے سلسلے میں اُن سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ شملے میں اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک سمینار کے سلسلے میں ہم لوگ ساتھ رہے تھے۔ جب میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ علی گڑھ میں لسانیات کی پروفیسری کے لیے اکسپرٹ کی حیثیت سے آئیں تو انھوں نے میری بات منظور کر لی۔ مسعود صاحب کو ترجیح دینے کا میرا جو مقصد تھا اس سے بھی انھیں اتفاق تھا۔ بہرحال اُن کے آنے سے یہ مرحلہ

آسان ہوگیا۔ اس وقت علیم صاحب وائس چانسلر تھے اور ڈاکٹر نورالحسن ڈین۔ میں نے دونوں سے پہلے ہی بات کرلی تھی۔ اگست ۱۹۶۸ء میں مسعود صاحب آگئے۔ اپنی خود نوشت "ورودِ مسعود" میں انھوں نے اپنے آنے کے لیے صرف علیم صاحب کی عنایت کا ذکر کیا ہے۔

۱۹۶۸ء کے شروع میں نارمن زائد کا خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ شکاگو یونیورسٹی مجھے ایک سال کے لیے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلانا چاہتی ہے۔ میں نے حامی بھرلی مگر یہ پروگرام ستمبر ۱۹۶۹ء میں عمل میں آیا۔ میں ستمبر کے آخر میں علی گڑھ سے دہلی اور وہاں سے ہوائی جہاز سے فرینک فرٹ گیا۔ بیوی ساتھ تھیں۔ وہاں میرا لڑکا جاوید ایرپورٹ پر موجود تھا۔ دو دن اس کے ساتھ ماینس (MAINZ) میں قیام کے بعد لندن ہوتے ہوئے ۳۰ ستمبر کو شکاگو پہنچا۔ وہاں میرے شاگرد چودھری محمد نعیم نے یونیورسٹی کے قریب ایک اپارٹمنٹ ہاؤس میں دو کمرے ریزرو کرالیے تھے۔ ہوائی اڈے پر نعیم اور نارنگ دونوں موجود تھے۔ نارنگ تو میرے استقبال کے لیے WISCONSIN وس کانسن سے آئے تھے۔ ایرپورٹ سے ہم لوگ سب سے پہلے اس اپارٹمنٹ ہاؤس میں پہنچے جو BEACH HOTEL کے نام سے موسوم تھا۔ سامان رکھ کر نعیم کے یہاں کھانے پر گئے۔ یہاں ڈاکٹر فضل الرحمان سے ملاقات ہوئی جو دو ایک دن پہلے شکاگو یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے شعبے میں پروفیسر ہوکر آئے تھے۔ انھوں نے پاکستان میں عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آکسفورڈ سے ڈی فل کیا تھا۔ پھر کچھ دن انگلستان کی یونیورسٹیوں میں کام کرنے کے بعد پاکستان آگئے تھے اور ایوب خاں کے زمانے میں اسلامک ریسرچ سوسائٹی کے سکریٹری اور مذہبی امور میں ایوب خاں کے مشیر بھی رہے تھے۔ ایوب خاں چاہتے تھے کہ بعض رسوم میں اصلاح ہو۔ مثلاً وہ چاند دیکھنے کے لیے ہوائی جہاز سے کچھ لوگ بھیجتے تھے تاکہ رویتِ ہلال کی وجہ سے اختلافات کی نوبت نہ آئے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ مذبح میں گوشت مشین سے ذبح کیا جائے تاکہ خون اِدھر اُدھر پھیلنے کی وجہ سے گندگی نہ ہو۔ پاکستان کے علما اس پر تیار نہ ہوئے۔ نزلہ ڈاکٹر فضل الرحمان پر گرا اور ان کی مخالفت شروع ہوگئی وہ گھبرا کر امریکہ چلے آئے۔ اُن کی ایک کتاب اسلام پر شایع ہو چکی تھی مگر بعض قدامت پرست حلقوں میں اس پر بھی اعتراضات ہوئے۔ یہ کتاب میں نے پڑھی تو مجھے اسلام کی تاریخ اور اُس کے بنیادی عقائد پر بہت پُر مغز لگی۔ اُن کا ادبی ذوق بھی بہت پاکیزہ تھا۔ اقبال کے خاص طور سے مدّاح تھے۔

شکاگو کے قیام کے زمانے میں اُن سے خوب ملاقاتیں ہوئیں۔ بعد میں ان کی کتاب ابن تیمیہ پر شایع ہوئی اور علمی حلقوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی۔ ایک اور کتاب اسلام اور جدیدیت ISLAM AND MODERNITY پر حال میں نکلی تھی۔ افسوس ہے کہ جولائی ۱۹۷۰ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

دوسرے دن نارمن زائڈ مجھے لے کر یونیورسٹی آ گئے۔ فہیم کا کلاس تھا اس لیے وہ نہ آ سکے تھے۔ میں کوئی نو بجے جنوبی ہند کی زبانوں کے مرکز پہنچا جہاں مجھے کام کرنا تھا۔ نارمن نے مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا جو میرے لیے پہلے سے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے صدر شعبہ کو میری آمد کی اطلاع بھی کر دی۔ یہ سنسکرت کے ایک عالم تھے اور ڈچ تھے جو امریکہ میں بس گئے تھے۔ ان کا نام وان بیوٹن (VANBEUTEN) تھا انھوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور دو چابیاں دیں۔ ایک کمرے کی اور ایک پوری عمارت کی۔ میں نے کہا کہ میں عمارت کی چابی لے کر کیا کروں گا۔ کہنے لگے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی آپ کو رات میں دیر تک کام کرنا پڑے اس وقت چوکیدار کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کو ہفتے میں دو دفعہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے سمینار لینے ہوں گے۔ ایک ٹرم میں غالب پر اور دوسرے میں اقبال پر۔ باقی دنوں میں آپ اپنا کام کر سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ہفتے میں دو دفعہ ہی آیئے اور باقی دنوں میں گھر پر کام کیجیے۔ چاہیں تو روزانہ آیئے۔ میں نے کہا میں روزانہ آنا پسند کروں گا کیوں کہ یہاں کی لائبریری سے کتابیں مل سکیں گی۔ گھر پر کتنی کتابیں لے جا سکوں گا۔ انھوں نے کہا جیسی آپ کی مرضی۔ پھر انھوں نے بتایا کہ طالب علم تو ایک ہی ہے۔ ہاں آپ کے سمینار میں آپ کے شعبے کے رفیق بھی شریک ہوں گے۔ اگر طالب علم نہ بھی ہوتا تو آپ اپنا ریسرچ کا کام کرتے۔ تامل میں کوئی طالب علم نہیں ہے۔ اس کے پروفیسر اپنی ریسرچ میں مشغول رہتے ہیں۔ ان سے صرف یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ٹرم میں دو یا تین لکچر شعبے کی ہفتہ وار میٹنگ میں دے دیا کریں۔ آپ بھی یہی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے دو سو ڈالر کا چیک دیا اور کہا کہ آپ ابھی آئے ہیں۔ کھانے پینے کے اخراجات کے لیے آپ کو روپے کی ضرورت ہوگی۔ یہ بعد میں آپ کی تنخواہ سے وضع ہوتے رہیں گے۔ میں ان کے اس اقدام سے بہت متاثر ہوا کیوں کہ واقعی مجھے اس وقت روپے کی سخت ضرورت تھی۔ پچاس ڈالر اپنے لڑکے سے جرمنی میں احتیاطاً لے لیے تھے۔ اس رقم میں مہینہ کیسے کٹتا۔ فہیم سے میں اور قرض لینا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ وہ پہلے ہی میرے ہوٹل کا ایک مہینے کا کرایہ پیشگی دے

چکے تھے۔ صدر شعبہ اس کے بعد مجھے شعبے کی سکریٹری جوڈی کے پاس لے گئے اور ان سے تعارف کرا کے مجھ سے کہا کہ اسٹیشنری اور دوسری چیزیں یہ مہیا کر دیں گی اور آپ جو مضمون ٹائپ کرانا چاہیں وہ کر دیں گی۔ جوڈی سے سب سے پہلے میں نے فاؤنٹین پین کے لیے روشنائی مانگی اس بات سے وہ بڑی خوش ہوئی اور روشنائی کی شیشی میرے حوالے کرتے ہوئے بولی کہ اس شعبے میں صرف میں فاؤنٹین پین استعمال کرتی ہوں باقی سب بال پین۔ اب آپ کے آنے سے فاؤنٹین پین استعمال کرنے والے ہم دو ہو گئے۔ جوڈی یہودی تھی۔ ویسے بھی شکاگو یونیورسٹی میں یہودی بہت تھے۔ یہ ہندوستان کی سیر کر آئی تھی اور ہندوستانی موسیقی اور ڈراما سے خاصی متاثر تھی۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد نعیم بھی کلاس لے کر آ گئے۔ ان کے ساتھ جا کر بینک میں حساب کھلوایا اور ایک کوآپریٹو اسٹور سے کھانے پینے کی اشیا خریدیں۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں لدے پھندے ہوٹل پہنچے۔ کافی کے بعد نعیم تو چلے گئے اور میں نے سب چیزیں ٹھکانے سے رکھنے میں بیوی کی مدد کی۔

اب میرا معمول تھا کہ صبح پونے نو بجے تک تیار ہو جاتا اور کپڑے پہن کر ہوٹل کے نیچے آ جاتا تھوڑی دیر میں یونیورسٹی کی بس آ جاتی جس کے ذریعے دس منٹ میں یونیورسٹی پہنچ جاتا۔ شکاگو یونیورسٹی میں نعیم کی کوشش سے اردو کی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تمام اہم اردو کی کتابیں اور رسالے آتے ہیں۔ اہم رسایل کے فایل بھی موجود ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ امریکہ والے ہندوستان اور پاکستان کی ہر اہم زبان کی اٹھارہ کاپیاں خریدتے ہیں اور اس کے لیے دہلی اور لاہور میں ان کے دفتر ہیں یہ کتابیں ان تمام مرکزوں کو بھیجی جاتی ہیں جن میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور لائبریری آف کانگریس کے لیے دو نسخے علاحدہ سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اب شاید اتنی تعداد میں کتابیں نہیں آتیں مگر دس بارہ غالباً اب بھی آتی ہیں۔

میرے طالب علم جاوید قاضی پاکستانی تھے۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بہت سے کورس لینے پڑتے ہیں۔ سمسٹر سسٹم رائج ہے۔ ہر ٹرم میں استاد کو ایک سیمینار دینا ہے۔ اس کی بنا پر ٹرم میں ایک مقالہ لکھنا ہوتا ہے اور ایک کسی کتاب پر تبصرہ۔ امدادی کتابوں کی ہر ٹرم سے پہلے نشان دہی کر دی جاتی ہے۔ پڑھانے کے علاوہ استاد اپنے کمرے میں اپنے ریسرچ اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ سکریٹری ساڑھے آٹھ بجے آتی تھی۔ اس کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ برآمدے میں کافی تیار

کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس کے برابر ملک پاؤڈر اور شکر رکھی ہوتی تھی۔ ہر شخص ڈبے میں ۱۵ سینٹ ڈال دیتا پھر کافی بناتا۔ کچھ لوگ آتے ہی کافی پیتے تھے، کچھ لوگ گیارہ بجے کے قریب۔ بارہ بجے سب لوگ لنچ کے لیے نیچے کینٹین میں چلے جاتے۔ لنچ بہت مختصر ہوتا۔ کسی نے سلاد کی ایک پلیٹ لے لی۔ کسی نے گوشت کا ایک پارچہ۔ کسی نے مرغی کی ٹانگ، اس کے ساتھ کافی کا ایک پیالہ پیا اور پندرہ بیس منٹ میں واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

سیمناروں کا کوئی وقت مقرر نہ تھا کچھ لوگ صبح کے وقت سمینار لیتے تھے، کچھ دوپہر میں اور کچھ ایسے بھی تھے جو رات کو۔ جہاں امیدواروں کی تعداد زیادہ ہوتی وہاں کورس کے لیے ایک ابتدائی امتحان ہوتا۔ ٹرم ختم ہونے سے پہلے استاد ٹرم پیپر دیکھ کر رپورٹ دے دیتا میں نے اس معمول میں کوئی فرق نہ پایا۔

میں جس زمانے میں امریکہ میں تھا وہاں کی یونیورسٹیوں کے طلبا ویت نام سے امریکی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ مطالبہ اخباروں میں مضامین، طلبا کے جلسوں اور صدر کے نام خطوط کے ذریعہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ طلبا نے طے کیا کہ ایک یوم احتجاج منایا جائے۔ وہ صدر (وائس چانسلر) کے پاس گئے اور مطالبہ کیا کہ یونیورسٹی اس دن بند کر دی جائے۔ صدر نے کہا کہ یونیورسٹی کبھی بند نہیں ہوتی۔ آپ لوگوں کا جی چاہے کلاس میں جائیں یا نہ جائیں یہ آپ کا اور آپ کے استادوں کا معاملہ ہے کہ وہ آپ کو پڑھائیں گے یا نہیں۔ میں اس میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ طلبا پھر استادوں کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا اچھا تو آپ کل کلاس میں نہیں آنا چاہتے کوئی حرج نہیں کسی دوسرے دن آجایئے۔ ہفتے کی تدریس کا نظام گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔ چناں چہ دوسرے دن کے سارے کلاس کسی اور دن رکھ دیے گئے۔ کام کا حرج بھی نہیں ہوا اور یوم احتجاج بھی منالیا گیا۔ افسوس کہ ہمارے یہاں فرض کا یہ احساس نہ استادوں میں ہے نہ طلبا میں۔

میرا کام تو آسان تھا۔ جاوید قاضی کو ہفتے میں دو دن غالب کی شاعری پر لکچر دیتا۔ بیچ بیچ میں وہ سوال کرتا جاتا۔ لکچر انگریزی میں ہوتے تھے۔ ان لکچروں میں کئی بار نسیم، نارمنزائڈ، فضل الرحمان اور مرکز کے کچھ استاد بھی شریک ہوئے۔ لائبریری میں کتابیں موجود تھیں۔ میں نے تدریس کے سلسلے میں مطالعے کے علاوہ انگریزی ادب کے اپنے مطالعے کو اور وسیع کیا۔ سوچا کہ ان

لوگوں کے تدریس کے طریقے سے بھی واقفیت حاصل کروں۔ چناں چہ سال بیلو SAUL BELLOW (مشہور امریکن ناولسٹ جسے بعد میں نوبل پرائز ملا) کے سمینار میں شرکت کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ اس ٹرم میں وہ حضرت کیمبرج گئے ہوئے ہیں۔ ایک سلسلہ تحلیل نفسی اور ادبی تنقید پر تھا۔ سوچا کہ اس میں شرکت کرلوں۔ پروفیسر کو ٹیلی فون کیا تو وہ حیران ہوئے کہ آپ کیوں اس کورس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس موضوع سے دلچسپی ہے سمینار سے یقیناً کچھ سیکھوں گا۔ چناں چہ انھوں نے اجازت دے دی۔ دوسرے دن اُن کے سمینار میں پہنچا تو ایک چھوٹے سے کمرے میں کوئی ۲۵ طالب علم دیکھے۔ ان کی عمریں ۲۵ سے ۴۵ سال تک کی ہوں گی۔ آدھی خواتین تھیں، سب کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ کچھ لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ فرش پر، کسی کے ہاتھ میں کافی کا پیالہ تھا کوئی سگریٹ پی رہا تھا۔ غرض خاصی بزم بے تکلف تھی، اُستاد ٹھیک وقت پر آئے کوئی کھڑا نہیں ہوا۔ انھوں نے آتے ہی لکچر شروع کردیا، کوئی ۴۵ منٹ کے بعد پوچھا کوئی سوال! اس پر گویا سارے کلاس نے سوالوں کی بوچھار کردی۔ سوالوں کی نوعیت کچھ تو یہ تھی کہ کتاب یہ کہتی ہے اور آپ وہ کہہ رہے ہیں۔ کچھ زیادہ بنیادی تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک سوالوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد پروفیسر نے ان سوالوں کی روشنی میں پندرہ منٹ پھر اپنے موقف کی وضاحت کی۔ اس طرح ڈیڑھ گھنٹہ ختم ہوا۔ ایک دفعہ پروفیسر کو دیر ہوگئی۔ طلبا نے دس منٹ انتظار کیا پھر چلے گئے۔ دس منٹ کے بعد جب میں بھی واپس جارہا تھا وہ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے دیر کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ کسی دوسری یونیورسٹی میں لکچر دینے گئے ہوئے تھے اتفاق سے ہوائی جہاز آدھے گھنٹے دیر سے آیا اسی وجہ سے اب آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ لڑکے تو سب چلے گئے۔ دوسرے دن انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ تاخیر سے آنے کی معذرت کی اور کہا کہ اب اپنے کلاس سے ایک دن پہلے کہیں باہر جاؤں گا۔ مجھے استاد اور طلبا دونوں کا یہ رویّہ پسند آیا۔

شکاگو یونیورسٹی میں خاصا علمی ماحول دیکھا اس کے ساتھ یونیورسٹی کے معیار کے متعلق ایک برتری کا احساس بھی۔ پروفیسر ریڈ فیلڈ جن کے سمینار میں میں نے شرکت کی ایک طالب علم کے جواب میں کہنے لگے۔ تمھاری بات درست ہے مگر ہماری یونیورسٹی کے معیار کے مطابق اور گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ مرکز میں جو استاد تھے ان میں نارمن زائڈ لسانیات کے پروفیسر، اے ماکن دسماجی

لسانیات کے پروفیسر) اور فضل الرحمان (اسلامی فکر کے پروفیسر) سے زیادہ ربط ضبط رہا۔ ملاقاتیں سوشیالوجی کے پروفیسر رڈالف اور اُن کی بیگم سے بھی ہوئیں۔ میرے قیام کے زمانے میں مشہور ماہرِ لسانیات جیکبسن (JACOBSON) مشہور مستشرق گنےبام (GUNE BAUM) اور مشہور فرانسیسی ماہرِ سماجیات ڈیوپول (DUPONT) کے بھی لکچر ہوئے جن میں میں نے شرکت کی۔ چودھری محمد نعیم نے میرے امریکہ آنے کی اطلاع کئی یونیورسٹیوں کو دے رکھی تھی۔ چناں چہ میڈیسن (وسکانسن) منوسوٹا، ہارورڈ، اور فلاڈلفیا یونیورسٹیوں میں میرے لکچر ہوئے۔ مجھے میڈیسن بہت پسند آیا۔ چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ امریکہ کے چھوٹے شہر بڑے شہروں کے مقابلے میں زیادہ بھلے لگے۔ یہاں نارنگ نے کئی لکچروں کا اہتمام کیا تھا اور ایک مشاعرہ بھی رکھا تھا۔ شکاگو یونیورسٹی میں بھی ایک سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا جس میں دو ڈھائی سو میل سے ہندوستانی اور پاکستانی آتے تھے۔ ایک کشش یہ بھی تھی کہ جو کتابیں ہندوستان یا پاکستان سے آتی تھیں ان میں نعیم انتخاب کرتے اور جو لائبریری کے قابل نہ سمجھتے تھے ان کو مشاعرے کی رات ایک الماری میں لگا دیتے تاکہ جو چاہے لے جائے۔ یہ سستے ناول اور سطحی شاعری کے نمونے ہوتے تھے مگر لوگ انھیں بڑے شوق سے لے جاتے تھے۔

میرے قیام کے زمانے میں غالبؔ پر ایک خاص تقریب ہوئی۔ اعجاز احمد نے جو نیویارک میں انگریزی پڑھاتے تھے کچھ امریکن شعرا کو غالبؔ کی دس غزلوں کے لفظی ترجمے بھیجے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ ان کو اپنے طور پر شعر کے قالب میں ڈھالیں۔ شعرا میں رابرٹ بلائی، ڈیو وڈرے، ایڈرین رچ، اور ولیم اسٹیفورڈ جیسے نام تھے۔ اعجاز احمد چند شعرا کو لے کر شکاگو آئے۔ دو نشستیں ہوئیں۔ ایک میں میں نے غالبؔ اور جدید ذہن کے نام سے انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا۔ دوسرے میں اعجاز احمد نے غالبؔ کی غزلیں تحت اللفظ سنائیں اور پھر چار امریکن شعرا نے غالبؔ کے کلام کی انگریزی میں تخلیق نو (TRANS CREATION) پیش کی۔ رات کو سب لوگ راماجن کے یہاں جمع ہوئے اور دیر تک ادبی بات چیت رہی۔ راماجن صرف سماجی لسانیات کے پروفیسر ہی نہ تھے خود بہت اچھے انگریزی کے شاعر تھے۔ اُن کے کلام کا ایک مجموعہ اس وقت انگلستان میں شایع ہو چکا تھا۔ دوسرا میرے قیام کے زمانے میں اشاعت کے لیے مکمل تھا اور انھوں نے مجھے دکھایا

بھی تھا۔ انھوں نے تامل کے قدیم ادب کے بھی تراجم کیے ہیں جو ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔

مجھے نیویارک دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ چناں چہ بیوی کے ساتھ میں پہلے نیویارک گیا وہاں کرنل بشیر حسین زیدی کے لڑکے سید زیدی اور اُن کی بیگم جوڈی تھیں۔ میرا قیام ہندوستانی سفارت خانے میں سید نذیر حسین زیدی کے یہاں رہا۔ سید اور جوڈی کے ساتھ میں نیوہیون (NEW HAVEN) گیا۔ جہاں (Y A L E) یونیورسٹی ہے۔ یہاں مشہور انگریزی نقاد Y. WINTERS سے ملاقات ہوئی۔ اس یونیورسٹی کی لائبریری دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ نیویارک میں عبدالعظیم بھی مل گئے جو میرے شاگرد رہے تھے۔ آج کل یہ علی گڑھ میں لسانیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کے ساتھ میں آزادی کا مجسمہ دیکھنے گیا جو نیویارک کے قریب ایک جزیرے پر واقع ہے اور یہاں پہنچنے کے لیے اسٹیمر سے جانا ہوتا ہے ویسے نیویارک مجھے پسند نہیں آیا۔ یہاں کی بھاگ دوڑ اور پُر شور زندگی سے وحشت ہوئی۔ ہاں سید نے ایک چینی ریستوراں میں جو کھانا کھلایا تھا ویسا اچھا کھانا میں نے بہت کم کھایا ہے۔ اچھے چینی کھانوں کا واقعی دنیا میں جواب نہیں ہے۔

نیویارک سے میں ہارورڈ گیا۔ یہاں میرے دو لکچر تھے۔ پروفیسر شیمل نے بڑی آؤ بھگت کی۔ پروفیسر کینٹ ول اسمتھ نے کھانے پر بھی بلایا۔ اس زمانے میں صبیح احمد کمالی پروفیسر اسمتھ کے مذاہب کے تقابلی مطالعے کے ادارے میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے وہیں میرا قیام رہا۔ ہارورڈ میں داؤد رہبر اور عابد اللہ غازی سے بھی ملاقات ہوئی۔ داؤد رہبر پروفیسر شیخ اقبال پروفیسر فارسی اورینٹل کالج لاہور کے صاحبزادے ہیں۔ یہ بوسٹن یونیورسٹی میں مذاہب کے استاد ہیں۔ کسی وجہ سے عیسائی ہو گئے تھے۔ ان کا اُردو اور فارسی ادبیات اور اسلام کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ موسیقی سے بھی شغف ہے۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ ہارورڈ کے چند روزہ قیام میں یہ برابر ساتھ رہے۔ ہارورڈ، یونیورسٹی کے علاقے کا نام ہے۔ اس میں جدید شہر کے بجائے ایک پرانے شہر کی شان ہے۔ شیمل کو یہ علاقہ خاصا پسند ہے۔ ایک دن کہنے لگیں کہ اگر آپ قطب مینار ہمیں دے دیں تو ہم اس کے بدلے میں ہارورڈ کا علاقہ آپ کو دے دیں گے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ ہارورڈ مجھے پسند آیا مگر اتنا نہیں۔

ہارورڈ میں بیوی کو چھوڑ کر میں ایک دن فلاڈلفیا گیا وہاں بھی میرا لکچر تھا۔

شکاگو واپسی کے بعد میں منوسوٹا MINNOSOTA ایک لکچر کے لیے گیا۔ اس زمانے میں سردی بہت تھی۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ شکاگو میں درجہ حرارت – ۲۵ تک ہو جاتا تھا۔ کمرے میں تو سنٹرل ہیٹنگ کی وجہ سے کرتے پاجامے میں یا معمولی سوئٹر کے ساتھ رہنا ہوتا تھا مگر ہوٹل سے اگر خط ڈالنے کے لیے باہر نکلنا ہوتا تو پورے جاڑے کے کپڑے پہننے ہوتے تھے کیوں کہ ہوا چلتی تھی تو سودا کا مصرعہ یاد آتا تھا ؎

نسیم تیر سی سینے کے پار گزرے ہے

اکتوبر کے آخر میں برف پڑنی شروع ہو جاتی ہے برف پڑتی تو کئی دن تک باہر جمی رہتی مگر سڑکیں فوراً صاف کر دی جاتی تھیں مگر منوسوٹا میں جو شکاگو کے شمال مغرب میں واقع ہے سردی اور زیادہ تھی۔ ہوائی جہاز ایرکنڈیشنڈ تھا جس کار سے یونیورسٹی پہنچا وہ بھی ایرکنڈیشنڈ تھی۔

یونیورسٹی کا مہمان خانہ اور لکچر ہال سب ایرکنڈیشنڈ تھے اس لیے مجھے سردی کا خاص طور سے احساس نہ ہوا مگر جب اپنے لکچر کے بعد رات کو پیدل میزبان کے ساتھ گیسٹ ہاؤس آ رہا تھا تو سڑک پار کرتے وقت دیکھا کہ درجہ حرارت – ۲۹ ہے یہ دیکھ کر ایک ساتھ پھریری آ گئی۔ منوسوٹا میں جنوبی ایشیا کی ایک تاریخی اٹلس کئی جلدوں میں تیار ہو رہی تھی اس کے ایڈیٹروں سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ مجھے اس عظیم پیمانے پر کام کے متعلق معلومات حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی سُنا ہے کہ یہ اٹلس اب چھپ چکی ہے۔ شکاگو میں قیام کے علاوہ شاداں ہندی سے بھی ملنا ہوتا تھا۔ اُن کا نام عنایت حسین ہے اور یہ ایک کیمسٹ ہیں۔ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ شعر ایک عمر سے کہہ رہے ہیں۔ کلام میں پختگی اور شگفتگی ہے۔ میں پان بکثرت کھاتا ہوں۔ امریکہ میں کتھا اور چھالیا تو مل جاتے تھے چونا شاداں ہندی فراہم کر دیتے تھے۔ خشک پان کچھ دن علی گڑھ سے آئے پھر ایک سلاد کا پتہ شاداں صاحب نے دیا جس کا مزا پان سے ملتا ہے۔ یہ سلاد آسانی سے دکانوں پر مل جاتی تھی۔ تمباکو کے پیکٹ بھی علی گڑھ سے آ جاتے تھے۔ لندن میں پان پر کوئی پابندی نہیں وہاں بازار میں پان مل جاتا ہے اور کئی جگہ کھانے پر پانوں کی تھالی بھی دیکھی مگر امریکہ میں کسی قسم کی سبزی یا مٹھائی باہر سے نہیں آ سکتی۔ کسٹم والے جراثیم کے ڈر سے ضبط کر لیتے ہیں۔ گیا تھا تو پانوں

کی ایک ڈھولی کپڑے میں لپیٹ کر لے گیا تھا کسٹم والوں نے سمجھا ہاتھ میں کوئی پیکٹ ہے۔ انھوں نے سامان تو کھلوا کر دیکھا مگر ہاتھ میں بنڈل پر دھیان نہ دیا۔ مگر یہ پان میں نے غلطی سے فرج میں رکھ دیے اور وہ چند روز میں سڑ گئے۔

اس زمانے میں سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے سلمان ندوی بھی وہیں تھے اور اسلامک اسٹڈیز میں ریسرچ کر رہے تھے۔ فضل الرحمان، شاداں ہندی، سلمان کے یہاں اکثر جانا ہوتا۔ نعیم کے یہاں تو پھیرے ہوتے ہی رہتے تھے۔ کہیں جانا ہوتا تو نعیم ہی لے جاتے تھے۔ اُن کی وجہ سے مجھے شکاگو میں بڑا آرام رہا۔ اُن کی امریکن بیوی اس زمانے میں ڈاکٹری پڑھ رہی تھیں۔ ایک لڑکا طاہر جمیل اور ایک لڑکی فرح تھی۔ دونوں اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ نعیم نے تاکید کر دی تھی کہ یونیورسٹی کے علاقے کے علاوہ کہیں رات کو اکیلا نہ نکلوں۔ شکاگو میں کئی علاقے ایسے ہیں جہاں کچھ سیاہ فام حضرات چاقو یا پستول دکھا کر سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ گھروں میں کمرہ اندر سے بند ہو جائے تو باہر سے نہیں کھل سکتا۔ کہیں جاؤ تو پہلے گھنٹی بجاؤ۔ مالک مکان ایک گول سوراخ سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ کون ہے پھر دروازہ کھولتا ہے۔ نعیم جب مجھے گھر پہنچا کر جانے والے ہوتے تو اصرار کرتے تھے کہ پہلے میں اندر چلا جاؤں پھر وہ اپنی کار اسٹارٹ کرتے تھے۔ ٹیکسی چلانے والوں میں کالے ڈرائیوروں کی خاصی تعداد تھی مگر نعیم نے تاکید کر دی تھی کہ ان کی گاڑی میں نہ بیٹھوں۔ امریکہ میں ٹپ کا رواج عام ہے۔ کھانے کا بل ہو یا ٹیکسی کا کرایہ دس فی صد ٹپ اس کے علاوہ ہوتی ہے۔ کالے ڈرائیور اکثر زیادہ ٹپ پر اصرار کرتے ہیں اور نہ دو تو جھگڑتے ہیں۔ شکاگو میں کالے مسلمانوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ یہ لوگ الی جا محمد (ELIJAH MOHAMED) کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ ان کے اپنے اسٹور اور ہوٹل ہیں یہ عام طور پر خوش حال ہیں۔

شکاگو میں ہندوستان اور پاکستان کے کئی ہزار طالب علم ہوں گے۔ ایسے ہندوستانیوں کی تعداد بھی خاصی ہے جو مستقل طور پر یہاں آکر بس گئے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں زیادہ مہنگی نہیں کہی جا سکتیں، ہاں مکانوں کے کرایے بہت ہیں۔ اپنا سامان خود لانا پڑتا ہے۔ کھانا خود پکانا پڑتا ہے۔ اگر آپ کسی ہوٹل میں ہیں تو کوئی ملازمہ (MAID) آکر بستر ٹھیک کر جائے گی اور کمرے کی مشین سے صفائی۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ کاریں بیشتر لوگوں کے پاس ہیں۔ سلائی، دھلائی، حجامت

وغیرہ مہنگی پڑتی ہے۔ اسی لیے زیادہ تر لوگ خود ہی اپنے بال کاٹ لیتے ہیں یا لمبے بال رکھتے ہیں۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرح خشک مزاج اور سرد مہر نہیں ہیں گرم جوشی سے ملتے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں اور بڑی کمپنیوں کے بالائی حلقوں میں مالی بدعنوانیوں کے قصے خاصے سننے میں آئے مگر عام کاروبار، خرید و فروخت اور معاملات میں دیانت دیکھی۔ امریکہ میں تشدد بہت ہے ہتھیار رکھنے کی عام آزادی ہے۔ کینیڈی کے قتل کے بعد ہتھیاروں کی عام فروخت پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی جو ناکام ہوئی۔ ذاتی آزادی پر بہت زور ہے۔ لباس کے معاملے میں بڑی رنگارنگی ہے۔ لوگ ہر طرح کے لباس پہنتے ہیں۔ شوخ رنگ خاصے مقبول ہیں۔ امریکی نوجوان محنت کا عادی ہے۔ ہر طرح کا مواد فراہم کرنے اور ہر طرح کے اعداد و شمار جمع کرنے کا اسے شوق ہے۔ لوگ ہفتے کے آخر میں یعنی جمعہ کی شام اور سنیچر کی صبح کو یا تو سیر کو نکل جاتے ہیں یا پھر گھر کے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جس طرح شام کو گپ کا رواج ہے وہ میں نے امریکہ میں کہیں نہیں دیکھا۔ گہرے دوست بھی کبھی کبھار ملتے ہیں۔ ہاں ایک دوسرے کی خیریت ٹیلی فون سے معلوم کرتے رہتے ہیں۔

کافی بہت پیتے ہیں۔ صبح فروٹ جوس سے دن شروع ہوتا ہے۔ کوئی نو بجے کے قریب خاصا اچھا ناشتا۔ بارہ بجے ہلکا لنچ۔ پھر شام کو چھ بجے کھانا۔ کچھ لوگ رات کو نو دس بجے عشائیہ (سپر SUPPER) کے طور پر کچھ کھا لیتے ہیں۔ نوجوانوں میں وہاں کی میکانیکی زندگی سے بیزاری کی لہر، ہپی (HIPPY) کا بھی روپ دھار لیتی ہے۔ کچھ نوجوان سیاسی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ کچھ ماحول کی آلودگی کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ اخباروں اور ناولوں سے جنسی آزادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل اس پیمانے پر تو نہیں پھر بھی جنسی بے راہ روی خاصی ہے۔ شادیاں زیادہ عمر میں نہیں ہوتیں۔ طلاق بھی جلد ہوتی ہے۔ عام طور پر بچے بڑے ہو کر اپنی الگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بوڑھوں کی زندگی خاصی مشکل ہے۔ ان کے لیے کچھ خاص ادارے بنائے گئے ہیں۔ مشترک خاندان جیسی چیز کا امریکہ میں وجود نہیں ہے۔ امریکن عورت شروع میں بچوں پر بہت توجہ کرتی ہے مگر ذرا بڑے ہوئے اور اسکول جانے لگے تو پھر بے نیاز ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بس میں اکثر ایک عورت آتی تھی کوئی پینتیس (۳۵) برس کی ہوگی۔ وہ ہندوستانی تمدن کے کورس میں شرکت کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کو اس کورس سے کیسے دلچسپی ہوئی۔ کہنے لگی کہ دس بارہ برس پہلے میں

اے بی (بی۔ اے) کر رہی تھی تو ایک کورس میں نے ہندوستانی تمدن کا بھی لیا تھا۔ یہ مجھے اچھا لگا۔ پھر میری شادی ہوگئی اور چار سال میں دو بچے ہوئے۔ اُن کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔ اب انھیں اتنی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں اس لیے اعلیٰ کورس لے کر اپنا شوق پورا کر رہی ہوں نعیم کے ذریعے سے مسٹر اور مسز بے بنڈ سے ملاقات ہوئی۔ میاں اس وقت اسّی سے اوپر کے تھے بیوی چند سال کم رہی ہوں گی۔ بیوی ایڈ ریوبی) کے ایک مشنری مرکز میں پیدا ہوئی تھیں۔ پھر میاں بیوی دونوں برسوں لاہور میں رہے تھے۔ اُردو شاعری سے دونوں کو دلچسپی تھی۔ مسلمانوں کے مستقبل سے بھی۔ انھوں نے بڑے دن کے موقع پر ہم لوگوں کو بلایا تھا کئی دفعہ کھانے پر اس کے بعد بھی بلایا۔ دونوں بڑی محبت کے لوگ تھے۔ اُن کا لڑکا صرف بڑے دن کے موقع پر ملا تھا۔ جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا وہاں برابر کے کمرے میں ایک نوّے سالہ بیوہ دن رہتی تھی۔ بیچاری بالکل اکیلی تھی۔ اس کا لڑکا ڈاکٹر تھا وہ ہر ہفتے آکر کھانے پینے کی چیزیں اور دوائیں دے جاتا۔ ایک دفعہ بخار میں مبتلا تھی۔ میری بیوی نے اس کی تھوڑی سی دیکھ بھال کی۔ ایک دفعہ اس کی ڈریس پر رفو کر دیا وہ دس ڈالر دینے لگی۔ میری بیوی نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ بڑی حیران تھی۔ امریکہ میں عام طور پر ہر کام کا معاوضہ دیا کرتے ہیں کسی کا احسان نہیں لیتے۔ جب میری بیوی نے اُسے سمجھایا کہ ہماری تہذیب میں کسی کا چھوٹا موٹا کام کرنے کا معاوضہ لینا بہت بُرا سمجھا جاتا ہے تو مان گئی۔ پھر اکثر آتی۔ کبھی آئس کریم لے کر، کبھی کوئی اور کھانے کی چیز لے کر۔

میں کیلی فورنیا دیکھنا چاہتا تھا مگر ہوا یہ کہ حکومتِ ہند نے کلچرل ایکسچینج (CULTURAL EXCHANGE) کے پروگرام میں مجھے ہنگری اور پولینڈ جانے کی دعوت دے دی۔ مارچ کے آخر میں میرا ٹرم ختم ہو رہا تھا۔ چناں چہ میں نے منظوری دے دی اور آخر مارچ میں مانٹریال کے لیے روانہ ہو گیا۔ عبدالرحمٰن بارکر نے اسلامک سٹڈیز انسٹی ٹیوٹ میں سر سید پر لکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ چناں چہ پورے چھے مہینے امریکہ میں قیام کے بعد وہاں سے رخصت ہوا۔ میرا قیام یہاں ہر لحاظ سے خوش گوار رہا۔ جدید امریکی ادب کا خاصا مطالعہ کیا۔ غالب اور جدید اُردو شاعری پر انگریزی میں کئی مضامین لکھے۔ کچھ عالموں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ امریکہ کے اعلیٰ تعلیم کے نظام کا علم ہوا۔ وہاں ایک طرف دنیا کی بہترین یونیورسٹیاں ہیں۔ دوسری طرف ایسی بھی بہت سی

ہیں جن کا کوئی معیار نہیں اور جہاں آسانی سے ڈگری مل جاتی ہے ۔ کالوں کے ساتھ ابھی تک مساوات نہیں ہے اگرچہ حالات پہلے سے بہت بہتر ہیں ۔ عام زندگی میں کتنی ہی آزادی ہو مگر انتخابات میں طلاق یا مشتبہ چال چلن کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ۔ امریکہ میں گھر کی مالکہ HOUSE WIFE اب بھی خاصی طاقتور ہے ۔ انتخابات میں اس کی رائے کی بڑی اہمیت ہے ۔

عام طور سے لوگ چند دن یا چند ماہ کی سیر کے بعد اس ملک ، وہاں کے لوگوں ، وہاں کی تہذیب ، ادب ، ذہنی کیفیت اور مخصوص رویے کے متعلق اس طرح باتیں کرتے ہیں گویا وہ اس موضوع پر اتھارٹی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ میرا قیام امریکہ میں بہت مختصر رہا ۔ میں چند استادوں اور چند طالبعلموں سے ہی مل سکا ۔ پھر میرا زیادہ وقت شکاگو یونیورسٹی میں گذرا ۔ اس بڑے شہر کے بہت سے علاقوں سے ناآشنا ہی رہا ۔ اس لیے امریکہ کے متعلق میں کوئی قطعی رائے دینے کا اہل نہیں ہوں ۔ ہاں جو میرے تاثرات ہیں ۔ جو میں نے دیکھا ، پایا اور محسوس کیا اس کا اظہار میں نے چند صفحات میں کر دیا ہے شکاگو یونیورسٹی کے علمی ماحول سے میں متاثر ہوا ۔ وہاں استادوں میں کام کی لگن دیکھی ۔ اس کا یہ نعرہ ہے کہ لوگ کام کریں اور اسے چھپوائیں ورنہ دفان ہوں ۔

بہر حال استادوں کے لیے یہ تو ظاہر کرتا ہے کہ وہ برابر کچھ کرتے رہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ یورپی اسکالروں کے نزدیک ان لوگوں کے کام میں گہرائی کم ہوتی ہے اور اعداد و شمار اور ان کی درجہ بندی پر زور زیادہ ۔ راما نجن سے میں نے پوچھا کہ تم ہندوستان کیوں نہیں واپس جاتے وہاں تمھارے جیسے اسکالروں کی ضرورت ہے ۔ اس نے کہا ہندوستان میں کام کی اور کام کے آدمیوں کی قدر نہیں ہے اور وہاں کے دفتری نظام کی وجہ سے اچھے لوگوں کو موقع نہیں ملتا ۔ انھوں نے اپنی مثال دی کہ وہ شکاگو میں ریڈر تھے اور ہندوستان میں ریڈری پر آنے کو تیار تھے ۔ پروفیسر گوکک (GOKAK) نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انھیں انگریزی یا لسانیات میں ریڈر شپ ضرور دلوادیں گے ۔ مگر اس میں اتنی دیر لگی کہ انھوں نے یہ خیال ہی ترک کر دیا ۔ شکاگو یونیورسٹی میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے بغیر کوئی اسسٹنٹ پروفیسر نہیں ہو سکتا ۔ تقرر شعبے کی پوری کمیٹی یعنی فیکلٹی کرتی ہے ۔ کوئی انٹرویو نہیں ہوتا ۔ امیدوار کا سارا کام پیش نظر ہوتا ہے ۔ فیکلٹی کی مدد سے ماہرین سے تحریری رائے بھی حاصل کی جاتی ہے ۔ فیکلٹی کا فیصلہ ہی سب کچھ ہے ۔ کبھی کبھار صدر شعبہ ٹیلیفون پر ہی

تقرر کی اطلاع دے دیتا ہے۔ تقرر عام طور پر تین سال کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے بعد فیکلٹی استاد کے کام کا جائزہ لیتی ہے اور اس میں طلبا کی رائے بھی اپنے طور پر حاصل کر لی جاتی ہے اس کے بعد یا تو مستقل طور پر تقرر ہوگا یا ایک اور تین سال کا موقع دیا جائے گا یا ملازمت ختم کر دی جائے گی۔ میرے نزدیک یہ طریقہ بہتر ہے اس میں یہ امکان نہیں کہ ایک دفعہ تقرر کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ترقی بھی ملتی جائے خواہ وہ آدمی کچھ کرے یا نہ کرے۔ فضل الرحمان کا تقرر اس طرح ہوا کہ اُن سے کہا گیا کہ ہماری یونیورسٹی میں تین لکچر دے دو۔ وہ لکچر دینے پاکستان سے امریکہ آئے۔ ان کی کئی کتابوں کی شہرت ہو چکی تھی۔ مشرقی علوم کے شعبے میں اسلامی آرٹ کی ایک جگہ خالی تھی فیکلٹی نے طے کیا کہ اس جگہ کو اسلامی فکر کی جگہ میں تبدیل کر دیا جائے اور اس پر فضل الرحمان کا تقرر کیا جائے۔ چناں چہ وہ اس جگہ پر آگئے۔ شکاگو میں انھوں نے مکان خرید لیا تھا۔ جولائی ۱۹۸۸ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ افسوس ہے ایسے اچھے اسکالر کی پاکستان نے قدر نہ کی۔

مشہور سائنداں کھرانا سے ٹیلی فون پر ہی بات ہو سکی۔ کہیں باہر جا رہے تھے اُن سے بھی میں نے شکوہ کیا کہ آپ ہندوستان میں کام کیوں نہیں کرتے۔ اُن کا کہنا بھی یہی تھا کہ میں وہاں کام کرنے کے لیے گیا تھا مگر کسی نے مجھے اہمیت نہ دی اور کچھ دن اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد امریکہ واپس آگیا۔ یہاں گراں قدر مشاہرے کے علاوہ میرے لیے یونیورسٹی نے ایک تجربہ گاہ بھی بنا دی ہے اور میں اپنی مرضی کے فیلو مقرر کرتا ہوں۔ ہندوستان میں رہ کر کیا کام کرتا۔ کھرانا کو GENETICS پر کام کے سلسلے میں نوبل پرائز مل چکا ہے۔ میرے زمانے میں شکاگو یونیورسٹی کے نوبل انعام پانے والوں کی تعداد ۲۹ تھی۔

ویسے ہندوستانی اساتذہ اور طلبا کی وہاں بڑی قدر ہے۔ وہ لوگ ان کی محنت اور صلاحیت کی تعریف کرتے ہیں۔ میرے نزدیک خرابی ہندوستانی اسکالروں میں نہیں ہمارے نظام کی ہے ہم زبانی تو سائنسی علوم اور ادب سبھی کے فروغ کی بات کرتے ہیں۔ مگر ایک طرف کام کی آزادی اور سہولت نہیں دیتے۔ دوسری طرف بیوروکریسی کی اسپرٹ تعلیمی اداروں اور سرکاری علمی اداروں میں بھی آگئی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کام کرنے والے لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں اور باتیں بنانے والے یا بااثر حضرات آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں استادوں کے تقرر کے طریقے میں بھی اصلاح

کی ضرورت ہے۔ صرف کام کی بنا پر جو مطبوعہ ہو تقرر ہونا چاہیے۔ چند منٹ کے انٹرویو میں کسی کی صلاحیت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔ ہاں مستند اور غیر جانب دار ماہرین سے رائے لی جا سکتی ہے۔ اگر موقع دینے کے بعد بھی اہلیت ظاہر نہ ہو تو ملازمت کو ختم کر دینا چاہیے۔ مگر ہمارے یہاں مروت کا رواج ہے اس لیے ہمارے یہاں یہ طریقہ شاید اختیار نہ کیا جا سکے۔ پھر ابھی ہم علاقائی، لسانی، مذہبی تعصبات سے آزاد کہاں ہو پائے ہیں جو صرف صلاحیت کو دیکھ سکیں۔

۲۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو میں سہ پہر کی فلائٹ سے مانٹریال کے لیے روانہ ہوا۔ عزیز احمد اس زمانے میں ٹورنٹو میں تھے۔ انھوں نے مجھے ٹورنٹو آنے کی دعوت دی۔ عبدالعظم نے لکھا کہ آپ نیویارک ہوتے ہوئے مانٹریال جائیے مگر نہ ٹورنٹو گیا نہ نیویارک۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں شکاگو سے مانٹریال پہنچ گیا۔ عبدالرحمان بارکر ایرپورٹ پر لینے آگئے تھے۔ یہ امریکی اسکالر مسلمان ہو گئے ہیں اور ان کی شادی بھی کینیڈا میں مقیم ایک ہندوستانی خاندان میں ہوئی ہے۔ ایک ہوٹل میں قیام رہا۔ بارکر کی لائبریری دیکھی۔ انھوں نے مخطوطات کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ اسلام اور اردو ادب پر کتابوں کی بڑی تعداد ہے۔ اسلامک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ایڈمس سے ملاقات ہوئی۔ یہ کینٹ ویل اسمتھ کے جانشین تھے اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ مانٹریال میں سید مظفر علی جو پہلے مولانا آزاد لائبریری میں ڈپٹی لائبریرین تھے، انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین تھے۔ ان کے یہاں کھانے پر علی گڑھ کے اور پاکستان کے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر جمیل احمد صدیقی مجھ سے ملنے شیربروک سے آئے تھے۔ پاکستانی سفارت کے ایک صاحب مقصود علی نے چھوٹتے ہی سوال کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو یہ دریافت کرنے کا کیا حق ہے۔ آپ تو پاکستان چلے آئے۔ ہم کو ہماری جمہوریت نے جو حقوق دیے ہیں ان کے حصول کے لیے کوشش کرتے رہیں۔ ہاں آپ لوگ ہمارے یہاں کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اب جب پاکستان بن گیا تو دونوں ملکوں کا مفاد اسی میں ہے کہ دوستی اور بھائی چارے کے ساتھ رہیں۔ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں اور اپنے ملکوں کو سماجی خوش حالی کی طرف لے جائیں۔

چند دن مانٹریال میں قیام کے بعد لندن آیا۔ جاتے ہوئے تو صرف ہوائی اڈے پر جہاز

بدلا ستھا۔ لکھنؤ کے ایک شاگرد آل حسن ایرپورٹ پر مجھے لینے آگئے تھے ان کے گھر پہنچا تو تھوڑی دیر میں رالف رسل بھی آگئے۔ یہ لندن یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر ہیں۔ خورشید الاسلام کے ساتھ مل کر انھوں نے تین مغل شاعر کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی نثر کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ شاعری کے ترجمے پر ابھی کام ہو رہا ہے۔ ہم لوگ لنچ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ لکھنؤ کے ایک پرانے شناسا ڈاکٹر محمود شاہ مجھے لینے آگئے۔ اُن کی بیگم رضیہ شاہ لکھنؤ سے فارسی میں آنرس کر چکی ہیں۔ ان کے بہت اصرار پر ہم لوگ اُن کے یہاں سہ پہر میں منتقل ہو گئے۔ آل حسن کی بیوی جرمن تھیں۔ ڈاکٹر شاہ کو خیال ہوا کہ میری بیوی کو وہاں آرام نہ ملے گا۔ ہم لوگ ڈاکٹر شاہ کے یہاں کوئی دس دن رہے۔ ان کے یہاں اُن کے اور ہمارے ایک دوست جمال اور ان کی بیگم شمس بھی ٹھہرے ہوئے تھے، جمال بڑے مخلص آدمی تھے اور دلچسپ باتیں کرتے تھے رات کو ڈاکٹر شاہ کے یہاں ہندوستانی اور پاکستانی دوستوں کا اجتماع تھا جس میں ہمارے ڈپٹی ہائی کمشنر کول بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد گانا شروع ہوا۔ کوئی بارہ بجے رات کو یہ صحبت برخاست ہوئی۔ صبح آٹھ بجے میرے دروازے پر کسی نے دستک دی اور کہا میرا چائے لایا ہے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جمال چائے کی ٹرے لیے کھڑے ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا حرکت۔ کہنے لگے میں نے اپنے لیے چائے بنائی تھی سوچا آپ کے لیے بھی بنا دوں۔

آل حسن بی بی سی میں ہندی سیکشن میں تھے۔ اُن کی آواز ریڈیو کے لیے بہت موزوں تھی۔ وہ بی بی سی میں بہت مقبول رہے۔ افسوس ہے کہ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے بی بی سی پر میرے دو انٹرویو ریکارڈ کیے۔ بی بی سی کے کینٹین میں ساقی فاروقی سے ملاقات ہوئی۔ ان کی شاعری کی شہرت ہو چکی تھی اور ان کی نظم "موت کی خوشبو" اس وقت موضوع بحث بھی تھی۔ ساقی سے پھر کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ کام تو یہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا کرتے ہیں مگر جدید شاعری میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ میں لندن میں خاص طور سے انڈیا آفس لائبریری گیا اور وہاں کچھ اردو شاعروں کے مخطوطات نکلوا کر دیکھے۔ سعادت یار خاں رنگین کا خاصا کلام وہاں ملا۔ لندن میں ہندوستان اور پاکستان سے آنے والوں کی تعداد کئی لاکھ ہو گی۔ لندن کے کئی محلوں میں خاصا ہندوستانی ماحول نظر آیا۔ مجھے چوں کہ حکومت ہند کی طرف سے پولینڈ اور ہنگری جانے کی دعوت مل چکی تھی اس لیے

ویزا کے سلسلے میں معلومات کرنے ہندوستانی ہائی کمیشن گیا۔ وہاں انور جمال قدوائی سے ملاقات ہوئی جو اس زمانے میں تعلیمی امور کے اتاشی تھے۔ انھوں نے پولینڈ اور ہنگری سے میرے سلسلے میں خط و کتابت بھی کی۔ ہنگری والوں نے تو فوراً دعوت دے دی اور ویزا کے لیے اجازت بھی مل گئی مگر پولینڈ والوں نے پریشان کیا۔ انھوں نے اس خط کو کوئی اہمیت نہ دی جو پولینڈ کی رائٹرس ایسوسی ایشن کی طرف سے مجھے موصول ہو چکا تھا اور اس پر اصرار کیا کہ پہلے پولینڈ سے دوبارہ اجازت لی جائے گی اور اس کے بعد ویزا ایک ہفتے میں ملے گا۔ میں اتنی دیر انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ چناں چہ حکومت ہند کو لکھ دیا کہ میں نہ جا سکوں گا۔ ساتھ ہی یہ شکایت بھی کی کہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم جن لوگوں کو کلچرل ایکسچینج کے پروگرام میں بیرونی ملکوں کو بھیجتی ہے ان کے ویزا کے حصول کے لیے انھیں سفارتوں میں دوڑنا پڑتا ہے اور انھیں بیوروکریسی کی بے توجہی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ میرا یہ خط بعد میں ہندوستان کے سارے سفارت خانوں کو بھیجا گیا اور جب ۱۹۷۲ء میں رومانیہ، ہنگری اور سوویت یونین کے دورے پر گیا تو مجھے دوڑنا نہ پڑا۔ ہاں یہ ضرور پتہ چلا کہ سوویت یونین اور کچھ کمیونسٹ ملکوں میں ویزا کی درخواست موصول ہونے پر فوراً کارروائی نہیں ہوتی بلکہ مرکز کو لکھ کر پھر تصدیق کی جاتی ہے کہ دعوت نامہ مستند ہے یا نہیں۔ سوویت یونین میں میرے پوچھنے پر رائٹرس یونین کے ایک عہدہ دار نے اس کا اعتراف بھی کیا۔

بہر حال اس سفر میں لندن دیکھنے کا ارمان بھی پورا ہو گیا۔ اگرچہ آکسفورڈ اور کیمبرج نہ جا سکا اور لندن بھی اچھی طرح نہ دیکھ سکا مگر جس لندن کے متعلق بچپن سے پڑھتا چلا آیا تھا اور جس کے نقش و نگار اور آثار انگریزی ادب کے مطالعے کے ذریعے میرے ذہن میں خاصے روشن تھے اس کا کچھ مشاہدہ ہو سکا۔ دریائے ٹیمس ہر موڑ پر آنے والے کی پذیرائی کرتا ہے۔ عمارتیں اکثر پرانی ہیں۔ ٹیکسیاں بھی بھاری بھرکم اور قدیم طرز کی ہیں۔ دوکانیں بڑی شان دار اور سجی ہوئی ہیں۔ سڑکیں صاف ستھری لیکن کچھ سڑکیں مجھے ہندوستان کی سڑکوں کی طرح گندی بھی نظر آئیں۔ میں اپریل کے شروع میں لندن پہنچا تھا۔ اس زمانے میں بھی کئی دفعہ برف گری۔ گو بہار کے آثار آ چلے تھے اور درختوں سے ہری کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کئی جگہ کھانے کی دعوتیں رہیں۔ زاہد حسین قادری کے یہاں جو مشہور استاد ادیب اور نقاد حامد حسن قادری کے بیٹے ہیں اور لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز

میں اُردو پڑھاتے ہیں مہاراجا محمود آباد سے ملاقات ہوئی۔ لکھنؤ، علی گڑھ اور رام پور میں اُن سے کئی دفعہ مل چکا تھا۔ یہاں وہ اس زمانے میں اسلامک سنٹر کے ڈائرکٹر تھے۔ اُنھیں سوٹ میں دیکھ کر تعجب ہوا مگر ان کی باتوں میں وہی پرانی شائستگی تھی۔ میں نے جب دریافت کیا کہ آج کل کیا شغل ہے تو ہنس کر کہنے لگے ملازمت کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر شاہ اور رضیہ شاہ نے مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فراموش نہیں کیا۔ رضیہ شاہ کو اسلامیات اور اُردو شاعری سے خاص دلچسپی ہے۔ کئی جگہ وہ میرے ساتھ گئیں۔ لندن کی ایک صحبت میں سحاب قزلباش نے ایک اردو اخبار کے لیے میرا انٹرویو لیا جو ہندوستان میں اُردو ادب سے متعلق تھا۔ انٹرویو کے بعد انھوں نے مجھ سے ایک سوال کیا۔ سرور صاحب سچ سچ بتائیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر کتنے مظالم ہو رہے ہیں؟ میں ان پر برس پڑا اور میں نے کہا کہ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں کیا میں منافق ہوں کہ پبلک میں کچھ اور کہوں اور پرائیوٹ طور پر کچھ اور۔ ظاہر ہے کہ تقسیم کی وجہ سے حالات خاصے خراب تھے۔ ہندوستانی مسلمان بہر حال اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آپ کو ہندوستانی مسلمانوں سے کیا دلچسپی ہے۔ آپ تو پاکستان آگئیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو آپ کی اس جھوٹی ہمدردی کی ضرورت نہیں وہ اپنے مسائل اپنے طور پر حل کر سکتے ہیں۔

لندن میں دس دن قیام کے بعد میں اور میری بیوی اپنے لڑکے جاوید سے ملنے جرمنی گئے۔ اس کے یہاں MAINZ میں کوئی ایک ہفتہ قیام رہا۔ اس کے ساتھ میں نے WEISBADEN کی سیر کی اور دریائے رہائن (RHINE) پر ایک اسٹیمر میں کوئی سو میل گیا۔ ایک جگہ اتر کر شاہینوں کا شاہی پارک ROYAL EAGLE PARK دیکھا۔ میرے خیال میں شاہین کی علامت کی معنویت یہیں کے شاندار پرندوں کو دیکھ کر اقبال پر آشکارا ہوئی ہوگی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ میں نے جرمنی سے اٹلی جانے کا پروگرام بنایا اور پروفیسر یوسا بی کو روما لکھ بھی دیا کہ وہ میرے قیام کا کسی ہوٹل میں انتظام کر دیں۔ مگر مجھے روانگی کی تاریخ غلط یاد تھی، جس دن جانے کا خیال تھا اس سے ایک دن پہلے جانا تھا۔ اس دن اتفاق سے ٹکٹ دیکھا تو معلوم ہوا کہ آج تو روانگی تھی اور روانگی کا وقت گزر رہا تھا۔ بہر حال بھاگم بھاگ فرانک فورٹ آیا LUFTHANSA کے دفتر پہنچا اس سے سفر کرنا تھا۔ جاوید کو یقین تھا کہ یہ ٹکٹ ضائع ہو گیا۔ مگر میں نے کمپنی کے دفتر میں جا کر صاف صاف صورتِ حال بیان کی۔ منیجر ہنسا اور کہا پروفیسر ایسا ہی کرتے ہیں۔ پھر بولا۔

آپ کب جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کل۔ اس نے اسی وقت ٹکٹ پر تصحیح کر دی۔ میں نے بوسانی کو تار دیا اور دوسرے دن روما پہنچ گیا۔

بوسانی ایرپورٹ پر موجود تھے۔ مجھے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں لے گئے جسے وہاں کی اصطلاح میں PENSIONE کہتے ہیں اس میں ہر طرح کا آرام تھا صرف نہانے اور حوائج ضروریہ کے لیے کوئی دس قدم دوسری طرف جانا پڑتا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک طالب علم عبدالرحیم کو میرے ساتھ کر دیا تاکہ مجھے روما کی سیر کراوے۔ وہاں کے آثار اور تاریخی مقامات کو دیکھ کر اقبال کا یہ شعر بار بار دہراتا رہتا ہے

"سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی

کچھ وقت عبدالرحیم کے ساتھ گذارا۔ انھوں نے ایک اطالوی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اطالوی حسن جس نے اقبال کو متاثر کیا تھا کم ہی نظر آیا۔ اطالوی کھانے جرمنی کھانوں سے مختلف اور مزے دار ہیں۔ پیزا PIZZA خاص طور سے پسند آیا۔ مکرونی MACRONI کی بڑی تعریف سنی تھی مگر مجھے تو نمکین سویوں کی طرح لگی۔ اطالوی اس کے عاشق ہیں۔ ہر قسم کی شراب کھانے کی میز پر تھی۔ سادا پانی نہ تھا ہاں سوڈا مل جاتا تھا اس سے کام چلا لیتا تھا۔

مجھے نیپلس (NAPLES) دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ وہاں سے لوگ CAPRI بھی جاتے ہیں جس کے راستے میں ایک جگہ کشتی ایک GROTTO میں سے گذرتی ہے اور یہ سمندر کی تہ سے کچھ نیچے ہے۔ مگر میں CAPRI نہ دیکھ سکا۔ ہوا یہ کہ جب میں نیپلز جانے کے لیے روما کے اسٹیشن سے صبح آٹھ بجے گاڑی میں سوار ہوا تو کسی نے میری جیب کاٹ لی۔ جیب میں سفری چیک، کچھ ڈالر، کچھ پونڈ اور کچھ اشرفیاں تھیں جو میری بیوی نے اپنے ہار کے لیے خریدی تھیں۔ غلطی میری تھی۔ سب چیزیں ایک ہی جیب میں تھیں اور گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے کافی کا ایک پیالہ پیا تھا جس کے لیے بٹوے سے ۵۰ لرا نکال کر دیے تھے۔ یہ وہاں کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے دیکھ لیا۔ ریل میں بھیڑ تھی۔ میرے پیروں پر کچھ لیرا گرے۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ اتنے میں شاطر چور اپنا کام کر گیا۔ کچھ دیر بعد جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوا غائب۔ بہت پریشان ہوا اب

میرے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ ہوٹل والے کا بل ادا کر سکتا۔ امریکن ایکسپریس کے سفری چیک جب دیے جاتے ہیں تو علیحدہ سے ایک رسید بھی دے دی جاتی ہے۔ جس سے چیک کھو جائیں تو ان کے بدلے دوسرے چیک مل سکتے ہیں۔ چناں چہ پہلے تو میں نے پولس میں رپورٹ لکھوائی۔ حالاں کہ بٹوا ملنے کی امید بہت کم تھی۔ پھر امریکن اکسپریس کے دفتر گیا وہاں رسید دکھائی جو الگ رکھی ہوئی تھی اور سارا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ دوشنبہ کو آیئے۔ آج سنیچر ہے آج یہ کام نہیں ہو سکتا۔ پھر میں دوشنبہ کو جاکر دوسرا چیک لے آیا۔ نیپلز کا پھیرا بہر حال کر لیا۔ دوپہر کو گیا اور رات کو واپس آگیا وہاں اقتدار حسن سے ملنا چاہتا تھا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔

روما سے ۲۷ اپریل کو چلا اور بمبئی ہوتا ہوا ۲۸ کو صبح دہلی آگیا۔ سہ پہر کی گاڑی سے علی گڑھ پہنچ گیا۔ تقریباً سات مہینے باہر گذرے۔

میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۳ء تک ساہتیہ اکادمی کا ممبر رہا۔ اپنی وفات تک مولانا آزاد اس کے اردو مشاورتی بورڈ کے صدر تھے اور ممبروں میں قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور میں تھے مولانا کے انتقال کے بعد اس بورڈ کا کنوینر مجھے بنایا گیا اور کونسل کے علاوہ اکیڈمی کے اگزکٹو بورڈ میں بھی اردو کے نمائندے کی حیثیت سے لیا گیا۔ میرے زمانے میں جن لوگوں کو ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ ملے۔ ان میں جگر مرادآبادی، مسعود حسن رضوی، فراق گورکھپوری، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، اختر الایمان، حیات اللہ انصاری، امتیاز علی عرشی اور رشید احمد صدیقی قابلِ ذکر ہیں۔ اکیڈمی کا انعام اگرچہ تخلیقی ادب پر ہوتا تھا مگر کسی کے ادب میں اگر تخلیقی شان ہو تو اس کو بھی دیا جاتا تھا۔ جب اکیڈمی نے یہ قاعدہ بنایا کہ جن ممبروں کو پندرہ سال ہو گئے ہیں ان کو دوبارہ منتخب نہ کیا جائے تو میری ممبری بھی ختم ہو گئی۔ بعد میں اردو مشاورتی بورڈ میں مجھے دوبارہ ۱۹۸۱ء میں ممبر منتخب کیا گیا۔

شعبۂ اردو میں اپنی صدارت کے زمانے میں کئی سمینار کرائے۔ ان میں نثر کا اسلوب، تنقید کے بنیادی مسائل، جدیدیت اور ادب، غالب، اردو فکشن اور اقبال پر سمینار قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پہلے اور آخری موضوع کے سوا باقی چاروں موضوعات پر مقالات کو شائع بھی کیا گیا اور انھیں ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ جدیدیت اور ادب پر سمینار کے ذریعے سے ہم عصر ادب کے اس میلان پر خاصی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اقبال پر جو سمینار شروع ہوا تھا اس میں یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ ۱۹۷۷ء میں

اقبال صدی کے موقع پر دہلی میں ایک بین قومی سیمنار کیا جائے اس کے کنوینر بعد میں سردار جعفری بنائے گئے تھے۔

۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پر سیمنار کے مضامین عرفان غالب کے نام سے شایع ہوئے تھے عکس غالب کے عنوان سے میں نے غالب کے اردو خطوط کا ایک انتخاب شایع کیا تھا اس انتخاب میں غالب کے بہت سے اہم خطوط شامل کر لیے گئے تھے۔

۱۹۷۲ء میں کلچرل ایکسچنج پروگرام کے تحت رومانیہ، ہنگری اور سوویت یونین کا سفر ہوا۔ میں اگست کے شروع میں گیا اور ستمبر کے آخر میں کوئی پچاس دن کے بعد واپس آیا۔ پہلے رومانیہ میں ایک ہفتہ پھر ہنگری میں دو ہفتے اور پھر سوویت یونین میں تین ہفتے گذارے۔ رومانیہ کے حسن سے میں بہت متاثر ہوا۔ رومانیہ میں جو حکومت ہے وہ کٹر کمونسٹ لوگوں کی ہے۔ ہنگری میں نسبتاً لبرلزم زیادہ ہے۔ رومانیہ میں میری ترجمان ایک نہایت حسین لڑکی دانا بلڈیمان (DANA BELDIMAN) تھی۔ واقعی یگانۂ روزگار تھی۔ چند روز بعد اسے رائٹرس یونین والوں نے کسی سیمنار میں ترجمانی کے فرائض ادا کرنے کے لیے بھیج دیا۔ پھر دوسری لڑکی ELINA ساتھ رہی۔ یہ لسانیات کی طالبہ تھی۔ اور ہر جگہ میرے ساتھ رہی۔ رومانیہ میں ہندوستان کے سفیر اہوجا اور ان کی بیگم امینہ احمد نے بڑی خاطر کی۔ امینہ روسی کے علاوہ فارسی بھی بہت اچھی جانتی ہیں اور انھوں نے خطاطی اور مصوری میں بھی نمایاں کام کیا ہے۔

ایک ہفتے قیام کے بعد میں بوڈاپسٹ BUDAPEST پہنچا جو ہنگری کا صدر مقام ہے۔ ہنگری چھوٹا سا ملک ہے۔ آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ ہم ہندوستانی ہر سال ہنگری کی آبادی کے بقدر اپنی آبادی میں اضافہ کر لیتے ہیں۔ یہاں دو ہفتے میرا قیام رہا۔ یہاں کے میوزیم دیکھے، یہاں کے ادیبوں سے ملاقات کی۔ یہاں کے رسالے ' نیو ہنگرین کوارٹرلی ' کے ایڈیٹر سے ملا۔ یہ رسالہ انگریزی میں نکلتا ہے۔ خاص طور پر مشہور مارکسی نقاد لوکاچ (LUCAKS) کے شاگردوں سے ملا۔ لوکاچ کا ایک سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ لوکاچ نے چوں کہ ۱۹۵۶ء کی ہنگری کی بغاوت میں باغیوں کا ساتھ دیا تھا اس لیے خروشچیف نے جب اپنے ٹینک بھیج کر ملک پر قبضہ کر لیا تو لوکاچ کچھ عرصے باہر رہا۔ پھر حالات سدھرنے پر واپس آیا۔ اس کی کتاب

STUDIES IN EUROPIAN REALISM

خاصی مشہور ہے۔ رائٹرس یونین کے نمایندوں نے سرکاری پالیسی کے تحت لوکاچ کو گمراہ قرار دے دیا تھا۔ مگر میری ترجمان نے مجھے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں حلقوں کے ادیبوں سے ملنے کا موقع دیا۔ رومانیہ میں سارتر، کامو اور کافکا کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی مگر ہنگری کے کئی ایسے ادیب اور نقاد ملے جو اُن کے قایل تھے۔ ایک خاص بات میں نے یہاں یہ دیکھی کہ سائنس دانوں میں ادب سے گہری دلچسپی تھی اور ادیبوں میں سائنسی نظریات اور علمی میلانات سے۔ شیکسپیر بہت مقبول تھا۔ اس کے ڈراموں کے ہنگری میں اتنے ترجمے ہوئے ہیں کہ ایک ادیب نے تو ہنس کر یہ کہہ دیا کہ شیکسپیر ایک ہنگرین شاعر ہے۔ ایک اور بات لوگوں میں یہ نظر آئی کہ وہ ہندوستان اور اس کی تاریخ سے خاصے واقف تھے۔ میں خاص طور پر اسلامیات کے بزرگ پروفیسر عبدالکریم جرمانوس سے ملا جو اکیاسی برس کے تھے اور اس وقت تک بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں درس دے رہے تھے۔ انھیں یونیورسٹی برابر پانچ پانچ سال کی توسیع دیتی رہتی تھی۔ ویسے ستر سال تک ملازمت کا رواج تھا۔ جرمانوس ہندوستان بھی آئے تھے اور اس سفر میں انھوں نے علی گڑھ کا پھیرا بھی کیا تھا۔ یہیں اُن سے پانچ چھ سال پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ ذاکر صاحب کے بڑے قایل تھے اور اُن کے ساتھ انھوں نے اپنی تصویریں مجھے دکھائیں۔ بوڈاپسٹ میں میں نے کئی ڈرامے دیکھے۔ یہ تھے تو ہنگرین میں مگر ترجمہ کی مدد سے اور لاجواب اداکاری کی وجہ سے میں ان ڈراموں سے کچھ لطف لے سکا۔ میں نے فرمائش کر کے ایک ثانوی اسکول دیکھا تاکہ ہنگری میں ثانوی نظامِ تعلیم کی کچھ واقفیت حاصل کر سکوں۔ ظاہر ہے تعلیم ہنگرین میں ہوتی ہے۔ لازمی مادری زبان کے علاوہ روسی اور ایک غیر ملکی زبان ہے۔ جرمن، فرنچ، اور انگریزی۔ پہلے لوگ جرمن زیادہ لیتے تھے۔ اب انگریزی لیتے ہیں۔ لازمی مضامین کی تعداد خاصی ہے۔ میں نے استادوں سے پوچھا کہ اتنا بوجھ آپ کے طالب علم کیسے برداشت کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بچے کی ذہنی نشوونما اور کسی پیشے یا کام یا اعلیٰ تعلیم کی تیاری کرنے کے لیے اتنی عمومی بنیاد ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ مکانوں کی قلت ہے اسی وجہ سے نوجوان دیر میں شادی کرتے ہیں۔ ہنگری میں مجھے اظہارِ خیال کی خاصی آزادی نظر آئی۔ یہاں کے لوگ مغربی ممالک کی سیر کو بھی جا سکتے ہیں۔ روسیوں کو عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا۔ میں ایک ریستوراں میں کافی پی رہا تھا۔ ریڈیو سے روسی زبان میں کوئی تقریر نشر ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان آیا اور اُس نے سب سے پہلے ریڈیو بند کر دیا۔ کسی نے

کچھ نہ کہا۔ انگریزی اخبار عام طور پر پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ رومانیہ میں یہ بات نہ تھی۔

ہنگری میں ہماری سفیر ایک خاتون (MUTHAMMA) تھیں۔ یہ کیرالا کی رہنے والی تھیں۔ ان سے شملے اور علی گڑھ میں پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس وقت تک روس سے ویزا نہیں آیا تھا اور مجھ سے کہا گیا کہ رومانیہ یا ہنگری میں ہندوستانی سفارت کے ذریعے مل جائے گا۔ بوڈاپسٹ میں سب سے پہلے میں نے اپنی سفیر سے رابطہ قایم کر کے ویزا کے سلسلے میں یاددہانی کر دی تھی۔ انھوں نے ماسکو لکھا۔ بہر حال جانے سے پہلے ویزا آ گیا۔ سفیر نے میری دعوت کی اور خود قیام گاہ تک پہنچانے آئیں۔ ہنگری مجھے واقعی پسند آیا۔

چوں کہ بوڈاپسٹ سے ماینز MAINZ قریب ہے اس لیے میں نے سوچا کہ وہاں ہوتا ہوا اور اپنے لڑکے جاوید سے ملتا ہوا ماسکو جاؤں گا۔ چناں چہ ٹکٹ بدلوائے اور جاوید کو تار دیا۔ اُسے کوئی گھنٹہ بھر میں تار مل گیا اور وہ دوسرے دن فرانک فورٹ کے ہوائی اڈے پر آ گیا۔ چوں کہ روس جانا تھا اس لیے میں ماینز میں صرف دو دن ٹھہرا۔ وہاں وقت نکال کر ہائیڈلبرگ گیا۔ وہ ہوسٹل دیکھا جس میں اقبال کا قیام رہا تھا اور سامنے وہ سڑک جو ان کے نام سے موسوم ہے اور دریائے نیکر کے کنارے ہے۔ یہ دریا شہر کے درمیان بہتا ہے اس کے کنارے ایک پرانا محل ہے جس کا ذکر عطیہ فیضی نے بھی کیا ہے، اس کے باہر چائے پی۔ ہائیڈلبرگ واقعی بڑا خوبصورت شہر ہے۔

تیسرے دن سہ پہر میں ماسکو کے لیے روانہ ہوا اور کوئی دو گھنٹے میں پہنچ گیا۔ ماسکو میں اس وقت ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ اب کے میرا قیام PEKING ہوٹل میں تھا۔ دوسرے دن اتوار تھا اس لیے کہیں نہ جا سکا۔ صرف مریم سلگانیک رائٹرس یونین کی طرف سے ملنے آئیں۔ یہ فیض کی دوست ہیں اور ان سے فیض کا بھی ذکر رہا۔ میں نے ان سے شکوہ کیا کہ پچھلے دنوں اور نٹیل کانگریس میں آیا تھا تو ادیبوں سے ملنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اب کے میں کچھ ادیبوں سے ضرور ملنا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ اسکالروں سے بھی۔ آپ کے یہاں یہ خانے کیوں ہیں۔ دوسرے میں نے ان سے پوچھا کہ ویزا ملنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی جب کہ میرا سفر پہلے ہی رائٹرس یونین کی منظوری سے طے ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے یہاں کے دفتری نظام کا ذکر کیا اور اعتراف کیا کہ واقعی ہماری کچھ مجبوریاں ہیں اور ویزا دینے سے پہلے ایک بار پھر ہیڈ کوارٹر سے دریافت کرنا ضروری ہے۔

مجھے آئے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ ایک صبح دروازہ پر دستک ہوئی۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ کشمیر کے پروفیسر پشپ PUSHPA اور ایک تلگو خاتون ہیں۔ پشپ سے تو ساہتیہ اکیڈمی میں بارہا ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ خاتون تلگو زبان کی ایک شاعرہ تھیں معلوم ہوا کہ یہ بھی اسی سلسلے میں آئی ہوئی ہیں۔ بہر حال ان کا باقی سفر میں ساتھ رہا۔ چند دن بعد پربھاکر ماچوے جو ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری تھے اور ہندی کی ایک شاعرہ درگاوتی بھی آگئیں۔ ہم لوگ LITHUANIA کے صدر مقام WILNUS ساتھ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمیں جارجیا بھیجنے کا خیال تھا مگر پروگرام بدل گیا۔ بہر حال بالٹک کی اس ریاست کے علاوہ وسطی ایشیا کی ریاستوں قزاقستان اور ازبکستان جانے کا بھی موقع ملا۔ لتھوانیا روس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں کے باشندے روس کی بالادستی سے کچھ خوش نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ہندوستان سے دلچسپی خاصی ہے۔ کئی لوگوں نے بہت سے ایسے الفاظ کی نشان دہی کی جو لتھوانیا کی زبان اور ہندوستانی میں مشترک ہیں۔ چند سال پہلے سنیتی کمار چٹرجی، مشہور ماہر لسانیات نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ دراصل آریہ وانگا بیسن سے نہیں بلکہ یورپ کے ان علاقوں سے آئے تھے جن میں اب یہ بالٹک کی ریاستیں واقع ہیں۔ انھوں نے ان مذہبی نظموں کی نشان دہی کی تھی جنھیں داہا کہتے ہیں اور جن کے اثرات اب بھی یہاں کی زبانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں ایک شاعر سے ملاقات ہوئی اور وہ خاصی دیر ہماری معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ وہ APHORISM یا مختصر اور بلیغ شاعری کے علمبردار تھے۔ ان کے ساتھ ہم مینڈرس (MENDRAIS) سے ملنے گئے جو اس ملک کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور لینن انعام یافتہ ہیں۔ ان کے کلام کا ترجمہ بھی ہمیں فراہم کیا گیا۔ یہ شاعری ایک طور پر انسان دوستی کی شاعری تھی اور اس میں عالمی امن پر خاص زور دیا گیا تھا۔ خطابت اس میں بھی خاصی تھی۔

ماسکو واپس آئے تو پربھاکر ماچوے اور ہندی کی شاعرہ درگاوتی بھی ہماری پارٹی میں شامل ہو گئیں۔ پہلے ہم قزاقستان پہنچے جس کا صدر مقام الما آتا ALMA ATA ہے۔ اس کے معنی ہیں سیب کا باپ۔ قزاقستان بہت بڑی ریاست ہے اور اس کے ایک خاص ہوائی اڈے سے روس کے خلائی پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ یہاں کی زبان ترکی ہے۔ ایرپورٹ پر جو لوگ ہمیں لینے آئے تھے ان میں ایک نے اپنا نام ازت بک (AZAT BAK) بتایا۔ میں نے سمجھ لیا

کریہ آزاد بک کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ چناں چہ ان سے فارسی رسم الخط میں اپنا نام لکھنے کو کہا۔ انھوں نے ازت بک لکھا۔ پھر میں نے انھیں بتایا کہ آپ کا اصلی نام غالباً آزاد بک ہوگا۔ ترکی بک فارسی میں آکر بیگ ہو جاتا ہے۔ الما آتا میں برف باری ہو رہی تھی جس کی وجہ سے یہاں کھمبوں اور درختوں پر برف کے ہار لٹکے ہوئے تھے۔ یہاں دو دن ہمارا قیام رہا۔ ایک دن ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ ہندوستان کے نمایندوں نے انگریزی میں تقریریں کیں۔ روسی نمایندوں نے روسی میں۔ اس کانفرنس میں تاجکستان کے ایک ممتاز شاعر مومن قناعت سے ملاقات ہوئی۔ ایک قزاق شاعر سلیمان جن کی کچھ نظموں کا فیض نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ کانفرنس میں اور بعد میں کھانے پر شریک تھے۔ یہاں منگول خیموں کے بیچ پر عمارتیں ہیں۔ کھانے پر دو تین قزاق عورتیں بھی شریک تھیں۔ بعد میں ناچ ہوا۔ مجھ سے بھی شرکت کے لیے کہا گیا مگر میں نے معذرت کرلی۔ شعر و شاعری کا دور بھی ہوا جس میں میں نے اور درگاوتی نے اپنی نظمیں سنائیں۔

الما آتا میں معلوم ہوا کہ چینی مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت سنکیانگ (SINKIANG) سے ہجرت کرکے یہاں آئی ہے۔ قزاقستان اور سنکیانگ کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک شاعرہ بھی تھی۔ میں نے اس سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو وہ ہوٹل آگئی۔ ترجمان کے ذریعے اس سے باتیں کیں، اس کی شاعری سنی اور پھر میں نے اس سے سوال کیا کہ آپ لوگ اپنے وطن سے ہجرت پر کیوں مجبور ہوئے۔ اس نے کہا کہ چینی حکومت میں مذہب کی مخالفت میں بہت شدت ہے۔ مسجدوں پر پابندی ہے۔ یہاں اس کے مقابلے میں مسجدوں میں جانے اور نماز پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے صرف یہ پابندی ہے کہ ہم اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتے کیوں کہ روسی قانون کے مطابق صرف دہریت کی تبلیغ ہو سکتی ہے کسی مذہب کی نہیں۔ ہاں اپنے مذہب پر قائم رہنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہمیں چینی حکومت کے مقابلے میں روسی حکومت زیادہ روادار لگی۔ اس پر مجھے مشہور فارسی مصرعہ یاد آیا ؎

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

الما آتا سے ہم لوگ تاشقند آئے۔ یہاں علی شیر نوائی میوزیم اور لائبریری دیکھی۔ لینن کے مجسمے ہر جگہ نصب تھے۔ کھانے کی میز پر سیخ کباب کا لطف اٹھایا۔ لائبریری میں امیر خسرو کے دیوان کا وہ نسخہ دیکھا جس پر حافظ کے دستخط بتائے جاتے ہیں۔ میں اس کی صحت کے متعلق کچھ

نہیں کہہ سکتا۔ ازبک زبان دراصل ترکی کی ایک شاخ ہے۔ وسط ایشیا کے بیشتر حصے میں ترکی زبان بولنے والے رہتے ہیں۔ صدیوں تک ان کی ادبی زبان فارسی رہی۔ اب فارسی صرف اسکالر جانتے ہیں۔ تاشقند میں مسجدیں بھی ہیں اور مسلمانوں کے مکتب بھی۔ ایک مزار پر بھی میں ہو آیا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت دعا مانگ رہی تھی۔ اس علاقے میں نوجوان بیشتر مذہب سے بیگانہ معلوم ہوئے ہاں بوڑھے ابھی تک اپنی وضع پر چل رہے ہیں۔

مجھے سمرقند اور بخارا دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ حافظ نے اپنے ترکِ شیرازی کے خال پر یہی دونوں شہر نذر کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ بخارا کا پروگرام نہ بن سکا مگر ہم لوگ سمرقند ہو آئے۔ اس کا نیا حصہ تو دوسرے شہروں کی طرح ہے مگر اس کے پرانے بازاروں سے گذرا تو سری نگر کشمیر کی معاشرت نظر آئی۔ سمرقند میں تیمور کے مزار پر گیا اور الغ بیگ کی رصدگاہ بھی دیکھی۔ تیمور کی قبر ایک تہ خانے میں ہے۔ روسی سائنسدانوں نے اس کی ہڈیوں کے ڈھانچے سے اس کے لنگڑے ہونے کی نشان دہی کی ہے۔ یہ سرِ پُر غرور ایک درسِ عبرت کے سوا اور کیا ہے۔ الغ بیگ کی رصدگاہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ یہ امرا صرف تلوار کے دھنی نہ تھے علم کے رسیا بھی تھے۔ سمرقند گو ازبکستان میں ہے مگر تاجکستان کی سرحد یہاں سے قریب ہے۔ یہاں لوگوں کو فارسی بولتے بھی سنا۔ ماسکو میں جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے تھے وہاں پھل کبھی کبھار ملتے تھے۔ یہ پھل سمرقند سے آتے تھے۔ چنانچہ ہم نے سمرقند میں سیب خوب کھائے۔ ہمارے ترجمان نے تو ساتھ لے جانے کے لیے ایک پیٹی سیبوں کی بھی خرید لی۔ گورمیر میں نیلے ٹائلوں کا گنبد ہے جو بڑا خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔ لینن گراڈ کی مسجد بھی اس طرز پر بنائی گئی ہے۔ سمرقند مجھے بہت پسند آیا۔

سمرقند سے ہم شام کو ماسکو کے لیے روانہ ہوئے اور کوئی چار گھنٹے میں ماسکو پہنچ گئے۔ وہاں ایک دن قیام کے بعد مجھے ۲۹ ستمبر کو دہلی کے لیے ایر انڈیا جہاز سے جانا تھا۔ ظ انصاری اور حلیق شفیق سے ماسکو میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ایک دعوت میں فیض سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں یہ خبر گرم تھی کہ وہ ماسکو میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے آنے والے ہیں۔ میں نے اس کے متعلق ان سے پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے تو انھوں نے کہا کہ خبر تو صحیح نہیں ہے مگر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں تو میں خاموش رہتا ہوں۔ یہ خاموشی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم لوگ ایک دن بابا غفوروف سے ملنے

بھی گئے تھے۔ میں نے ان کو اپنی کتاب "تنقید کیا ہے؟" کا نیا ایڈیشن نذر کیا تھا۔ ظ۔ انصاری آخری دن میرے پاس آئے اور اصرار کرنے لگے کہ آپ ایک ہفتے اور ٹھہر جائیے۔ اب آپ رائٹرس یونین کے بجائے روسی اکیڈمی کے مہمان ہوں گے جس کے سربراہ بابا جان غفوروف ہیں۔ ضابطے کا خط آج ٹائپ نہ ہو سکا کل آپ کو مل جائے گا۔ میں نے کہا کہ پروگرام کے مطابق کل میرا ویزا ختم ہو رہا ہے اور مجھے ماسکو چھوڑنا ہے۔ اگر تحریری دعوت نامہ مل جاتا تو میں رک جاتا مگر موجودہ صورت میں جانا ہی بہتر ہو گا۔ بہرحال میں صبح کی فلائٹ سے ہندوستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ فلائٹ تہران ہو کر تھی۔ اس طرح تہران کا ایرپورٹ بھی دیکھ لیا۔ تہران تک پونے دو سو مسافروں کی گنجایش کے ہوائی جہاز میں ہم تین مسافر تھے۔ تہران سے جہاز بھر گیا۔

میں ظ۔ انصاری کے اصرار پر ٹھہر جاتا مگر میں نے سوچا کہ ویزا ختم ہو رہا ہے اور اس کی توسیع تک نہ جانے مجھے کیا کیا دشواریاں اٹھانا پڑیں۔ اس سفر کے شروع میں رومانیہ جاتے ہوئے استنبول کے ہوائی اڈے پر پریشان ہو چکا تھا۔ استنبول ہمارا جہاز صبح گیارہ بجے پہنچا تھا۔ رومانیہ کے لیے فلائٹ رات کے آٹھ بجے تھی۔ جی چاہا کہ کمال اتاترک کی سرزمین کی سیر کر لوں اور کم سے کم مسجد ایا صوفیہ اور باسفورس کی بہار دیکھ لوں۔ ویزا تھا نہیں۔ میں نے PAN AM کے کارکنوں سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ آپ ایرپورٹ سے کوچ لے لیں اور تین چار گھنٹے میں شہر گھوم آئیں۔ چناں چہ میں نے سوچا کہ سامان ٹرانزٹ لاونج (TRANSIT LOUNGE) میں رکھوا دوں اور خود کوچ یا ٹیکسی لے کر شہر چلا جاؤں۔ مگر پولس والوں نے میرا پاسپورٹ ضبط کر لیا۔ وہ یہ سمجھے کہ میں بے قاعدہ اور بغیر ویزا کے ترکی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پولس کے ایک کارکن نے میری قومیت پوچھی، میں نے کہا "ہندوستانی ہوں" اس پر اس کا رویہ اور سخت ہو گیا اور اس نے کہا کہ پاسپورٹ شام کو روانگی کے وقت ملے گا۔ میں نے اپنی کتھا پین ایم (PAN AM) کے اُن کارکنوں کو سُنائی جو اُدھر سے گذر رہے تھے اور جنھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ شہر کی سیر کو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور مجھے اصرار کر کے ایرپورٹ کے ریستراں (RESTAURANT) میں لے گئے اور کہا کہ ہماری کمپنی کی طرف سے لنچ دیا جائے گا۔ لنچ کے بعد کافی آئی۔ بیرے نے پوچھا کہ آپ فرنچ کافی پسند کریں گے یا ترکی کافی۔ میں نے سوچا روما میں ہو تو

رو ما والوں کی سی کرو۔ چناں چہ ٹرکش کافی کا آرڈر دے دیا۔ اس کافی کا ایک گھونٹ لیا تھا کہ غالب کا یہ شعر یاد آگیا ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

کافی اتنی کڑوی تھی کہ بڑی مشکل سے چند گھونٹ حلق میں اتر سکے۔ پھر میں باہر نکلا۔ ایک جگہ سے کچھ ترکی ٹکٹ لفافے خریدے اور علی گڑھ خط لکھے۔ وقت پھر بھی نہ کٹتا تھا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا روانیہ کے اس ہوائی جہاز کے دفتر تک پہنچا جہاں سے شام کو روانگی تھی۔ وہاں ایک ترکی لڑکی ملی۔ اُسے اپنی بپتا سنائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح میرا پاسپورٹ اور سامان دلوا دے جو پولس والوں نے ضبط کر لیا تھا۔ اُس نے مجھے دلاسا دیا۔ مجھے ہوائی اڈے کے ریستراں میں پہنچا دیا اور خود پاسپورٹ حاصل کرنے چلی گئی۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد خوش خوش آئی اور پاسپورٹ میرے حوالے کیا سامان کے متعلق بتایا کہ وہ ہوائی جہاز کے عملے کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ میں نے اُسے بڑی دعائیں دیں۔ کافی پلائی اور تھوڑی دیر بعد TRANSIT LOUNGE چلا گیا جہاں اپنے بیگ سے سفری پاندان نکال کر پان کھایا۔ لاؤنج میں ہنگری کی ایک خاتون اور لبنان کے ایک تاجر سے ملاقات ہوئی۔ کوئی ساڑھے سات بجے ہم لوگ ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہوئے تو دیکھا کہ وہی ترکی لڑکی بورڈنگ کارڈ دے رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور الوداع کہا۔ یہ قصہ اس لیے بیان کرنا ضروری معلوم ہوا کہ اس کے بعد ماسکو میں، میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ بعد میں دہلی کے پربھاکر ماچوے سے اُن کی داستان سن کر اور بھی عبرت ہوئی۔ اُن کا ویزا ختم ہو گیا تھا۔ بلغاریہ کے سفر سے واپس آئے تو ماسکو سے ہوائی جہاز دو دن بعد جانے والا تھا۔ چناں چہ انھیں دو دن تک ایرپورٹ میں ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ کسی سے ملنے کی یا کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ انھوں نے ان سب لوگوں کو ٹیلی فون کیا جن کو وہ جانتے تھے مگر کوئی مدد کو نہ آیا۔ دو دن ایک طور پر نظر بند رہ کر وہ دہلی واپس آگئے۔

۱۹۷۲ء میں مجھے ایک سال کی توسیع ملی تھی۔ اس توسیع کے لیے میں نے کسی سے کچھ نہ کہا تھا۔ میں اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ علیم صاحب مجھے عرصہ دراز سے جانتے ہیں اور میرے کام سے

کبھی اچھی طرح واقف ہیں اس لیے یہ سلسلہ ابھی چلے گا مگر ہوا یہ کہ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر نورالحسن نے جو اُس وقت وزیرِ تعلیم تھے یونیورسٹی کا نیا ایکٹ اس طرح نافذ کرایا کہ اس سے یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبا اور ممتاز مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو شکایت ہوئی۔ اس میں نامزدگی پر زیادہ زور دیا گیا تھا انتخاب پر کم۔ میں بھی اس ایکٹ کو غلط سمجھتا تھا اور میں نے اس سلسلے میں نیشنل ہیرالڈ میں ایک مضمون بھی لکھا تھا جس میں اس پر زور دیا تھا کہ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ بعض ضروری تبدیلیوں کے ساتھ پھر نافذ کیا جائے۔ یہ ایکٹ ۱۹۶۵ء کے واقعات کی وجہ سے چاگلا صاحب کی وزارت میں ختم کر دیا گیا تھا۔ میں نے نئے ایکٹ کی مخالفت ذاتی طور پر ہی نہیں کی اس کو بدلوانے کے لیے اور ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کو ضروری تبدیلیوں کے ساتھ واپس لانے کے لیے یونیورسٹی کی اسٹاف ایسوسی ایشن کے ارکان کے ساتھ وزیرِ تعلیم، وزیرِ اعظم اور صدرِ جمہوریہ سے بھی ملاقات کی نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے دوبارہ توسیع نہ دی گئی اور میں نے ۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ڈاکٹر خورشید الاسلام کو جو اس وقت سینیئر ریڈر تھے چارج دے دیا۔

اب تک میرا معمول یہ تھا کہ کوئی دو بجے تک شعبۂ اُردو میں رہتا تھا اور سہ پہر میں انجمن کے دفتر جاتا اور وہاں انجمن کے کاموں کو دیکھتا۔ سبکدوشی کے بعد میں نے پورا وقت انجمن کو دینا شروع کیا۔ اس وقت انجمن کے صدر پنڈت آنند نرائن مُلّا تھے۔ اُن سے میں نے یہ اشارہ کر دیا تھا کہ انجمن اگر ایک ہزار ماہوار کے لگ بھگ میرے لیے مشاہرے کا انتظام کرے تو میں کل وقتی طور پر انجمن کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ موجودہ صورت میں مجھے زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے ادھر اُدھر دیکھنا پڑے گا۔ احتیاطاً میں نے ڈاکٹر شیاما چرن دوبے ڈائرکٹر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز شملہ کو ایک خط بھی لکھا تھا کہ وہ اگر مجھے وہاں وزٹنگ فیلو مقرر کر دیں تو میں اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر کے موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھنے کے لیے آمادہ ہوں۔ شملے کے اس انسٹی ٹیوٹ کو میں ۱۹۶۶ء میں دیکھ چکا تھا اور ایک سمینار کے سلسلے میں وہاں دس دن قیام بھی کر چکا تھا۔ ڈاکٹر دوبے لکھنؤ یونیورسٹی میں انتھروپالوجی (ANTHROPOLOGY) کے لکچرر رہ چکے تھے اور مجھے اچھی طرح جانتے تھے مگر چونکہ انسٹی ٹیوٹ کی نگرانی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر نورالحسن کے دائرۂ اختیار میں تھی جن کے لائے ہوئے بل کی میں نے مخالفت کی تھی اس لیے میں اس سلسلے میں

زیادہ پُرامید نہ تھا۔ چناں چہ میں نے انجمن کی کل ہند کانفرنس کی تیاریاں شروع کردیں تاکہ اُردو تحریک کو اور فعال بنایا جائے۔ یہ کانفرنس دہلی میں دسمبر کے آخر میں ہونے والی تھی مگر اس زمانے میں ریل کے ملازمین نے ہڑتال کردی اس لیے کانفرنس کو ملتوی کرنا پڑا۔ فروری میں مجھے توسیعی لکچروں کے لیے اورنگ آباد جانا تھا۔ بیوی نے اجنتا اور ایلورا نہیں دیکھے تھے اور حیدرآباد کا ایک اور پھیرا کرنا چاہتی تھیں۔ چناں چہ میں نے آندھرا پردیش کا رخ کیا۔ پہلے ہم لوگ حیدرآباد گئے۔ وہاں سے اورنگ آباد۔ اورنگ آباد سے ایک دن اجنتا اور دوسرے دن خلد آباد اور دولت آباد جس کے درمیان ایلورا کے غار اور مجسمے ہیں۔ واپسی میں بھوپال کے اسٹیشن پر آفاق احمد (جو وہاں حمیدیہ کالج میں لکچرر تھے) ملنے آئے اور انھوں نے بھوپال میں دو ایک دن قیام کے لیے اتنا اصرار کیا کہ ہم لوگ مجبور ہو گئے اور دو دن وہاں ٹھہرے۔ اُن کے کالج میں ایک لکچر دیا اور بھوپال کی سیر کی۔

آخر فروری میں علی گڑھ واپسی پر شملے سے ایک خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ وہاں سال بھر کے لیے میرا وزٹنگ فیلو کی حیثیت سے تقرر ہو گیا ہے۔ پھر بھی میں مُلا صاحب سے ملا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر وہ جنرل سکریٹری کی تنخواہ کوئی ایک ہزار کے لگ بھگ مقرر کرسکیں تو میں انجمن میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے انجمن کی مالیات کے پیشِ نظر مجبوری ظاہر کی اور مجھے یہ مشورہ دیا کہ یہ آفر قبول کرلوں۔ چناں چہ میں نے انجمن سے استعفا دے دیا اور ۲۱ مارچ کو شملے کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں دوسرے دن جوائن بھی کرلیا۔ انجمن کا چارج مُلا صاحب کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹر خلیق انجم کو دے دیا۔ دسمبر ۱۹۵۵ء سے مارچ ۱۹۷۴ء تک کا علی گڑھ کا یہ زمانہ بڑی مصروفیت کا رہا۔ علاوہ شعبۂ اُردو کی صدارت کے انجمن کا کام، پہلے ایس ایس ہال کی پرووسٹی (۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک) اور پھر آفتاب ہال کی پرووسٹی (۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۱ء تک)، فیکلٹی آف آرٹس کی ڈین شپ (۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک)، کلچرل کمیٹی کی صدارت (دو سال تک)، ساہتیہ اکادمی کی مصروفیات، یونیورسٹی کی اگزیکیوٹو کونسل کی ممبری، غرض اس جان حزیں پر بہت بار تھا۔ انتظامی کاموں میں گرفتار ہونا نہ چاہتا تھا مگر ذاکر صاحب اور پھر کرنل بشیر حسین زیدی کے اصرار پر یہ ذمہ داریاں قبول کرنی پڑیں۔ شعبے میں درس و تدریس کے فرائض کے علاوہ ریسرچ کے کاموں کی نگرانی اور

شعبے کے علمی وادبی معیار کو ترقی دینے کی کوششیں تو میرے فرائض منصبی میں تھیں۔ اس زمانے میں 'ہماری زبان' کے لیے ہر ہفتہ اداریہ لکھنا، اُردو ادب مرتب کرنا، کئی سال تک فکر و نظر کی ادارت کرنا یہ سب بھی چلتا رہا۔ اس زمانے میں بھی برابر تنقیدی مضامین لکھتا رہا۔ آل انڈیا یونیورسٹی اُردو اساتذہ کانفرنس کا صدر بھی رہا۔ اور اس کی کانفرنس علی گڑھ میں کرائی۔ روس، افغانستان، امریکہ، انگلستان، جرمنی، اٹلی، رومانیہ، ہنگری اور دو بار سوویت یونین کا سفر بھی ہوا لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مژہ یار کے تشنۂ خون ہونے کا خیال زیادہ رہا اپنی مژگان خوں فشاں کے لیے کم رکھا۔ بہر حال ۱۹۷۲ء میں مضامین کے دو مجموعے "نظر اور نظریے" اور "مسرت سے بصیرت تک" مرتب کر کے مکتبہ جامعہ کو دے دیے۔ یہ ۱۹۷۲ء کے آخر اور ۱۹۷۴ء کے وسط میں شایع بھی ہو گئے۔ مجھے یہ تسکین ہے کہ میری صدارت کے زمانے میں شعبۂ اُردو یونیورسٹی میں اور ملک میں ایک امتیازی مقام حاصل کر چکا تھا۔ میں نے ہی بڑی کوشش کر کے یہاں لسانیات کا شعبہ الگ کرایا ہے۔ پہلے شعبۂ اُردو میں ایک شاخ شروع کرائی تھی۔ میری ہی سفارش پر پروفیسر مسعود حسین خاں کا پروفیسر کی جگہ پر تقرر ہوا۔ ہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر کسی طرح میں یونیورسٹی کے انتظامی کاموں میں زیادہ نہ الجھتا تو اپنے علمی و ادبی کام کو اور آگے بڑھا سکتا۔ میرا یہ ایمان رہا ہے کہ کسی ادارے کو چلانے کے لیے صرف اپنے کاموں میں مصروف رہنا کافی نہیں ہے۔ ساتھیوں اور رفیقوں کو مناسب کاموں میں لگانا اور مجموعی طور پر ایک پورے خاندان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی طرف توجہ کی۔ معیاروں کو مدِّ نظر رکھا۔ اس کی وجہ سے کچھ لوگ جن کو میں ترقی نہ دے سکا مجھ سے بدظن بھی ہوئے مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھا۔ اپنے راستے پر گامزن رہا۔

عام طور پر سلکشن کمیٹیوں میں میری بات مان لی جاتی تھی کیونکہ یہ صلاحیت کی بنا پر ہوتی تھی مگر ایک دفعہ ایسا نہ ہوا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی بہت اچھے استاد تھے۔ اُن کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے شایع ہو چکے تھے۔ ناصر کاظمی، ابن انشا، اور خلیل الرحمٰن اعظمی تینوں کی شاعری کی، میر کے اثرات کی وجہ سے جدید غزل میں اہمیت بھی مسلم ہو چکی تھی۔ مگر جب شعبۂ اُردو میں پروفیسر کی ایک جگہ نکلی تو اُن کا تقرر نہ ہو سکا حالانکہ میں نے اس کی پُر زور سفارش کی

تھی۔ کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ یونیورسٹی نے انھیں مرنے کے بعد پروفیسر بنایا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بی۔ اے کی تعلیم کے زمانے میں آتش پر کچھ مضامین لکھے تھے جو نگار میں شائع ہوئے تھے۔ نیاز صاحب سمجھتے تھے کہ یہ کوئی پختہ کار ادیب ہوں گے۔ مگر جب اس نوجوان کو دیکھا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اس حیرت کا اظہار بعد میں انھوں نے مجھ سے کیا بھی تھا۔ انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے جو مقالہ لکھا تھا اس میں ترقی پسند تحریک کا تنقیدی جائزہ لیا گیا تھا۔ مجنوں گورکھپوری نے اس مقالے کی بڑی تعریف کی تھی۔ ان کو خون کا کینسر ہو گیا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر رہی ہوگی۔ انھوں نے نہ صرف کلاسیکی اردو ادب کا ہی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا بلکہ ہم عصر ادب کے ہر رنگ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ خصوصاً رسالوں میں جو اہم تخلیقات شایع ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے متعلق ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔ میری ادارت کے دور میں ان کے بہت سے فکر انگیز مضامین ہماری زبان میں شایع ہوئے تھے۔ نئی شاعری کا سفر کے نام سے انھوں نے اردو شاعری کا ایک بہت اچھا انتخاب بھی کیا تھا جو مکتبہ جامعہ نے شایع کیا تھا۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں ہمارے جدید شاعری کے ایک اہم رنگ کی ترجمان اور ان کی تنقید ایک فن کار کی تنقیدی بصیرت کا بڑا قابلِ قدر نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔

میرا ایک شعر ہے

دنیا بڑی ہے اس کے مسایل بڑے بڑے
اس مخمصے میں بھول گیا اپنے گھر کو میں

یہ بات ان معنوں میں بھی صحیح ہے کہ اپنی منصبی، علمی و ادبی مصروفیات کے چکر میں میں نے عرصے تک کوئی مکان بنانے کی فکر نہ کی تاکہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ بہرحال بیوی کے اصرار پر ۱۹۷۴ء کے شروع میں مکان کا نقشہ بنوایا۔ زمین بہت پہلے دودھ پور میں لے لی تھی وہ بھی اپنے دوست عظمت الٰہی زبیری رجسٹرار مسلم یونیورسٹی کی عنایت سے۔ اب مکان بنانے کا خیال آیا تو شملے جانا نکل آیا۔ شملے میں یہ آسانی تھی کہ ساڑھے تین مہینے کی تعطیل یکم دسمبر سے ۱۵ مارچ تک ہوتی تھی۔ جولائی میں بھی پندرہ دن کی تعطیل ہوتی تھی۔ بہرحال ۱۹۷۵ء کے شروع سے مکان کی

تعمیر شروع کی ۔ میرے دوست محمد اویس یونیورسٹی انجینیر نے نگرانی کی ۔ جون کے وسط تک میں اپنے مکان میں منتقل ہو گیا ۔ چوں کہ ان معاملات کا تجربہ نہ تھا اس لیے مکان تو خاصا بڑا بنوا لیا مگر بیوی کی خواہش کے مطابق باغ نہ لگا سکا ۔ چناں چہ میرا مکان اب بھی نہ تو جدید سہولتوں سے آراستہ ہے اور نہ خوبصورت کہا جا سکتا ہے ۔ مجیب صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے ایک خط میں پوچھا تھا کہ آپ کے یہاں لان میں پھول کھلے ہیں یا نہیں ۔ وہ چند سال پہلے آئے تھے تو اس طرف توجہ دلائی تھی اور یہ بات انھیں بعد میں بھی یاد رہی ۔ افسوس ہے کہ خواہش کے باوجود اب تک اس سلسلے میں میرا خانہ خالی ہے ۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی یک طرفہ رہی ، علمی و ادبی کاموں ، یونیورسٹی کے معاملات ، تعلیمی و تہذیبی مسائل پر سارا وقت صرف کر دیا ۔ گھر کی دیکھ بھال اور ٹھکانے سے رہنے پر توجہ نہ کی اب تو پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے پھر بھی جو ہو سکا کروں گا ۔

شملہ

شملہ سمندر کی سطح سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک خوبصورت پہاڑی مقام ہے سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں جب چند ساتھیوں کے ساتھ مسوری سے شملے پیدل گیا تھا تو یہاں دو دن ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ اُس زمانے میں یہاں لوگ رکشا میں شہر کی سڑکوں پر نظر آتے تھے ، رکشا قلی کھینچتے تھے ۔ شملے میں ہموار زمین کم ملے گی ۔ کسی جگہ جانا ہو تو چڑھنا اترنا پڑے گا ۔ دوسری دفعہ ۱۹۶۶ء میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے ایک سمینار میں گیا تھا ۔ یہ انسٹی ٹیوٹ سمر ہل پر ہے جو شملے سے کوئی پانچ سو فٹ بلند ہے ۔ پہلے یہ والیسریگل لاج کہلاتی تھی اور والیسرائے یہاں اپریل سے ستمبر تک قیام کرتے تھے ۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن جب صدر ہوئے تو انھوں نے یہ عمارت قوم کو دے دی اور یہ طے کیا کہ یہاں اعلیٰ تحقیق کا ایک ادارہ پرنسٹن PRINCETON یونیورسٹی کے طرز پر بنایا جائے ۔ میں جب پہلی اپریل ۱۹۷۴ء کو یہاں پہنچا تو میرا قیام ڈیل ویل DELVILLE میں رہا ۔ اس میں چار فیلو رہتے تھے ۔ یہ عمارت بوا لیو گنج کے

بازار سے قریب ہے۔ کوئی ایک میل اوپر چڑھ کر ہم لوگ روزانہ انسٹی ٹیوٹ جاتے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ایک چوٹی پر واقع ہے اور وہاں سے میلوں تک پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ عمارت غالباً ۱۸۰۱ء میں تیار ہوئی تھی مگر اس کی دیکھ بھال آزادی کے دور میں ٹھیک سے نہ ہو سکی اس شاندار عمارت میں لکڑی کے جو پینل ہیں وہ برما کے ساگون کے ہیں۔ یاد پڑتا ہے کہ میرے قیام کے زمانے میں برطانیہ کے ہائی کمشنر فری مین FREEMAN آئے۔ یہ نیو اسٹیٹس مین مشہور ہفتہ وار انگریزی اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ عمارت کے متعلق تو انھوں نے کچھ نہ کہا ہاں اس پینل کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ کے ہندوستان چھوڑنے کا اتنا رنج نہ تھا جتنا اس شاندار ساگون کے ہاتھ سے جانے کا۔

شملے میں مشہور آرٹسٹ امرتا شیر گل کے چرچے اکثر سننے میں آئے یہ مشہور آرٹسٹ جوانی ہی میں فوت ہو گئی۔ اس کے غیر معمولی حسن اور غیر معمولی کمالِ فن دونوں کے پرستار شملے میں اس وقت بھی موجود تھے۔ اس زمانے میں مشہور انگریزی مصنف مالکم میگرج MALCOM MUGGERIDGE کی خود نوشت سوانح عمری پڑھی جس میں انگریزوں کے زمانے میں شملے کی رونق اور امرتا شیر گل دونوں کا پر لطف تذکرہ ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر نہار رنجن رے تھے۔ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ لکھنؤ میں ان کا ساتھ رہا تھا۔ میرا بڑا احترام کرتے تھے۔ فیلو تین طرح کے تھے، کچھ مستقل، ان کی تعداد چار تھی۔ وزٹنگ فیلو میری طرح، جو ایک یا دو تین سال کے لیے آئے تھے۔ اس کے علاوہ گیسٹ فیلو یا مہمان فیلو بھی تھے۔ یہ لوگ عام طور پر گرمی میں مہینے دو مہینے کے لیے آتے تھے۔ ان کے قیام کا انتظام انسٹی ٹیوٹ میں ہوتا تھا اگرچہ ایک کینٹین بھی تھی مگر اس کا انتظام تسلی بخش نہ تھا۔ فیلو حضرات میں سبھاش ملک، نثمون، لوکھنڈوالا، وی وی جان، مشہور کنڑ شاعر اڈیگا، مشہور مراٹھی شاعر ریگے، مشہور ہندی ناولسٹ نرمل ورما، ہندی ادیب پربھاکر ماچوے، تاریخ کے بی بی مصرا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے سیمیناروں میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں فلسفے کے استاد دیا کرشن، کنڑ ناولسٹ اننت مورتی، پنجابی ادیب عطر سنگھ، بنگالی شاعر بدھ دیو بوس، بنگالی ادیب آنند شنکر رے کے نام یاد آتے ہیں۔ ہر ہفتے جمعرات کو ایک میٹنگ میں

کرنی تھی کوئی فیلو اپنے مضمون پر مقالہ پڑھتا تھا جس پر بحث ہوتی تھی ۔ سال میں تین چار سمینار ضرور ہوتے تھے ۔ ایک ڈاکٹر ہربنس سنگھ فیلوز کی دیکھ بھال کے لیے تھے ۔ یہ بہت اچھے ڈاکٹر اور بہت اچھے انسان تھے ۔ ایک دفعہ میری نواسی "تابندہ" خاصی بلندی سے گر گئی ۔ غنیمت یہ ہوا کہ وہ جھاڑیوں میں گری ورنہ خدا جانے کیا ہوتا ۔ ڈاکٹر ہربنس سنگھ نے اس کا بڑی جاں فشانی سے علاج کیا اور وہ چند دن میں ٹھیک ہو گئی ۔

ڈیل ویل (DELVILLE) جہاں ہمارا قیام تھا ایک پہاڑی کے سرے پر تھی اس کے نیچے وہ سڑک تھی جو سمر ہل اسٹیشن کو جاتی تھی ۔ سامنے ایک پہاڑی سلسلہ تھا ۔ کالکا سے شملہ ایک چھوٹی ریل سے آتے ہیں پورے راستے میں جو ۸۹ کلومیٹر کا ہے کوئی سو چھوٹی بڑی سرنگیں ہیں ۔ ریل کی پٹری سامنے کے پہاڑ سے اترتی گھومتی ہوئی ہمارے مکان کے پاس سے گذرتی تھی ۔ رات میں جب کوئی ریل گاڑی گذرتی تو معلوم ہوتا تھا کوئی اژدہا جس کے سارے جسم سے شعاعیں نکل رہی ہیں بل کھاتا ہماری طرف بڑھا چلا آتا ہے ۔ شام کا منظر اکثر بہت روح پرور ہوتا ۔ پہاڑوں میں شفق کے بدلتے ہوئے رنگ بڑے دل فریب ہوتے ہیں ۔ شملے کے شفق پر میں نے اس زمانے میں ایک نظم بھی لکھی تھی ۔

شملے پہنچ کر اس بات سے مسرت ہوئی کہ یہاں اردو کا خاصا چرچا ہے ۔ سرکاری زبان ہندی ہے مگر اردو کو دوسری زبان کہا جا سکتا ہے کیوں کہ سہ لسانی فارمولے میں لازمی طور پر ہندی، انگریزی اور اردو پڑھائی جاتی تھی ۔ ہماچل کی پرانی ریاستوں میں اردو سرکاری زبان رہی تھی ۔ جب ہماچل پردیش وجود میں آیا تو یشونت سنگھ پرمار وزیر اعلیٰ ہوئے ۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے انتھروپالوجی میں پی ۔ ایچ ڈی کیا تھا ۔ سرمور ریاست کے رہنے والے تھے ان کی تقریریں اردو میں ہوتی تھیں گرمی میں مشاعرے ہوتے تھے جس میں شملے کے باسی بڑے شوق سے شریک ہوتے ۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ کئی دکانوں پر اردو بورڈ تھے ۔ بہت سے دکان داروں کو اردو کا اخبار ہند سماچار پڑھتے دیکھا ۔ میرے پہنچنے کے ایک مہینے بعد انسٹی ٹیوٹ میں میری شاعری کا ایک پروگرام ہوا جس میں کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک میں نے اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں ۔ میرا پہلا لکچر بھی جو جدیدیت اور اردو شاعری کے امتیازات پر تھا بہت پسند کیا گیا ۔ شملہ میں انسٹی ٹیوٹ کے فیلوز کے علاوہ دہلی کے دیال اور ان کی

جرمن بیوی ہیڈا (HEDA) ہماچل یونیورسٹی کے کئی استاد اور شہر کے کچھ لوگ بھی انسٹی ٹیوٹ کے ہفتہ وار جلسوں اور سمیناروں میں شریک ہوتے تھے۔ دیال دہلی کے کسی بڑے خاندان کے فرد تھے۔ اور سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد شملے میں ہی مکان بنالیا تھا۔ ان کی جرمن بیوی ہیڈا نے انگریزی میں اپنی خود نوشت لکھی تھی جسے پڑھنے کا مجھے بھی موقع ملا۔ وہ ہٹلر کے زمانے میں جرمنی سے ہندوستان آئی تھیں۔ ڈیل ویل میں برابر سبھاش ملک، اُن کی پارسی بیوی زریں اور اور یز شموئن نوکھنڈ والا رہتے تھے۔ ملک انتھروپالوجی کے اسکالر تھے۔ شموئن عربی کے۔ انھوں نے آکسفورڈ سے گب کی نگرانی میں ڈی فل کیا تھا۔ سال بھر کے بعد سید زیدی اور اُن کی بیوی جوڈتھ کیرول (JUDITH CAROL) بھی آ گئے۔ سید زیدی کرنل بشیر حسین زیدی کے صاحبزادے تھے۔ ذہین اور صاف گو۔ نوجوانی میں اُن کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ جوڈتھ مشہور امریکن شاعرہ سلویا پلاتھ (SYLVIA PLATH,) پر YALE سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکی ہیں۔ اب کنٹر کی نظموں کا جنھیں وچن کہا جاتا ہے ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔

شملے کے قیام سے میرا مطالعہ بھی بڑھا اور بہت سے ادیبوں شاعروں اور اسکالروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ان میں پروفیسر دیا شنکر واسقے کے، نہار رنجن رائے تاریخ کے۔ کے۔ اے۔ ایس۔ آئینگر انگریزی کے، سچیدانند مورتی فلسفے کے، نرسمہا راؤ انگریزی کے اور کپیلا واتسائن ہندوستانی آرٹ کی اکسپرٹ تھیں۔ واتسائن اور ہری ونش بچن، گنیندر پربھاکر ماچوے، نرمل ورما ہندی کے ممتاز ادیب تھے۔ واتسائن کچھ الگ تھلگ رہتے تھے مگر ادبی بات چیت میں صاف اور واضح الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ سیسر کمار گھوش ٹیگور کے قائل اور اروندو کے بھگت تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا مگر سمیناروں میں اکثر اختلاف کا موضوع بنتے تھے۔ ڈاکٹر شیاما چرن دوبے خود انتھروپالوجی کے بہت اچھے اسکالر تھے۔ ان کی بیوی لیلا تو میری بہن بنی ہوئی تھیں۔ وی۔ وی جان ان سب میں اپنی تیز طرار طبیعت، انگریزی ادب کے مطالعے اور اعلیٰ تعلیم کے مسائل پر نظر کی وجہ سے بڑے مقبول تھے۔ سدھیر چند تاریخ کے فیلو تھے۔ یہ اور ان کی بیوی کسم کھلے ذہن کے اور ملنسار لوگ تھے۔ تاریخ میں رام پور کے اے۔ آر۔ خاں، ہندی کے مشہور ادیب جینندر کمار، ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر گری لال جین، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سیاست کے استاد رشید الدین خاں

سے بھی اُسی زمانے میں ملاقاتیں ہوئیں۔ کرشنا کرپلانی جو ساہتیہ اکاڈمی کے سکریٹری رہے تھے کئی مہینے انسٹی ٹیوٹ کے مہمان رہے تھے۔ یہ مولانا آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری رہ چکے تھے اور مولانا کے بہت قایل تھے۔ ان سے مولانا کی آخری دور کی بہت سی باتوں کا علم ہوا۔ جوشؔ کے سلسلے میں کرپلانی نے بتایا کہ وہ کراچی میں ابو طالب نقوی سے بہت سی مراعات کا وعدہ لے کر پاکستان ہجرت کے لیے آمادہ ہو گئے۔ پھر دلی آکر جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد سے پوچھا کہ وہ کیا کریں۔ پنڈت جی نے تو یہ کہا کہ اگر وہ بچوں کے مستقبل کی طرف سے پریشان ہیں تو چھ مہینے پاکستان میں قیام کریں مگر چھ مہینے ہندوستان میں ضرور رہیں۔ مولانا نے کہا کہ میرے پاس پاکستان ہائی کمیشن سے آپ کے متعلق رپورٹ آچکی ہے جس سے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ سب کچھ طے کر کے پاکستان سے آئے ہیں پھر مجھ سے کیا مشورہ چاہتے ہیں۔ اب تو آپ کے لیے وہاں جانا ہی مناسب ہے۔ اس پر جوشؔ مولانا آزاد سے خفا ہو گئے۔ یادوں کی برات میں انھوں نے مولانا کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُسے اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ جوشؔ ابو طالب نقوی کے کہنے اور بہت سی مراعات کے وعدے پر وہاں گئے۔ مگر انھیں وہاں وہ سب مراعات نہ ملیں جن کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں جگرؔ کا کردار یہ ہے۔ مشاعروں کے سلسلے میں اکثر پاکستان جایا کرتے تھے اور فضل احمد کریم فضلی انھیں مہینوں کے لیے روک لیتے تھے۔ جس زمانے میں ناظم الدین وہاں برسرِ اقتدار تھے تو انھوں نے جگرؔ صاحب سے کہا کہ آپ مستقل طور پر پاکستان آجایئے۔ اخبار جنگ کے لیے کبھی کبھار کچھ اشعار لکھ دیا کیجیے گا اس طرح ایک معقول مشاہرے اور مکان کا انتظام ہو جائے گا۔ مگر جگرؔ راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں پاکستان مشاعروں میں اور احباب سے ملنے آتا رہوں گا مگر میرا مستقل قیام ہندوستان میں ہی رہے گا۔

شملے میں اُردو کا خاصا چرچا تھا۔ وزیرِ اعلیٰ پرمار نے جون میں سالانہ مشاعرے کا افتتاح کرتے ہوئے بڑی شستہ اُردو میں تقریر کی تھی۔ مشاعرے کے صدر لال چند پرارتھی۔ چاند کلوی تھے جو ریاست کے وزیر تھے۔ ہماچل کے شعرا میں شباب للت، کرشن کمار طور، ارمان شہابی، راجیش کمار اوج، دھرم پال عاقل لاہوری قابلِ ذکر ہیں۔ شملے کی ایک خاص شخصیت شیخ عبدالمجید تھے۔ یہ سنجولی میں رہتے تھے جو شملے سے کوئی ایک دو میل کے فاصلے پر ہے۔ روزانہ مال روڈ پر نظر آتے

انھوں نے اپنی کتابوں کا خاصا قیمتی ذخیرہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کی نذر کر دیا تھا کتابیں زیادہ تر انگریزی ادب اور اسلام سے متعلق تھیں۔ پکے قوم پرست تھے۔ ہریانہ اور ہماچل کے وقف بورڈ کے لیے انھوں نے خاصا کام کیا تھا۔

انسٹی ٹیوٹ میں میرے زمانے میں جو سیمینار ہوئے ان میں فلسفے میں انسان کا تصور اور ادب میں انسان کا تصور قابلِ ذکر ہیں۔ میں نے دونوں میں مقالے پڑھے تھے جو خاصے پسند کیے گئے۔ دوسرے سیمینار کا جو اکتوبر ۱۹۷۵ء میں ہوا کنوینر میں ہی تھا۔

شملے میں ہر آٹھویں دسویں کسی فیلو کے یہاں دعوت ہوتی۔ کھانے کے بعد اکثر شعر و شاعری کا دور چلتا۔ میری ایک نظم سب ساتھیوں کو اتنی پسند آئی تھی کہ اس کی ہر محفل میں فرمائش ہوتی۔ میں نے کسی نشست میں دانشوری کا زوال پر ایک نظم لکھی تھی جس میں ایک شعر میں اقبال سے استفادہ بھی تھا شعر یہ ہے ؎

آہوانِ دشت کو دیتے تھے جو درسِ خرام
وہ بھی شاہی اصطبل کی آبرو بنتے گئے

اس زمانے میں ایک حلقے میں انسٹی ٹیوٹ پر یہ اعتراض ہو رہا تھا کہ یہاں گرمیوں میں بہت سے ادیبوں کو اس لیے بلایا جاتا ہے کہ ان کے قلم کی نوک کچھ مدھم ہو جائے۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کے کچھ افسر بھی آیا جاتے تھے۔ چناں چہ ڈاکٹر دوبے سے کسی نے شکایت کی کہ سرور صاحب نے انسٹی ٹیوٹ کو شاہی اصطبل کہا ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں نے یہ نظم دو تین سال پہلے علی گڑھ میں لکھی تھی وہ ادب شناس تھے اس لیے خاموش ہو گئے۔

شملے میں تفریحی پروگرام آس پاس کے کسی پہاڑی مقام وائلڈ فلاور ہال، کفری، فاگو، نالدہرا تک ہی محدود رہے۔ کلو اور منالی جانے کا اشتیاق ہی رہا۔ پہاڑ کے معنی میرے نزدیک برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں، گنجان پائن کے درختوں اور پر شور پہاڑی نالوں کے ہیں۔ شملے میں برف آخر دسمبر سے فروری تک پڑتی تھی۔ پائن کے جھنڈ ضرور تھے مگر سب سے قریب دریا، ستلج کوئی ساٹھ ستر میل دور تھا۔ شملے میں ویسے بھی پانی کی کمی گرمیوں میں ضرور ہو جاتی تھی۔ شملہ اور اس کے مضافات چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر مشتمل ہیں۔ سسل ہوٹل کے سامنے کچھ ہموار سڑک تھی اسے چوڑا

میدان کہا جاتا تھا۔ شملے کی مال کے سامنے رج تھی۔ یہاں بھی ایک ہموار قطعۂ زمین تھا باقی سارے حصے میں چڑھنے اترنے گذرتی تھی۔ ہماچلی گانے بجانے کے شوقین ہیں۔ اکثر مرد شراب پیتے ہیں۔ عورتیں ان کے مقابلے میں جفاکش اور تندرست ہیں۔ زیادہ تر کام یہی کرتی ہیں۔ اردو کے بہت سے ادیب اور شاعر صرف اردو کے ماحول میں مگن ہیں۔ ایسے لوگ کم ہیں جن کا سابقہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں سے بھی رہا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان میں سے بیشتر صرف اردو سے واقف ہیں یا ایک حد تک اپنے علاقے کی سرکاری زبان سے۔ اردو کے ایسے ادیب کم ہیں جن کے ذاتی مراسم دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں سے ہوں۔ میرا تجربہ خوش قسمتی سے اس عام روش سے مختلف رہا ہے۔ اسکول کے زمانے میں مشرقی یوپی میں گنتی کے چند مسلمان طلبا میں تھا۔ میری دوستی بھی مسلمان طالب علموں سے زیادہ ہندو طالب علموں سے رہی۔ کچھ غیر مسلم استاد بھی ایسے ملے جن کی شفقت اور محبت آج تک یاد ہے۔ اسکول کے بعد ایک کرسچین کالج میں چار سال تعلیم پائی۔ وہاں بہت سے عیسائی استادوں اور طالب علموں سے ربط ضبط رہا۔ کچھ انگریز استادوں سے بھی۔ علی گڑھ کے بعد لکھنؤ گیا تو وہاں ایسی دنیا پائی جو علی گڑھ سے وسیع تھی اس زمانے میں یونیورسٹی کے استادوں میں کچھ ہندوستان کے چوٹی کے عالم اور اسکالر تھے۔ یہ زیادہ تر مدراس، بنگال اور پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ میں لکھنؤ میں صرف اردو دنیا میں اسیر نہ رہا۔ ہندی کے ادیبوں اور اسکالروں، انگریزی کے استادوں، اقتصادیات، سیاسیات، نفسیات، تاریخ، سائنس کے استادوں سے ملنا ہوتا رہا۔ فارسی، عربی اور اردو کے استادوں میں پروفیسر وحید مرزا، پروفیسر مسعود حسن رضوی، احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی جیسے لوگ تھے۔ مگر ان میں صرف احتشام حسین کا ربط ضبط دوسری زبانوں اور دوسرے شعبوں کے استادوں سے تھا۔ میں نے علم و ادب کے علاوہ استادوں اور طالب علموں کے مسائل میں بھی دلچسپی لی۔ پھر علی گڑھ آیا۔ علی گڑھ کی علمی فضا بہر حال لکھنؤ کی علمی فضا کے مقابلے میں محدود تھی۔ چناں چہ علی گڑھ سے سبکدوش ہونے کے بعد شملے کے انسٹی ٹیوٹ میں مختلف علوم کے ماہرین اور مختلف زبانوں کے ادیبوں سے مل کر ایک وسعت ذہنی کا احساس ہوا۔ شملے کے انسٹی ٹیوٹ میں مختلف علوم کے علاوہ علمی و ادبی رسالوں کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ نئی کتابوں کا اضافہ برابر ہوتا رہتا تھا۔ چناں چہ شملے کے قیام کے

زمانے میں ایک طرف میں نے اپنے ادبیات کے مطالعے کو وسعت دی۔ دوسری طرف عالمی ادب کے فن کاروں سے اور گہری واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تیسری طرف سمیناروں اور ہفتہ وار لکچروں کے مباحث میں بہت کچھ سیکھا۔ شاید ٹیلرسن کا قول ہے کہ "وہ انگریزی ادب کو کیا جانتا ہے جو صرف انگریزی ادب کو جانتا ہے۔" میرے خیال میں یہ بات بہت پتے کی ہے۔ اردو ادب کا عرفان حاصل کرنے کے لیے ہمیں اردو کے علاوہ فارسی ادب، ہندی ادب اور انگریزی ادب کا علم ہونا ہی چاہیے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی ادبیات کے جدید میلانات کا بھی۔ ادبی تخلیق ایک خاص فضا میں وجود میں آتی ہے اور یہ فضا اتنی اکہری نہیں جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں ادیبوں اور ادب کے طالب علموں کے لیے دو دشواریوں کا سامنا ہے۔ ایک طرف آزاد ہندوستان میں اردو زبان کے ساتھ بے انصافی اور اردو زبان کو نظر انداز کرنے کی صریح کوشش جو صرف اہلِ سیاست کی طرف سے نہیں بلکہ شمالی ہند کی اکثریت کی طرف سے بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ دوسری دشواری خود اردو والوں کی پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے یہ بھلا دیا کہ کلاسیکی دور میں جو بُرا بھلا نظامِ تعلیم تھا وہ اگرچہ جانو، یاد کرو اور دہراؤ (LEARN REMEMBER AND REPEAT) کے اصول پر تھا مگر اس میں ایک بنیادی مضبوطی ضرور تھی۔ وہ ایسا ایک طرفہ بھی نہ تھا۔ جدید تعلیم اپنے سارے دعووں کے باوجود بیدار ذہن پیدا نہیں کر رہی ہے۔ قدروں کا احساس نہیں دے رہی ہے اور علوم کے سلسلے میں ایک کھلی نظر عطا نہیں کر رہی ہے۔ سطحی عام تعلیم کے بعد وہ اختصاص کی طرف لے جاتی ہے۔ اس طرح بقول ایلیٹ کے وہ معلومات زیادہ عطا کرتی ہے۔ علم کم اور اگر علم بھی دیتی ہے تو دانش مندی (WISDOM) نہیں دیتی۔ میں اختصاص کی طرف مائل نہ ہو سکا۔ لیکن علم کی دانش مندی اور ادب کی قدر شناسی کا راز داں ہونے کی کوشش ضرور کرتا رہا۔ لکھنؤ پھر شکاگو یونیورسٹی، پھر شملے نے اس سلسلے میں مجھے بہت کچھ دیا۔

جولائی ۱۹۷۶ء میں شملے کے قیام کے زمانے میں ڈاکٹر گیان چند کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میر انقرر الٰہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا ہے اور میں نے وائس چانسلر کو یہ مشورہ دیا ہے کہ جموں یونیورسٹی سرور صاحب کو دو یا تین سال کے لیے اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے بلا لے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ وائس چانسلر ایک میٹنگ کے سلسلے میں شملے جا رہے

ہیں۔ آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں آپ ضرور اُن سے مل لیں۔ میری عمر اُس وقت ۶۴ برس کی ہونے والی تھی۔ دو یا تین سال کے لیے یہ آفر دلکش معلوم ہوا۔ شملے میں تو زیادہ قیام کا سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ جب وائس چانسلر آئے تو میں اُن سے ملا۔ انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں جموں آجاؤں اور میں نے سب پہلوؤں پر غور کر کے انھیں جلد جواب دینے کا وعدہ بھی کر لیا۔ جب اُن کا باقاعدہ تقرر کا پروانہ آیا تو ہامی بھر لی۔ مگر چند روز بعد سید رضی الحسن چشتی وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کا ٹیلیفون آیا کہ کشمیر یونیورسٹی میں ایک اقبال چیر قایم ہو رہی ہے اور وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ سرور صاحب کشمیر آجائیں۔ انھوں نے ذاتی طور پر بھی مجھ سے اس پیش کش کو قبول کرنے کے لیے اصرار کیا۔ چشتی میرے سینٹ جانس کالج کے پرانے ساتھی اور دوست تھے۔ میں نے اُن سے جموں یونیورسٹی کی پیش کش کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ شرما صاحب کو میرے کشمیر جانے پر راضی کر لیں گے۔ تقرر ۱۹۷۷ء کے نئے تعلیمی سال سے تھا۔ میں حسب معمول شروع دسمبر میں علی گڑھ آگیا۔ اور یہیں مجھے کشمیر کے تقرر کا پروانہ بھی ملا۔ پھر جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا یہ اصرار ہوا کہ میں مارچ میں جموں آؤں اور دو تین مہینے وہاں کام کر کے سری نگر جاؤں۔ میرے لیے اس میں زحمت تھی۔ بہرحال کشمیر کی کشش جموں پر غالب آئی۔ اس سے پہلے ۱۹۶۹ء میں خواجہ غلام محمد صادق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر نے ایک ملاقات میں یہ کہا تھا کہ میں جموں یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر آجاؤں۔ مگر میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ کشمیر یونیورسٹی کا سوال ہوتا تو میں ضرور یہ پیش کش قبول کر لیتا۔ میرے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کی بات بھی چلی تھی مگر ۱۹۶۹ء کے ستمبر میں مجھے شکاگو یونیورسٹی جانا تھا جہاں مجھے وزٹنگ پروفیسر بنایا گیا تھا۔ میں نے صادق صاحب کو اس کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ صادق صاحب کا دسمبر ۱۹۷۱ء میں انتقال ہو گیا اور یہ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ اس میں کچھ یارانِ نجد کی مہربانی بھی شامل تھی۔

میں ۱۹ مئی ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ سے چلا۔ دوپہر کو دلی سے جموں کی گاڑی لی اور دوسرے دن صبح کوئی نو بجے جموں پہنچا۔ چوں کہ لمبے قیام کے لیے جا رہا تھا اس لیے سامان بھی خاصا ہو گیا تھا۔ جموں سے ایک ٹیکسی لے کر میں ۲۰ مئی کی شام کو سری نگر پہنچا۔ چشتی اور رحمان علی خاں ٹورسٹ سنٹر پر مجھے لینے کے لیے آگئے تھے۔ چشتی کے گھر پر ایک ہفتہ قیام رہا۔ پھر کیمپس کے

پروفیسر کوارٹر میں آگیا۔ ۲۱ مئی کو میں نے اس نئے عہدے کا چارج لے لیا۔ دفتر کوئی نہ تھا مگر ایک کلرک اور چپراسی ملا تھا۔ چناں چہ گھر کے ایک کمرے میں دفتر قائم کیا اور اللہ کا نام لے کر زندگی کے اس نئے باب کا آغاز کر دیا۔

ریاست کشمیر میں اُس وقت گورنر راج تھا۔ بہر حال پہلا کام یہ کیا کہ شیخ عبداللہ سے ملنے گیا وہ بڑی محبت سے ملے اور مجھ سے اقبالیات پر کام کے منصوبے سے متعلق دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چشتی نے چند روز کے بعد سری نگر کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور اہلِ علم کا ایک جلسہ کیا جس میں میں نے اقبال کے سلسلے میں اپنے کام کا خاکہ پیش کیا۔ میں نے اس پر خاص زور دیا کہ ایک اقبال انسٹی ٹیوٹ اقبال پر تحقیق کے لیے قائم کرنا چاہیے صرف ایک چیئر سے کیا ہوگا۔ انسٹی ٹیوٹ میں ریڈر، لکچرر اور فیلو سبھی ہوں گے اور ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے لیے تربیت بھی ہوگی اور اقبال پر ریسرچ بھی۔ اس کا پُر جوش خیر مقدم ہوا۔ دفتر کے لیے جگہ چار پانچ مہینے بعد مل گئی۔ کشمیر یونیورسٹی کی لائبریری کو میری تجویز پر اقبال لائبریری کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اسی کے ایک حصے میں اقبال چیئر کا دفتر بھی قائم ہو گیا۔ میں نے ۲۵ جولائی ۷۷ء کو اقبال چیئر کا افتتاحی لکچر دیا اور اکتوبر میں اقبال اور تصوف پر ایک سمینار کیا۔ اس میں پروفیسر سید احمد اکبر آبادی۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری اور جگن ناتھ آزاد بیرونی مہمانوں کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ یونیورسٹی اور شہر کے اسکالر بھی خاصی تعداد میں تھے۔ سمینار کا افتتاح شیخ صاحب نے کیا تھا۔

دسمبر کے پہلے ہفتے میں لاہور میں بین الاقوامی اقبال کانگریس کا ہفت روزہ اجلاس تھا۔ میرے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ میں تقسیم کے بعد پاکستان نہیں گیا تھا جو عزیز پاکستان میں تھے اُن سے ملاقات کو عرصہ گذر گیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۴ء کی گرمی میں لاہور کا پھیرا ہوا تھا۔ میری بیوی کو بھی پاکستان جانے کا بڑا اشتیاق تھا۔ چناں چہ ہم لوگ آخر نومبر میں علی گڑھ آئے۔ دو تین دن قیام کے بعد دلی گئے اور وہاں سے ۲ دسمبر کو لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ کانفرنس ایک دن پہلے شروع ہو چکی تھی۔

دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ ہم دونوں کا پاسپورٹ اس وقت تک لکھنؤ سے نہیں آیا تھا۔ روز انتظار رہتا۔ آخر مایوس ہو کر میں وزارت خارجہ گیا۔ وہاں میں صرف عشرت عزیز کو جانتا تھا جو علی گڑھ

میں شعبۂ انگریزی میں لیکچرر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے جوائنٹ سکریٹری خلیلی صاحب سے ملایا جو مرزا اسمٰعیل کے عزیز تھے۔ انھوں نے بڑی عنایت کی۔ چند گھنٹوں میں ان کی محنت سے مجھے عارضی پاسپورٹ مل گیا۔ دوسرے مدعوئین سردار جعفری، جگناتھ آزاد، اور صباح الدین عبدالرحمٰن پہلی دسمبر کو جاچکے تھے۔ کانفرنس دو دسمبر سے شروع ہو رہی تھی۔ میں ۲ دسمبر کی شام کی فلائٹ سے روانہ ہوا اور دو گھنٹے میں لاہور پہنچ گیا۔ پاکستانی سفارت نے میرے پہنچنے کی اطلاع بھیج دی تھی مگر جو لوگ بیرونی مہمانوں کو لینے آئے تھے وہ دیر میں ملے۔ بہرحال پھر وہ مجھے دوسرے خصوصی مہمانوں کے ساتھ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل لے گئے۔

ہوٹل میں بڑی چہل پہل تھی۔ ایران، افغانستان، ترکی، مصر، سعودی عرب، روس، انگلستان، کناڈا، امریکہ، بنگلہ دیش، اور ہندوستان غرض بہت سے ملکوں سے ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ صرف پاکستان سے تیس سے اوپر شرکا تھے۔ صبح کو ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ مشہور پاکستانی محقق وحید قریشی جن سے پہلے سے ملاقات تھی ایک صاحب کو لے کر آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ عبدالرحمٰن چغتائی مشہور مصور کے بھائی ہیں۔ چغتائی صاحب سے میری خط و کتابت بھی رہی تھی۔ ان سے میں نے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے لیے سرورق بھی بنوایا تھا مگر چوں کہ عرشی صاحب کو یہ پسند نہ آیا اس لیے کتاب کے اندر شامل کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنا مرقع غالب بھی مجھے بھیجا تھا۔ چغتائی صاحب کے بھائی نے بتایا کہ چغتائی نے اپنا نیا شاہکار مرقع اقبال میرے لیے اپنے دستخط کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا اور یہ وصیت کر دی تھی کہ سرور صاحب جب لاہور آئیں تو انھیں دے دیا جائے یا پھر کوئی معتبر آدمی ہندوستان جا رہا ہو تو اس کے ذریعے بھجوایا جائے۔ چغتائی صاحب کے بھائی اور وحید قریشی کے ساتھ اس موقع پر میری تصویر بھی لی گئی۔ میں چغتائی کا شروع سے قائل رہا ہوں۔ اُن لکیروں اور خطوط میں ایک جہانِ معنی آباد ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں مرقع غالب شائع کیا تھا۔ اس میں اقبال کا تعارف بھی ہے۔ ان کے تازہ ترین شاہکار میں اقبال کے متعدد اشعار کو مصوری کے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ اور ان تصویروں سے اقبال کے تخیل کی پرواز مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اُس وقت بھی اس نادر کارنامے کی قیمت ۵۰۰ روپے تھی۔

اس کے بعد کئی دن کانفرنس کی مصروفیت میں گذرے۔ میں نے اپنا مقالہ پہلے بھیج دیا

تھا مگر کانفرنس کے دفتر کو بعد میں موصول ہوا۔ چوں کہ مقالات زیادہ تھے اور وقت کم اس لیے ہر مقالہ نگار کو صرف دس منٹ دیے جانے تھے کہ وہ مقالے کا کچھ حصہ پڑھ دے یا اس کا خلاصہ بیان کر دے۔ پھر اجلاس کئی کمروں میں بیک وقت ہوتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے مقالات سننے کو نہ ملے اور جو سُنے اُن میں بھی تشنگی کا احساس ہوا۔ بہر حال بڑی بات یہ تھی کہ اتنی بڑی تعداد میں اسکالروں سے ملنے کا موقع ملا اور خصوصاً پاکستان کے بہت سے ادیب اور اسکالروں سے ملاقات ہو سکی۔ صوفی تبسم سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ بڑے لطف سے ملے۔ صدر ضیاء الحق نے ایٹ ہوم دیا تھا۔ اس میں بہت سے لوگ تو صدر کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ میں اور صوفی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ صوفی سے میں نے اس اندراج کی تصدیق چاہی جو فیض کے پطرس بخاری پر مضمون میں مسز ارونا آصف علی کے متعلق ہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب پطرس بخاری آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر تھے۔ مسز آصف علی ہندوستان چھوڑو تحریک میں پرجوش حصہ لے رہی تھیں اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف اکسا رہی تھیں ان کی گرفتاری کے لیے وارنٹ جاری تھا اور روز آل انڈیا ریڈیو سے ان کا سراغ لگانے والوں کو انعام کی بشارت دی جاتی تھی۔ وہ روپوش تھیں یا آج کل کی اصطلاح میں زیر زمین (UNDER GROUND) پطرس بخاری سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ایک رات جب زلف شب تا کمر پہنچ چکی تھی کسی نے بخاری کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بخاری یہ سمجھ کر نکلے کہ کوئی سرکاری پیام ہوگا۔ دیکھا تو مسز آصف علی ایک آدمی کے ساتھ دروازے پر کھڑی تھیں اور بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے بخاری سے کہا کہ پولس میرے پیچھے ہے اور اسے اس جگہ کا پتا چل گیا ہے جہاں میں اب تک چھپی ہوئی تھی اب کوئی اور پناہ گاہ نظر نہیں آتی۔ تم سے عرصے سے مراسم ہیں۔ تم چند روز کے لیے مجھے پناہ دے دو پھر میں کوئی انتظام کروں گی۔ پولس کو کسی طرح شبہ نہ ہوگا کہ میں تمھارے یہاں بھی ہو سکتی ہوں۔ بخاری نے بلا پس و پیش مسز آصف علی کو اندر آنے کو کہا اُن سے کہا کہ شلوار پہن لیں اور شاگرد پیشہ میں جا کر وہاں اطمینان سے رہیں۔ چناں چہ ریڈیو پر روز اُن کی تلاش کے سلسلے میں اعلان ہوتا تھا جب کہ وہ ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کے یہاں براجمان تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد کسی اور جگہ منتقل ہو گئیں۔ صوفی نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے یہ اضافہ کیا کہ میں نے جب بخاری سے پوچھا کہ تم نے مسز آصف علی کو کیوں پناہ دی جب کہ اس میں

تمھاری ملازمت جاتے کا ہی نہیں گرفتاری کا بھی اندیشہ تھا. تو بخاری نے جواب دیا کہ صوفی اگر تم کسی کا قتل کر کے میرے یہاں پناہ لینے آتے تو کیا میں انکار کر دیتا. مسٹر آصف علی نے جب میرے یہاں پناہ لینے کی درخواست کی تو میں کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ انھیں مایوس کروں. بخاری کے کردار کا یہ پہلو واقعی لائقِ ستائش ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ سے خط و کتابت رہتی تھی مگر ملاقات اب جا کر ہوئی. مجھ سے ملنے تشریف لائے اور دیر تک ادبی گفتگو ہوتی رہی. وہ واقعی علم کے سمندر تھے. میری تنقید کے بھی مداح تھے. فیض سے کئی بار ملنا ہوا. سب سے دلچسپ ملاقات نذیر نیازی سے ہوئی. انھوں نے گفتگو میں یہ بات بھی کہی کہ اقبال کے ذہن میں پاکستان کا وہ نقشہ نہ تھا جو اب سامنے آیا ہے. میں نے اس کے معنی یہ لیے کہ ٹامسن کے نام ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں مسلم صوبوں کے ہندوستان کی فیڈریشن کا ایک حصہ ہونے کی طرف جو اشارہ ہے وہ اقبال کے موقف کو بہتر طور پر ظاہر کرتا ہے. نذیر نیازی کا خیال بھی کچھ ایسا ہی تھا. اب نہ نذیر نیازی بقید حیات ہیں، نہ صوفی تبسم نہ سید عبداللہ. نذیر نیازی کے اس خیال کی وضاحت کیسے ہو۔

اس کانفرنس کے دوران رالف رسل، باربرا میٹکاف (امریکی اسکالر) شیلا میک ڈونو (کناڈا کی اسکالر) پروفیسر بوسانی (اٹلی) سے بھی دیر تک تبادلہ خیالات رہا. شام کو اکثر ضیافتی تقریبات ہوتیں. شالامار باغ میں مندوبین کو استقبالیہ دیا گیا. صدر ضیاء الحق نے ایک نشست میں اقبال پر ایک لکچر دیا. ایک مشاعرے میں پاکستان کے کئی ممتاز شعرا سے بھی ملاقات ہوئی. محمد طفیل ایڈیٹر نقوش نے ایک ہوٹل میں نقوش کے اقبال نمبر (۲) کے اجرا کے سلسلے میں جلسہ کیا. بوسانی صدر تھے. ہندوستان کی طرف سے میں نے اور سردار جعفری نے تقریر کی. میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ برصغیر میں صرف تین شہر ہیں بانکے گاؤں. یعنی لاہور، لکھنؤ اور حیدر آباد. آپ جسے چاہیں سر فہرست رکھیں. مگر ان شہروں میں جو بات ہے وہ کہیں اور کہاں. اس تقریر کا خاصا چرچا رہا. اس تقریر کا ٹیپ خراب ہو گیا تھا اس لیے یہ شائع نہ ہو سکی. طفیل اصرار کرتے رہے کہ تقریر دوبارہ لکھ دوں مگر میں یہ نہ کر سکا. اس کی وجہ سے وہ مجھ سے آزردہ بھی ہوئے. میں تو کسی مضمون کو صاف کرنے بھی بیٹھتا ہوں تو وہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے. اس سے بہتر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئے سرے سے

کوئی مضمون لکھ دیا جائے۔

لاہور میں اقبال کانگریس کے سلسلے میں کئی تقریبات میں شرکت کی۔ منیرہ دختر اقبال کے یہاں بڑا شاندار ڈنر تھا۔ ملک کے ممتاز موسیقار غلام علی اور مہدی حسن کا گانا بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ اُن کے یہاں خاص بات یہ ہے کہ غزل کے اشعار میں لہجے کے آتار چڑھاؤ کا بھی لحاظ ہے اور اس طرح شعر کا لطف کچھ اور ہو جاتا ہے۔ ویسے میں تحت اللفظ غزل کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ اس میں شاعر کے لفظ کا جادو ہی اپنا کام کرتا ہے۔ نغمے میں تُ ملا نہ سے بات کچھ اور ہو جاتی ہے۔ لحن زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ لفظ کو صدر کی بجائے بائیں میں جگہ ملتی ہے۔

جاوید اقبال سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ وہ اقبال کے فرزند ہیں اس لیے اُن سے ایک روحانی تعلق محسوس ہوا۔ اُن کے یہاں کھانے پر بوسانی اور بعض دوسرے غیر ملکی اسکالر بھی تھے۔ بوسانی کو میں SAINT کہتا ہوں۔ یہ اسلامیات اور فارسی کے عالم ہیں۔ عقیدے کے لحاظ سے بہائی ہیں۔ انھوں نے ہی روم میں میرے قیام کے زمانے میں میرے لیے ہوٹل کا انتظام کیا تھا اور روم کی سیر کے لیے اپنے ایک شاگرد کو متعین کر دیا تھا۔ پادریوں کی سی صورت، خوش مزاج اور نرم لہجے والے یہ اسکالر مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اقبال پر انھوں نے کئی معرکے کے مضمون لکھے ہیں اُردو فارسی کا علم بھی معتبر ہے۔

پاکستان ٹی وی والوں نے کشور ناہید کو میرا انٹرویو لینے بھیجا۔ یہ چند منٹ کا انٹرویو تو ٹیلی کاسٹ ہوا مگر ہم چار ہندوستانی مندوبین یعنی میں، سردار جعفری، صباح الدین عبدالرحمن اور جگن ناتھ آزاد کا ایک گھنٹے کا انٹرویو ٹیلی کاسٹ نہ ہوا۔ شاید حکومت کی پالیسی ہم لوگوں کو زیادہ اہمیت دینے کی نہ تھی۔ ہاں کشور ناہید کے سوالوں سے ان کی ذہانت، پتے کی بات پوچھنے اور بات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوگیا۔ وہ بہت جلد یہ اندازہ لگا لیتی ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ کشور ناہید یوں پیدا تو بلند شہر میں ہوئیں مگر بچپن میں پاکستان چلی گئیں انھوں نے نثری نظم کے فارم کو وزن و وقار عطا کیا ہے۔ وہ اب پاکستان کے رسالے 'ماہ نو' کی چیف ایڈیٹر ہیں۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جدید اُردو شاعری میں وہ صاحب طرز کہی جا سکتی ہیں۔

وزیر آغا قتیل شفائی، منیر نیازی سے بھی ملنا ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کہیں باہر گئے ہوئے تھے

ان سے ملاقات نہ ہوسکی ۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں سید معین الرحمٰن برابر میری دیکھ بھال کرتے رہے۔ معین الرحمٰن میرے پرانے دوست سید وقار عظیم کے شاگرد رہے ہیں۔ خود انھوں نے اُردو تحقیق میں خاصا نام پیدا کیا ہے۔ اُن کی بیوی زہرا معین نے عرفان اقبال کے نام سے اقبال پر میرے کچھ مضامین لاہور سے شائع کیے تھے۔ ایک اور مجموعہ "اقبال اور ان کا فلسفہ" بھی مکتبہ عالیہ سے اس زمانے میں شایع ہوا تھا۔ زہرا معین نے میری تحریروں سے میری خود نوشت بھی مرتّب کی ہے اور حرف سرور کے نام سے اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۷۹ء اور دوسرا ۱۹۸۵ء میں خاصے اضافے کے ساتھ شایع ہوا۔ معین الرحمٰن اور اُن کی بیگم کا علم و ادب سے شغف دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ میاں بیوی نے میری جو تحریر بھی انھیں ملی محفوظ کر لی ہے۔ خود میرے پاس اپنی بعض تحریریں نہیں مگر ان کے پاس ضرور مل جائیں گی۔

لاہور میں دس دن قیام کے دوران اپنے استاد خواجہ منظور حسین سے کئی بار ملنا ہوا۔ خواجہ صاحب کی کتاب اقبال اور دوسرے شعرا، کانفرنس کے دوران چھپ کر آئی۔ مجھے فخر ہے کہ اس کی پہلی کاپی خواجہ صاحب کے دستخط کے ساتھ میرے پاس محفوظ ہے۔ اُن کا لڑکا شاہد علی گڑھ میں بہت چھوٹا تھا اب ماشاء اللہ شادی شدہ ہے اور کتابوں کا کاروبار کرتا ہے۔ اُن کے یہاں ایس۔ اے رحمان سے بھی ملاقات ہوئی جنھوں نے اقبال کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے اور اقبال اور سوشلزم پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

کانٹی نینٹل ہوٹل میں ایک ہفتہ قیام کے بعد میں اور میری بیوی عبادت بریلوی کے یہاں منتقل ہو گئے اور دو دن وہاں قیام کر کے کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ بعض عملی معاملات میں میں بالکل کورا ہوں۔ مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ میرا ویزا صرف پندرہ دن کا ہے اور میں لاہور سے کراچی جانے کی سوچ رہا تھا۔ رالف رسل نے میرا پاسپورٹ دیکھا تو انھوں نے کہا کہ آپ کے ویزے کی مدّت تو چند روز میں ختم ہو رہی ہے۔ اس پر ویزا کی توسیع کی جستجو میں نکلنا پڑا۔ اورینٹل کالج میں عبادت بریلوی نے میرا ایک لکچر رکھا تھا اور اس کے بعد پاکستان کے بہت سے ادیبوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ جلدی جلدی لکچر ختم کر کے میں خواجہ محمد صادق سکریٹری کانگریس کے ساتھ مجسٹریٹ کے یہاں گیا اور کوئی دو گھنٹے میں مزید دو ہفتے کی توسیع کرا کے واپس آیا۔ اور لوگ تو انتظار کر کے

واپس چلے گئے تھے مگر انتظار حسین موجود تھے۔ اُن سے دیر تک باتیں رہیں۔ انتظار حسین ڈبائی کے رہنے والے ہیں۔ میرٹھ میں تعلیم پائی۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے۔ یہ اخبار مشرق میں کالم نویس ہیں۔ ناصر کاظمی سے ان کی گہری دوستی تھی۔ ان کے افسانوں میں اکثر ہجرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ہندوستانی دیو مالا اور واقعات کربلا دونوں سے متاثر ہیں۔ داستان گوئی کے طرز بیان سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ گنگا اور فرات کے درمیان پل بنانے کی سعی ان کے یہاں خاصی نمایاں ہے۔ زبان کے تخلیقی برتاؤ سے ان کے افسانوں میں بڑی جان آگئی ہے۔ یہ کم گو آدمی ہیں۔ مگر تحریر میں دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

ابواللیث صدیقی نے میرے کراچی پہنچنے کی اطلاع کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر احسان رشید کو دے دی تھی۔ یہ رشید صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی اولاد احمد صدیقی کے کلاس فیلو اور بعد میں علی گڑھ کے شعبۂ اقتصادیات کے ساتھی۔ میرا قیام اپنی بہن کے یہاں گلشن اقبال میں تھا۔ دوسرے دن کراچی یونیورسٹی میں ایک استقبالیہ میں اختر رائے پوری، ممتاز حسین، مجنوں گورکھپوری، شان الحق حقی، ابوالفضل صدیقی، شاہ علی، فرمان فتح پوری، ابوالخیر کشفی، شاہ عبدالقیوم اختر جمیل خاں، اور بہت سے پروفیسروں اور ادیبوں سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ ابواللیث صدیقی نے کراچی میں میرے لکچروں کا پروگرام بنایا۔ ان کے اُردو بورڈ کے دفتر جا کر اُردو لغت کا کام دیکھا۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور پریس کلب میں تقریریں کیں۔ زیادہ وقت اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ گذرا۔ اس کے علاوہ کچھ دن اپنے برادر نسبتی اقبال بخش قادری کے یہاں قیام کیا۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جب اپنے بھانجے اسلم فرید کے ساتھ پولس کے ایک افسر کے پاس حسب قاعدہ اپنی آمد کا اندراج کرانے گیا تو انھوں نے سب سے پہلے پاسپورٹ لے کر میرے ویزا میں توسیع کے لیے خود ہی ساری کارروائی کر دی۔ اس طرح میں ایک مہینے کے قریب کراچی میں رہ سکا۔

جو لوگ پاکستان بننے کے بعد اُدھر چلے گئے اُن میں سے بیشتر کراچی میں بس گئے۔ کچھ حیدرآباد، سندھ اور سکھر چلے گئے۔ غرض مہاجرین کی بڑی تعداد سندھ میں رہی۔ پنجاب کم لوگ

گئے اور گئے بھی تو پھر کراچی جا کر ہی دم لیا۔ چناں چہ کراچی اور سندھ کے چند شہروں میں ہی مہاجرین کی آبادی کا بڑا حصہ ملے گا۔ کراچی میں سندھی کم اور مہاجر زیادہ نظر آتے ہیں۔ خال خال ہندو بھی۔ میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے دفتر میں خاص طور سے کئی دفعہ گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور انجمن کے کارکنوں سے دیر تک باتیں کیں۔ فیض احمد فیض نے مرزا ظفرالحسن کی مدد سے غالب کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ مرزا ظفرالحسن نے اس کی لائبریری کے لیے کتابیں بڑی محنت سے گھر باہر سے جمع کیں۔ اب یہاں ایک اچھا دارالمطالعہ ہے اور اس کے ہال میں ادبی اجتماع بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ادارہ غالب نے فیض کی کئی کتابیں بھی شائع کی ہیں۔ میرا ایک لکچر غالب پر اس ادارہ میں ہوا۔ یہیں مشفق خواجہ سے ملاقات ہوئی۔ انجمن اور مولوی عبدالحق کے کاموں میں انھوں نے بڑی مدد کی تھی۔ یہ خود ایک ممتاز محقق، کالم نویس اور شاعر بھی ہیں۔ ان کے مطالعے کی وسعت اور ان کی تحریروں کی شگفتگی دونوں مسلّم ہیں۔ مرزا ظفرالحسن حیدرآباد کے ہیں، مخدوم کے ساتھیوں میں سے ہیں اور وہاں کے ریڈیو میں بھی کام کر چکے ہیں۔ ان کے یہاں کام کی جو لگن ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ پتھر سے بھی پانی نکال سکتے ہیں۔ فیض کے فدائی اور مخدوم کے شیدائی ہیں اور گفتگو میں ان کا ذکر آ ہی جاتا ہے۔ کراچی کے قیام کے زمانے میں جمیل الدین عالی سے بھی ملاقات ہوئی اور انھوں نے ازراہِ عنایت نہاری کی بڑی پُرتکلف دعوت بھی دی۔ عالی لوہارو خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ہندی دوہوں کو انھوں نے اُردو میں مقبول اور معتبر بنایا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ ان کے یہاں اختر حسین رائے پوری سے بھی ملاقات ہوئی اور دیر تک ادبی مسائل پر گفتگو رہی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ "ادب اور زندگی" والے اختر ہیں۔ عالی صاحب کے یہاں عبدالقادر قصوری کے صاحبزادے سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے والد کو ذوالفقار علی بھٹو نے قتل کروا دیا تھا۔ ان کو امید تھی کہ ان کے والد کے قتل کے الزام میں بھٹو کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ان پر مقدمہ چلے گا۔ اُس وقت ان کی اس پیشین گوئی پر یقین نہ آتا تھا مگر بعد میں یہ حرف بہ حرف پوری ہو گئی۔ دنیا کے بیشتر ملکوں کی طرف سے ضیاءالحق کو تار دیے گئے کہ پھانسی کی سزا کو عمر قید یا جلاوطنی میں منتقل کر دیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

کراچی میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جو لوگ یہاں سے گئے ہیں وہ خوش حال ہیں۔ اس کے

ساتھ یہ بات بھی نظر آئی کہ لوگ صارفیت CONSUMERISM کے جال میں پھنس گئے ہیں۔
عرب امارتوں کے علاوہ سعودی عرب، اور لیبیا بہت سے لوگ گئے ہیں اور وہاں سے واپس آکر بڑی شان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان میں قریب قریب ہر چیز باہر سے آتی ہے۔ مقامی صنعتیں کمزور ہیں اور ملک کی معیشت کا انحصار بڑی حد تک اُن رقوم پر ہے جو مشرق وسطیٰ میں مُقیم پاکستانی اپنے عزیزوں کو یہاں بھیجتے ہیں۔ گرانی ہندوستان سے زیادہ ہے مگر بڑی بات یہ ہے کہ کوئی بھوکوں نہیں مرتا۔ کراچی یونیورسٹی کے علمی معیار کے مقابلے میں مجھے پنجاب یونیورسٹی کا معیار بہتر معلوم ہوا۔ وہاں پرانی علمی و ادبی روایات کا اثر اب بھی ہے۔ کراچی رفتہ رفتہ ایک تجارتی شہر ہوتا جا رہا ہے۔ چوں کہ شہر کی آبادی بے تحاشا بڑھ رہی ہے اس لیے نقل و حرکت اور میل جول اتنا آسان نہیں۔ شہر کی بس سروس بھی قابلِ اطمینان نہیں کہی جا سکتی۔ لاہور کی آبادی بھی بڑھی ہے مگر پھر بھی پچیس ۲۵ تیس ۳۰ لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔ کراچی کی آبادی تو کسی طرح ستّر پچھتّر لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

کراچی کے قیام میں عزیزوں سے ملتا رہا۔ میرا بھانجا اسلم اور میری نواسی راشدہ خاص طور سے یاد آتے ہیں۔ اسلم ایک بینک میں ملازم ہے اس کا مضمون توریاضی رہا ہے مگر شعر و ادب سے اُسے اتنا شغف ہے کہ اشعار ہی نہیں نثر کے پورے کے پورے پیراگراف یاد ہیں۔ راشدہ نے سائیکالوجی میں ایم۔ اے کیا ہے اور اخبار مشرق میں کالم لکھتی ہے۔ اس کے شوہر اخبار جہاں کے ایڈیٹر ہیں جو جنگ کے ادارے کی طرف سے شایع ہوتا ہے۔ اُردو اخباروں میں جنگ کے کئی ایڈیشن شایع ہوتے ہیں۔ ایک ایڈیشن لندن سے بھی نکلتا ہے۔ اُردو پریس نے پاکستان میں بڑی ترقی کی ہے اس کے مقابلے میں انگریزی کا پرانا اخبار DAWN اگرچہ اپنی روش پر چلا جاتا ہے مگر قومی اخبار کے بجائے علاقائی اخبار معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے یہاں ٹریبون

واپسی سے چند روز پہلے سلیم احمد سے ملاقات ہوئی یہ بڑے ذہین آدمی ہیں۔ ایک صاحبِ طرز شاعر اور چونکانے والے نقاد۔ یہ حسن عسکری کے بڑے قایل ہیں۔ عسکری سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ بہت بیمار تھے۔ واپسی کے بعد اُن کے انتقال کی خبر ملی۔ احمد علی اس زمانے میں کہیں آتے جاتے نہ تھے۔ میں اُن سے ملنے گیا۔ قرآن شریف کے ترجمے میں مصروف تھے۔ یہ اقبال کے بالکل قایل

نہیں۔ افسوس ہوا کہ پختگی کے باوجود بھی وہ یک طرفہ ذہن رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو کے کچھ شاعروں کے تراجم انگریزی میں بڑی خوبی سے کیے ہیں۔ میں اس بات پر اکثر غور کرتا رہا ہوں کہ اچھے اچھے ادیب اور نقاد اکثر علاقائی نقطۂ نظر سے بلند نہیں ہو سکے۔ احمد علی دہلی کے ہیں وہ زبان کے ایک خاص طرز کے ایسے دل دادہ ہیں کہ داغ کے بھی بڑے قایل ہیں مگر اقبال کی شعریت سے متاثر نہیں ہو سکے۔ داغ کے مقابلے میں اقبال کا وژن بہت بلند پایہ اور ان کا شعری کارنامہ بہت وقیع، عہد ساز، روح پرور اور حیات آفریں ہے۔ اسی طرح لکھنؤ میں میں نے دیکھا کہ مسعود حسن رضوی جیسے بالغ نظر نقاد اور ادیب انیس کے شاعرانہ کمالات کے بڑے مدّاح تھے اور غالب کو بھی مانتے تھے مگر اقبال اور بعض شعرا کے سلسلے میں ان کا رویہ مختلف تھا۔ صفی اور ثاقب کے بڑے مداح تھے۔ فانی کے زیادہ قایل نہ تھے۔ نظیر کے مقابلے میں وہ جوش کو بہتر شاعر سمجھتے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم کا ۱۹۱۲ء میں یہ کہنا کہ لکھنؤ والوں نے اقبال کی مناسب پذیرائی نہ کی آج تک صحیح ہے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں سراج لکھنوی سے باتیں ہو رہی تھیں انھوں نے آویزش (بہ معنی کشمکش) کی سند پوچھی۔ میں نے اقبال کا یہ مصرعہ پڑھا ؎ "تا کجا آویزش دین و وطن"۔ سراج نے جواب دیا کہ کوئی اور سند دیجیے۔ میں اس معاملے میں اقبال کو نہیں مانتا۔ میں نے کہا میرے لیے تو یہی سند کافی ہے۔

جنوری ۱۹۷۰ء کے پہلے ہفتے میں علی گڑھ واپس آیا۔ فروری میں وسکانسن یونیورسٹی جانے کا خیال تھا۔ وہاں محمد عمر میمن نے اردو ادب پر ایک سمینار کے لیے دعوت دی تھی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے سفر خرچ کی منظوری بھی بھیج دی تھی مگر میرا پاسپورٹ جو پاکستان کے لیے ملا تھا عارضی تھا اور اس کی مدت فروری میں ختم ہو رہی تھی۔ مستقل پاسپورٹ لکھنؤ سے آیا نہ تھا اس لیے نہ جا سکا۔ اگر لکھنؤ کا ایک چکر لگا لیتا تو شاید یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی مگر بھاگ دوڑ سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ محمد عمر میمن عربی کے مشہور عالم مولانا عبدالعزیز میمن کے بیٹے ہیں۔ بڑے ذہین اسکالر ہیں۔ باپ عربی زبان و ادب کے مانے ہوئے استاد تھے۔ بیٹا عربی کے علاوہ جدید علوم پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اس نے انگریزی میں اردو ادب کے شہ پاروں کے بڑے اچھے ترجمے کیے ہیں اور کئی قابل قدر افسانے بھی لکھے ہیں۔ میمن صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ان کی علمیت کے ساتھ ان کی ظرافت اور خود پسندی کے ساتھ خست کے بھی بہت سے افسانے مشہور تھے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں

نے جو کچھ پس انداز کیا تھا اس کا بہت بڑا حصّہ علمی اداروں کو دے دیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔

شروع مارچ ۱۹۷۰ء میں سری نگر واپس گیا تو چشتی جا چکے تھے اور اُن کی جگہ پروفیسر رئیس احمد وائس چانسلر ہو کر آ گئے تھے۔ چشتی تو سینٹ جانس کالج کے پرانے ساتھی تھے اور عرصے کے بعد جب سری نگر میں ساتھ ہوا تو سی سے نومبر کے آخر تک وقت بڑے لطف سے گذرا۔ اُن کی بیوی سیدہ نسیم شعر بھی کہتی ہیں اور اُردو سے انگریزی میں انھوں نے ترجمے بھی کیے ہیں۔ چشتی کم آمیز ہیں مگر بڑے کھرے آدمی ہیں۔ میں اکثر اُن سے کہتا رہا ہوں کہ وہ ترجمے یا تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کریں تو اُن کے پاکیزہ ادبی ذوق اور گہرے مطالعے سے ادبی دنیا کو کچھ فائدہ ہو۔ مگر فرائض منصبی میں انہماک نے انھیں اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ پروفیسر رئیس احمد علی گڑھ میں فزکس کے پروفیسر تھے۔ کہتے ہیں کہ میرے شاگرد بھی رہے ہیں۔ علی گڑھ میں لازمی اُردو، آرٹس، سائنس، کامرس کے سبھی طلبہ پڑھتے تھے خاصا ہجوم ہوتا تھا اس لیے اس منزل پر جن لوگوں نے مجھ سے پڑھا ہے اُن کے نام کیسے یاد آ سکتے ہیں۔ سید حامد صاحب بھی جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے یہی کہتے ہیں۔ بہر حال رئیس احمد بڑے سلجھے ہوئے اور منتظم آدمی ہیں۔ اُن کے خیالات بائیں بازو کے ہیں۔ سائنسداں ہونے کے ساتھ ادب کا مطالعہ بھی خاصا ہے۔ اور انگریزی کے علاوہ اُردو میں بھی تعلیمی مسایل پر لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اُن کی عدم موجودگی میں قائم مقام وائس چانسلر کے فرائض انجام دیا کروں مجھے پس و پیش تھا مگر اُن کے اصرار پر ماننا پڑا۔ چناں چہ اُن کے زمانے میں، پھر اُن کے بعد وحید ملک کے زمانے میں اور آخر میں منظور عالم کے زمانے میں بھی وائس چانسلر کی عدم موجودگی میں اس طرح کام کرنا پڑا۔ کشمیر یونیورسٹی نئی ہے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۹ء تک یہ جموں اور کشمیر یونیورسٹی رہی اور اس کے دو کیمپس ایک سری نگر میں اور ایک جموں میں رہے۔ ۱۹۶۹ء میں الگ الگ یونیورسٹیاں وجود میں آ گئیں۔ ۱۹۶۹ء میں خواجہ غلام محمد صادق چیف منسٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ جموں یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کر لوں۔ میں نے کہا کہ جموں میں شاید میں زیادہ مفید نہ ہو سکوں ہاں کشمیر یونیورسٹی میں موقع ملے تو میں تیار ہوں۔ صادق صاحب چاہتے تھے کہ میں کشمیر یونیورسٹی میں ہی آ جاؤں۔ مگر ہمارے کچھ بائیں بازو کے

دوستوں نے صادق صاحب کو اس اقدام سے باز رکھا۔ چوں کہ میں نے جدیدیت کے تجربے کی، حمایت کی تھی اس لیے ترقی پسند تحریک کے معتبر علمبردار اس زمانے میں میرے خلاف ہو گئے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ آج کل یونیورسٹیوں کی جو حالت ہو گئی ہے اس میں وایس چانسلری ایک عذاب بن گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ذاکر صاحب، اچاریہ نریندر دیو اور سی۔ ڈی۔ دیش مکھ جیسے وایس چانسلر یونیورسٹی میں علمی کاموں کی قیادت اور طلبہ کی ذہنی رہنمائی کا کام انجام دے سکتے تھے۔ اب تو اساتذہ اپنے فرائض سے غافل ہیں اور طلبا چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنگامہ آرائی کرنے لگے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے اثرات اب یونیورسٹیوں کی فضا کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔ اس لیے وایس چانسلر کا زیادہ وقت کوئی ہنگامہ فرو کرنے اور مینڈکوں کو تولنے میں گذرتا ہے۔ آزادی کے بعد ڈیڑھ سو سے زیادہ یونیورسٹیاں وجود میں آگئیں۔ مگر آج اعلیٰ تعلیم کا معیار کسی طرح اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ تعلیمی ادارے اب تعلیم کے گہوارے کم ہیں، ڈگریوں کے کارخانے زیادہ۔

۱۹۷۸ء میں میں نے اقبال چیئر کا دفتر لائبریری کی عمارت میں قایم کیا۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں اقبال اور مغرب کے عنوان پر ایک سمینار کیا جس میں ملک کے کئی سربرآوردہ ادیب شریک تھے۔ شیخ عبداللہ نے اس کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر میں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ قایم کرنے کی تجویز اُن کے سامنے رکھی۔ چناں چہ ۱۹۷۹ء کے شروع میں انسٹی ٹیوٹ قایم ہو گیا اور اس میں ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تربیت کی اجازت مل گئی۔ ایک فیلو کے تقرری کی اجازت پہلے ہی مل گئی تھی پھر ایک ریڈر اور ایک لکچرر کے تقرر کی منظوری ملی۔ ۱۹۷۹ء میں پہلے لکچرر کی جگہ پر امین اندرابی کا تقرر ہوا جو ڈاکٹر زور کے شاگرد رہ چکے تھے۔ پھر ۱۹۸۰ء میں ریڈر کی جگہ پر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کا تقرر ہوا۔ انھوں نے علی گڑھ سے فارسی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا۔ کچھ عرصے انجمن ترقی اردو ہند میں میرے ساتھ لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ پھر میرے انجمن سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فارسی کے لکچرر ہو گئے تھے۔ جائسی صاحب فارسی ادب کے گہرے علم کے علاوہ ترجمے کے کام میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے میری فرمایش پر علی شریعتی کے رسالے "اقبال مصلح قرن آخر" اور میری سید بیر شنگر کی کتاب "محمد اقبال" کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اسے اقبال انسٹی ٹیوٹ سے شایع کیا گیا۔ ایم فل کے لیے پہلے سال جن اسکالروں کا داخلہ منظور ہوا ان میں امین اندرابی، اُن کی

بیگم نصرت اندرابی، شفیقہ رسول، بلقیس سراج اور زرینہ بھٹ یہ پانچ تھے۔ ان میں آخرالذکر کو چھوڑ کر سب نے پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر لیا۔

انسٹی ٹیوٹ میں ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی تربیت کے علاوہ سمیناروں اور توسیعی لکچروں کا خاص انتظام رہا۔ اقبال پر ہر سال ایک سمینار ضرور ہوتا تھا۔ سمینار کے مقالے کتابی صورت میں شایع کیے جاتے تھے۔ لائبریری پر خاص توجہ کی گئی اور اقبال کی ساری تصانیف کے علاوہ تصوف، علوم اسلامیہ، اُردو اور انگریزی ادب پر اہم کتابیں منگائی گئیں۔ پاکستانی کتب کے حصول پر خاص توجہ رہی اور اس طرح اقبال پر پاکستان سے جو بھی کتابیں شایع ہوئی ہیں وہ سب حاصل کی گئیں۔ اقبال ریویو کا فائل بھی فراہم کیا گیا۔ اس طرح نقوش کے خاص نمبر بھی منگائے گئے۔ یہ لائبریری اسکالروں کے کام کرنے کے لیے بڑی حد تک مفید ہو گئی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں میں نے پروفیسر عالم خوند میری کو سال بھر کے لیے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلایا۔ اپنے قیام کے زمانے میں انھوں نے اقبال پر کئی لکچر دیے اور اس کے علاوہ اسکالروں کے کام میں بھی مدد کی۔ ۱۹۸۰ء میں مشہور مستشرق اور اسکالر پروفیسر اینی میری شمل میری دعوت پر سری نگر آئیں اور انھوں نے اقبال، گوئٹے، منصور حلاج اور رومی پر تین بصیرت افروز لکچر دیے۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں پہلے تین مہینے کے لیے اور پھر ایک سال کے لیے پروفیسر مسعود حسین میری دعوت پر وزٹنگ پروفیسر ہو کر آئے۔ ۱۹۸۵ء میں پروفیسر سید سراج الدین چار مہینے کے لیے تشریف لائے۔

۱۹۸۲ء کے شروع سشن میں شیخ صاحب نے میرے کہے بغیر مجھے دو سال کی توسیع دے دی تھی حالاں کہ میں علی گڑھ واپس جانا چاہتا تھا۔ ۱۹۸۲ء کے جون میں شیخ صاحب بیمار ہو گئے۔ اُن کی علالت کا سلسلہ کئی مہینے رہا۔ دہلی سے کئی مشہور ڈاکٹر ان کے علاج کے لیے بلائے گئے۔ مگر ان کا وقت آ گیا تھا۔ ۸ ستمبر ۱۹۸۲ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے جنازے میں دس لاکھ سے کم آدمی نہ ہوں گے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی اور ملک کے بہت سے ممتاز لیڈر تدفین میں شریک تھے۔ انھیں حضرت بل میں اس پارک میں دفن کیا گیا جو شیر کشمیر پارک کے نام سے موسوم ہے اور حضرت بل کی مسجد سے قریب ہے۔

شیخ صاحب کی پیدائش ۱۹۰۵ء کی بتائی جاتی ہے مگر یوسف ٹینگ کی تحقیق کے مطابق ۱۹۰۲ء

کی نکلی۔ وہ سری نگر کے مضافات صورہ میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول کرنے کے بعد ایس۔ پی کالج سری نگر میں اور پھر اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے بی۔ ایس سی کیا تھا۔ اقبال سے اسی زمانے میں ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور ان ملاقاتوں کا ذکر وہ بڑی عقیدت اور احترام سے کرتے تھے۔ بی۔ ایس۔ سی کے بعد وہ ایم۔ ایس۔ سی کرنے علی گڑھ آئے جہاں سے ۱۹۲۹ء میں انھوں نے کمسٹری میں ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری لی۔ علی گڑھ کے قیام کی مدّت دو سال رہی۔ اور اس زمانے میں وہ ہاکی کے ایک اچھے کھلاڑی سمجھے جاتے تھے اور جب کشمیر واپس گئے تو انھیں ڈوگرا شاہی نظام نے ایک اسکول میں سائنس ٹیچر کی جگہ دی۔ وہ پہلے سے کشمیری مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے ناروا سلوک، اُن کی زبوں حالی، اُن کے افلاس، اُن کی بے روزی اور تیرہ بختی کی وجہ سے ملول و حزیں رہتے تھے۔ اس ناقدری نے اس جذبے کو اور اُبھارا۔ کچھ اور پڑھے لکھے مسلمان نوجوان بھی ایسا ہی احساس رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ مل کر انھوں نے ڈوگرہ حکومت کے ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج شروع کیا۔ پہلے ایک ریڈنگ روم قایم کیا جس میں کچھ نوجوان جمع ہوتے تھے اور سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ شیخ صاحب جب کشمیریوں کے مجمع میں تقریر کرتے تھے تو اپنی خطابت سے ہزاروں کے مجمع پر ایک جادو کر دیتے تھے۔ اپنی تقریروں میں وہ اقبال کے اشعار سے بھی بڑا کام لیتے تھے۔ ریڈنگ روم پارٹی نے کچھ عرصے بعد کشمیر مسلم کانفرنس کا روپ اختیار کرلیا اور پوری وادی میں اس کا اثر پھیل گیا۔ ۱۹۳۱ء میں کچھ لوگوں کی گرفتاری کے سلسلے میں عوام نے احتجاج کیا تو پولس نے گولی چلادی جس کی وجہ سے خاصی تعداد میں لوگ شہید ہو گئے۔ ۱۳ر جولائی کا دن اسی لیے کشمیر میں یوم شہدا کے طور پر اب تک منایا جاتا ہے۔ کشمیر کے مذہبی رہنما اس وقت میر واعظ یوسف شاہ تھے۔ شیخ صاحب چونکہ اس وقت عوام کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے اس لیے شروع میں یوسف شاہ نے بھی اُن کی حمایت کی۔ ۱۹۳۲ء میں کشمیر کے تین نوجوان مرزا افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق اور غلام محمد جکن قانون کی تعلیم حاصل کرنے علی گڑھ آئے۔ میں بھی ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ پہنچ گیا تھا۔ جلد ہی ان تینوں کشمیری نوجوانوں سے میرا ربط ضبط بڑھا اور اُن کی زبانی مجھے شیخ صاحب کی قیادت میں تحریک حریت کشمیر کے جنگل کی آگ کی طرح پوری وادی میں پھیل جانے کا علم ہوا۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ آپ

انھیں شیرِ کشمیر کہا جاتا ہے اور وہ جدھر سے گذرتے ہیں مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم اُن کی پذیرائی کے لیے کھڑا رہتا ہے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں جب کشمیر گیا تو خود اپنی آنکھ سے اُن کی مقبولیت کا عالم دیکھا۔ شیخ صاحب اُس وقت دُبلے پتلے مگر خاصے لمبے تھے۔ داڑھی بھی رکھتے تھے۔ کشمیر کی تحریکِ حریت کی اقبالؔ اور دوسرے مسلم رہنماؤں نے بھرپور حمایت کی اور اخبار انقلاب لاہور نے تو اپنے آپ کو اس تحریک کا پروپگنڈا کرنے کے لیے وقف کردیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے خاص طور سے شیخ صاحب کی خدمات کو سراہا۔ مسلم لیگ نے اُن کی کوئی مدد نہیں کی۔ میرواعظ یوسف شاہ صاحب بھی شیخ صاحب کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر اُن سے کھنچ گئے۔ ۱۹۳۸ء میں شیخ صاحب نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کردیا۔ شیخ صاحب نے اس بات کو کئی دفعہ دہرایا کہ یہ اقدام انھوں نے اقبالؔ کے مشورے سے کیا تھا کیوں کہ اقبال اس تحریک میں غیر مسلم کشمیریوں کی شرکت بھی ضروری سمجھتے تھے تاکہ اس پر فرقہ وارانہ جماعت ہونے کا الزام نہ لگنے پائے۔ کانگریس نے شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کی حمایت کی اور پنڈت جواہر لال نہرو اور شیخ صاحب ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ میں شیخ صاحب کا ذکر برابر سنتا رہتا تھا مگر انھیں پہلی دفعہ اگست ۱۹۴۵ء میں دیکھا جب رشید صاحب اور میں پی۔ای۔این کانفرنس میں شرکت کے لیے جارہے تھے۔ دلی سے ہم لوگ سوار ہوئے تو شیخ صاحب برتھ کی تلاش میں ہمارے کمپارٹمنٹ میں بھی آئے۔ دوسرے دن میں نے انھیں جے پور میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ دیکھا۔ اُن سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ میں لکھنؤ میں تھا ایک دن ذاکر صاحب کا تار آیا کہ مجھ سے فوراً آکر ملو۔ چنانچہ دوسرے دن علی گڑھ پہنچا تو انھوں نے بتایا کہ کشمیر میں ڈائرکٹر ایجوکیشن کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔ اسداللہ کاظمی صاحب کا ٹرم ختم ہو رہا ہے۔ شیخ صاحب نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی مناسب نام تجویز کرنے کو کہا ہے۔ فی الحال تو ایک نئے کالج کی پرنسپلی کا سوال ہے لیکن بعد میں ڈائرکٹر ایجوکیشن کی جگہ بھی خالی ہوگی۔ تم فوراً کشمیر ہاؤس جاکر شیخ صاحب سے مل لو۔ چنانچہ میں دلی جاکر ان سے ملا۔ اُس وقت شاہ میری صاحب اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب سے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دنیا جہان کی باتیں ہوئیں اور انھوں نے پرنسپلی کی جگہ قبول کرنے کے لیے مجھ سے اصرار کیا۔ میں نے کہا میں غور کرکے چند روز میں جواب دوں گا۔ چند روز کے بعد مدحت کامل قدوائی چیف

سکریٹری کی طرف سے باقاعدہ تقرر کا خط آیا۔ مگر میں نے ہر پہلو پر غور کر کے معذرت کر لی۔ یونیورسٹی سے کالج کی پرنسپلی پر جانا مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ ۱۹۵۲ء میں کاظمی صاحب نے مجھے کشمیر یونیورسٹی میں تین توسیعی لکچروں کے لیے بلایا۔ ہر لکچر میں شیخ صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ تین لکچروں کے بعد جو تحریری تھے شیخ صاحب نے مجھ سے چوتھے دن اقبال پر ایک لکچر دینے کی فرمایش کی۔ چناں چہ میں نے یہ لکچر بھی دیا۔ پھر انھوں نے اپنے یہاں چائے پر بلایا۔ بخشی صاحب نے بڑی دھوم کی دعوت کی۔ شیخ صاحب کی علم دوستی اور ادب نوازی سے میں خاصا متاثر ہوا۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں ریڈیو کشمیر کا افتتاح ہونے والا تھا۔ شیخ صاحب نے اس موقع کے لیے مجھ سے ایک پیغام کی فرمایش کی۔ میں نے انھیں ایک نظم بھیجی جس کے چند اشعار دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے ؎

نگارِ جنتِ کشمیر مجھ سے قولِ عرفی سن
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"
معاذ اللہ مرے رندوں کے سینوں کی یہ بے نوری
تعالی اللہ ترے شیخ و برہمن کی جگر تابی
عروسِ وادیٔ گنگ و جمن ہے محوِ آرائش
اسی پر زیب دیتی ہے ترے گوہر کی خوش آبی

میں سمجھتا تھا کہ اس نظم کا پرجوش خیر مقدم ہوگا مگر شیخ صاحب نے صرف یہ لکھا کہ آپ کی نظم موصول ہو گئی ہے اور اخبار خدمت میں اشاعت کے لیے بھیج دی گئی ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب آج کل حکومتِ ہند سے بہت بدظن ہیں اور حکومت بھی ان کو شبہے کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اگست ۱۹۵۳ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور بخشی صاحب اُن کی جگہ وزیرِ اعظم بنائے گئے۔

شیخ صاحب کی قید و بند کی داستانیں سنتا رہا۔ اخباروں میں اُن کے متعلق حیرت انگیز بیانات نکلنے لگے۔ میری ملاقات خاصا عرصہ گذر جانے کے بعد دہلی میں ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ پھر ۱۹۷۴ء کے شروع میں جب وہ شمیم احمد شمیم کے ساتھ علی گڑھ آئے تو میرے یہاں بھی تشریف لائے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی صورت میں مجھے پھر کشمیر بلالیں۔ کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے قیام

کی وجہ سے بالآخر میں وہاں پہنچ گیا۔

اقبال چیئر اور پھر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سلسلے میں اُن سے ملاقات تو اکثر ہوتی رہتی تھی۔ پھر انھوں نے ۱۹۸۱ء کے شروع میں مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ اُن کی خود نوشت سوانح عمری پر جو اُن سے انٹرویو کر کے محمد یوسف ٹینگ نے لکھی تھی۔ میں زبان کے لحاظ سے نظرِ ثانی کروں۔ میں نے خوشی سے یہ ذمہ داری منظور کر لی۔ چناں چہ ٹینگ صاحب ہر ہفتے مجھے چند ابواب دے جاتے تھے اور میں انھیں دیکھ کر واپس کر دیتا تھا۔ یہ سارا کام کئی مہینے چلا۔ اور ۱۹۸۱ء کے نومبر تک مکمل ہو گیا۔ مگر جب شیخ صاحب کے انتقال کے بعد یہ کتاب چھپی تو میں نے دیکھا کہ میری اصلاح کے باوجود بہت سی اغلاط رہ گئی ہیں اور بعض اشعار بھی صحیح نہیں لکھے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتابت کی صحت کے وقت میری اصلاحیں پیشِ نظر رہی ہوں گی۔ کسی دوسری کاپی سے صحت ہوئی ہو گی۔ کتاب کا نام 'آتشِ چنار' بھی میرا تجویز کردہ ہے۔ اس کے انگریزی ترجمے کی بات بھی چلی تھی اور شیخ صاحب کی خواہش پر میں نے رالف رسل سے اس سلسلے میں خط و کتابت بھی کی تھی وہ آمادہ بھی تھے مگر پھر بات آگے نہ بڑھ سکی۔ کیوں کہ شیخ صاحب نے ایک ہندوستانی پبلشر سے ترجمے کی بات شروع کر دی۔ اس ترجمے کے دو یا تین باب میری رائے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ترجمہ میرے نزدیک قابلِ اطمینان نہ تھا۔ چند دن کے بعد شیخ صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ ۱۹۸۶ء میں بیگم عبداللہ خود آتشِ چنار کا نسخہ میرے لیے لے کر آئیں۔ جب میں نے اسے پڑھا تو خیال ہوا کہ اس میں مسودے کا کچھ حصہ ضرور حذف کیا گیا ہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے شیخ صاحب نے اندرا گاندھی پر سخت تنقید کی تھی۔ مطبوعہ کتاب میں یہ تنقید موجود نہیں۔ آتشِ چنار کے متعلق میرا تاثر یہ ہے کہ یہ شیخ صاحب کی نظر سے کشمیر کی تحریکِ حریت اور اس کے بعد کے واقعات کی تصویر ہے۔ یوسف ٹینگ کی تحریر میں ایک ادبی چاشنی ہے۔ شیخ صاحب کا مطالعہ گہرا نہ تھا مگر وہ حیرت انگیز انجذابی صلاحیت رکھتے تھے۔ گفتگو میں مخاطب کی باتوں کو بڑے غور سے سنتے تھے۔ وہ ادیبوں، عالموں، سائنس دانوں، سیاست دانوں سبھی سے ملتے رہتے اور معاملے کی تہ تک جلد پہنچ جاتے تھے۔ اُن کی انا کی لے بھی خاصی بلند تھی۔ وہ ہر مجمع پر چھا جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ خاصے نڈر آدمی تھے اور مجمع کیسا ہی مخالف

ہوئے سے قابو میں کرنے کا گر جانتے تھے۔ اُن کی آواز میں ایک قدرتی لحن تھا اور جب اقبال کے اشعار پڑھتے تھے تو ان اشعار کی تاثیر کچھ بڑھ جاتی تھی۔ وہ جس کے قایل ہو جاتے اُس کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ اُن کے پُرانے ساتھیوں میں مرزا افضل بیگ کو میں طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ شیخ صاحب کے ساتھ زندگی کے ہر پیچ و خم اور نشیب و فراز میں رہے افسوس کہ آخر میں ان دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ مرزا افضل بیگ کا انتقال شیخ صاحب کے انتقال کے چند ماہ پہلے ہوا۔ مشہور تھا کہ شیخ صاحب کے حواریوں نے انھیں مرزا افضل بیگ سے بدظن کر دیا تاکہ افضل بیگ شیخ کے جانشین نہ ہو سکیں۔ سیاست میں ایسا اکثر ہوا ہے۔ افضل بیگ بڑی صلاحیت کے آدمی تھے۔ طویل سیاسی مذاکرات میں انھیں کا رول سب سے اہم ہوتا تھا۔ ان میں ایک ظریفانہ حس بھی تھی اور وہ خاصی انتظامی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد بخشی غلام محمد وزیر اعظم ہوئے تھے۔ بخشی صاحب کے متعلق میں نے کشمیر میں یہ روایت سنی کہ وہ ذاتی طور پر پاکستان سے الحاق کے حق میں تھے مگر انھوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا جو بھی فیصلہ ہو انھیں منظور ہوگا۔ شیخ صاحب اور مولانا سعید مسعودی اور چند اہم حضرات کے اصرار سے فیصلہ ہندوستان سے الحاق کا ہوا۔ بخشی صاحب نے اسے کھلے دل سے تسلیم کیا اور چند سال بعد جب شیخ صاحب کے موقف میں تبدیلی ہوئی تو قدرتی طور پر بخشی صاحب کو اُن کا جانشین بنایا گیا۔ اُس وقت بھی بخشی نائب وزیر اعظم کی حیثیت سے انتظامیہ پر خاصے حاوی تھے۔ شیخ صاحب کے ساتھ افضل بیگ تھے بخشی صاحب کے ساتھ خواجہ غلام محمد صادق۔ کچھ عرصے کے بعد بخشی صاحب اور صادق صاحب میں اختلاف ہو گیا۔ کامراج منصوبے کے بعد بخشی صاحب کی جگہ صادق صاحب نے لی۔ صادق پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کمیونسٹ پارٹی سے اُن کا دیرینہ رشتہ تھا۔ بخشی صاحب اگرچہ اعلیٰ درجے کے منتظم تھے مگر اُن کے زمانے میں بہت سی بدعنوانیاں بھی ہوئیں۔ صادق صاحب کی شہرت اس لحاظ سے بے داغ تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اُن کے انتقال پر میر قاسم وزیر اعلیٰ ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں شیخ اندرا گاندھی پیکٹ کے بعد شیخ صاحب بائیس برس کے بعد دوبارہ برسرِ اقتدار آئے۔

کشمیر کی ممتاز ہستیوں کا تذکرہ مولانا سعید مسعودی کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ یہ کشمیر کی

تحریک حریت میں شیخ صاحب کے دست راست تھے۔ اقبال نے جس وادی لولاب کا ذکر ارمغانِ حجاز میں کیا ہے۔ اُسی وادی کے رہنے والے تھے۔ مولانا انور شاہ کشمیری بھی اسی علاقے کے تھے مولانا مسعودی کو "مفکر کشمیر" کہا جاتا تھا۔ وہ دیوبند کے فاضل تھے اور اقبال سے ان کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ایک گفتگو میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے حق میں تھے مگر ۱۹۵۳ء کے بعد جس طرح ریاست کی اندرونی خود مختاری آہستہ آہستہ سلب کر لی گئی اس کے وہ خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک دفعہ ۳۷۰ کا نفاذ جس طرح ۱۹۵۲ء تک رہا وہی مناسب تھا۔ مولانا مسعودی اقبال انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے اور مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ اب وہ گاندربل میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کشمیر کی ایک اور شخصیت مرزا کمال الدین شیدا کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ مرزا صاحب کشمیر کے ایک علم دوست اور ادب نواز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وادیٔ گل کی ادبی سرگرمیوں میں مرزا کمال الدین کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ وہ حضرت مخدوم صاحب کی درگاہ کے ٹرسٹیوں میں سے ہیں۔ جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی کے ناظم بھی رہے ہیں اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے ہیں اقبال سے گہرا شغف ہے۔ انھوں نے کشمیر کے علما اور مشایخ کے حالات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ بھی شایع ہو چکا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کو انھوں نے دس ہزار کا گراں قدر عطیہ سلطان العارفین حضرت مخدوم صاحب کے وقف سے دلوایا تھا تاکہ اس کے ابتدائی کاموں میں مدد مل سکے۔ شبلی جب کشمیر آئے تھے تو انھیں کے والد کے یہاں قیام کیا تھا۔ کشمیر کے ایک شعلہ مستعجل کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ تھا شمیم احمد شمیم جس کو ۴۵ سال کی عمر میں سرطان کے موذی مرض نے ہم سے چھین لیا یہ کشمیر کا وہ نوجوان تھا جس نے تحریر، تقریر، صحافت، سیاست سب میں بڑے بڑوں سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ اس نے کالج تک کی تعلیم تو کشمیر میں پائی تھی مگر ایل بی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا تھا۔ اُردو میں ایم۔ اے۔ پریویس ہی کر پایا۔ فائنل کرنے کی نوبت نہ آئی۔ میرا شاگرد بھی تھا۔ اس کے ہفتہ وار اخبار آئینہ نے بہت جلد اُردو صحافت میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ بعد میں یہ روزانہ ہو گیا تھا مگر ہفتہ وار آئینہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ پہلے وہ کشمیر اسمبلی کا ممبر ہوا۔ بعد میں

بخشی صاحب کو شکست دے کر پارلی منٹ کا ممبر بنا۔ پارلی منٹ میں ایک مقرر کی حیثیت سے اُس نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ خوشونت سنگھ نے اُس زمانے کی پارلی منٹ کے تین مشہور مقرّروں کے نام گنائے تھے۔ انگریزی میں بلیو مودی، ہندی میں اٹل بہاری باجپائی اور اُردو میں شمیم احمد شمیم۔ اس کے قلم میں بلا کی کاٹ تھی اور اس کے طنز کے وار بڑے گہرے پڑتے تھے۔ مولانا مسعودی نے ایک دفعہ اس کے متعلق کہا تھا کہ شمیم قلم سے نہیں چاقو کی نوک سے لکھتا ہے۔ جب میں ۱۹۷۰ء میں ایک توسیعی لکچر دینے کشمیر گیا تھا تو میرا قیام شمیم کے یہاں ہی تھا۔ اس زمانے میں وہ باغات برزلہ میں رہتا تھا۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں اُس کی آنکھوں میں تکلیف ہوئی۔ رسولی تجویز ہوئی۔ لندن میں اس کا آپریشن ہوا اور وہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ جولائی میں اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ شیخ صاحب نے اسے دوبارہ پارلی منٹ کے لیے ٹکٹ نہیں دیا۔ اس لیے اُن سے اختلاف ہو گیا۔ اس نے جنتا پارٹی میں شرکت کرلی مگر انتخابات میں نیشنل کانفرنس کی مقبولیت کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ دو سال بعد اُسے پھر تکلیف شروع ہوئی۔ امریکہ علاج کے لیے بھی گیا مگر بے سود۔ یکم جولائی ۱۹۸۰ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

کشمیر کے مشہور پہاڑی مقامات گلمرگ، پہل گام تو کئی مرتبہ گیا۔ ایک دفعہ اور سونامرگ بھی ہو آیا۔ مگر سونامرگ اب وہ ۱۹۲۲ء کا سونامرگ نہ رہا تھا۔ برف صرف چوٹیوں پر تھی۔ سبزہ زاروں کی جگہ آبادی نے لے لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سندھ نالہ بھی اس تبدیلی پر ماتم کناں ہے اور اپنے میں سمٹ گیا ہے۔ پہلگام بڑا خوبصورت ہے مگر اس خوبصورتی پر بڑھتی ہوئی آبادی، افسروں کے بنگلوں اور شہر کی سی ہماہمی نے بُرا اثر کیا ہے۔ نہ جانے کیوں ہم لوگ ایسے مقامات کے حسن کو کسی نہ کسی طرح اپنی تجارتی اغراض کی وجہ سے پامال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اب لدر کے اصلی حسن کو دیکھنے کے لیے کئی میل اوپر چندن واڑی جانا پڑتا ہے اور آڑو نالے کی آب و تاب کے نظارے کے لیے کولہائی پہاڑ کی طرف ۔ ڈل جھیل بھی خاصی سکڑ گئی ہے۔ ہر طرف اس کے کناروں کو پاٹ کر مکان بنا لیے گئے ہیں۔ جنگلی گھاس آدھی جھیل پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی صفائی کی بارہا کوششیں کی گئیں مگر ابھی تک کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ آس پاس کے جنگل بے دریغ کاٹے جانے کی وجہ سے آب و ہوا پر بُرا اثر پڑا ہے۔ جاڑا زیادہ شدید اور گرمی زیادہ تکلیف دہ ہونے لگی ہے۔ ڈل کے

سامنے کے پہاڑ جو درختوں سے ڈھکے ہوتے تھے ننگے بوچے نظر آتے ہیں۔ کشمیر کا حسن بجا طور پر مشہور ہے مگر سری نگر سے زیادہ مضافات میں نظر آتا ہے۔ اقبال نے جس دخترکِ برہمن کی داد دی تھی، اس کا شعلہ بھی کچھ مدھم لگا۔ کشمیری پنڈت ہی نہیں کشمیری مسلمان بھی بڑے ذہین ہیں۔ باہر جاتے ہیں تو اپنی قابلیت کی دھوم مچا دیتے ہیں۔ مگر کشمیر میں یہ کام کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ علاقائی عصبیت تو خیر ہر جگہ بڑھ رہی ہے مگر کشمیر میں اور زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ اب کشمیری ریاست کے باہر کے لوگوں سے کم ہی مانوس نظر آتے ہیں۔ اپنی جنت میں مگن ہیں۔ شیخ صاحب تعلیمی اداروں میں باہر سے لوگوں کو بلانے کے حق میں تھے۔ فاروق عبداللہ بھی اس روش کے حامی ہیں مگر مجموعی طور پر کشمیر اب ریاست کے باہر کے لوگوں کی پذیرائی اس طرح نہیں کرتا جس طرح پہلے کرتا تھا۔ اس کی کچھ ذمّہ داری باہر سے آنے والے اُن لوگوں پر بھی ہے جنھوں نے کشمیر کے قیام میں صرف اپنی سہولت کی طرف توجہ دی۔ کشمیر کے نوجوانوں کی تربیت پر نہیں۔ مگر میرے نزدیک بڑھتی ہوئی علاقائی عصبیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذاتی طور پر مجھے خوشی ہے کہ میری پذیرائی خاصی گرم جوشی سے کی گئی اور میرے دس سال کے قیام میں مجھے ہر طرح کا تعاون ملا۔ شاید اقبال کی جو مقبولیت ہے اس کا کچھ اثر اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی ذات پر بھی پڑا ہو۔ بہر حال یونیورسٹی کے استادوں کے ایک چھوٹے سے حلقے کو چھوڑ کر جسے یہ اندیشہ تھا کہ میرے سامنے اُس کا چراغ نہیں جلے گا شہر، یونیورسٹی حکومت اور عوام غرض سبھی حلقوں سے مجھے قدر شناسی کا ثبوت ملا۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اکثر سمیناروں میں شہر سے کافی لوگ آتے تھے۔ یونیورسٹی میں چوں کہ کم ہی اساتذہ اور طلبا رہتے ہیں اس لیے عام طور پر چار بجے کے بعد کیمپس میں سنّاٹا ہو جاتا ہے۔ صرف ۱۱ بجے سے چار بجے تک یونیورسٹی میں چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ کشمیر میں زیادہ تر لوگ نمکین چائے پیتے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں میں یہ شیر چائے اور مسلمانوں میں نون چائے کہلاتی ہے۔ قہوے کے شوقین ہیں۔ مگر یہ قہوہ دراصل ہری چائے کی پتّی سے بنایا جاتا ہے اور اس میں بادام، زعفران، جاوتری وغیرہ اجزا اسے بڑا مزے دار کر دیتے ہیں۔ سردی میں قہوے کا ایک پیالہ جسم و جان میں نئی توانائی عطا کرتا ہے۔ کشمیری چاول گوشت یا ساگ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ بھیڑ کے گوشت کے شوقین ہیں۔ گائے کا گوشت یہاں نہ پہلے کھایا جاتا تھا نہ اب کھایا جاتا ہے۔ ان کا دعوتوں کا کھانا

وازوان کہلاتا ہے۔ باورچیوں کا ایک قبیلہ جو وازہ کہلاتا ہے یہ پکاتا اور کھلاتا ہے۔ کشمیریوں کے یہاں وازوان بڑی نعمت ہے۔ چار آدمی آمنے سامنے بیٹھ کر ایک بڑی تھالی سے کھاتے ہیں جسے ترامی کہتے ہیں۔ چاول سے بھری ہوئی تھالی میں مرغ کی ٹانگیں، کباب اور تلی ہوئی پسلیاں جو طبق ماس کہلاتی ہیں رکھی ہوتی ہیں۔ پھر مختلف طرح کے گوشت کے سالن آتے رہتے ہیں۔ ایک بڑے پیالے میں دہی ہوتا ہے۔ رشتا اور گوشتابہ جو سب سے آخر میں آتا ہے پسندیدہ کھانے ہیں۔ پہلے میٹھے کا رواج نہ تھا اب سوجی کے حلوے کا چلن ہو چلا ہے۔ شادیوں میں وازوان ضروری ہے اس لیے غریب آدمیوں کو دعوت پر بہت خرچ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے کشمیری پنڈتوں کی شادی بھی دیکھی۔ وہاں بھی اسی سے ملتا جلتا کھانا ہوتا ہے۔ کشمیری پنڈت عام طور پر گوشت کھاتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا تیوہار شوراتری ہے۔ کشمیری زبان میں شاعری کا خاصا سرمایہ ہے۔ نثر دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرح جدید دور کی پیداوار ہے۔ کشمیری زبان مسلمانوں کی آمد سے پہلے شاردا رسم خط میں لکھی جاتی تھی اس کے بعد فارسی رسم خط میں لکھی جانے لگی۔ کشمیری پنڈتوں کے یہاں اب بھی شاردا رسم خط جاننے والے مل جائیں گے۔ پرانے زمانے میں سنسکرت کے کئی بڑے ودوان اور عالم یہاں پیدا ہوئے۔ سنسکرت ادب میں کشمیری پنڈتوں کا کارنامہ خاصا وقیع ہے۔ پھر یہاں فارسی کا رواج ہوا۔ کشمیری پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔ غنی کشمیری جیسے شاعر کو تو ایرانی بھی مانتے ہیں۔ علما اور صوفیا نے کشمیر کی مذہبی، سماجی اور ادبی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ صوفیوں کے مشہور سلسلوں، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ کے علاوہ کبروی سلسلہ بھی یہاں چلا۔ لیکن ریشی سلسلے کے صوفیا کشمیر کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ لوگ عرصے تک غاروں میں رہتے تھے۔ تارک دنیا اور تارک لذات تھے۔ گوشت انھوں نے کبھی نہیں چھوا۔ چنانچہ ان بزرگوں کے عرس کے دن کشمیری عام طور پر گوشت نہیں کھاتے۔ شیخ العالم کا مزار چرار شریف میں ہے اور ان کا عرس بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔ ریشی فرقے کے ایک بزرگ کا مزار پہلگام کے قریب عیش مقام کی پہاڑی پر ہے ایک دوسرے بزرگ کا مزار تنگ برگ اور گل مرگ کے درمیان ہے۔ سری نگر میں خانقاہ معلیٰ جو امیر کبیر شیخ علی ہمدانی کی قیام گاہ تھی، جامع مسجد آثار حضرت بل اور سلطان العارفین مخدوم حضرت شیخ حمزہ کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ حضرت بل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا موئے مبارک ہے جو اورنگ زیب کے زمانے میں حیدرآباد سے یہاں لایا گیا۔ حضرت بل کی پرانی عمارت کی جگہ شیخ عبداللہ نے ایک شاندار مسجد بنائی ہے جس کا نقشہ فیاض الدین مشہور آرکیٹکٹ نے تیار کیا تھا۔ کشمیر کے طرزِ تعمیر پر بدھ طرزِ تعمیر کا اثر زیادہ ہے۔ گنبد کم ہی ملیں گے جامع مسجد کی عمارت دور سے پگوڈا معلوم ہوتی ہے۔ حضرت بل کی مسجد کا گنبد تاج محل کے گنبد کے طرز پر بنایا گیا ہے اس کے پاس ہی وہ پارک ہے جس میں شیخ صاحب دفن ہیں۔

ڈل کے دوسرے کنارے پر سامنے شالیمار باغ، اس سے چند میل دور جھیل کے داہنے کنارے پر نشاط باغ اور داہنے کونے پر چشمہ شاہی ہے۔ یہ قدرے بلندی پر واقع ہے۔ اس کے قریب راج بھون ہے۔ جہاں ریاست کا گورنر رہتا ہے۔ اس سے کوئی دو میل اوپر پری محل ہے جو دارا شکوہ نے ایک رصدگاہ اور لائبریری کے طور پر بنوایا تھا۔ یہاں سے سری نگر اور اس کے نواح کا منظر، جھیل کی سفید چادر، جہلم کے پیچ و خم اور پس منظر میں وادی کا احاطہ کیے ہوئے پہاڑیاں سب نظر آتی ہیں۔ پاس ہی شنکر اچاریہ کی چوٹی ہے جس کی سیڑھیاں چڑھنے میں آدمی کا سانس پھول جاتا ہے۔ پری محل کئی دفعہ جانا ہوا۔ مجھے ہر دفعہ یہ محسوس ہوا کہ میری روح جسم کی قید سے آزاد ہو کر اس بساطِ رنگ و بو کی سیر کر رہی ہے اور اسے ایک عجیب شادابی اور شادمانی میسّر ہے۔

کشمیر سے مجھے بڑی محبت ہے۔ میں کشمیریوں کی ترقی اور خوش حالی کا خواہاں ہوں، اس لیے وہاں جو بے چینی، جو شورش ہے اسے دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ڈوگرا راج میں کشمیری مسلمانوں پر بڑے مظالم ہوئے۔ اُن کے ساتھ حکومت کا برتاؤ بہت خراب رہا اُن کی ذہنی و مادّی ترقی کی راہ میں عرصۂ دراز تک روڑے اٹکائے گئے۔ اُن کے تہذیبی سرمائے اُن کے شعر و ادب کے فروغ پر کوئی توجہ نہ ہوئی۔ تعلیم میں وہ پچھڑے رہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصّہ بہت ہی کم رہا۔ لے دے کے وہ دست کاری اور گھریلو صنعتوں میں مصروف رہے جس کی دور دور تک دنیا میں مانگ تھی۔ کشمیر میں کڑھائی کا کام زیادہ تر مرد کرتے ہیں۔ عورتیں یا تو کھیت پر کام کرتی ہیں یا گھر باہر کا کام۔ مرد کشیدہ کاری اور دوسرے نازک کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ اب بیگم شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کو کشیدہ کاری کی طرف متوجہ کیا ہے۔ شیخ عبداللہ کا سب سے نمایاں

کام بر سرِ اقتدار آنے پر زمینداری کو ختم کرنا تھا۔ ہندوستان میں کہیں اس طرح کسانوں کو زمین کا مالک نہیں بنایا گیا۔ آج وہاں ہر ایک کے پاس ایک چھوٹا سا قطعہ زمین اور اس میں چند سیب کے بوٹے اور دو ایک اخروٹ کے درخت ہوں گے۔ کشمیر میں وہ غربت اب نہیں ہے جو آزادی سے پہلے تھی۔ تعلیم پر بھی خاص توجہ ہوئی ہے خصوصاً عورتوں کی تعلیم پر۔ مگر کشمیر میں مشکل یہ ہے کہ سب بچے ابتدائی تعلیم مکمل نہیں کرتے۔ انھیں ماں باپ دوسرے تیسرے درجے سے اٹھا لیتے ہیں اور قالین بافی کے کام میں لگا دیتے ہیں۔ چونکہ مردوں کی انگلیوں کے مقابلے میں عورتوں کی اور عورتوں کے مقابلے میں بچوں کی انگلیاں زیادہ نرم ہوتی ہیں اس لیے قالین بافی میں گانٹھیں دینے کا کام بچے بہتر کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک اسکوائر انچ میں کئی سو گانٹھیں ہوتی ہیں۔ مگر کوئی غیر مسلم بچہ ابتدائی تعلیم نہیں چھوڑتا۔ یہ صرف مسلمان بچے ہی کرتے ہیں۔ کشمیر میں خاصی تعداد میں ایسے خاندان ہیں جو بہت امیر ہیں۔ یہ زیادہ تر امپورٹ اکسپورٹ کا کام کرتے ہیں۔ کشمیری قالینوں اور دیگر مصنوعات کی مانگ بیرونی ملکوں میں بڑھی ہے۔ سیاحوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

پہلے کشمیر میں سال میں چھ مہینے گرمی ہی میں کام ہوتا تھا اور نومبر سے مارچ تک سناٹا رہتا تھا۔ اب وہ بات تو نہیں ہے مگر اب بھی جاڑے میں بار بار برف باری کی وجہ سے زندگی کی رفتار اور کام کی رفتار دونوں پر اثر پڑتا ہے۔ وادی تک پہنچنے کے لیے آزادی سے پہلے دو راستے تھے۔ ایک ہر موسم میں کھلی رہنے والی راولپنڈی اور سری نگر کے درمیان سڑک۔ دوسری جموں کو سری نگر سے ملانے والی سڑک۔ راولپنڈی سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر مری کا پہاڑی مقام ہے۔ اس کے بعد سے سری نگر تک سڑک اگرچہ نشیب و فراز سے گذرتی ہے مگر پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی راستے میں کہیں نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں جموں والی سڑک بانہال سے گذرتی ہے۔ بٹوت سے رام بن تک کا راستہ اکثر خراب رہتا ہے۔ پھر اس پر سے علاوہ مسافروں اور ساز و سامان کے فوجی قافلے بھی گزرتے رہتے ہیں۔ سڑک کو چوڑا بھی کیا گیا ہے مگر ٹریفک بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس سڑک کی حالت خراب ہی ہے۔ عرصے سے ایک متبادل راستے کی بات چل رہی ہے۔ مغل شاہراہ کو جدید دور کے ٹریفک کے قابل بنانے پر بھی غور ہو رہا ہے مگر اب تک کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا۔ پہلے ریل پٹھان کوٹ تک جاتی تھی اب جموں تک ہے اور ادھم پور تک

لانے کا کام خاصا آگے بڑھ گیا ہے مگر فی الحال جموں روڈ کے علاوہ سری نگر پہنچنے کا کوئی اور راستہ سوائے ہوائی جہاز کے نہیں۔ ہوائی سروس کی وجہ سے بہت سہولت ہوگئی ہے مگر عام آدمی اس سے فایدہ کم اٹھا پاتے ہیں۔

کشمیر کی سیاست سے متعلق چند باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کشمیری مسلمان جذباتی طور پر پاکستان سے الحاق چاہتے تھے۔ مگر شیخ صاحب کے اثر سے نیشنل کانفرنس نے ہندوستان سے الحاق منظور کر لیا۔ قانونی طور پر تو مہاراجہ ہری سنگھ کی الحاق کی درخواست کافی تھی۔ مگر شیخ صاحب نے عوام کے نمایندے کی حیثیت سے مہاراجہ ہری سنگھ کی تجویز کی تائید کی۔ اس سے پہلے نیشنل کانفرنس کے کچھ افراد جن میں بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق بھی تھے لاہور گئے تھے اور وہاں انھوں نے مسلم لیگ کے رہنماؤں سے بات کی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ قبائلیوں نے درپردہ پاکستانی حکومت کے اشارے پر کشمیر پر حملہ کر دیا۔ قبائلیوں نے بجلی گھر کو تباہ کر کے بارہ مولا پر قبضہ کر لیا اور وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ وہ سری نگر کے قریب بٹ مالو تک پہنچ گئے۔ جب ہندوستانی فوج آئی تو رفتہ رفتہ یہ علاقہ ان قبائلیوں سے خالی کرایا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ بھی کہا تھا کہ کشمیر کے عوام رائے شماری (REFERENDUM) کے ذریعے سے اپنی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ اس کے لیے پاکستان کو اس حصّے کو خالی کرنا تھا جو آج آزاد کشمیر کہلاتا ہے مگر ایسا نہیں ہوا۔ معاملہ اقوام متحدہ میں پہنچا مگر رائے شماری کے لیے ہندوستان کی جو شرط تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ اس عرصے میں شیخ عبداللہ کی حکومت یہاں بنی اور دستور میں دفعہ ۳۷۰ کے ذریعے کشمیر کی خصوصی پوزیشن کو تسلیم کیا گیا۔ کشمیر کی قانون ساز اسمبلی نے تو ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کی توثیق کر دی مگر رائے شماری کا جو وعدہ جواہر لال نہرو نے کیا تھا اس کے لیے فضا ہموار نہ ہو سکی۔ ۱۹۵۲ء تک شیخ صاحب اور ہندوستانی حکومت کے درمیان تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ شیخ صاحب کی بعض تقریروں سے یہ اشارہ ملا کہ اب وہ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان دونوں سے الگ ایک آزاد ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ اس نصب العین کے راستے میں قدرتی طور پر دشواریاں تھیں۔ بہرحال اگست ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد غلام محمد بخشی وزیراعظم بنے۔ اُن کے دور میں ہندوستان کے بعض قوانین کشمیر میں بھی

نافذ کیے گئے۔ ان کے بعد کچھ عرصے کے لیے شمس الدین اور پھر خواجہ غلام محمد صادق وزیرِ اعلیٰ ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں صادق کے انتقال کے بعد میر قاسم وزیرِ اعلیٰ مقرر کیے گئے۔ بالآخر اندرا گاندھی کو یہ احساس ہو گیا کہ شیخ صاحب کی مقبولیت اب بھی بہت ہے۔ اس لیے انھوں نے ان سے مفاہمت کے لیے مذاکرات شروع کیے۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب دوبارہ وزیرِ اعلیٰ بنائے گئے۔ اگرچہ اس وقت اسمبلی میں کانگریس کی بھاری اکثریت تھی۔ جب مرکز میں جنتا وزارت بنی تو شیخ صاحب اس سے سمجھوتہ چاہتے تھے۔ مگر جنتا حکومت کو خیال تھا کہ شیخ صاحب کی مخالفت بہت زیادہ ہے اس لیے وہ اُن کے مخالفوں سے اشتراک کر کے حکومت بنا سکتی ہے۔ شیخ صاحب کے پرانے ساتھی مولانا سعید مسعودی کشمیر کی جنتا پارٹی کے صدر بنائے گئے۔ میر واعظ مولوی فاروق نے جو شروع سے شیخ صاحب کے مخالف تھے جنتا پارٹی کا ساتھ دیا۔ مگر جولائی ۱۹۷۷ء کے انتخاب میں نیشنل کانفرنس خاصی اکثریت سے پھر برسرِ اقتدار آ گئی اس سے پہلے جتنے انتخابات ہوئے تھے اُن کے بے لاگ اور منصفانہ ہونے میں بہت شبہ تھا مگر یہ انتخاب جو مرارجی ڈیسائی کی حکومت نے کرایا تھا متفقہ طور پر منصفانہ اور صاف ستھرا مانا گیا تھا۔ میں ۱۹۷۷ء میں کشمیر میں تھا۔ یہ انتخاب میرے سامنے ہوئے تھے۔ کشمیر میں کچھ جماعتیں اُس وقت بھی کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے خلاف تھیں۔ مگر شیخ صاحب کا عوام پر اثر تھا اور ان لوگوں کی سرگرمیاں خاصی محدود تھیں۔ ۱۹۶۵ء میں جب پاکستانی فوج گلمرگ کی پہاڑیوں کے راستے کشمیر میں داخل ہوئی تو اس علاقے کے چرواہوں نے ہی ہندوستانی فوج کو اُن کی آمد سے خبردار کیا تھا مگر ریاست کے عوام میں ہندوستان کے خلاف جذبہ ضرور تھا۔ جب بھٹو کو گرفتار کر کے اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی دی گئی تو وادی میں لوگوں نے جماعتِ اسلامی پر غصہ اتارا کیوں کہ جنرل ضیاء الحق کو جماعت اسلامی کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ ۱۴ اگست کو جس دن پاکستان کو آزادی ملی وادی میں جابجا چراغاں ضرور ہوتا۔ اگر پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہندوستان کی ٹیم پر فتح حاصل کرتی تو وادی میں بڑی خوشیاں منائی جاتیں۔ فاروق عبداللہ اندرا گاندھی کی مدد سے برسرِ اقتدار آئے اور اندرا جی نے بعد میں ان کو برطرف کرا کے غلام محمد شاہ کو وزیرِ اعلیٰ بنوایا۔ حالاں کہ اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس وقت گورنر بی۔ کے نہرو

اس اقدام کے خلاف تھے اس لیے ان کا تبادلہ گجرات کر دیا گیا۔ اس وقت بعض دوستوں کے کہنے پر میں بھی اندرا گاندھی سے ملا تھا اور ان سے کہا تھا کہ فاروق عبداللہ کو اس طرح نہ ہٹایا جائے کیوں کہ اسمبلی میں اکثریت اُن کے ساتھ ہے۔ مگر وہ نہیں مانیں۔ وہ فاروق عبداللہ سے بہت ناراض ہو گئی تھیں۔

راجیو گاندھی نے جب یہ دیکھا کہ فاروق عبداللہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو انھوں نے ۱۹۸۵ کے انتخابات میں نیشنل کانفرنس سے سمجھوتہ کیا۔ فاروق عبداللہ مخلص آدمی ہیں وہ ہندوستان سے الحاق کو تسلیم کرتے ہیں اور اُن عناصر کے مخالف ہیں جو پاکستان نواز ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ادھر چند سالوں میں ان کی اور نیشنل کانفرنس کی مقبولیت کم ہو گئی ہے۔ اور اب تو لوگ کھلم کھلا شیخ صاحب کی قیادت پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔ حال میں وادی میں بے چینی اور شورش بڑھ گئی ہے۔ آتش زنی اور بم کے دھماکوں کے واقعات اکثر ہوتے ہیں۔ پاکستان کے کچھ تربیت یافتہ عناصر اب وادی میں انتشار پھیلانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ حال میں لداخ میں بودھوں اور مسلمانوں کے درمیان بھی فسادات ہوئے اور ایک حلقے سے یہ مطالبہ بھی اٹھا کہ لداخ کو مرکز کی تحویل میں دیدیا جائے۔ جموں کے علاقے میں کشمیر کی بالادستی کے خلاف پہلے سے جذبہ ہے۔ جموں والے یہ بات بھولنے کو تیار نہیں کہ پہلے وہ پوری ریاست کے حکمراں تھے۔ جموں کے علاقے میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی بھی ایک تہائی آبادی ہے۔ کشمیر کی وادی میں ۹۵ فی صد مسلمان ہیں۔ لداخ میں بودھ کچھ اکثریت میں ہیں۔ عمومی طور پر ریاست میں دو تہائی کے قریب مسلمان ہیں۔ میرے نزدیک کشمیر کے مسئلے کا حل یہ ہونا چاہیے کہ تینوں خطوں، لداخ، کشمیر، جموں میں علاقائی کونسلیں قایم کی جائیں جو اپنے اپنے علاقے کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کریں۔ ان علاقائی کونسلوں کے کام کی نگرانی ایک ریاستی کونسل کرے جو ہر علاقے کی آبادی کے لحاظ سے نمایندوں پر مشتمل ہو۔ پوری ریاست میں اندرونی خود مختاری ہو۔ اندرونی خود مختاری کا اصول ویسے بھی تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ ہمارا دستور وفاقی ہے۔ وفاق میں ریاستوں کو اگر اپنے اندرونی معاملات میں اور آزادی دی جائے تو علاقے کے تشخص کی حفاظت ہو جائے گی اور پھر یہ تشخص ایک بڑے ملکی و قومی تشخص سے ہم آہنگ ہونے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گا۔ کشمیری اتنے پاکستان نواز نہیں جتنے ہندوستان مخالف ہیں۔ ہندوستان میں جب فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہیں تو

قدرتی طور پر کشمیری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پہلے جن سنگھ اور اب بی۔ جے۔ پی کشمیر کے تشخص کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اب بھی بی۔ جے۔ پی کا یہ مطالبہ ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کو حذف کیا جائے۔ کانگریس اور بائیں بازو کی جماعتیں اور جنتادل اگرچہ دفعہ ۳۷۰ کے باقی رکھنے کے حق میں ہیں مگر وہ یہ غور نہیں کرتیں کہ جب تک ۳۷۰ کو اور مضبوط نہ کیا جائے اور ریاست کو اندرونی آزادی نہ دی جائے اس وقت تک کشمیر میں عوام کو یہ خطرہ رہے گا کہ ہندوستان ہماری ساری خصوصیات کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ ریاست کا جو حصہ ہندوستان میں ہے وہ ہندوستان کے ساتھ رہے جو آزاد کشمیر کہلاتا ہے وہ پاکستان کا حصہ تسلیم کیا جائے۔ جنگ بندی لائن کو بین الاقوامی سرحد مان لیا جائے۔ ریاست جموں و کشمیر اپنی اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کے ساتھ ہو۔ آزاد کشمیر پاکستان کے ساتھ رہے۔ ہونا بالآخر یہی ہے مگر قوموں کی تاریخ میں سیدھی سادی، سامنے کی، اور عملی بات پر لوگ متفق نہیں ہوتے۔ ہمارے برصغیر میں انتہاپسندی، تشدد اور تنگ نظری کا دور دورہ ہے۔ حالاں کہ دنیا کی دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے کے قریب آرہی ہیں، اور نیوکلیائی ہتھیاروں پر پابندی کے منصوبے بن رہے ہیں۔ مگر ہندوستان اور پاکستان میں ابھی تک خاصی ذہنی خلیج حائل ہے۔ بالآخر دونوں کا مفاد ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیتے ہوئے ایک دوسرے کے تعاون میں ہے۔ یورپ کے ملک اب ایک یورپین برادری میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اُن کے یہاں ایک کرنسی اور ایک پارلیمنٹ کے منصوبے بن رہے ہیں۔ ہمارے علاقے کے ممالک اگر ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور ایک دوسرے سے مل کر رہنا سیکھ لیں تو جنوبی ایشیا تیسری دنیا ہی نہیں عالمی برادری میں بھی ایک نمایاں رول ادا کر سکتا ہے۔

کشمیر کو جموّں کی ضرورت ہے۔ جموّں کے راستے سے ہی کشمیر میں ضرورت کی بہت سی اشیا پہنچ سکتی ہیں۔ جموّں کو کشمیر کی ضرورت ہے۔ کشمیر کی مصنوعات جموّں کے راستے سے ہی دنیا کو جاتی ہیں۔ جموّں کشمیر کی جنت کا پھاٹک ہے اور کشمیر کی نعمتوں کے دنیا تک پہنچنے کا وسیلہ سال میں چھ مہینے ریاست کا صدر مقام سری نگر ہوتا ہے اور چھ مہینے جموّں۔ یہ دونوں کے ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہونے کی ایک علامت ہے۔

کشمیر کی سرکاری زبان اُردو ہے گو یہ ریاست کے بہت کم لوگوں کی مادری زبان ہے کشمیر میں کشمیری، جموں میں ڈوگری اور لداخ میں لداخی بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑی، پنجابی اور بالتی کا بھی کچھ خطوں میں چلن ہے۔ مگر ریاست کے تینوں خطوں کے لیے رابطے کی زبان اُردو ہی ہے۔ اسی لیے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انیسویں صدی کے آخر میں اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ کشمیر میں دفاتر کا سارا کام اب تک انگریزی میں ہوتا ہے مگر وہاں سے اُردو کے اخبار بڑی تعداد میں نکلتے ہیں۔ ان میں آفتاب اور سری نگر ٹائمس کی اشاعت خاصی ہے۔ کشمیر کی ترقی پر ادھر خاص توجہ کی گئی ہے۔ جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز ریاست کی سبھی زبانوں کے ساتھ اُردو کی ترقی کے لیے بھی کام کر رہی ہے۔ اس کا رسالہ شیرازہ اُردو کے اہم رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔ کشمیر میں غلام رسول نازکی، فیصر قلندر، فاروق نازکی، حکیم منظور جیسے شاعر اور علی محمد لون، حامدی کشمیری، شمیم احمد شمیم اور یوسف ٹینگ جیسے ادیب اور نثر نگار ہیں۔ فارسی شعر و ادب کی روایت تو صدیوں پرانی ہے۔ میں آخر مارچ ۱۹۸۰ء میں آنکھوں کا آپریشن کرانے علی گڑھ آیا تھا۔ پھر ستمبر میں وہاں گیا اور کتابیں اور سامان لے کر اکتوبر ۱۹۸۰ء میں علی گڑھ واپس آیا۔ تقریباً دس سال کے وہاں کے قیام کی شیریں یادیں میرے حافظے کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۹ء میں کشمیر یونیورسٹی کے کانووکیشن میں مجھے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔ میری خدمات کا یہ اعتراف میرے لیے قابلِ قدر ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کا جو پودا میں نے لگایا تھا خدا کرے وہ ترقی کرے اور اس کے علمی معیار عالمی معیاروں کے مطابق ہوں بہر حال میں تو قانونِ باغبانیِ صحرا کا قایل ہوں ؎

"لہو کی چند بوندیں میں نے بکھرائی ہیں راہوں میں
نہ جانے کس شگوفے کو بہاروں کا سلام آئے"

(سرور)

حرفِ آخر

جب سے کشمیر سے واپس آیا ہوں پرانے کاغذات کے انبار یعنی اپنے مضامین کے مسودے، اشعار، اپنے نام مشاہیر اور ہم عصروں کے خطوط تلاش کر کے یکجا کر رہا ہوں۔ میری بیوی کو شکایت ہے کہ میں کباڑ جمع کرتا رہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں دوسروں کی طرح پرانے خطوط جلسوں کے نوٹس، روداد یں، قرارداد یں وغیرہ ضایع نہیں کرتا۔ یہ ضرور ہے کہ علی گڑھ سے رام پور وہاں سے لکھنؤ، لکھنؤ سے پھر علی گڑھ آنے میں اور علی گڑھ میں کئی بار مکان بدلنے میں کاغذات خاصے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مضامین اشعار اور اہم خطوط اب یکجا ہو گئے ہیں۔ ان پارہ ہائے لخت لخت کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرا نامۂ اعمال خاصا سیاہ ہے۔ میں نے ہزاروں صفحے لکھے ہیں۔ انگریزی میں بھی متعدد مضامین ہیں۔ اب اٹھتّر برس کی عمر میں یہ کوشش ہے کہ کام کی چیزیں سب کتابی صورت میں آجائیں۔ دیکھنا ہے کہ اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔ یہ کمزوری اب بھی باقی ہے کہ اگر کسی نئی اور اہم کتاب کا علم ہوتا ہے تو فوراً پڑھنا چاہتا ہوں، کوئی ممتاز عالم یا ادیب یا اسکالر کوئی مقالہ پڑھے یا تقریر کرے تو اس کے سننے کی خواہش ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی کمزوری یہ تھی کہ وہ لکھنے پر مشکل سے اپنے کو آمادہ کر پاتے تھے۔ جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا تھا تو لکھنے بیٹھتے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کی یہ تحریریں بھی اُن کے تابندہ ذہن اور شگفتہ اسلوب کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی تھیں۔ مجھ میں بھی یہ کمزوری ہے کسی موضوع پر لکھنا ہو تو اس کے لیے مطالعہ خاص توجہ سے کرتا ہوں۔ مختلف پرچوں پر نوٹ بھی لیتا رہتا ہوں۔ لکھنے بیٹھتا ہوں تو پہلے دو ایک صفحے پھاڑنے پڑتے ہیں۔ کیوں کہ اس آغاز سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اگر دو تین صفحے ہو گئے تو پھر مضمون مکمل کرنے کی دُھن سوار ہو جاتی ہے اور دو تین دن میں مضمون مکمل ہو جاتا ہے۔ یاد آتا ہے کہ ایک عرصے تک میں نے شام سے بیٹھ کر چھ سات گھنٹے میں مضمون مکمل کیا ہے۔ اب آنکھ کے آپریشن کے بعد اور عمر کے تقاضے کی بنا پر یہ کام دو تین دن میں

ہو پاتا ہے۔ میرا خط پہلے ہی اچھا نہ تھا اب تو کچھ اور جناتی ہو گیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایک دفعہ میرا ایک مضمون دیکھ کر کہا تھا کہ آپ کی تحریر پڑھنے کے لیے صرف اُردو رسم خط سے واقفیت کافی نہیں کچھ ذہانت کی بھی ضرورت ہے۔ میں اُن لوگوں پر رشک کرتا ہوں جو صاف اور خوش خط لکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق، سکندر علی وجد، نورالحسن ہاشمی کی تحریر مجھے بڑی بھلی لگتی ہے۔ رشید صاحب کا خط پختہ تھا مگر اس کا پڑھنا آسان نہ تھا۔ راجندر سنگھ بیدی کا خط بھی اسی قبیل کا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط میں دو تین بار کوشش سے پڑھ لیتا تھا۔ پہلی قرأت میں شاید ہی کوئی اسے پڑھ پاتا ہوگا۔ دراصل میری طبیعت میں صبر نہیں ہے۔ خوش خطی کی مشق مجھے بھی مکتب میں کرائی گئی تھی مگر میری جلد بازی کی وجہ سے یہ رائگاں گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ صاف اور قدرے جلی تحریر لکھنے والے کی سیرت کی کشادگی کی دلیل ہے اور باریک عبارت اور بدخطی ذہن کی پراگندگی کی۔ خدا جانے یہ بات کس حد تک صحیح ہے۔

پہاڑوں سے مجھے شروع سے عشق رہا ہے۔ میل ول MELVILE تو انسان کے لیے سمندر کی کشش کا بڑے مزے سے ذکر کرتا ہے۔ میرے لیے پہاڑوں میں زیادہ کشش ہے۔ مجھے اُن کی آغوش میں سکون ملتا ہے۔ طبیعت کو ایک شادابی حاصل ہوتی ہے۔ برف پوش چوٹیوں کا نظارہ روح کو پرواز پر مائل کرتا ہے۔ چٹانوں میں سے ہو کر تیز اور پر شور موجوں کا سکڑنا، سمٹنا، پھیلنا اور آگے بڑھنا وجد میں لاتا ہے۔ اگر ندی پر شور نہیں ہے بلکہ ایک شیریں نغمے کے ساتھ ترل ترل بہ رہی ہے تو ورڈزورتھ کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے۔ BEAUTY BORN OF MURMURING SOUND دیودار کے جھنڈ کے جھنڈ کہہ رہے ہیں کہ ہماری طرح تم بھی آسمان سے باتیں کرو۔ دریا کے کنارے دور تک خودرو پھول، رنگ اور خوشبو پھیلاتے ہیں۔ یہ نظارے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم اور روح دونوں نے غسل کیا ہے۔ ذہن سے سارا زنگ دور ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ حسن زندگی کا ایک نیا عرفان عطا کرتا ہے۔ فطرت کی آغوش میں دم لے کر ہم پھر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پہلگام، چندن واڑی، شیش ناگ، کلڑ ناگ، اچھ بل، گلمرگ، کھلن مرگ، کنگن، سونا مرگ، باتل، زوجی لا، مٹاین میری روح میں آج بھی بسے ہوئے ہیں۔ میں نینی تال، مسوری، شملے، اوٹی بھی گیا ہوں مگر یہاں عروس فطرت کی ایک آدھ ہی جھلک

نظر آتی ہے۔ حُسن بے پروا کی وہ بے حجابی جس کا اقبال نے اپنے ایک شعر میں ذکر کیا ہے کشمیر ہی میں دیکھنے کو ملے گی۔

میرے پہلے مجموعے سلسبیل کے بیشتر اشعار کشمیر میں ہی کہے گئے۔ یاد آتا ہے کہ کشمیر سے آکر مجاز کو سونا مرگ پر ایک نظم سُنائی تھی اس شعر پر پہنچا تو وہ اُچھل پڑے ؂

دوڑے تو دوڑ جائے دو عالم میں سیلِ غم

لیکن نگاہِ بد سے یہ جلوہ بچا رہے

سلسبیل ۱۹۳۵ء میں شایع ہوئی۔ اس پر نیاز فتح پوری، اصغر گونڈوی اور پطرس نے بڑے اچھے تبصرے کیے تھے۔ ہاں اختر حسین رائے پوری نے ناخدا کے نام سے رسالہ اُردو میں جو ریویو لکھا اس میں صرف ایک نظم ایورسٹ کی تعریف کی تھی۔

رشید صاحب سے قربت بڑھی تو اُن کے یہاں بہت سے ادیبوں اور علما سے ملاقات ہوئی۔ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، اصغر گونڈوی، ذاکر صاحب اور عابد صاحب، جوش اور جگر اُن کے یہاں آئے دن مہمان ہوتے۔ ان میں سے ذاکر صاحب اور عابد صاحب سے دل زیادہ ملا۔ رشید صاحب ڈاکٹر ضیاء الدین کے حامیوں میں تھے۔ ذاکر صاحب اُن سے اختلاف رکھتے تھے۔ مگر چونکہ رشید صاحب اور ذاکر صاحب طالب علمی کے زمانے سے گہرے دوست تھے اس لیے اس اختلاف کا دونوں کے خلوص و محبت پر کوئی اثر نہ تھا۔ ذاکر صاحب آتے تو دنیا بھر کے مسایل پر باتیں ہوتیں۔ عابد صاحب ہکلے تھے۔ اُن کا ذہن بڑا مرتب تھا کوئی مسئلہ ہو وہ بڑی پر مغز گفتگو کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی لفظ پر اٹک جاتے تو اُسے کوشش کر کے نکال ہی لیتے تھے۔ آخر عمر میں یہ مرض کم ہو گیا تھا اور وہ چھوٹی چھوٹی تقریریں بھی کرنے لگے تھے۔ ایک دن پہلگام میں دس دن اُن کا ساتھ رہا۔ وہ اس زمانے میں کانٹ کی مشہور کتاب CRITIQUE OF PURE REASON تنقیدِ عقلِ محض کا جرمن سے اُردو میں ترجمہ کر رہے تھے۔ میں اس بات پر حیرت کر رہا تھا کہ وہ خاصی تیزی سے ایک جملے کا ترجمہ دوسری زبان کے ایک جملے میں کر لیتے تھے۔ نہ سوچنا، نہ کوئی لغت دیکھنا۔ شعر جب ترنم سے پڑھتے تھے تو نہ معلوم کیسے ہکلاہٹ غائب ہو جاتی تھی۔ عابد صاحب باقاعدہ روزانہ کام کرنے کے عادی تھے۔ ذاکر صاحب

علی گڑھ کے بہترین طالب علم، بہترین مقرر اور طلبا کے مقبول رہنما تھے۔ کورس کی کتابیں کم پڑھتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی چیزیں زیادہ۔ اُن کے ایک ساتھی پروفیسر حبیب الرحمان نے مجھ سے بیان کیا کہ بی۔ اے میں انھوں نے بڑی محنت سے ہر مضمون کے نوٹس تیار کیے تھے یہ دیکھ کر کہ ذاکر صاحب نے کچھ پڑھا نہیں ہے اور امتحان سر پر ہے انھوں نے اپنے نوٹ ذاکر صاحب کو پڑھنے کو دے دیے۔ نتیجہ نکلا تو ذاکر صاحب فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ حبیب الرحمان سکنڈ ڈویژن میں۔ جب گاندھی جی اور مولانا محمد علی علی گڑھ کے طلبا کو ترکِ موالات کی دعوت دینے آئے تو شروع میں ذاکر صاحب پر اُن لوگوں کی جذباتی اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا۔ رشید صاحب کی روایت یہ ہے کہ مولانا شوکت علی کی آخری تقریر نے اُن پر اثر کیا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے ڈاکٹر صاحب کو سمجھایا تھا کہ اُن کی نامزدگی ڈپٹی کلکٹری کے لیے ہو سکتی ہے۔ اس کا اُلٹا اثر ہوا بہرحال ذاکر صاحب نے علی گڑھ کو خیرباد کہا اور جامعہ کے قافلے میں شامل ہو گئے۔ رشید صاحب نے ایک دفعہ یہ بھی بتایا تھا کہ انھوں نے اور کچھ اور دوستوں نے ذاکر صاحب کو آئی سی ایس کے ایک انٹرویو کے لیے کسی طرح راضی کر کے بھیج دیا تھا۔ مگر وہاں ذاکر صاحب کے بجائے خورشید احمد خاں (صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بیٹے) کا انتخاب ہوا۔ اچھا ہی ہوا۔ ذاکر صاحب تو دراصل قومی تعلیم کے تجربے کو کامیاب بنانے اور نئی نسل کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کرانے کے لیے موزوں تھے۔ مجھے خواجہ منظور حسین کے فیض سے ادب میں قدروں کا احساس ہوا۔ رشید صاحب سے ہمدردی اور ادبی بصیرت ملی۔ اور ذاکر صاحب سے زندگی کو بامعنی بنانے اور روشن خیالی کو عام کرنے کا جذبہ۔ ذاکر صاحب سے مل کر مجھے زندگی، تعلیم، تہذیب، مشرق، مغرب، علم و ادب کے اسرار و رموز کا بہتر علم ہوا۔ وہ کبھی اپنی علمیت کا رعب نہیں جماتے تھے۔ نہ آسمان سے بات کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جس سے بات کر رہے ہیں اس کے تجربے میں شرکت کر رہے ہوں۔ میں نے بہت سے بڑے آدمی ایسے دیکھے جو مخاطب کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس دلاتے تھے۔ ذاکر صاحب سے بات کرنے کے بعد آدمی اپنے کو کچھ بلند محسوس کرتا تھا۔ اُن کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ ملنے والے سے پوچھتے کہ آج کل کیا پڑھ رہے ہو یا کیا لکھ رہے ہو، پھر اُن کتابوں کی بات کرتے جن کا ذکر آ جاتا۔ ذاکر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا مگر وہ یہ بات ظاہر نہ کرتے اور کتابوں پر قدرے تفصیل سے رائے زنی چاہتے۔ غرض باتوں

باتوں میں ملنے والا بہت کچھ سیکھ لیتا تھا۔ ڈاکر صاحب بڑے اچھے مقرر بھی تھے۔ تقریر میں بہتے ہوئے دریا کی روانی کا نہیں بلکہ رہ رہ کر شعاعیں دینے والے شیشے کا احساس ہوتا تھا۔ رشید صاحب کا مطالعہ گہرا نہ تھا مگر ان میں ایک نکتہ سنجی تھی۔ فارسی ادب اور کلاسیکی اُردو ادب کے مطالعے نے اُن میں ایک رچا ہوا مہذب شعور پیدا کر دیا تھا۔ مگر جدید ادب اور جدید میلانات سے انھیں زیادہ واقفیت نہ تھی۔ ان کے یہاں معلومات پر کبھی توجہ نہ رہی۔ "تاثرات پر اور کیفیات پر ہمیشہ رہی۔ وہ خاصی جاندار نثر لکھتے تھے اور غالب یا کلاسیکی ادب کے کسی حوالے سے اُسے اور بلیغ بنا دیتے تھے۔ دراصل وہ ایک انشائیہ نگار، مزاح نگار اور طنز نگار تھے۔ مضامینِ رشید اور خنداں اُردو میں طنز و ظرافت کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ گنجہائے گراں مایہ اور ہم نفساں رفتہ میں جو خاکے ہیں وہ اُردو میں مرقع نگاری کے معیاری نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں جذباتیت بھی ہے۔ جا بجا ہیرو پرستی بھی مگر شخصیتوں کے بڑے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ یہ ایک طور سے پنسل سے بنائے ہوئے ہلکے گہرے آڑے ترچھے نقوش ہیں جو بہت سی روغنی تصویروں پر بھاری ہیں۔ ایم۔ اے۔ او کالج کی زندگی کو جس طرح انھوں نے اپنی یادوں کے جادو سے ایک جام جہاں نما بنا دیا ہے وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ علی گڑھ کے قصیدہ گو بھی ہیں اور غزل گو بھی۔ اُن کے خطوط بھی اُن کی شخصیت کی طرح رنگا رنگ ہیں۔ وہ خط نہیں لکھتے تھے مکتوب الیہ پر صوفیا کی اصطلاح میں توجہ ڈالتے تھے۔ انھیں اپنے خطوط کی اشاعت اس لیے پسند نہ تھی کہ ان میں وہ بعض اوقات اشخاص اور مسائل کے سلسلے میں بے تکلف اظہارِ خیال کرتے تھے۔ ویسے زندگی میں بہت محتاط رہتے تھے اور با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا کے قایل تھے۔ آخری دور میں بیماری اور تنہائی نے انھیں کچھ مردم بیزار سا کر دیا تھا۔ لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ جلد پُرانے ساتھیوں سے بدگمان بھی ہو جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے طالب علموں کی بہت مدد کی۔ مگر ایسا بھی ہوا کہ بعض لوگوں نے اُن کی خوشامد کر کے اپنا کام نکال لیا اور بعض زیادہ صلاحیت کے لوگ محروم رہ گئے۔ ان کی خواہش کے احترام میں اُن کے وہ خطوط جو انھوں نے مجھے لکھے تھے میں نے اُن کی زندگی میں شایع نہیں کیے۔ مگر اب جب کہ اُن کے خطوط کے چار مجموعے شایع ہو چکے ہیں ان کے خطوط جن کی تعداد دو سو سے زیادہ ہی ہے جلد ضروری حواشی کے ساتھ شایع

کرنے کا ارادہ ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین علی گڑھ کے بہت سے اشخاص کے ہیرو رہے ہیں مگر اُن کے علمی ریکارڈ اور علی گڑھ سے ان کی محبت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی میں اُن کا معتقد نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین بڑے ان تھک آدمی تھے مگر اصولوں کے زیادہ قایل نہ تھے اور شعر و ادب کی اُن کے نزدیک صرف یہی اہمیت تھی کہ معزز مہمانوں کے سپاس نامے اور قصیدے، اُردو میں ضروری سمجھے جاتے۔ ہر انتخاب میں ان کی پارٹی کی فتح ہوتی تھی۔ ماتحتوں سے وہ مکمّل وفاداری چاہتے تھے۔ قومی تحریکوں میں انھوں نے بہت کم حصّہ لیا۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے کہ میں ہندوستان ٹائمس اس لیے پڑھتا ہوں کہ اس کے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ سمجھوں۔ بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے علی گڑھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ ان کے خلوص میں شبہ نہیں۔ علی گڑھ سے اُن کی محبت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر انھوں نے علی گڑھ کا علمی معیار بلند کرنے میں، علی گڑھ میں سیرت و اخلاق کی درستی میں، زندگی کی اعلیٰ قدروں کی ترویج میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ چند ملازمتیں فراہم کرنے میں، پروپگنڈا اور پبلسٹی میں زیادہ۔ یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے انجینیرنگ کالج کی بنیاد رکھی اور میڈیکل کالج کے لیے وسیع پیمانے پر چندے کی مہم شروع کی۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ ادارے کسی طرح وجود میں آجائیں معیاروں کو وہ چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ وہ انگریز پرست تھے اور ان کا ذہن نوآبادیاتی تھا۔

یہاں علی گڑھ کے چند ایسے اساتذہ کا ذکر بھی ضروری ہے جو اس زمانے میں شہرت رکھتے تھے۔ اُن میں پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، پروفیسر محمد حبیب، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ظفر الحسن، میاں محمد شریف اور حیدر خاں یونیورسٹی کی ذہنی زندگی میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ابوبکر احمد حلیم جہان آباد بہار کے رہنے والے تھے۔ نہایت نفیس اور نپی تلی انگریزی میں ٹھہر ٹھہر کر تقریر کرتے۔ یونین کے اکثر مباحثوں میں وہ اور ریمس باتھم (RAMS BOTHAM) پرو وائس چانسلر یا تو کسی تجویز کے محرک ہوتے یا مخالف۔ ڈسپلن کے خاصے قائل تھے۔ مزاج میں تھوڑی سی صاحبیت تھی مگر ساتھیوں اور اچھے طلبا کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ پروفیسر محمد حبیب ایک مورخ کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ قوم پرست خیالات کے تھے۔ طلبا سے بڑی محبت کرتے تھے اور

مستحق اور غیر مستحق سبھی طلبا کی مدد کرتے رہتے تھے۔ جب اولڈ بوائز نے آفتاب ہوسٹل بنایا تو اس کے پہلے اعزازی پرووسٹ حبیب صاحب ہی تھے۔ اس میں زیادہ تر فرسٹ ڈویژن لانے والے اور مالی امداد کے مستحق طلبا رکھے جاتے تھے۔ حبیب صاحب کے پاس جو جاتا اس کی سفارش کر دیتے۔ میں جب آفتاب ہال کا پرووسٹ ہوا تو ایک جگہ کے لیے میرے پاس ان کی چھ سفارشیں آئیں۔ میں یہ سب لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپ ان میں سے جس کو ترجیح دیں اُسے لے لوں۔ حبیب صاحب نے بڑی معصومیت سے فرمایا کہ بھائی مجھ سے کسی سے انکار نہیں کیا جاتا تم ان میں سے جسے لے سکو لے لو۔ حبیب صاحب بڑی اچھی انگریزی لکھتے تھے اور ان کا خط بھی خاصا خوبصورت تھا۔ سیّدین صاحب تقریر اور تحریر دونوں میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ماہر تعلیم کی حیثیت سے اُن کا خاصا نام تھا۔ زندگی بڑی باقاعدہ تھی۔ پابندی سے اسٹاف کلب میں ٹینس کھیلتے مگر گپ شپ کے لیے نہیں ٹھہرتے تھے۔ اُن کا ادب کا مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا۔ اُن کے زمانے میں ٹریننگ کالج پورے ملک میں مشہور تھا۔ حبیب الرحمان، بشیر احمد ہاشمی جیسے ساتھیوں کی وجہ سے ادارے کا خاصا نام تھا۔ ذاکر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ راس مسعود کے بھی شیدائی تھے۔ ڈاکٹر ظفر الحسن فلسفے کے پروفیسر تھے۔ اُن کے REALISM پر آکسفورڈ کے مقالے کا خاصا چرچا تھا۔ مگر علمی سرگرمیوں میں انھیں کم شریک دیکھا۔ ایک خاص حلقے کے پیر و مرشد تھے۔ اُن کا جادو میرے خالہ زاد بھائی اور دوست ڈاکٹر افضال حسین قادری پر چل گیا تھا۔ انھیں کے اثر سے ڈاکٹر افضال حسین قادری جو ایک ممتاز سائنس داں تھے مسلم لیگ کے ایک سرگرم ممبر رہے اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہندوستان کی تقسیم کی ایک اسکیم بھی بنائی۔ آزادی اور تقسیم کے بعد دونوں پاکستان چلے گئے۔ میاں محمد شریف فلسفے میں ریڈر تھے۔ علی گڑھ میں اُن کی شہرت ایک اچھے منتظم کی تھی۔ بعد میں انھوں نے جمالیات اور اقبال پر لاہور جاکر خاصا اہم کام کیا۔ حیدر خاں علی گڑھ کی بڑی دلچسپ شخصیت تھے۔ علی گڑھ کے عاشق تھے۔ طلبا سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے مگر اُن کو اپنے پٹھانی لہجے میں ڈانٹتے بھی بہت تھے۔ کیمسٹری کے بڑے اچھے استاد تھے مگر ریسرچ وغیرہ کی انھیں فرصت نہ تھی۔ اُن کا زیادہ وقت انتظامی معاملات کے سلجھانے میں گزرتا تھا۔ بلا کے صاف گو آدمی تھے۔

کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ سوا اپنی بیگم ممتاز جہاں پرنسپل ویمنس کالج کے۔ محبت کی بات بھی اس طرح کرتے جیسے لڑ رہے ہوں۔ انھیں کے متعلق رشید صاحب کی روایت ہے کہ ترکِ موالات کے زمانے میں جب کسی نے ان سے سوال کیا کہ اگر خانہ کعبہ اور علی گڑھ دونوں پر بم گرنے والا ہو تو آپ کس کو بچائیں گے؟ حیدر خاں کا جواب تھا علی گڑھ کو۔ میں نے بہت سے عاشق دیکھے ہیں مگر حیدر خاں اور رشید صاحب کا سا علی گڑھ کا عشق کسی میں نہیں دیکھا۔

رام پور میں میرا قیام کوئی ڈیڑھ سال ہی رہا۔ اس زمانے کے اہم واقعات پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ مگر چند شخصیتوں کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ ان میں سب سے اہم جناب امتیاز علی خاں عرشی ہیں۔ عرشی صاحب سے ملاقات تو پہلے سے تھی مگر ان کی گوناگوں صفات کا احساس رام پور میں ہوا۔ عربی، فارسی اور اردو کے ایک بلند پایہ عالم اور محقق ہونے کے علاوہ وہ رضا لائبریری کے لائبریرین ہی نہ تھے ایک چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ وہ بڑے اچھے دوست اور بڑے بلند پایہ ساتھی اور رفیق تھے۔ قدامت کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ کٹر اور تنگ نظر نہ تھے۔ وہ کھرے پٹھان تھے مگر ان میں بعض پٹھانوں کی خشونت اور جذباتیت نہ تھی۔ دستور الفصاحت مکاتیب غالب بنام نواب یوسف علی خاں اور کلب علی خاں، رضا لائبریری کے عربی مخطوطات کی فہرست اور پھر دیوانِ غالب (نسخہ عرشی) ان کے بڑے کارنامے ہیں جو زندہ رہیں گے۔ معمولی استفساروں کے جواب جس توجہ اور تفصیل سے دیتے تھے اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ کچھ حلقوں میں نسخہ بھوپال کے متعلق شبہ کیا گیا تھا کہ یہ غالب کے اپنے خط میں نہیں ہے۔ مگر عرشی صاحب نے غور کر کے یہ فیصلہ کیا کہ یہ غالب ہی کا خط ہے۔ اس کے بعد اس میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ ایک دفعہ بریلی کے ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ ان کے پاس سودا کا ایک دیوان ان کے اپنے خط میں ہے۔ میں نے عرشی صاحب کو لکھا۔ انھوں نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر مدعی نے مکمل سکوت اختیار کیا۔ عرشی صاحب کے مزاج میں ایک ہلکی سی لہر ظرافت کی بھی تھی۔ ایک دفعہ آگرے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا جس میں رام پور سے عرشی صاحب اور میں گئے تھے۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے بعد اس میں کچھ مزا نہ رہا تھا۔ چنانچہ میرے ساتھ یکے بعد دیگرے دو فلمیں دیکھیں۔ رات کو لیٹے ہوئے ایک

سرد آہ بھر کر بولے۔ سرور صاحب کی صحبت میں اب تک دو بلیجر دیکھ چکے ہیں۔ نہ جانے آئندہ کیا حشر ہونے والا ہے۔ مگر میں جب دو دن کے بعد چلا آیا تو ان کا دل بھی نہ لگا اور وہ بھی رام پور واپس آ گئے۔ انجمن کی ۱۹۵۰ء کی کانفرنس میں میری فرمایش پر انھوں نے اپنی برجستہ عالمانہ تقریر سے سماں باندھ دیا تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ مجھے اس کا علم رام پور سے رخصت ہوتے وقت ہوا جب انھوں نے مجھے اپنی دو غزلیں بھیجیں۔

دوسری شخصیت صاحبزادہ واجد علی خاں اثنک کی ہے جو اچھن صاحب کہلاتے تھے۔ یہ نواب صاحب کے رشتہ داروں میں تھے۔ پاک پٹن کے پیر جماعت علی شاہ کے مرید تھے اور ہر سال وہاں کا پھیرا ضرور کرتے تھے۔ شاعری میں محمود رام پوری شاگرد داغ سے تلمذ تھا۔ انھوں نے اپنا ایک شعر ایسا سنایا کہ میں پھڑک اٹھا۔ جب جگر صاحب اور رشید صاحب کو سنایا تو وہ بھی جھومنے لگے۔ شعر یہ تھا ؂

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للہ چلے جائیے مے خانے سے

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شعر اُن کے استاد کا تھا۔ اچھن صاحب بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ اُن کے اشعار میں پختگی اور استادی نمایاں تھی۔ یہ جرمنی میں بھی کچھ مدت تک رہے تھے۔ وہاں ذاکر صاحب سے ملاقات بھی رہتی تھی۔ ذاکر صاحب نے اُن کا ایک قصہ بڑے مزے لے کر سنایا تھا جب جامعہ قرول باغ میں تھی تو گو مالی حالت اچھی نہ تھی۔ مگر ذاکر صاحب نئی نئی اسکیمیں بناتے رہتے تھے۔ طے ہوا کہ مختلف مغربی ممالک پر اُردو میں مکتبہ جامعہ سے کتابیں شایع کی جائیں۔ اٹلی پر لکھنے کی اثنک صاحب نے ہامی بھر لی، اُن کے لیے ایک کمرہ ضروری ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا۔ یہاں اُن کے پاس ملنے والوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب اور حامد علی خاں بھی کبھی جا کر دیکھ لیتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ اُن کے سامنے ایک ڈسک پر ایک موٹی سی کاپی رکھی رہتی تھی جس کے پہلے صفحے پر جلی قلم سے اٹلی لکھا ہوا تھا۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ اثنک صاحب غائب ہو گئے کمرے کا جائزہ لیا گیا تو صرف وہی کاپی ملی جس کے پہلے صفحے پر جلی قلم سے اٹلی لکھا ہوا تھا۔ کاپی کے سارے صفحات خالی تھے۔

رضا انٹر کالج کے استادوں میں ایک نوجوان کیلاش چندر تھے۔ یہ سنسکرت کے جونیر ٹیچر تھے۔ بڑی صلاحیت کے آدمی تھے مگر کوئی انھیں پوچھتا نہ تھا میں نے ان کو سینیر گریڈ دلوایا سنسکرت اور ہندی کے علاوہ اُردو بھی اچھی جانتے تھے۔ موسیقی کے فن پر گہری نظر تھی۔ بعد میں یہ اجاریہ برہاسپتی کے نام سے مشہور ہوئے۔ قرآن شریف کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ موسیقی میں مسلمانوں کے کارنامے پر انھوں نے بہت سے مضامین لکھے۔ ان کے علاوہ حسن عادل اکنامکس کے لکچرر، خلیل اللہ قریشی جغرافیہ کے لکچرر، احمد رضا خاں فزکس کے لکچرر اور حفیظ اللہ لائبریرین یاد آتے ہیں، جن کی صلاحیت، فرض شناسی اور خلوص کی وجہ سے کالج میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں جامعہ ملیہ کی جوبلی کے لیے چندہ اکٹھا کرنے ذاکر صاحب کئی بار آئے۔ ہم لوگوں نے بھی حسبِ توفیق خدمت کی۔ ان کا قیام سیدین صاحب کے یہاں رہتا تھا۔ ملاقات دوسرے تیسرے سیدین صاحب یا زیدی صاحب کے یہاں ہوتی رہتی تھی۔ ایک شام کالج سے واپس آیا تو ذاکر صاحب گھر میں میرے بیوی بچوں سے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے کہا ذاکر صاحب آج ادھر کہاں بھول پڑے۔ ہنس کر بولے سیدین صاحب تو آسمان سے نیچے اترتے ہی نہیں جب دیکھو آفاقی امور کا تذکرہ رہتا ہے میں وہاں سے بھاگ کر آیا ہوں دو تین گھنٹے آپ کے ساتھ گذاروں گا تو زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کی بھی توفیق ہوگی۔ پھر جرمنی میں کام کی لگن، جلد سازی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری کا تذکرہ ہوا۔ میرے اشعار سنے، غالب کے کچھ فارسی اشعار سنائے اور کہنے لگے اب کئی دن تک کائناتی مسائل پر گفتگو ہو تو کوئی حرج نہیں۔

ایک صاحب صدیق علی خاں اور یاد آئے۔ اُن کے ساتھ مزے کی بات ہوئی۔ ان سے پہلی دفعہ ملاقات کسی سرکاری فنکشن میں ہوئی تھی۔ رسمی سی باتیں ہوئی تھیں۔ ایک دن کالج آئے اور مجھ سے کہنے لگے سرور صاحب آپ نے پہلے یہ کیوں نہ بتایا کہ آپ سُنّی ہیں میں تو اب تک آپ کو شیعہ سمجھتا رہا۔ میں نے کہا بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ اس بات کے اعلان کی ضرورت نہ سمجھی کہ میں سُنّی ہوں لیکن آخر آپ کو کیسے خیال ہوا کہ میں شیعہ ہوں۔ کہنے لگے نواب شیعہ، زیدی صاحب شیعہ، سیدین صاحب شیعہ، آپ کا نام بھی شیعوں جیسا ہے میں سمجھا اپنی ہی برادری کے کسی آدمی کو لے

آئے ہوں گے۔ میں نے کہا بھائی میں صدیقی ہوں لیکن جب سے تخلص نام کے ساتھ لکھنے لگا صدیقی نہیں لکھا۔ مولوی عبدالحق نہ جانے کیسے مجھے سید آل احمد سرور لکھنے لگے۔ میں نے مولوی صاحب کو ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ رضا انٹر کالج میں سیرت رسولؐ پر جلسہ نہ ہوا تھا میں نے کرایا اور سعید احمد اکبرآبادی سے تقریر کرائی۔ سید ین صاحب نے جلسے کی صدارت کی۔ میں دراصل شیعہ سُنّی اختلافات کو اچھا نہیں سمجھتا۔ میرے بہت سے گہرے دوست شیعہ بھی رہے ہیں ہندو بھی اور سکھ بھی۔ میرا مسلک صلح کل ہے۔ مجھے اس کا دکھ ہے کہ لکھنؤ میں جہاں ہندو مسلم فسادات کبھی نہیں ہوئے شیعہ سُنّی فسادات اکثر ہوتے ہیں جلسوں اور جلوسوں میں تبرا اور اس کی ضد میں مدحِ صحابہ دونوں سے میرے نزدیک اجتناب کرنا چاہیے۔ اسلام تو ایک انسانی برادری کا پیغام لے کر آیا ہے اس کے پیروؤں میں اتنے تفرقے کیوں؟ مسلمانوں کو اس گروہ بندی سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔

لکھنؤ کے قیام میں جن لوگوں سے قربت رہی ان میں آنند نرائن مُلّا، اثر لکھنوی، مسعود حسن رضوی، علی عباس حسینی، احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی، عبدالاحد خاں خلیل، اجاریہ نریندر دیو، احسن فاروقی، رشید جہاں، چیلاپتی راؤ، ڈی۔ پی۔ مکر جی، ویر بہادر، دیوکی پانڈے، صدیق حسن، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر نسیم بیبی، ڈاکٹر زین العابدین قدوائی، شیام کشن نرائن، قابلِ ذکر ہیں۔ جگر صاحب سے علی گڑھ کے قیام میں مراسم ہو گئے تھے مگر لکھنؤ میں اُن سے بارہا ملنا ہوا اور ان کی سیمابی فطرت، ان کی معصومیت، ان کے خلوص اور وضعداری کا نقش اور گہرا ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے علی گڑھ میں ملاقات ہو چکی تھی لکھنؤ میں کئی بار ملنا ہوا۔ مولانا نے فلسفے اور نفسیات دونوں پر اُردو میں گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔ آخر میں انگریزی میں قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ شروع میں دہریت کی طرف مائل تھے، بعد میں مذہبیت غالب آ گئی۔ مولانا محمد علی کے پرستاروں میں تھے ان کی کتاب "محمد علی - ایک ذاتی ڈائری" ایک پرستار کا خراجِ عقیدت ہے۔ اکبر کے بھی بڑے مدّاح تھے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد خاصی ہے۔ اُن کی خود نوشت صاف گوئی اور ذہانت کی بڑی اچھی مثال ہے۔ مولانا کی شہرت اُن کے ہفتہ وار اخبار 'سچ' اور پھر 'صدق' کے ذریعے ہوئی۔ اُن کے اسلوب میں زبان و بیان کی بہت سی خوبیاں ہیں، مگر اُن کی جذباتیت کی وجہ اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ رعایتِ لفظی کا التزام کچھ زیادہ ہی ہے۔ مولانا کی زندگی میں بڑا ضبط و نظم تھا۔ ایک ایک لمحے کا حساب رہتا تھا۔

ڈاکٹر وحید مرزا، عربی کے شعبے کے صدر تھے، فارسی کے بھی ممتاز اسکالر تھے۔ امیر خسرو پر اُن کی کتاب آج بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ جب لکھنؤ میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس کے فارسی کے شعبے کے صدر کسی وجہ سے نہ آسکے۔ ڈاکٹر وحید مرزا کو اُن کی جگہ صدارت کرنی پڑی، اس موقع پر انھوں نے جو خطبہ پڑھا وہ ہندوستان میں فارسی ادب پر تحقیق کا بہت اچھا جائزہ تھا۔ ڈاکٹر ہادی حسن کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے سبکدوش ہونے کے بعد یہ کوشش کی گئی کہ وحید مرزا صاحب کو چند سال کے لیے علی گڑھ بلا لیا جائے مگر ایسا نہ ہو سکا وہ آخر میں پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اُردو ترجمے کے کام میں پروفیسر محمد شفیع کے جانشین ہوئے۔

نورالحسن ہاشمی علی گڑھ میں میرے شاگرد رہے تھے۔ یہ انگریزی میں ایم۔ اے کر کے لکھنؤ سے آئے تھے۔ ایم۔ اے کے علاوہ دہلی کے دبستانِ شاعری پر اُن کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ بھی میری نگرانی میں پیش کیا گیا تھا۔ اُردو اور فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور انگریزی ادب سے بھی ایک حد تک استفادہ کیا ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں صرف یہی عروض کے بھی ماہر ہیں۔ تنقید سے زیادہ تحقیق سے شغف ہے۔ گو تنقید میں بھی ان کا کارنامہ خاصا وقیع ہے۔ انھوں نے بعد میں فارسی میں بھی ایم۔ اے کیا تھا۔ شعر بھی کہتے ہیں اور ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی شایع ہو چکا ہے۔ انھوں نے انگریزی سے کچھ تراجم بھی کیے ہیں۔ ہومیوپیتھی میں بھی درک رکھتے ہیں۔ میری طرح پان بھی خوب کھاتے ہیں۔ یہ جلسوں اور ہنگاموں سے دور اپنے علمی و ادبی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

عبدالاحد خاں خلیل فارسی اور اُردو دونوں میں ایم۔ اے تھے۔ پہلے کالون کالج میں اُردو پڑھاتے تھے۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں ہمارے شعبے میں آگئے۔ کچھ عرصے بعد اُردو

میں پی۔ ایچ ڈی بھی کر لیا۔ شاہ جہاں پور کے پٹھان تھے۔ مگر مزاج میں نرمی تھی۔ ٹینس کا بہت شوق تھا۔ اسٹاف کلب میں یہ بھی ہمارے مشاغل میں شریک رہتے تھے۔ اسٹاف کلب میں یونیورسٹی کے دوسرے اُستادوں سے گپ شپ کے علاوہ CHINESE CHEQERS جسے میں چینی چکر کہتا تھا اور ٹیبل ٹینس کا دور ضرور ہوتا۔ نعمت اللہ روڈ پر رہتے تھے اور جب میں بیرو روڈ سے نعمت اللہ بلڈنگ آگیا تو یہ میرے پڑوسی بھی تھے۔ اپنے ایک لڑکے کے مرگی کے دوروں کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔ مگر مزاج کی شگفتگی میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔

میں جب لکھنؤ پہنچا تو بشیشر پال سیٹھ وائس چانسلر تھے۔ ان کے بعد غالباً ۱۹۴۹ء میں اچاریہ نریندر دیو وائس چانسلر ہوئے۔ یہ دمے کے مریض تھے اور ہر وقت دوائی کی شیشی جیب میں رکھتے تھے۔ دُبلے پتلے معمولی قد و قامت کے آدمی تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی بے پروا تھے مگر اپنے علم و فضل اور کردار کی بلندی کی وجہ سے ہر جگہ نمایاں رہتے۔ پالی زبان کے اسکالر، تاریخ کے رمز شناس اور ہندی کے ممتاز ادیب تھے۔ اُردو بھی اچھی جانتے تھے اور غالب، انیس اور اقبال کے بہت سے اشعار انھیں یاد تھے۔ وہ جب ہندی میں تقریر کرتے تو اس میں ایک ادبی رنگ ہوتا اور اُردو کی تقریر میں بھی سلاست اور روانی ہوتی۔ مگر نظریاتی طور پر ہندوستانی کے علم بردار تھے۔ چندر بھان گپتا سے خاصی دوستی تھی۔ پہلے کانگریس کے ممتاز رہنما تھے۔ مگر پھر ایک سوشلسٹ رہنما کی حیثیت سے اُبھرے۔ مارکسزم پر عقیدے کے باوجود کمونسٹ نہ تھے۔ کافی ہاؤس اکثر آتے تھے، اور اگر مجھے دیکھتے تو کوئی اچھا شعر سنانے کی فرمائش ضرور کرتے۔ ایک دفعہ آئے اور کافی کی ایک پیالی پی کر چلنے لگے تو میں نے کہا اچاریہ جی ایسی بھی کیا جلدی، کچھ دیر تو اور بیٹھیے۔ کہنے لگے بھائی۔ باہر کار میں چندر بھان گپتا بیٹھے ہیں۔ میرے اصرار کے باوجود کافی ہاؤس نہیں آئے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہاں شراب پی جاتی ہے۔ میں نے کہا تب تو آپ کو انھیں ضرور ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اچاریہ جی جب لکھنؤ یونیورسٹی سے رخصت ہو کر جانے لگے تو انھوں نے مالویہ ہال میں ایک سیاسی تقریر کی جس میں اکبر کے اشعار بڑے موقع سے استعمال کیے تھے۔ بعد میں میں نے پوچھا کہ اچاریہ جی

آج تو آپ نے برسوں کی قسم توڑ دی۔ کہنے لگے وائس چانسلر کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ یونیورسٹی میں کوئی سیاسی تقریر نہ کروں۔ اب تو میں جا رہا ہوں اس لیے آزادی سے ہر بات کہہ سکتا ہوں۔ جب میں نے یونیورسٹی سے استعفا دیا تو انھوں نے دو خط نیشنل ہیرالڈ میں میری حمایت میں لکھے۔ اور یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد پر زور دیا کہ میری خدمات کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

ڈی۔ پی۔ مکرجی لکھنؤ یونیورسٹی کے اُن استادوں میں تھے جن کی پورے ملک میں شہرت تھی۔ میری فرمائش پر انھوں نے اقبال سوسائٹی میں اقبال کے فلسفے پر ایک لکچر دیا جس میں یہ بھی کہا کہ اقبال کے یہاں فکر کی گہرائی ٹیگور سے زیادہ ہے۔ ایک بنگالی کی زبان سے یہ بات بڑی معنی خیز ہے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ بات اقبال کے انگریزی خطبات اور کچھ انگریزی تحریروں کے مطالعے کی بنا پر کہی تھی اور ٹیگور کی ایک ایک سطر پر انھیں عبور تھا۔ یہ کچھ عرصے ریاستی حکومت کے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں بھی کام کر چکے تھے۔ بیورلی نکلس (BEVERLY NICHOLS) نے تو صرف انھیں کو ہندوستان میں دانشور (INTELLECTUAL) پایا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے تو ذاکر صاحب نے انھیں علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں یہ پانچ سال رہے۔ اچاریہ نریندر دیو کے یہ بھی قائل تھے۔ اور چیلاپتی راؤ کے دوست۔ مگر چیلاپتی راؤ اپنی تحریروں میں انھیں کبھی نہیں بخشتے تھے۔ آخر میں کینسر کا مرض ہو گیا تھا اور علی گڑھ سے رخصت ہونے کے تھوڑے دن بعد ہی ان کا دہرہ دون میں انتقال ہو گیا۔

چیلاپتی راؤ سے ملاقات ڈی۔ پی۔ مکرجی کے ذریعے سے ہوئی۔ بڑے عجیب و غریب آدمی تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ عام طور سے عورتوں سے بیزار رہتے تھے کارلٹن ہوٹل میں قیام رہتا تھا۔ صبح دس بجے دفتر آتے اور رات کو دس بجے کے بعد واپس جاتے۔ گلے میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے آواز مستقل بھرائی رہتی تھی اور بات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ہم لوگ اس کے عادی ہو گئے تھے۔ شنکر پلے (مشہور کارٹونسٹ) سے دوستی تھی اور SHANKAR'S WEEKLY میں بھی اکثر لکھا کرتے تھے۔ MAGNUS کے نام سے اُن کے اخبار میں بھی اکثر لکھا کرتے تھے۔ تحریر میں کچھ وکٹورین دور کی انگریزی کا رنگ تھا۔ مگر قلم میں

بڑی جان تھی اور طنز میں بلا کی کاٹ۔ گووند بلبھ پنت کو انھوں نے ہی کمایوں کا آدم خور MAN EATER OF KUMAUN کہا تھا۔ وہ یوپی حکومت کے خلاف اکثر لکھتے رہتے تھے اور پنت جی ان کی شکایت پنڈت جواہر لال نہرو سے کرتے رہتے تھے مگر چونکہ جواہر لال نہرو جانتے تھے کہ چیلاپتی راؤ بڑے پکے قوم پرست اور بڑے کھرے آدمی ہیں اس لیے وہ ان کی شکایتوں کو ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ کسی سے کبھی ملنے نہیں جاتے تھے۔ کسی سرکاری تقریب میں انھیں کسی نے نہیں دیکھا۔ کافی ہاؤس ضرور آتے تھے پانچ بجے کا وقت ان کا چائے کا تھا اور اس وقت ہی اُن کے دوست اُن سے مل سکتے تھے۔ چائے وہ اس طرح انڈیلتے تھے جیسے کافی انڈیلی جاتی ہے۔ اُن کا انجام بڑا عبرتناک ہوا۔ دہلی میں اخبار کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک دوست سے ملنے گئے وہ نہ ملے تو ایک ڈھابے میں پہنچے اور چائے کا آرڈر دیا۔ آرڈر دے کر ایک کرسی سے ٹیک لگائی اور بے ہوش ہو گئے جو لوگ وہاں تھے انھوں نے دیکھا کہ سانس بھی نہیں آرہی ہے تو پولس کو اطلاع کی گئی اور اُن کی لاش مُردہ گھر پہنچا دی گئی، کیوں کہ انھیں کوئی نہیں پہچان سکا تھا۔ اُن کا ڈرائیور کچھ دیر بعد انھیں لینے آیا۔ مگر وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔ پھر کچھ نوجوان اخبار نویسوں نے تلاش شروع کی اور دوسرے دن مردہ خانے سے لاش کو پہچان کر لائے۔ اتنا بڑا صحافی کس کس مپرسی میں مرا ہے۔ یہی دنیا کا رنگ ہے۔

یونیورسٹی میں دو نوجوان استاد اودھ کشور سرن اور ویر بہادر سنگھ مجھ سے اور احتشام صاحب سے خاصے قریب ہو گئے تھے اودھ کشور سرن سوشیالوجی کے استاد تھے۔ ویر بہادر اکنامکس کے۔ سرن وجودیت کے قائل تھے ویر بہادر پرجوش مارکسسٹ۔ مگر دونوں کھرے دوست بھی تھے۔ سرن مزے میں آکر ایک خاص زبان بھی استعمال کرتے تھے۔ مثلاً کسی ممتاز آدمی کو لکیری کہنا یعنی اس کے نام کے نیچے لکیر کھینچی جا سکتی ہے۔ صورت سے حقیر فقیر تھے مگر بلا کا دماغ پایا تھا۔ ویر بہادر تو کام کی گویا مشین تھے۔ ترقی پسندوں کی انجمن کے سارے کاموں میں، پھر استادوں کی ایسوسی ایشن میں ہر طرح کی دوڑ دھوپ کے لیے تیار رہتے

تھے ۔ گورکھپور میں مجنوں کے شاگرد رہے تھے اور اُن کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے استعفا دیا تو انھوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی تھی کہ میرا استعفا منظور نہ ہو اور اس سلسلے میں رات دن ایک کر دیے تھے ۔ بعد میں راجیہ سبھا کے ممبر بھی ہو گئے تھے ۔ افسوس ہے کہ جوانی ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا ۔

دیوکی پانڈے انگریزی کی لکچرر تھیں ۔ الموڑے کی رہنے والی تھیں ۔ اُردو سے بھی دلچسپی تھی اور تہذیبی پروگراموں اور ڈراموں میں اکثر حصّہ لیتی تھیں ۔ اسی وجہ سے اُن سے خاصی دوستی رہی ۔ دُبلی پتلی نازک اندام تھیں ۔ ایک دفعہ ویر بہادر کافی ہاؤس سے انھیں لینے بندریا باغ گئے ۔ واپسی میں رکشہ والے نے دو سواریوں کا کرایہ طلب کیا ۔ ویر بہادر نے کہا بھائی یہ سمجھ لو کہ میں نے واپسی میں ایک اوورکوٹ پہن لیا ہے ۔ بڑی اچھی اداکار تھیں ۔ پیش پال نے ایک ڈراما لکھا تھا ۔ "نشے نشے کی بات" اس میں ہیروئن کا کردار انھوں نے بڑی خوبی سے پیش کیا تھا ۔ میرے علی گڑھ آنے کے بعد انھوں نے کسی پائلٹ سے شادی کر لی پھر اُن کی کوئی خیر خبر نہ ملی ۔

رشید جہاں کا تذکرہ علی گڑھ میں سُنا تھا مگر ان سے ملاقات لکھنؤ میں ہوئی ۔ وہ بیرو روڈ کے قریب ہی پی ۔ این سری واستو روڈ پر رہتی تھیں ۔ اُن کے شوہر محمود الظفر یو پی کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری تھے ۔ رشید جہاں ڈاکٹری بھی کرتیں ۔ افسانے بھی لکھتیں اور پارٹی کا کام بھی کرتیں ۔ وہ واقعی ایک شعلۂ جوالہ تھیں ۔ شیخ عبداللہ بانی گرلز کالج علی گڑھ کی بڑی بیٹی ۔ مزاج میں سیمابیت تھی اور باتوں میں موہنی ۔ ایک مشاعرے میں جگر صاحب کو میں نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلایا تھا ۔ انھیں لینے رشید جہاں کو بھیجا ۔ جگر صاحب جدید تعلیم یافتہ خواتین سے بہت گھبراتے تھے مگر رشید جہاں نے اپنے خلوص سے انھیں بہت جلد رام کر لیا اور وہ بعد میں اُن کی بہت تعریف کرتے تھے ۔ ایک دفعہ میں اُن کی عیادت کو گیا ۔ سخت زکام میں مبتلا تھیں ۔ میں قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔ انھوں نے ڈانٹا کہ دور جا کر بیٹھو ورنہ میرا زکام تمھیں لگ جائے گا ۔ اتنے میں سجاد ظہیر آئے ۔ سجاد ظہیر باتیں بھی ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے ۔ چال بھی نستعلیق ہوتی تھی اور نقل و حرکت میں بھی آہستگی ۔ وہ آئے تو رکشہ والا

پیچھے پیچھے آیا۔ انھوں نے اطمینان سے بیٹھ کر پہلے جیب سے رومال نکالا، اپنا چہرہ پونچھا، پھر دوسری جیب سے بٹوا نکالا اور اطمینان سے رکشہ والے کو دینے کے لیے ریزگاری نکالنے لگے۔ رشید جہاں اس پر آگ ہو گئیں۔ کہنے لگیں کہ کب سے رکشہ والا کھڑا ہے، تمھارے نخرے ختم ہی نہیں ہوتے۔ تمھاری اس سستی کی وجہ سے میں نے تم سے شادی نہیں کی۔ اگر شادی ہو جاتی تو کسی دن میں تمھیں تمھاری اس عادت کی وجہ سے قتل کر دیتی۔ سجاد ظہیر بیٹھے مسکراتے رہے۔

چونکہ میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا سرگرم کارکن تھا اور ہر ہفتے اس کے جلسے میرے گھر پر ہوتے تھے اس لیے رشید جہاں مجھے مارکسسٹ سمجھتی تھیں۔ جب میں نے آنند نرائن ملا کے مجموعۂ کلام "جوئے شیر" پر مقدمہ لکھا تو بہت خفا ہوئیں۔ کہنے لگیں اب آپ ہر چور ان والے کی شان میں قصیدہ لکھا کریں گے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ ترقی پسندی کے معنی مارکسزم نہیں اور گو میرے خیالات بائیں بازو سے زیادہ قریب ہیں مگر میں کمونسٹ نہیں ہوں اور مُلا صاحب کے یہاں جو انسان دوستی ہے وہ میرے نزدیک بڑی قابلِ قدر ہے۔ مگر انھوں نے میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی بس خفا ہوتی رہیں۔ مگر اُن کا غصہ تھوڑی دیر کا ہوتا تھا پھر ملیں تو وہی محبت و خلوص جو اُن کی خصوصیت تھا۔ رشید جہاں سے میری بیوی کی بہت پٹتی تھی۔ دونوں صاف گو ہیں اور لگی لپٹی نہیں رکھتیں۔ اُن سے اکثر بحث ہوتی پھر گھنٹوں دنیا بھر کے مسائل پر باتیں ہوتیں وہ یا تو ہنستی رہتیں یا غصے میں ہوتیں۔ صرف ایک دفعہ میں نے انھیں مغموم دیکھا۔ اُن کی ایک سہیلی کا انتقال ہو گیا تھا وہ بہت رنجیدہ بستر پر دراز تھیں۔ محمود الظفر نے تھوڑی دیر بعد پارٹی کے کسی کام کو کہا۔ انھوں نے کہا کل کروں گی آج میں بہت رنجیدہ ہوں۔ محمود تو گویا مشین ہو گئے تھے، انھوں نے کچھ سمجھانا چاہا تو بڑی نرمی سے کہا آج میں کوئی کام نہیں کر سکتی کل دیکھا جائے گا۔ محمود خاموش ہو گئے۔

وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئیں۔ ایک دفعہ بمبئی جا کر آپریشن کرایا مگر چند ماہ کے بعد مرض عود کر آیا۔ محمود عرصے سے ماسکو جانا چاہتے تھے ظاہر ہے کہ انھیں اس کی اجازت نہ مل سکتی تھی۔ پھر رشید جہاں نے یہ طے کیا کہ وہ ماسکو میں اپنا علاج کرائیں گی اس طرح محمود کو ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ روم ہوتی ہوئی ماسکو پہنچیں مگر وہاں پہنچنے کے چند دن بعد ہی اُن کا انتقال ہو گیا۔ رشید جہاں

کے کچھ افسانے پہلے انگارے میں شائع ہوئے تھے۔ بعد میں اُن کے افسانوں کے دو مجموعے اور شایع ہوئے۔ ان میں خصوصاً متوسط طبقے کی عورتوں کی مظلومیت کی بڑی جاندار تصویر ملتی ہے۔

ڈاکٹر نسیم صُبحی سے بھی لکھنؤ میں دوستی رہی۔ یہ بچوں کے خصوصی معالج تھے مگر عام مریضوں کا بھی علاج کرتے تھے۔ اُن کے والد ڈاکٹر عبدالکریم کی پروفیسر وحیدالدین سلیم سے بہت دوستی تھی اور وہ اکثر عبدالکریم صاحب کے یہاں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ نسیم صُبحی کا نام وحیدالدین سلیم نے ہی رکھا تھا۔ شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ مریضوں کو نمبر سے دیکھتے تھے۔ کیا مجال اُن کا دوست بھی اس معمول میں خلل ڈال سکے۔ ایک دفعہ میری لڑکی انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے رہی تھی آخری پرچہ سر پر تھا کہ اسے بخار آگیا اور نسیم صُبحی کو دکھایا تو انھوں نے یرقان بتایا۔ میں نے صبر کر لیا کہ لڑکی اب آخری پرچہ نہ کر سکے گی اور اس کا سال ضایع ہو جائے گا مگر اس کے روتے پر نسیم صُبحی نے کہا کہ جس طرح بھی ہوگا میں اسے امتحان دلواؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے علاج کے لیے ضروری ہدایات دیں۔ ایک دن کا وقفہ تھا۔ اس میں دو دفعہ نسوں میں گلوکوز کے انجکشن دیے گئے۔ امتحان کی صبح بخار اتر گیا تھا۔ لڑکی کو میں قریب ہی امتحان کے سنٹر لے گیا۔ انھوں نے صرف یہ ہدایت کی تھی کہ بالائی منزل کے بجائے پہلی منزل پر ہی امتحان ہو۔ وہ اور اُن کی بہن عارفہ کافی ہاؤس کے بڑے شوقین تھے۔ پابندی سے دوپہر کو آتے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھتے۔ میری شاعری کے بڑے مدّاح تھے۔ اب انگلستان میں پریکٹس کرتے ہیں۔

میں بعض معاملات میں بہت سست واقع ہوا ہوں بیرورو ڈ کے جس مکان میں رہتا تھا اُسے اس لیے خالی کرنا پڑا کہ مالک مکان اس میں آنا چاہتا تھا۔ جب کچہری کے کارندے آگئے تو جاگا۔ کتابیں اِدھر اُدھر رکھیں اور خود عبدالغنی منیجر جہانگیر آباد ریاست کی توجہ سے کچھ دن کے لیے جہانگیر آباد پیلیس میں اٹھ آیا۔ مہارانی بی۔ اے کا امتحان دے رہی تھیں۔ اور مجھ سے اردو پڑھتی تھیں۔ انھوں نے سامان کے لیے ایک حصّہ خالی کرا دیا اور خود مجھے اور بچوں کو اپنے مہمان خانے میں ٹھہرا دیا۔ میں وہاں ایک ہفتے رہا اور برابر مکان کی تلاش کرتا

رہا۔ بالآخر ڈاکٹر زین العابدین قدوائی نے جو کچہری روڈ پر رہتے تھے اپنے مطب کا بالائی حصّہ مجھے دیدیا مجھ سے کوئی کرایہ بھی نہیں لیا۔ تین مہینے سے زیادہ وہاں قیام رہا۔ ڈاکٹر صاحب ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اور اُردو فارسی کا بہت اچھا مطالعہ تھا۔ بڑی محبت کے آدمی تھے۔ کبھی کبھار قومی آواز میں کسی شاعر پر کوئی اعتراض کر دیا۔ پھر مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اُن کے جوان لڑکے آصف قدوائی مفلوج ہو گئے تھے۔ مگر لیٹے لیٹے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے تھے۔ قدوائی صاحب تن و توش کے آدمی تھے مگر ان کا تخلّص نزالا تھا۔ وہ بیکس بھیاروی لکھتے تھے۔ بھیارہ بارہ بنکی میں کوئی گاؤں ہے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی بعد میں شایع ہوا۔

اسی زمانہ میں صدیق حسن صاحب سے بھی ربط ضبط ہوا۔ سول سروس کے بہت سینیر آدمی تھے۔ جب تقسیم ہوئی تو انھوں نے ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا۔ شعروادب سے گہری دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتے تھے مگر ظاہر کرتے تھے کہ اپنی بیوی کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ جگر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ "آتشِ گل" کی نکاسی میں انھوں نے بڑی مدد کی۔ جگر صاحب کی علالت کے زمانے میں انھوں نے ہر طرح اُن کی آسایش کا خیال رکھا۔ سکریٹریٹ میں زیادہ تر نہایت صاف ستھرے کرتے پاجامے میں آتے تھے۔ حکومت، اپنی برادری، ادبی حلقوں اور عوام سب میں مقبول تھے۔ جگر صاحب کے لیے کچھ پنشن میں نے مرکز سے منظور کرادی تھی، اور صدیق حسن نے کچھ ریاستی حکومت سے۔ افسوس ہے کہ جگر صاحب کا ستمبر ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا۔ چند سال اُن کی بیگم کو بھی پنشن ملی۔ پھر یہ سلسلہ دفتر والوں کی غفلت کی نذر ہو گیا۔

نیاز فتح پوری کا "نگار" تو میں ہائی اسکول کے زمانے سے باقاعدہ پڑھتا تھا۔ ان سے ملاقات لکھنؤ پہنچنے پر ہوئی۔ میں نے نگار میں اُن کی فرمایش پر کئی مضامین لکھے تھے۔ نیاز صاحب اُردو کے ممتاز ادیب، انشاپرداز، دانشور اور اہم نقاد ہیں۔ ان کے نگار کا ہمارے ادبی رسائل میں بلند مقام ہے۔ اس کی باقاعدہ اشاعت، اس کے مضامین اور اس کے استفسارات سب اسے دوسرے ادبی رسالوں سے ممتاز کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا پریس قائم کر لیا تھا اور

نگار کے علاوہ نیاز صاحب کی تصانیف بھی وہیں پہنچ گئیں۔ نیاز صاحب اُن معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف سارا وقت ادب کی نذر کیا بلکہ اس کے ذریعے سے ایک صاف ستھری، باوقار زندگی بھی بسر کی۔ وہ نوجوان لکھنے والوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اور اگر کسی کو ضرورت ہو تو معاوضہ بھی دیتے تھے۔ مولویوں سے ان کی برابر نوک جھونک رہتی تھی۔ من و یزداں کے نام سے اُن کی جو کتاب شائع ہوئی ہے وہ اُن کی دانشوری کی اچھی مثال ہے۔ نیاز صاحب کی نظر عربی، فارسی اور اُردو ادب تینوں پر گہری تھی۔ زبان کی ذراسی لغزش اُن سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ انھوں نے نگار کے بعض ایسے خاص نمبر نکالے جن کے ذریعے سے علمی تنقید کو خاصا فروغ ہوا۔ اُن کا یہ قول کہ مجھے اگر اُردو کا صرف ایک شاعر انتخاب کرنا ہو تو مومن کو لوں گا ظاہر کرتا ہے کہ وہ عام رائے سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے۔ مومن کی شاعری کے جگر بھی بہت قائل تھے مگر اس معاملے میں اقبال کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مومن غزل کے ایک اہم شاعر ہیں اور بس۔ میر، غالب، اقبال کی صف میں انھیں جگہ دینا زیادتی ہے۔ مومن کی دنیا کے مقابلے میں غالب کی دنیا کتنی وسیع معلوم ہوتی ہے۔ پھر مومن کا مکر شاعرانہ یا اُن کی ناصحیت اُن کو خاصا محدود کردیتی ہے۔ نیاز صاحب نے میرے مضامین کے ایک مجموعے "تنقیدی اشارے" کا ایک اڈیشن بھی نگار پریس سے شائع کیا تھا۔ افسوس کہ آخر عمر میں خانگی پریشانیوں کی وجہ سے انھیں پاکستان جانا پڑا۔ میں نے اس موقع پر اُن کے محبوب شاعر مومن کا یہ شعر انھیں یاد دلایا تھا۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

حیدرآباد کی ایک صحبت میں نیاز صاحب کو جوش ملیح آبادی سے کچھ آزردگی ہوئی۔ انھوں نے پھر نگار میں جوش پر اعتراضات شروع کردیے اور اُن کے مقابلے میں علی اختر حیدرآبادی کو بہتر شاعر قرار دیا۔ ادبی دنیا میں نیاز کے اس رویّے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ نیاز صاحب میں انانیت بہت تھی۔ میں ایسے لوگوں سے زیادہ قریب کبھی نہ ہوسکا۔ مگر اُن کے ادبی مرتبے، اُن کے وقیع کارنامے اور اُن کی شخصیت میں ایک طرحداری اور بانکپن کا قایل ضرور

ہوں۔ نیاز نے اُردو کو بہت کچھ دیا۔ مخزن کے دور سے آزادی کے دس سال بعد تک کوئی ساٹھ برس کی ادبی زندگی میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ وہ ادبِ لطیف کے دور سے چلے تھے لیکن ایک عرصے کے بعد شاعرانہ نثر لکھنے کے بجائے ایسی پختہ نثر لکھنے لگے جس میں ایک لہر شعریت کی بھی ہوتی تھی۔ وہ ہر رنگ میں شعر کہہ سکتے تھے۔ نگار کا وہ خاص نمبر جس میں شعرا کا اپنا انتخاب تھا، اور دوسرے سال اس پر چار نقادوں کے تنقیدی مضامین، ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ نظیر نمبر، مومن نمبر، ریاض نمبر بھی بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

لکھنؤ میں احسن فاروقی سے بھی ربط ضبط رہا۔ میرے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی اُن کا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی کے انگریزی کے شعبے میں ہوا تھا۔ اکثر شام کو میرے ساتھ ٹہلنے جاتے تھے۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ دراصل بدایوں کے قریب کے ایک قصبے شیخو پور کے تھے۔ ان کے والد لکھنؤ آ گئے اور راجہ بلہرا کی شادی ان کی لڑکی سے ہو گئی۔ فاروقی کی شادی ایک شیعہ خاندان میں ہوئی۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میں دن میں سُنّی رہتا ہوں رات کو شیعہ۔ ترقی پسندی سے انھیں بڑی چڑ تھی اور میرے یہاں چونکہ ترقی پسندوں کا مجمع اکثر رہتا تھا اس لیے فاروقی سے ان سے بحث و مباحثہ بھی چلتا رہتا۔ انگریزی ادب پر گہری نظر تھی۔ اُردو شاعری اور فکشن دونوں کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انیس کی مرثیہ نگاری پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تو انیسیوں کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی۔ لیکن فاروقی تنقیدی بصیرت کے مالک تھے۔ اور ان کے یہ مضامین اور ناول پر اُن کے مضامین خاصے وقیع ہیں۔ انھوں نے خود بھی ناول اور افسانے لکھے۔ ایک زمانے میں آزاد نظم بھی لکھی اور مجھے سنائی تھی۔ بہت اچھے دوست تھے اور ان کی زندگی ہمیشہ دوستوں کے لیے وقف رہتی تھی۔ پاکستان جا کر کچھ دن پریشان رہے، پھر حالات بہتر ہو گئے۔ "نیا دور" کی ترتیب میں انھوں نے جمیل جالبی کی بڑی مدد کی تھی۔ ساقی میں برابر لکھتے رہتے تھے۔ شام اودھ اُن کا سب سے اچھا ناول ہے۔ اُن سے آخری ملاقات دسمبر ۱۹۷۷ء میں کراچی میں ہوئی تھی۔ جنوری ۱۹۷۸ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

آخر میں چند ایسی بزرگ شخصیتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جن کی علی گڑھ کی ذہنی

اور ادبی تاریخ میں کوئی نہ کوئی اہمیت ہے اور جن سے میرا اکثر ملنا ہوا۔ ان میں سب سے پہلے سید محفوظ علی بدایونی کا نام لینا ضروری ہے۔ ہم سب انھیں میر صاحب کہتے تھے ظفر علی خاں کے ساتھی تھے اور مولوی عبدالحق اور مولانا محمد علی اُن کے دوست اور معاصر تھے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد سالیہ چلے گئے تھے اور کچھ دن بمبئی میں بھی گزارے۔ مگر زیادہ تر بدایوں میں ہی قیام رہا۔ مولانا محمد علی کے اصرار پر کچھ دن "ہمدرد" کی ادارت میں بھی شامل رہے۔ مُلّا بودھا موئی کے نام سے مزاحیہ مضامین لکھے۔ میری درخواست پر شمع بے نور کے نام سے علی گڑھ میگزین میں بھی ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے پہلے جب وحید احمد صاحب نے نقیب نکالا تھا تو اُس میں اُن کے کئی مضامین شایع ہوئے تھے ہمارے طنز و مزاح کی تاریخ میں اُن کا نام احترام سے لیا جائے گا۔ بقول رشید احمد صدیقی وہ کبھی سامنے نہیں آئے مگر ہمیشہ اپنے "انداز قد" سے پہچانے گئے۔ چھوٹا سا قد، سپید داڑھی، متبسم چہرہ، باتوں میں علمیت کے ساتھ ایک شوخی۔ شہرت سے دور بھاگتے تھے۔ غالب اور اقبال کے بڑے قایل تھے۔ ایک دفعہ مولوی عبدالحق اُن سے ملنے بدایوں گئے۔ جمعہ کی نماز میں میں نے مولوی صاحب کو بھی اُن کے ساتھ اگلی صف میں دیکھا۔ مولوی عبدالحق نے انجمن سے اُن کے مضامین مرتب کر کے شایع کر دیے تھے۔ مولانا محمد علی کی شخصیت پر انھوں نے ایک بہت اچھا مضمون علی گڑھ میگزین کے لیے لکھا تھا۔

مولوی طفیل احمد سراپا عمل تھے۔ میں نے انھیں ہمیشہ مصروف دیکھا۔ سرسید سے انھیں کام کرنے کی لگن ملی تھی۔ منگلور ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بڑے سرگرم ممبر۔ انھوں نے یو پی میں کئی اسلامیہ اسکول اور کالج قایم کیے۔ سود کے جواز پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ان کی بڑی اہم کتاب ہے جس میں سرسید کے آخری دور کے مستند واقعات درج کیے گئے ہیں۔ انھوں نے آخر عمر میں سرسید کی سیاست کے لیے بیک کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ان سے اپنا اختلاف ظاہر کیا تو وہ ازراہِ عنایت میرے یہاں تشریف لائے اور کئی گھنٹے تک اس مسئلے پر باتیں کیں۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ سرور صاحب میں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی ہیں میر

دل نے گوارا نہ کیا کہ سر سید پر حرف گیری کروں۔ سر سید کی آخری دور کی سیاست پر بیک کا اثر بہت گہرا ہے۔ اس لیے میں نے بیک پر ساری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ میں اس عقیدت پر حیران رہ گیا۔ مولانا طفیل احمد نے علی گڑھ کے طلبا کی ایک ڈائرکٹری بھی مرتب کی تھی۔ کام کی لگن کا یہ عالم تھا کہ پیٹ میں درد ہے۔ گرم پانی کی بوتل رکھے ہوئے ہیں اور میٹنگ میں حصہ لے رہے ہیں۔ ایسے لوگ اب کہاں۔ مسلک کے اعتبار سے قوم پرست تھے اور علی گڑھ کے فدائی۔ سر سید کی عظمت دراصل اس بات میں ہے کہ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اتنے مجاہد پیدا کیے۔

شیخ عبداللہ بانی مسلم گرلس کالج کشمیری تھے۔ سر سید لڑکوں کی تعلیم زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لڑکے تعلیم یافتہ ہوں گے تو لڑکیاں بھی اُن کے اثر سے ترقی کرنے لگیں گی۔ شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کی تعلیم کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ سخت مخالفت کے ماحول میں انھوں نے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ انٹر کالج اور پھر ڈگری کالج بنا۔ اُن کی بیگم جو اعلیٰ بی کہلاتی تھیں اس تعلیمی مہم میں اُن کی دست راست تھیں۔ سر سید کے دور کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جو ایک قومی جذبہ، ایک دردمندی اور ایک خدمت کی لگن تھی وہ شیخ عبداللہ میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے بھی انھوں نے سعیِ بلیغ کی۔ جب ملتے تھے تو اکثر مسلمانانِ ہند کے حالات پر گفتگو ہوتی تھی۔ ایک دفعہ غازی آباد کے اسٹیشن پر اس عالم میں ملاقات ہوئی کہ یہ دہلی کی ٹرین سے اُترے تھے اور میں میرٹھ جا رہا تھا۔ میری گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تھی۔ خیر میں انھیں ویٹنگ روم تک پہنچانے گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگے۔ سرور صاحب! یہ مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ میں نے کہا حضرت فی الحال تو مجھے یہ فکر ہے کہ میری گاڑی کا کیا ہوگا۔ مسلمانانِ ہند کے مستقبل پر اطمینان سے کبھی علی گڑھ میں باتیں ہوں گی۔

حبیب اللہ خاں بھی سر سید کے دور کے تربیت یافتہ اور اُن کے نظر کردہ تھے۔ یہ ڈپٹی حبیب اللہ کہلاتے تھے۔ جس طرح نذیر احمد کو لوگ ڈپٹی نذیر احمد کہتے تھے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بڑے قائل تھے۔ اُن کی یاد میں آفتاب ہوسٹل انھوں نے ہی بنوایا تھا۔ حیات آفتاب

بھی انھیں کی توجہ سے شائع ہوئی۔ بڑے اصول پرست تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین سے اختلاف آخر تک سخت رہا۔ میں کبھی کبھار اُن کی خدمت میں حاضری دیتا تھا اور اُن سے سرسید کے دور کے متعلق بہت سی معلومات ملتی تھیں۔ اُن میں اور میر ولایت حسین میں مثالی دوستی تھی۔ اُن کے مکان کا نام ولایت منزل اور میر ولایت حسین کے مکان کا نام حبیب اللہ منزل ہے۔ ولایت منزل انھوں نے یونیورسٹی کے نام کردی اپنے عزیزوں کو نہ دی۔ سرسید کے دور کے تربیت یافتہ لوگ یہ خوبی بھی رکھتے تھے کہ سب کچھ دیتے تھے کچھ نہ لیتے تھے۔

میر ولایت حسین کی آپ بیتی اُن کے انتقال کے بعد سید محمد ٹونکی صاحب نے ایڈٹ کر کے شایع کرادی تھی۔ اس میں سرسید کے دور کے بعض واقعات کی بڑی مستند داستان ہے۔ میر صاحب کی زندگی مشکل حالات میں جدوجہد، استقلال اور خدمت کا ایک نمونہ ہے۔ میر صاحب نے جس طرح تعلیم حاصل کی اور پھر علی گڑھ کے تعلیمی مشن میں شریک ہوئے اس کا قصہ تو اہمیت رکھتا ہی ہے مگر انھوں نے شبلی، سید محمود، مولانا شوکت علی، اور سرسید کے آخری ایام کی جو تصویر کشی کی ہے وہ بڑی سبق آموز ہے۔ سرسید کو سید محمود نے اپنے خلل دماغ کے زمانے میں گھر سے نکال دیا تھا۔ اُن کا انتقال ایک دوست حاجی اسمٰعیل خاں ذنادلی کے یہاں ہوا۔ تجہیز و تکفین کے مصارف محسن الملک نے یہ کہکر ادا کیے کہ اب یہ چندہ لینے پھر تو نہ آویں گے۔ سچ ہے اپنے دور میں بڑے سے بڑے آدمی کی عظمت کو کم ہی پہچانا جاتا ہے۔

چند بزرگوں کے اس فیض کا تذکرہ کر کے جو ان سے پہنچا میں کچھ ایسے دوستوں کے ذکر پر اس سلسلے کو ختم کرنا چاہتا ہوں جن کا ایک عرصۂ دراز تک ساتھ رہا جنھوں نے اپنے اپنے دائرے میں ایک امتیاز حاصل کیا اور جن کی شخصیت میرے لیے زندگی کے حبس کے عالم میں ایک ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح رہی۔ یہ قابلِ ذکر بات ہے کہ ان دوستوں میں مسلمان، ہندو، سکھ سبھی ہیں (میری مراد راجندر سنگھ بیدی، عالم خوندمیری اور حمیدہ سعید الظفر سے ہے)۔

راجندر سنگھ بیدی کا تعلق گرونانک کے سلسلے سے تھا۔ شکل صورت سے قطعاً پنجابی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ دُبلے پتلے متوسط قد کے آدمی تھے۔ میں نے سب سے پہلے اُن کی کہانی

'بھولا' ادبی دنیا میں پڑھی تھی اور مجھے یہ بہت پسند آئی تھی۔ پھر جب اُن کا افسانوں کا پہلا مجموعہ "دانہ ودام" شایع ہوا تو میں نے آل انڈیا ریڈیو سے اس پر ریویو کیا جس میں افسانے کی دنیا میں اس نووارد کا پرجوش الفاظ میں خیر مقدم کیا۔ کچھ دن کے بعد حکومت پنجاب کی طرف سے سال کی بہترین کتاب پر انعام دینے کا اعلان ہوا ججوں میں مجھے بھی رکھا گیا اور پطرس بخاری کو بھی۔ میں نے دانہ ودام کی سفارش کی مگر بخاری نے زبان کی اغلاط کی وجہ سے اس کے بجائے حجاب امتیاز علی کے افسانوں کے مجموعے کو انعام دلوادیا۔ یوپی والوں پر یہ اعتراض ہوتا تھا اور اس اعتراض میں پطرس بخاری بھی شریک تھے) کہ یہ لوگ صرف زبان کے اغلاط دیکھتے ہیں۔ بیدی کے معاملے میں پنجاب کے اہل الرائے حضرات نے بھی یہی کیا۔ میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا۔ خیر۔ کچھ دن بعد ایک شام راجندر سنگھ بیدی میرے یہاں وارد ہوئے۔ آئے تو اپنے بھائی کی سفارش کرنے کے لیے تھے کہ کسی پرچے میں اس کے نمبر بڑھوا دیے جائیں مگر جب میں نے معذرت کی کہ میں یہ کام نہیں کرتا تو انھوں نے قطعاً بُرا نہ مانا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ایک تازہ افسانہ سنایا جس کا عنوان "پوسٹ ماسٹر" تھا۔ بیدی اُن دنوں ڈاکخانے میں کلرک تھے۔ افسانہ ایک پنشن یافتہ پوسٹ ماسٹر کے بارے میں تھا جو بے کاری سے اکتا کر پھر ڈاکخانے میں نوکری کر لیتا ہے۔ مجھے یہ بھی بہت پسند آیا۔ بیدی کے افسانے اور ڈرامے شایع ہوتے رہے۔ تقسیم کے بعد وہ لاہور سے دہلی آگئے۔ کچھ دن جموں ریڈیو میں کام کیا اور پھر بمبئی فلموں میں کہانیاں لکھنے کے لیے پہنچے۔ یہاں اپنی محنت سے انھوں نے فلمی دنیا میں بھی ایک کہانی کار اور اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ دانہ ودام کے بعد گرہن، گرہن کے بعد اپنے دکھ مجھے دے دو اور پھر ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کا ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' بھی ایک منفرد اور شاندار کارنامہ ہے۔ دہلی، بمبئی اور علی گڑھ میں اُن سے کئی بار ملنا ہوا۔ میں کئی دفعہ اُن کے یہاں بمبئی میں ٹھہرا وہ بھی کئی دفعہ شبلی روڈ پر میرے یہاں مہمان ہوئے۔ سردار ہوتے ہوئے بھی پان تمباکو کھاتے تھے۔

وہ یقیناً اُردو کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہیں اور اُن کے کوئی ایک درجن افسانے اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوسکتے ہیں۔ بمبئی کے فلمی ماحول میں اُن سے کچھ لغزشیں بھی

ہوئیں۔ عمر بھر دوستوں سے اُن کے خلوص، محبت اور وضعداری میں فرق نہ آیا۔ میرا بیٹا جاوید جب جرمنی جارہا تھا تو میں اسے رخصت کرنے بمبئی نہ جا سکا۔ بیدی اور ان کی بیوی نے آ کے اس طرح رخصت کیا جس طرح اپنے بیٹے کو کرتے۔ اُن کے افسانوں میں بھی ظرافت کی ایک زیریں لہر ملتی ہے لیکن خطوں میں یہ رنگ تو جا بجا نمایاں ہوتا ہے۔ میرے بڑے لڑکے کو انھوں نے بلایا اور کسی اخبار میں ملازمت کا لالچ دیتے ہوئے لکھا کہ بہر حال نکار نہ سہی سیر سہی۔ جب بیٹی کے لڑکا پیدا ہوا تو مجھے لکھا کہ عمر بھر ہاں ہاں کرتا رہا اب نانا ہو گیا ہوں۔ سرداروں کے متعلق بڑے مزے کے لطیفے سناتے تھے۔ ایک مسلمان دوست کا لطیفہ بھی سنایا تھا جو ہر دعوت میں اپنی چوٹی لے کر شریک ہو جاتا تھا۔ پھر آنکھ میں آنسو بھر کر کہنے لگے سرور صاحب مگر وہ چوٹی والا اب بہت یاد آتا ہے۔ ایک دفعہ میں بمبئی پہنچا تو بیوی سے کچھ ناچاقی تھی اور پرانے دوست مجروح سلطان پوری سے بات چیت بند۔ میری تحریک پر دونوں سے صلح صفائی ہو گئی تو بڑے خوش ہوئے کہ آپ کا آنا مبارک ہوا۔ اُن سے آخری ملاقات شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فکشن سیمینار میں ہوئی تھی۔ آخر زمانے میں بہت بیمار رہے۔ بیوی اور بیٹے سے نہ بنتی تھی اُن کے افسانے 'صرف ایک سگریٹ' میں اس فضا کا عکس ملتا ہے۔ جب ہم لوگ ۱۹۷۴ء میں اُن کے یہاں چند دن قیام کرنے کے بعد رخصت ہوئے تو اسٹیشن پر میری بیوی کو اپنے تازہ مضامین کا ایک مجموعہ دیا۔ پہلا مضمون مہمان پر تھا جس میں بن بلائے مہمانوں پر بڑے مزے کی طنز تھی۔ ہم لوگ ان سے پوچھنے والے ہی تھے کہ مہمان کا ممدوح کون ہے کہ اُن کا خط آیا جس میں لکھا کہ آپ کو کتاب دینے کے بعد خیال آیا۔ خدا جانے آپ لوگ اسے پڑھ کر کیا سوچیں گے۔ "سردار تو پہلے جو کرنا ہے کر جاتا ہے سوچنا بعد میں ہے۔" پریم چند کے بعد اُردو کے چوٹی افسانہ نگاروں میں میرے نزدیک بیدی اور منٹو اور ان کے بعد عصمت اور کرشن چندر آتے ہیں۔ قرۃ العین چوٹی کی ناول نگار ہیں۔ انھوں نے بعض بڑے جاندار افسانے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ہاؤسنگ سوسائٹی اور جلاوطن۔ ان کے ناولٹ بھی اس صنف میں ایک اضافہ ہیں۔ اگرچہ بیدی کا 'ایک چادر میلی سی'، میرے نزدیک اُردو کا بہترین ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔ بیدی نے لاجونتی، رانو، اندو جیسے غیر فانی کردار اُردو کو دیے ہیں۔ ان کے بہت سے خط میرے پاس محفوظ

ہیں۔ جنھیں علحدہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔

عالم خوندمیری کو پہلے میں نے حیدرآباد کے ایک جلسے میں غالباً ۱۹۵۶ء میں دیکھا۔ اس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر سخت تنقید کی تھی۔ اور اس کی انتہا پسندی واضح کی تھی۔ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالعلیم بھی اس جلسے میں موجود تھے، مگر وہ خاموش رہے۔ تقریر مدلل اور عالمانہ تھی۔ اس وقت عالم خوندمیری عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفے کے اُستاد تھے، فلسفے پر اُن کے عبور اور ایک رچے ہوئے ادبی ذوق کی اس وقت بھی علمی حلقوں میں قدر کی جاتی تھی۔ پھر دہلی میں اُن سے ملاقات ہوئی اور ہمارے مراسم گہرے ہوتے گئے۔ کئی دفعہ وہ میری دعوت پر علی گڑھ آئے۔ اور شعبۂ اُردو میں مقالے پڑھے۔ غالب پر ۱۹۶۹ء میں بہت سے سمینار ہوئے۔ ان میں شعبۂ اُردو کا سمینار اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ اس زمانے کے تمام ممتاز ادیب اور اسکالر شریک ہوئے تھے۔ پروفیسر مجیب نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ عالم خوندمیری کا مقالہ بہت سراہا گیا تھا وہ جدیدیت کے میلان کے حامی تھے اور غالب اور اقبال کے خاص طور سے قدر شناس۔ اُردو کے علاوہ انگریزی میں بھی لکھتے تھے اور انھوں نے ملک کے ممتاز دانشوروں میں اپنے لیے ایک جگہ بنالی تھی۔ میں نے انھیں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ۱۹۸۰ء میں کشمیر بلایا تھا اور اُن کی وساطت سے مشہور مصور ایم۔ ایف حسین سے اقبال کا ایک پورٹریٹ بنوایا تھا جو کشمیر یونیورسٹی کی اقبال لائبریری میں آویزاں ہے۔ عالم نے میری فرمائش پر خطبات اقبال پر بڑے بصیرت افروز لکچر دیے تھے۔ ان میں سے کچھ شایع ہو چکے ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کی علمی سرگرمیوں میں اُن کی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے بڑا قابلِ قدر اضافہ ہوا تھا۔ افسوس کہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اُن جیسے استاد کو بہت آخر میں پروفیسر بنایا۔ کچھ دن بعد ہی وہ سبکدوش ہو گئے۔ کئی دفعہ دل کا دورہ پڑ چکا تھا، پھر گردے خراب ہو گئے۔ آخر کے چند ماہ میں ہر مہینے خون صاف کیا جاتا تھا وہ احتیاط اور پرہیز کے عادی نہ تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر میر ولی الدین پروفیسر وحید الدین اور عالم خوندمیری فلسفے اور ادب میں تینوں کا کارنامہ بہت شاندار ہے۔ عالم خوندمیری بڑے اچھے دوست اور ساتھی تھے۔ اُن کی علمی بصیرت، ادبی ذوق، نکتہ سنجی اور دلنواز شخصیت کی یاد ہمیشہ تازہ

رہے گی۔

سکندر علی وجدؔان سے بہت مختلف تھے۔ عالم میں سیمابیت تھی۔ وجدؔ میں ٹھہراؤ اور شائستگی۔ وجدؔ کی نظمیں اجنتا اور ایلورا بڑی قابلِ قدر ہیں۔ سول سروس میں آگئے تھے۔ سرکاری کام فرض کی طرح انجام دیتے تھے مگر عشق شعر و ادب سے تھا۔ خط بڑا پاکیزہ تھا۔ مولوی عبدالحق کے خط سے حیرت انگیز مشابہت تھی۔ مولوی صاحب کے عقیدت مندوں میں بھی تھے۔ ایک زمانے میں میرا خیال تھا کہ میں انجمن ترقی اردو ہند سے علیحدہ ہوجاؤں اور وجدؔ کو جو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے اپنی جگہ جنرل سکریٹری بنوادوں۔ مگر کچھ دوستوں نے توجہ دلائی کہ کسی ادارے کو چلانا وجدؔ کے بس کی بات نہیں ہے، اس لیے یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ آخر میں وہ راج سبھا کے ممبر بھی ہو گئے تھے۔ فنون لطیفہ سے خاص شغف تھا اور مصوری اور موسیقی دونوں کا ایک پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر حمیدہ سعیدالظفر آنکھوں کے امراض کی ڈاکٹر تھیں اور اس پیشے میں بین الاقوامی شہرت رکھتی تھیں۔ مشہور ڈاکٹر سعیدالظفر کی بیٹی اور ممتاز کمیونسٹ رہنما محمودالظفر کی بہن تھیں۔ ان کا تعلق رام پور کے ایک ممتاز روہیلہ خاندان سے تھا۔ ڈاکٹر سعیدالظفر میڈیکل کالج لکھنؤ کے پروفیسر تھے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ساتھی اور دوست۔ حمیدہ نے وڈسٹاک (WOOD STOCK) ازابیلا تھوبرن کالج اور میڈیکل کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ پہلے موہن لال اسپتال میں تھیں۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آپ تھلما لوجی انسٹی ٹیوٹ میں آگئیں اور وہیں سے ڈائرکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئیں۔ وہ یونیورسٹی کی پہلی خاتون تھیں جو پروفیسر بنائی گئیں۔ اپنے پیشے کے علاوہ پرندوں کے مشاہدے اور فوٹو گرافی سے گہرا شغف تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے ڈاکٹر سالم علی سے گہرے مراسم تھے۔ وہ نہایت ہر دلعزیز ڈاکٹر تھیں اور بڑی توجہ سے مریضوں کو دیکھتی تھیں۔ ہزاروں کی اندھیری زندگی میں اُن کی وجہ سے روشنی کی کرن دوڑی۔ مطالعہ خاصا وسیع تھا اور ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ ترقی پسند خیالات رکھتی تھیں مگر پیشے کی مصروفیت کی وجہ سے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ علاج میں کبھی چھوٹے بڑے، امیر غریب، ہندو یا مسلمان کا

امتیاز نہیں برتا۔ سب پر یکساں توجہ رہی۔ وقت کی پابندی اور معیاروں کے التزام میں اپنی مثال آپ تھیں۔ مجھ سے اُس وقت سے مراسم تھے جب وہ لکھنؤ میں ایم۔ ایس کر رہی تھیں۔ میری دونوں آنکھوں میں عرصے سے موتیابند تھا مگر ان کے مشورے کے مطابق میں نے آپریشن ۱۹۸۷ء میں کرایا۔ اس وقت تک اگرچہ وہ مریضوں کو دیکھتی تھیں مگر آپریشن کرنا چھوڑ دیا تھا۔ انھیں کے مشورے سے مشہور سرجن ڈاکٹر آہوجا نے میرا آپریشن کیا۔ وہ آپریشن کے وقت موجود رہیں اور بعد میں بھی مناسب ہدایات دیتی رہیں۔ افسوس ہے کہ مئی ۱۹۸۸ء میں پہلے اُن پر لو کا اثر ہوا اور پھر بخار تیز ہونے کی وجہ سے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی اور چند گھنٹوں میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی انسان دوستی، وضعداری، اپنے پیشے میں اعلیٰ درجہ کی مہارت، باقاعدگی، کم آمیزی کے باوجود دلسوزی اور دردمندی، ذہانت، خوب سے خوب تر کی جستجو کو جو بھی اُن سے قریب رہا ہے کبھی نہ بھلا سکے گا۔ شادی نہیں کی تھی۔ صحت بھی اچھی تھی مگر قضا و قدر کو یہی منظور تھا کہ ۶۷ برس میں ہی اُن کو اچانک سماوی بلاوا آ جائے۔

سید اختر احمد اختر اورینوی سے پہلی ملاقات ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی وہ بھی اس جگہ کے امیدوار تھے جس کا میں۔ ایک رجسٹر میں سارے مضامین کے تراشے ساتھ لائے تھے پہلے سائنس کے طالب علم تھے پھر خرابی صحت کی وجہ سے ادب کی طرف آ گئے۔ اُن کے بعض افسانوں کی اُس وقت بھی شہرت تھی۔ پہلے پٹنہ کالج میں اور پھر پٹنہ یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر رہے۔ شعر بھی کہتے تھے اور اُن کے کلام کا ایک مجموعہ بھی شایع ہو چکا ہے۔ تنقیدی مضامین کے بھی کئی مجموعے نکلے۔ کالج کے ڈراموں کی ہدایت کاری وہی کرتے تھے۔ بڑے اچھے خطیب تھے۔ ایک مرتبہ پٹنے کے گرودوارے میں انھوں نے گرو گوبند پر ایسی اچھی تقریر کی کہ ان کو ایک کرپان نذر کی گئی۔ شروع میں جب میں پٹنے گیا تو کلیم الدین احمد کے یہاں میرا قیام تھا مگر اُن کے یہاں زیادہ تر خاموشی رہتی تھی۔ کلیم الدین احمد قلم کے مرد میدان تھے مگر ان کی بات چیت ہاں یا نہیں سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ ایک صبح اختر آئے اور ہم دونوں کو برآمدے میں خاموش بیٹھے دیکھا۔ وہ اصرار کر کے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اس کے بعد جب بھی پٹنہ جانا ہوا میں اختر کے یہاں ہی ٹھہرا۔ اُن کی بیگم شکیلہ اختر خود بہت اچھی افسانہ نگار تھیں اور میاں

بیوی دونوں خاصے بانوق تھے۔ اختر قادیانی تھے۔ ایک دفعہ جب میں رخصت ہونے لگا تو اپنے چھوٹے بھائی فضل سے کہہ کر کچھ قادیانی لٹریچر میرے بکس میں رکھوادیا۔ مجھ سے کچھ کہا نہیں۔ ایک زمانے میں ادبی جلسوں اور کانفرنسوں میں، میں، احتشام اور اختر ساتھ ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ اختر قادری نے اس پر تین مورتی کی پھبتی کہی تھی۔ بنگلہ دیش میں اُن کے کئی عزیز بنگالیوں کے ہاتھوں کام آگئے۔ اِن کا ان پر بڑا گہرا اثر تھا۔ آخر میں PARKINSON'S DISEASE کا شکار ہو گئے تھے۔ اُن سے آخری ملاقات ۱۹۷۴ء میں ہوئی جب وہ بستر مرگ پر تھے۔ دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ شکایت کی کہ اب کہ میرے پاس کیوں نہ ٹھہرے۔ میں نے کہا اس علالت میں آپ کو میری وجہ سے زحمت ہوتی۔ اختر ایک فرد کا نہیں ایک انجمن کا نام تھا۔ بہار میں ادبی سرگرمیاں اُن کے دم سے تھیں۔

اختر کے ذریعہ سے ہی محمد ایوب ایڈووکیٹ اور جمیل مظہری سے ملاقات ہوئی۔ محمد ایوب انجمن ترقی اُردو بہار کے صدر اور ایک ممتاز وکیل تھے۔ لڑکیوں کا ایک اسکول بھی چلاتے تھے۔ جوانی میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ میں نے ہماری زبان میں اُن پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ جب اُن کے انتقال کے بعد اختر کے ساتھ ایوب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو مجھے زمین سے کوئی دو انچ اوپر ایک مٹی کے ڈھیر تک لے جایا گیا، نہ کوئی نشان تھا نہ کتبہ۔ شاید اُن کے خاندان کی یہی روایت تھی۔ جمیل مظہری ایوب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اختر مجھے اُن سے ملاتے لے گئے تو ایوب سے بھی ملاقات ہوگئی۔ جمیل مظہری کو اُن کے سارے دوست علاّمہ کہتے تھے۔ یہ علاّمہ بڑے سیمابی، بڑے جذباتی، بڑی گرم جوشی سے ملنے والے اور ٹوٹ کر محبت کرنے والے نکلے۔ کلکتے میں ایک دفعہ ملے تو اس طرح بغل گیر ہو گئے کہ اُن کے جلتے ہوئے سگریٹ سے میرے ہاتھ پر ایک کچو کا لگ گیا، مگر انھیں کچھ خبر نہ ہوئی۔ شعر کی داد بہت زوروں سے دیتے تھے۔ نہ جانے کیوں اصرار کر کے مجھ سے میرا کلام سنتے۔ پھر اپنا کلام سُناتے۔ جمیل مظہری کی شاعری اقبال اور جوش کے بعد اور ترقی پسند تحریک سے پہلے ہماری جدید شاعری کے ایک اہم موڑ کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان کے تخیل میں ندرت تھی، فکر میں بلندی اور تازگی تھی۔ اُن کی نظموں اور غزلوں دونوں کی اہمیت مسلّم ہے۔ اگرچہ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ میرے یہاں تغزل

نہیں ہے۔ اُن کی مثنویاں اُردو مثنوی میں ایک اضافہ ہیں۔ آب و سراب تو خاص طور سے اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کا یہ شعر بھلائے نہیں بھولتا ؎

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر سر میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

فروری ۱۹۶۰ء میں رانچی جانا ہوا۔ شین اختر کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا وایوا تھا۔ جمیل مظہری ان کے نگراں تھے۔ میں ٹرین سے واپس آنا چاہتا تھا مگر جمیل مظہری نے اصرار کیا کہ ایک دوست کی کار سے چلیں گے اور چند گھنٹوں میں گیا پہنچ جائیں گے۔ کار میں راستے میں کچھ خرابی ہو گئی اور ہم لوگ رات کے دو بجے گیا پہنچے۔ راستے بھر جمیل مظہری مجھ سے میرا اپنا کلام سنتے رہے۔ یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔ صبح کو وہ پٹنہ چلے گئے اور میں علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جمیل مظہری مولانا آزاد اور جوش کے بہت قائل تھے۔ شمع آزادی کے پروانے تھے، درس و تدریس میں باقاعدگی اور تنظیم نہ تھی مگر ان کی نکتہ سنجی اور ادبی بصیرت سے طلبا کو بہر حال بہت کچھ میسر آ جاتا تھا۔

میں جب سینٹ جانس کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں مولانا عابد حسن فریدی اور مولانا حامد حسن قادری اردو پڑھاتے تھے۔ میں سائنس کا طالب علم تھا اس لیے فریدی صاحب سے تو قرب حاصل نہ ہو سکا، ہاں اردو سے دلچسپی کی وجہ حامد حسن قادری صاحب سے اکثر ملنا ہوتا رہتا تھا۔ یہ دونوں سگے بھائی تھے، دونوں کا قد چھوٹا تھا، دونوں کے داڑھی تھی۔ فریدی صاحب گول مٹول آدمی تھے۔ قادری صاحب اکہرے جسم کے۔ دونوں کے تبحرِ علمی کا کالج میں چرچا تھا۔ قادری صاحب کے مضامین رسائل میں دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوا اور فارسی اور اُردو ادب پر اُن کی گہری نظر کا قائل ہونا پڑا۔ اس زمانے میں سیماب اکبرآبادی نے آگرہ اسکول کا غلغلہ بلند کر رکھا تھا۔ مولانا قادری اس کے قائل نہ تھے۔ قادری صاحب کی عملی تنقید اگرچہ پرانے رنگ کی ہوتی تھی مگر بڑی عالمانہ اور پُر مغز۔ مزاج میں ایک شوخی بھی تھی۔ تاریخ گوئی میں انھیں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ بڑی رواں دواں اور دلکش تاریخیں نکالتے تھے۔ اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ تاریخ و تنقید کے نام سے شایع ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس پر ریویو میری کتاب "تنقیدی اشارے" کے ساتھ کیا تھا اور اس کی بڑی تعریف کی تھی۔ انھوں نے کمال داغ کے نام سے داغ کے کلام کا ایک انتخاب بھی کیا اور داغ کی شاعری پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا۔ مگر اُن کی سب سے اہم تصنیف داستانِ تاریخِ اردو ہے۔ اس میں ابتدائی دور سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک سارے نثر نگاروں پر تبصرہ ہے اور ان کی تحریروں کے نمونے بھی۔ ابتدائی دور کے متعلق اُن کی بعض آرا جدید تحقیق کی روشنی میں نظرِ ثانی کی محتاج ہیں مگر کتاب اب بھی

اُردو نثر نگاری کی ایک جامع تصنیف کہی جا سکتی ہے۔ مولانا خط بڑے مزے کے لکھتے تھے۔ اُن کے خط کافی تعداد میں میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں جا بجا انھوں نے ان تاریخوں کا بھی حوالہ دیا ہے جو کسی واقعے، کسی حادثے، کسی شخصیت کے متعلق ہیں۔ لکھتے تھے کہ اُن کے مادّے اُن کے ذہنوں میں رہتے تھے۔ پھر مناسب الفاظ کو نظم کر دینا ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جب آگرے سے کراچی جانے لگے تو مجھے خط لکھا تھا جس میں اپنی ہجرت کی تاریخ داغ کے اس مصرع سے نکالی تھی۔

"اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا"

آگرے کے قدیم محلے گھٹیا اعظم خاں میں رہتے تھے، میں کئی بار اُن سے ملنے وہاں گیا ہوں، اُن کے مکان کے پاس ہی کالے خاں کی وہ بارہ دری بھی دیکھی تھی جس کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ غالب کا بچپن یہیں گزرا تھا۔

تاریخ گوئی کا رواج اب بہت کم ہو گیا ہے۔ مگر ایک زمانے میں یہ بہت مقبول صنعت تھی۔ مارہرے کے سید آل محمد صاحب نے تو ایک پوری کتاب میں اپنے دور کے اشخاص اور واقعات پر تاریخیں یکجا کر دی ہیں۔ ہمارے دیار میں بھی تاریخ گوئی بہت مقبول تھی۔ اگر اُردو کے تاریخ گو شعرا کا کوئی تذکرہ لکھا جائے تو اس میں مولانا حامد حسن قادری کی تاریخوں کو نمایاں جگہ ملے گی۔

ایک اور شخصیت جس سے قربت رہی پروفیسر آصف فیضی کی تھی۔ اپنا نام اے۔ اے۔ اے فیضی لکھا کرتے تھے۔ عطیہ فیضی شاید اُن کی پھوپھی ہوتی تھیں۔ پروفیسر آصف فیضی عربی کے عالم اور مسلم لا کے ماہرین میں سے تھے۔ بمبئی کے لا کالج کے پرنسپل، مصر میں ہندوستان کے سفیر، پبلک سروس کمیشن کے ممبر اور آخر میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ میری تحریر اور ہماری زبان میں میرے اداریوں کی بڑی تعریف کرتے تھے مگر مجھے خط انگریزی میں لکھتے تھے۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور عالمی معیاروں کا پورا احساس رکھتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ ان سے عطیہ فیضی اور اقبال کے مراسم کے متعلق دریافت کیا تھا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ میری پھوپھی کی باتوں میں مبالغہ بہت ہوتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک اقبال کے متعلق عطیہ کے سارے بیانات آنکھ بند کر کے تسلیم نہیں کرنا چاہییں۔ ہاں اس بات میں شبہ نہیں کہ یورپ میں یہ دونوں ایک دوسرے سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔ میں نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ بمبئی کے چند علم دوست خاندانوں میں اُردو سے جو محبت تھی وہ شمالی ہند کے ان خاندانوں میں بھی جو اُردو والے کہلاتے تھے کم دیکھنے میں آئی۔ فیضی صاحب برابر اُردو کے فروغ کے لیے مشورہ دیتے رہتے

تھے اور اُردو کے علمی سرمائے میں اضافے کے لیے تجاویز پیش کرتے رہتے تھے ۔ کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر زور کا تقرر ان کی ہی توجہ کا نتیجہ تھا ۔ غلام محمد بخشی سے فیضی صاحب کی نہ بنی ۔ وہ جو دربارداری چاہتے تھے فیضی صاحب کے بس کی نہ تھی ۔ پھر فیضی صاحب یونیورسٹی کے معاملات میں کسی کی دخل اندازی بھی پسند نہیں کرتے تھے ۔

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو دس سال تک انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر رہے ۔ قدرتی طور پر مجھ سے اس زمانے میں بہت ربط ضبط رہا ۔ وہ گوکھلے کے پیرو، پرانے لبرل اور سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے سکریٹری تھے ۔ سپرہاؤس کے بانیوں میں تھے اور وہیں اُن کا قیام رہا ۔ بچپن میں فارسی پڑھی تھی اور فارسی سے دلچسپی آخر تک رہی ۔ ایک دفعہ خاص طور سے مولانا غنیمت کی مثنوی مجھ سے پڑھنے کے لیے منگوائی تھی ۔ آخر عمر میں جواہر لال نہرو سے تبت کے معاملے میں اختلاف ہو گیا تھا ۔ جب ان کی راج سبھا کی ممبری کی میعاد ختم ہو گئی تو میں نے صدر رادھا کرشنن سے درخواست کی کہ وہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کو اس کوٹے میں سے نامزد کر دیں جو ممتاز اشخاص کے لیے مخصوص ہے ۔ رادھا کرشنن تیار ہو گئے اور مجھ سے کہا کہ کنزرو صاحب کی مرضی معلوم کر لو ۔ میں بھاگم بھاگ کنزرو صاحب کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی منظوری دے دیں مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے ۔ کہنے لگے ، صدر کے نمائندے کی حیثیت سے میں اپنی رائے آزادی سے نہ دے سکوں گا ۔ جب میں نے رادھا کرشنن کو یہ بات بتائی تو انھوں نے کہا کہ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ کنزرو صاحب اس پیش کش کو منظور نہ کریں گے ۔ کنزرو صاحب ہماری مشترک تہذیب کے نمائندے ، اُردو کے فدائی اور معتدل سیاست کے علمبردار تھے ۔ آخر میں بینائی جاتی رہی تھی اور آگرے میں اپنے آبائی مکان میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ ان کی مستی کردار ، ان کی وضعداری ، اُن کی خدمت کا جذبہ اکثر یاد آتا ہے ۔ وہ صاف ستھری اصولی سیاست کے قائل تھے ۔ کسی طرح کی انتہا پسندی انھیں گوارا نہ تھی ۔ گاندھی جی اور سر تیج بہادر سپرو کے بڑے قائل تھے ۔ اندرا گاندھی کے آخری دور کی بے اصولی سے انھیں سخت اختلاف تھا ۔ اُن کے ساتھ ہمارے بزرگوں کی ایک مثال ختم ہو گئی ۔

پروفیسر ہمایوں کبیر بنگال کے ممتاز ادیب ، آکسفورڈ کے گریجویٹ ، ہندوستانی طلبا کی فیڈریشن

کے رہ نما اور پھر مولانا آزاد کے سکریٹری کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے۔ انھوں نے آکسفورڈ میں فلسفے میں آنرس کیا تھا۔ وہ اُردو اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ آخر ایک مدّت تک مولانا کے ساتھ رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مولانا آزاد کی اُردوئے معلّیٰ ہمایوں کبیر کی سمجھ میں کم ہی آتی ہوگی۔ اس لیے مولانا کی کتاب INDIA WINS FREEDOM (ہمایوں کبیر کی لکھی ہوئی ہے۔ مولانا آزاد کی زبان ان کے پلّے کیا پڑی ہوگی۔ غلام رسول مہر نے خاص طور پر یہ اعتراض کیا ہے جیسا کہ ہمایوں کبیر نے لکھا ہے۔ مولانا روزانہ اپنی زندگی کے واقعات انھیں سناتے تھے وہ برابر انگریزی میں نوٹ لیتے رہتے تھے اور ان کی مدد سے ایک ڈرافٹ انگریزی میں تیار کرتے تھے۔ مولانا ان کے ساتھ اس ڈرافٹ کو غور سے دیکھتے اور جہاں ضروری سمجھتے ترمیم یا اضافے کی ہدایت دیتے۔ اس طرح پورا مسودہ تیار ہوا تو انھوں نے پھر اس پر نظرِ ثانی کی۔ مولانا انگریزی اچھی خاصی جانتے تھے۔ صرف ایک وضعداری کے تحت انگریزی میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اس لیے میرے نزدیک یہ کتاب مولانا کے خیالات کا ہو بہو ترجمہ ہے اور کسی ترجمے میں اصل زبان کی خوبیاں تلاش کرنا غلط ہے۔ ہمایوں کبیر جب مولانا کے انتقال کے بعد وزیرِ تعلیم ہوئے تو انھوں نے انجمن ترقی اُردو ہند کا دفتر دہلی لے جانے پر زور دیا اور اس کی عمارت کے لیے گرانٹ دینے کا بھی وعدہ کیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ چونکہ حکومت انجمن کو امداد دیتی ہے اس لیے اس کا صدر بھی حکومت ہی نامزد کرے اور اس کی مجلسِ عام اس غرض کے لیے تین نام حکومت کو بھیجے۔ مجھے اس پر اعتراض تھا۔ چنانچہ میں نے ان سے مل کر اصرار کیا کہ امداد کے لیے یہ شرط ہٹالی جائے کیونکہ انجمن کی صدارت کے لیے مجلس بہرحال کسی ممتاز ادیب یا اُردو دنیا کی کسی جانی مانی شخصیت کو ہی منتخب کرے گی۔ حکومت کی طرف سے نامزدگی کا اُردو دنیا پر اچھا اثر نہ ہوگا۔ بقول اکبر یہ سمجھا جائے گا کہ یہ کورٹ ہو گئی۔ ہمایوں کبیر نے میری بات مان لی اور میرے سامنے سکریٹری تعلیم کو حکم دیا کہ یہ شرط ہٹالی جائے۔ انھوں نے اس پر اصرار کیا تو قدرے سختی سے کہا کہ یہ میرا فیصلہ ہے اس کی تعمیل کی جائے۔ ایک زمانے میں ان کا نام علی گڑھ کی وائس چانسلری کے لیے

بھی تجویز ہوا تھا۔ اُس وقت کے وزیرِ تعلیم ترگنا سین نے ہمایوں کبیر سے ان کی مرضی دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ میں اس شرط پر تیار ہوں کہ لوک سبھا کی ممبری برقرار رہے۔ قواعد کے مطابق یہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد علیم صاحب کا تقرر ہوا۔ چونکہ پینل میں ان کا نام بھی تھا۔ افسوس ہے کہ ہمایوں کبیر نے سیاست سے دلچسپی کی وجہ سے وائس چانسلری نہ کی وہ بہت اچھے وائس چانسلر ثابت ہوتے۔ ۱۹۶۱ء میں ٹیگور کی صد سالہ برسی کی تقریبات کی انھوں نے صدارت کی تھی اور آلڈس ہکسلے، ایزایا برلن اور دنیا کے دوسرے ممتاز ادیبوں اور عالموں سے اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ ہمارے کتنے دانشور، عالم اور ادیب سیاسیات کے کوچے میں کھو گئے۔ دانشوروں کو حکومت کی مشین کا پرزہ نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کا کام ذہن کی رہبری اور افکار کی قیادت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں اقتدار اور طاقت کا نشہ نہیں ہے۔ ذہنوں پر حکمرانی اور اپنی بصیرت عام کرنے کی تسکین کا سہارا ہی ہے۔

اندرا گاندھی سے کئی بار ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات فروری ۱۹۸۴ء کو ہوئی۔ انجمن کے کاموں کے سلسلے میں اُن سے ملنا ہوتا رہتا تھا۔ جب وہ فاروق عبداللہ کو ہٹانا چاہتی تھیں تو کچھ دوستوں کے اصرار پر میں اُن سے ملا اور اس بات پر زور دیا کہ فاروق عبداللہ کی حکومت کو نہ گرایا جائے۔ وہ عام طور پر دوسرے کی بات توجہ سے سنتی تھیں مگر خود کم کچھ کہتی تھیں۔ اس بار جیسے انھیں اپنے دل کی بھڑاس نکالنی تھی۔ انھیں فاروق عبداللہ سے بہت شکایت تھی۔ اپنی بہو مینکا گاندھی کی فاروق عبداللہ کی حمایت بھی انھیں ناگوار تھی۔ میں نے کئی بار اس اقدام کے خطروں پر زور دیا، مگر وہ اٹل رہیں۔ دراصل وہ ایسا آدمی چاہتی تھیں جو سو فی صدی ان کا ساتھ دے۔ اندرا گاندھی کی وزارت کے دو دور ہیں۔ پہلا نہایت شاندار اور مجموعی طور پر ملک کے مفاد کے مطابق۔ لیکن ۱۹۷۲ء کے بعد اُن میں آمریت آگئی تھی۔ پھر انھوں نے کسی کی نہ سنی۔ ایک اطالوی صحافی سے انھوں نے کہا تھا کہ یہاں کی جمہوریت مجھے کچھ کرنے نہیں دیتی۔ اُن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اپنی وزارت میں وہ اکیلی مرد ہیں۔ کانگرس میں ایل۔ این۔ مشرا جیسے لوگوں کی ان کی سرپرستی سے اخلاقی قدروں کو خاصا صدمہ پہنچا۔ ذاتی طور پر ان میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ ادب اور فنونِ لطیفہ کی قدر کرتی

تھیں ۔ اُن میں طرحداری بھی تھی اور دلداری بھی ۔ آخر تک اُن کے تبسّم میں حیرت انگیز کشش تھی اور وہ اس کشش سے واقف تھیں ۔ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ بتایا کہ جواہر لال نہرو صدر سے مشورہ کرتے تھے ۔ اندرا گاندھی صدر کو اپنے فیصلوں سے آگاہ کرنا کافی سمجھتی تھیں ۔ سچ ہے اقتدار آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا اُسے صرف حاکم بنا دیتا ہے ۔ کسی کا یہ قول غلط نہیں کہ اقتدار بگاڑتا ہے اور مکمل اقتدار پورے طور پر بگاڑ دیتا ہے ۔ مگر اندرا گاندھی کی یہ خوبی تسلیم کرنی چاہیے کہ وہ ہماری مشترک تہذیب کی علمبردار تھیں ، تنگ نظر نہ تھیں ۔ سیکولرزم پر اُن کا اعتقاد تھا ۔ ماضی کی طرف نہیں مستقبل کی طرف دیکھتی تھیں ۔ افسوس اب ماضی پرست سیاست کی طاقت بڑھتی جاتی ہے ۔ بی ۔ جے ۔ پی کا بڑھتا ہوا اثر ملک کے لیے ایک خطرہ ہے ۔ سیکولر جماعتوں کو اس خطرے کا اور احساس ہونا چاہیے ورنہ ملک کی ترقی رک جائے گی اور وہ فرقہ واریت کے دلدل میں گرفتار ہو جائے گا ۔

میں نے شاعری تو دس گیارہ سال کی عمر سے شروع کر دی تھی مگر اس زمانے کی غزلیں اور نظمیں ضایع ہو گئیں ۔ سینٹ جانس کالج میں تعلیم کے دوران کالج کے مشاعروں میں شعر سنانے کا موقع ملا ۔ سینٹ جانس کالج میگزین میں کچھ نظمیں اور غزلیں شایع بھی ہوئیں ۔ فانی بدایونی اور مانی جائسی کے رسالہ تسنیم میں ایک افسانہ اور مضمون بھی چھپا تھا ۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت کے زمانے میں نثر کی طرف توجہ ہوئی ۔ کشمیر کے سفر سے شاعری کو پھر تحریک ملی اور میرا پہلا مجموعۂ کلام " سلسبیل " ۱۹۳۵ء میں شایع ہوا ۔ اس کا ادبی حلقوں میں خاصا خیر مقدم بھی ہوا ، مگر درس و تدریس کی ضروریات اور کچھ ذاتی میلان کی وجہ سے پھر نثر خصوصاً تنقید پر زیادہ توجہ رہی ۔ شعر میں برابر کہتا رہا ہوں ۔ کوئی کیفیت ، کوئی تجربہ ، کوئی منظر ، کوئی چہرہ ، کوئی تضاد مجھے ایک اور عالم میں لے جاتا ہے ۔ پھر کوئی مصرع ذہن کے نہاں خانے سے ابھرتا ہے ، کبھی پہلا مصرع کبھی دوسرا ۔ اگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات بن گئی تو پھر سلسلہ آگے چلتا ہے ورنہ نہیں ۔ ایک شعر کے بعد ہی کاغذ قلم

کی پھر ضرورت ہوتی ہے، ورنہ شعر کچھ دیر کے بعد ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ کاغذ پر نقش اوّل تیار کرنے کے بعد اسے علیحدہ رکھ دیتا ہوں اور پھر کچھ وقفے کے بعد جو لکھا ہے اُس پر تنقیدی نظر ڈالتا ہوں، کبھی خاصی ترمیم ہوتی ہے کبھی زیادہ نہیں۔

میں نے بہت سے اشخاص اور واقعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں مگر زیادہ تر کسی مسئلہ یا کسی میلان پر۔ میرے یہاں ذات بھی ہے اور کائنات بھی مگر نظر کائنات پر زیادہ ہے۔ غزلیں زیادہ تر کسی کیفیت کے تحت لکھی گئی ہیں، کسی خاص مصرعۂ طرح پر یا کسی مشاعرے کے لیے کم۔ کچھ لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ میں نے "اپنی ادبی زندگی کا آغاز تخلیقی کاوشوں سے کیا اور اس میدان میں اپنی عدم استطاعت کا شعور ہو جانے کے بعد تنقید کا پیشہ اختیار کیا"۔ میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں۔ ہوا یہ کہ چونکہ نقاد کی حیثیت سے میں نے بہت کچھ لکھا اور اس کی اہمیت بھی تسلیم کی گئی اور چونکہ رسالوں میں باقاعدہ اپنا کلام نہ بھیج سکا اور مشاعروں میں بھی دوسری مصروفیات کی وجہ سے کم ہی شرکت کر سکا۔ اس لیے میری شاعری پر وہ توجہ نہ ہوئی جو شاید ہونی چاہیے تھی۔ ادبی دنیا میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ کسی کی ادب کے ایک دائرے میں قدر ہوئی تو دوسرے دائرے کو اہمیت نہ دی گئی۔ ایسے کئی شاعروں کو میں جانتا ہوں جن کا کلام بڑا قابلِ قدر ہے مگر چونکہ وہ کسی اور حیثیت سے مشہور ہو گئے ہیں اس لیے اُن کے شاعرانہ قدر پر توجہ نہ ہوئی۔ ایسے شعرا کی تعداد بھی کم نہیں جو کسی میلان، تحریک یا فیشن اور فارمولے کے ذریعے سے منظرِ عام پر آئے۔ شاعری میں مجموعی طور پر ایک فکری میلان کے ساتھ میں مروجہ فارم کو اپنا تا رہا ہوں لیکن میرے یہاں بے قافیہ اور آزاد نظم بھی مل جائے گی۔

میرے خیال میں میری شاعری سے میری تنقید کو اور میری تنقید سے میری شاعری کو مدد ملی ہے۔ تخلیقی شعور کے پروان چڑھنے اور برگ و بار لانے کے لیے تنقیدی شعور کی ضرورت ہے اور تنقید میں آب و تاب تخلیقی صلاحیت سے آتی ہے۔ بہت سے نئے شاعر تنقید کی آمریت کا رونا روتے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ کچھ نقّاد دیانت داری سے اپنا فرض انجام نہیں دیتے۔ اس میں کبھی نظریے کا اختلاف، گروہ بندی یا محض تعصب کی کار فرمائی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نقاد کچھ تجربات سے ہمدردی نہ رکھتا ہو اور کسی نئی چنگاری

کو نہ پہچان پاتا ہو لیکن ان کوتاہیوں کی وجہ سے تنقید اور نقاد کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ بہرحال تنقید تجربے اور تجربے میں فرق کر کے، قدروں کی پہچان کر کے معنویت کی تلاش اور معیاروں پر نظر کے ذریعے ذوقِ سلیم عام کرنے میں مدد دیتی ہے۔ تخلیق کار میں اگر تنقیدی شعور کم ہو تو اس کی تخلیق ایک منزل پر رک جاتی ہے وہ یا تو سہل پسندی کا شکار ہو جاتا ہے، یا اپنے کو دہرانے لگتا ہے یا شہرت کا شہید ہو جاتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں ایسا اکثر ہوا ہے کہ شاعر کو جو شہرت ملی ہے وہ صرف اس کے فن کی خوبی کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی نظریے یا میلان یا تحریک یا فارمولے کے سہارے، یا شاعر کی سماجی حیثیت کی وجہ سے۔

اچھی تنقید ذہن کی تنظیم کر کے مہذب اور باشعور قاری پیدا کرتی ہے۔ ادب کا تجربہ یہ ہے کہ اس میں اکثر فوری انصاف نہیں ہوتا مگر بالآخر ضرور ہوتا ہے۔ اقبال نے غلط نہیں کہا ہے کہ "جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو اس کے دور کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور جب شاعر کی آنکھ بند ہو جاتی ہیں تو اس دور کی آنکھ کھلتی ہے۔" غالب کے دور میں اُن پر ذوق کو ترجیح دی جاتی تھی وہ فارسی ہی کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ تنقید اس سلسلے میں توازن قایم کرتی ہے۔ نظیر کے دور میں خواص پسندی کی وجہ سے اُن کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا۔ وہ عوام میں مقبول رہے، خواص انھیں گوارا نہ کر سکے۔ ردِ عمل کے طور پر انھیں ہندوستان کا شیکسپیر اور اُردو شاعری کے تاریک افق پر تنہا ستارہ بھی کہا گیا۔ یہ بھی انتہا پسندی تھی مگر آج اُردو تنقید اُن کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے مگر اس سلسلے میں مبالغے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ ترقی پسندی ہو یا جدیدیت دونوں میلانات کے اثر سے جن شاعروں کو وقتی شہرت ملی اُن کے متعلق آج زیادہ صحت مند، سنجیدہ اور جامع، متوازن اور منصفانہ تنقید ملتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی شاعری صرف عصری میلانات کی آئینہ دار نہیں ہوتی۔ ماورائے عصر بھی ہوتی ہے۔ تنقید برابر کسی نئے پہلو کی دریافت، کسی نئی عمدگی کی پہچان، حُسن کاری کے کسی نئے روپ کی طرف توجہ دلاتی رہتی ہے۔ روایت فرسودگی کی طرف لے جائے تو بغاوت کی تازگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغاوت جب بے لگام ہو جائے تو پھر کلاسیکی ضبط و نظم پر توجہ کرنی پڑتی ہے۔ ہر بغاوت کسی نہ کسی

سبھولی ہوئی روایت کی توسیع ہوتی ہے اور پھر یہ بغاوت روایت بھی بن جاتی ہے۔ آزاد نظم کی اب جو اہمیت محسوس کی جا رہی ہے وہ نقادوں کی توجہ کی مرہونِ منّت ہے۔ تنقید نے ہی ہمیں سکھایا ہے کہ مشاعرے کی مقبولیت شاعری کی عظمت کی ضامن نہیں ہوتی۔ یہ شاعری فوری اپیل اور مقبول راہ پر چلنے کی وجہ سے بھی مقبول ہوتی ہے۔ کوئی جانبدار تنقید کسی جوہرِ قابل کی پہچان سے نہیں روک پائی۔ ہم اس جانبداری کو فوراً پہچان لیتے ہیں اور اس کے طلسم میں گرفتار نہیں ہوتے۔ اچھی شاعری وہ ہے جو ذہن میں چراغاں کر دے، جو مانوس جلووں کو تازگی اور تازگی کو مانوسیت عطا کرائے۔ جو زبان کے اپنے مخصوص استعمال سے، اپنی تہہ داری سے، اپنے ابہام سے اس دریا کو کوزے میں سمو دینے کی صلاحیت سے، ہمیں زندگی کے حسن، اس کے نیرنگ، اُس کے تضادات اور اُس کی پہنائی سے آشنا کر دے، وہ ہمیں زیادہ حسّاس، زیادہ مہذب بنا دے۔ وہ ہمیں زندگی کے ہر منظر سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت عطا کرے، وہ ہمیں بہتر انسان بنا دے۔ شاعری انقلاب نہیں لاتی، ذہنی انقلاب کے لیے فضا ہموار کرتی ہے۔ یہ تلوار نہیں نشتر ہے۔

مگر متمدن انسان کے زیادہ تر کام اب نثر انجام دیتی ہے۔ اس لیے نقاد کو شاعری کی تنقید کے علاوہ نثر کی تنقید خصوصاً فکشن کی تنقید پر بھی پوری توجہ دینی چاہیے۔ اگر آج ہماری تنقید زیادہ تر شاعری سے متعلّق ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ساری دنیا کے ادب میں ایسا ہوا ہے۔ مگر اس بات کی ضرورت بہرحال ہے کہ نثر پر تنقید کی لَے بڑھے کیوں کہ ہماری نثر اب ایسی گئی گزری نہیں رہی۔ افسانے اور ناول میں اس نے نمایاں ترقی کی ہے۔ انشائیہ، سوانح نگاری، خود نوشت، طنز و مزاح، سفرناموں، مکاتیب کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہماری نثر میں موجود ہے۔ تنقید اس طرف اور توجہ کرے تو تخلیقی نثر کا معیار بہتر ہوگا۔ اس تنقید کے سامنے مشرق و مغرب کے سارے معیار ہونے چاہییں۔

تنقید میں اصطلاحوں کا استعمال ناگزیر ہے، مگر تنقید کی زبان بہرحال عام فہم اور شگفتہ ہونی چاہیے۔ تنقید سائنس سے مدد لیتی ہے مگر سائنس نہیں ہے، ادب کی ایک شاخ ہے۔

یہ صرف یونیورسٹی کے اساتذہ کا پیشہ ورانہ مشغلہ نہیں، نہ کوئی مخصوص انڈسٹری ہے۔ اس کا مقصد ایک مخصوص طبقے کی ذہنی ورزش نہیں، پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت اور تہذیب اور انسانیت کی قدروں کی اشاعت ہے۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک نے بلاشبہ بہت ترقی کی ہے۔ ہم غذا کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ ہمارے صنعتی کارخانے ہر قسم کی چیزیں پیدا کر رہے ہیں۔ پہلے سوئی تک باہر سے آتی تھی اب ہم ہوائی جہاز بنا رہے ہیں۔ خلا میں راکٹ اور میزائل چھوڑ رہے ہیں۔ ہمارے سیٹلائٹ SATELITE بھی فضا میں معلق ہیں۔ اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کی تعداد بڑھی ہے۔ سائنسدانوں کی ایک فوج ہم نے تیار کرلی ہے۔ ہم اپنی پیداوار باہر کے ملکوں کو بھی خاصی مقدار میں بھیج رہے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کے لیے بڑے بڑے پشتے اور بند باندھے گئے ہیں۔ ہرے انقلاب GREEN REVOLUTION سے آپریشن فلڈ OPERATION FLOOD تک بہت کچھ ہوا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہماری خواندگی کی شرح چوالیس فی صدی سے زیادہ نہیں اور عورتوں کی خواندگی تو اس سے بھی بہت کم ہے۔ شہروں میں خوش حال طبقے نے سربہ فلک مکان ضرور بنا لیے ہیں۔ مگر عام مکانوں کی تعداد بھی کم ہے اور ان کی حالت بھی خستہ ہے۔ وبائی امراض سے ہم نے بڑی حد تک نجات حاصل کرلی ہے مگر ملیریا پر قابو نہیں پا سکے۔ ہمارے عوام کی زندگی اب بھی روٹی روزی کی ایک جان لیوا مہم ہے۔ اشیائے خوردنی کی ہی نہیں سبھی چیزوں کی قیمتیں آسمان کو پہنچ رہی ہیں۔ ماحول کی آلودگی خطرناک ہے۔ تشدد حد سے بڑھ گیا ہے۔ لاقانونیت زوروں پر ہے۔ رشوت ستانی اور مالی بدعنوانیوں کی تو کوئی حد ہی نہیں رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری اخلاقی قدروں کو گھن لگ گیا ہے۔ کسی چیز پر عقیدہ نہیں۔ مذہب کا نام زیادہ لیا جاتا ہے مگر اس میں عقاید اور عبادات پر ہی زور رہے، معاملات پر کوئی توجہ نہیں۔ مذہب کے نام پر عوام کو گمراہ کرنے کا کام زور شور سے جاری ہے۔ کہا جاتا تھا کہ مشرق روحانیت کا گہوارہ ہے، مغرب مادیت کا۔ مجھے تو اب یہی روحانیت یہاں کم نظر آتی ہے۔ ہاں مادیت میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ زندگی میں نظم و ضبط کی کمی ہو رہی ہے۔ ضبط و نظم دراصل اور بے

سے لادا نہیں جاتا۔ زندگی کے کسی نصب العین پر عقیدے، کسی منزل کی جستجو، کسی معیار کی تلاش سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں معیار اب صرف دولت کمانا رہ گیا ہے۔ ہم سب صارفیت (CONSUMERISM) کے شکار ہیں۔ ہر چیز تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ حقوق پر بہت زور ہے، فرائض کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ شہریت کے تمدن کے، مہذب زندگی کے کیا آداب ہیں ان سے ہمیں سروکار کم ہے۔ اپنی مادی آسودگی کی زیادہ فکر ہے۔ گھر کو لوگ صاف رکھتے ہیں اور سڑک پر ساری گندگی ڈال دیتے ہیں۔ کوئی کام بغیر نذرانے کے نہیں ہو سکتا۔ پرانے لوگ کہتے تھے کام عبادت ہے۔ آج لوگ کہتے ہیں کام حماقت ہے۔ کام کا بہانہ کافی ہے۔ مشرقی جرمنی کے متعلق کہیں ایک قصہ پڑھا تھا کہنے والے نے کہا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد روسی اُن کے پاس صرف کچھ آلو اور اُل برشٹ (ULBRISHT) (کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ) چھوڑ آئے تھے۔ باقی سب چیزیں یہاں تک کہ ریل کی پٹریاں تک اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ مگر اپنی محنت اور جاں فشانی سے کمیونسٹ بلاک میں وہ سب سے زیادہ خوش حال ہو گئے تھے (گو مغربی جرمنی اُن سے بہت آگے تھا) کہنے والے کے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بھی جرمن ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی اور جاپان بالکل تباہ ہو گئے تھے۔ آج وہ دنیا کی سب سے خوش حال طاقتوں میں ہیں۔ اور امریکہ اور یورپ اب جاپان اور جرمنی سے خوفزدہ ہیں۔ یہ سب کچھ دراصل کام کے اخلاق (WORK ETHICS) سے ممکن ہوا۔ ورنہ جرمنوں اور جاپانیوں میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہیں۔ ہم اس پر بڑا فخر کرتے ہیں کہ ہندوستان تیسری دنیا میں اور ترقی پذیر ممالک میں خاصا آگے ہے مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ تیسری دنیا کو ایک نقاد نے دھرتی کے بیچارے THE WRETCHED OF THE EARTH کہا ہے اور کوریا، سنگاپور، برازیل، تیوان جیسے ملکوں میں ترقی کی رفتار ہندوستان سے بہتر ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

ہمارے قریے تو کیا ابھی قصبے اور شہر بھی فردوس کے بجائے جہنم کا نقشہ پیش کرتے

ہیں۔ ہمارے اسکولوں میں پڑھائی کم ہوتی ہے سیاست زیادہ۔ ہمارے کالجوں میں نوجوانوں کی فوج ہنگامے کرنے، ریلوں پر یلغار کرنے اور سینما ہالوں کے خلاف مظاہرہ کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں علم کی لگن کم ہے۔ کوئی چلتی ہوئی ڈگری حاصل کرنے، کوئی ملازمت اچک لینے کی تگ و دو زیادہ۔ ہماری سیاست، مذہب اور ذات پات کی تفریق کی زبان سے مذمت کرتی ہے، مگر انتخابات میں اسی سے کام لیتی ہے۔ انتخابات اب قوتِ بازو اور قوتِ زر سے جیتے جاتے ہیں۔ کچھ جرائم پیشہ لوگ پہلے چھپ کر سیاست دانوں کی مدد کرتے تھے اب اعلانیہ میدان میں آکر طاقت حاصل کرتے ہیں اور من مانی کرتے رہتے ہیں۔

پبلک سیکٹر ضروری ہے مگر اس میں پیداوار بڑھانے پر توجہ کم ہے تنخواہ حاصل کرنے پر زیادہ۔ پرائیوٹ سیکٹر واقعی اپنا حلقہ اثر محنت اور لگن سے بڑھاتا ہے مگر اسے جائز ذرایع سے کوئی سروکار نہیں۔ اسے اپنا کام کسی طرح نکالنا ہے۔ افسر کام چور ہوتے جا رہے ہیں اور کلرک فرعون۔ چائے پانی، جل پان یا کشمیریوں کی اصطلاح میں تھوڑے سے "دمشک" کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ بہت سے افسر یا تو سیاست دانوں کے اشارے پر کام کرتے ہیں یا تحفے تحائف اور تفریح کی لالچ میں۔ فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حالی نے لکھا تھا کہ عرب میں ایام جاہلیت میں کبھی گھوڑا بڑھانے یا پانی پلانے پر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ ہمارے یہاں کوئی رکشہ کسی سائیکل سے ٹکرا جائے تو جھگڑا ہو جاتا ہے۔ شادیوں میں فضول خرچی عام ہے۔ لاوڈ اسپیکر پر کیرتن یا وعظ یا فلمی گانے زور شور سے بجتے رہتے ہیں، خواہ کسی کی پڑھائی میں حرج ہو یا کوئی بیمار ہو۔ لوگ یہ بھول گئے کہ آزادی کے معنی بے لگامی کے نہیں ہیں اور فرد کی آزادی مرض نہیں ہونا چاہیے۔ اقبال نے جو خودی کے علمبردار تھے یہ بھی کہا ہے کہ مطلق خودی شیطنت کی طرف لے جاتی ہے۔ دراصل ہمارے ملک نے گو صنعتی دور میں قدم رکھا ہے اور سوشلزم کو اپنا رہا ہے مگر فیوڈل یا جاگیردارانہ یا سامنتی مزاج سے ہم چھٹکارا نہیں پا سکے ہیں۔

فیوڈلزم میں انسانی رشتوں کی پہچان اور تہذیب کی سرپرستی تو ہم نے کھو دی۔ سرمایہ داری کی محنت اور مقابلے کی اسپرٹ کو اپنانے کے بجائے اس کی خود غرضی، زرپرستی اور لاانسانیت (DE HUMANIZATION) کو اپنا لیا ہے۔ مذہب سے محبت ہے مگر اس کے رسم و رواج

سے زیادہ اس کی روح سے کم۔ زبان صرف سیاسی مقصد کے لیے ہے نہ اس کی تحصیل پر توجہ ہے نہ تعلیم پر۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے کسی زبان جاننا ذہن کی ترقی کے لیے مفید ہے۔ ہمارے ملک میں اپنی زبان کے علاوہ کوئی دوسری ملکی زبان پڑھنا ہی نہیں جاتا۔ ہندی جب سے سرکاری زبان ہوئی ہے اُس وقت سے اسے مشکل بنایا جارہا ہے۔ تت سم الفاظ کی کثرت اور تدبھو الفاظ سے بے التفاتی اسے مصنوعی اور محدود کررہی ہے۔ زبان جتنی آسان ہوگی اتنی ہی ترقی یافتہ ہوگی۔ جتنا وہ دوسری زبانوں سے لے گی اتنی ہی سرمایہ دار کہلائے گی۔ افسوس ہے کہ ہندی صرف سنسکرت کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں اُردو، پنجابی، بنگالی، تمل، تلگو، ملیالم، کنڑ، مراٹھی کی طرف نہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ہندی میں ٹیگور، اقبال اور بھارتی کے پائے کا کوئی کیوں نہیں ہوا۔ زبان سرکاری یا سیاسی سرپرستی سے نہیں اپنی جامعیت، اپنی عوام کی ذہنی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت اور اپنے شاندار علمی و ادبی سرمائے سے ترقی کرتی ہے۔ اُردو دوست خود اُردو کے فروغ کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ حکومت سے لَو لگائے ہوئے ہیں۔ اُردو ہماری قومی زبان ہے صرف مسلمانوں کی زبان نہیں۔ ملک کے آدھے سے زیادہ مسلمان اُردو نہیں جانتے۔ وہ مشاعروں کی واہ واہ، اکیڈمیوں کے انعامات، کتب خانوں کے لیے کچھ عطیات سے مطمئن ہوجاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا انتظام حکومت کا فرض ہے مگر حکومت اگر اپنے فرض سے کوتاہی برتتی ہے تو ہمیں تو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ حکومت ویسے ہی کتنے فلاحی کام کرتی ہے۔ جب لکھنؤ میں ممیور نانند سے بحث ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے دیکھ لیجیے گا پچیس تیس برس میں اُردو پڑھنے والے بہت کم رہ جائیں گے میں اُن کی پیش گوئی کو عصبیت پر مبنی سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اُردو والے اپنی زبان کو ضرور زندہ رکھیں گے۔ مگر ادھر اردو والوں کا حال یہ ہے کہ وہ ماتم کرتے ہیں، شکوہ شکایت کرتے ہیں، حکومت کو معروضات پیش کرتے ہیں، خود کچھ نہیں کرتے۔ اس زبان کو حکومت یا اکثریت نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا خود اُردو والوں کی بے توجہی لاپروائی اور بے عملی نے۔ ابھی وقت ہے۔ ابھی اُردو کم سے کم دلوں کی دنیا میں موجود ہے۔ اسے ذہن، سیرت، شخصیت اور زندگی کے کاروبار میں کام میں لایا جاسکتا ہے۔ زبان کی مضبوط بنیاد کے بغیر ادب کا رنگ محل

تعمیر نہیں ہو سکتا۔

اُردو رسم خط کو بہر حال باقی رکھنا ہے۔ مگر املا میں، تدریس اور جدید دور کی ضروریات کے لحاظ سے کچھ اصلاحیں ضروری ہیں۔ الفاظ ملا کر نہ لکھے جائیں۔ جن الفاظ کے آخر میں الف کی آواز آتی ہے وہ الف سے لکھے جائیں، عربی اور فارسی کا جو تلفظ اُردو میں رائج ہو گیا ہے اس کا لحاظ رکھا جائے۔ بین قومی اعداد اختیار کیے جائیں۔ املا میں اصلاح کی تجاویز انجمن ترقی اُردو ہند نے اور بعد میں ترقی اُردو بورڈ کی ایک کمیٹی نے پیش کی تھیں مگر اُردو دوست خوف کا شکار ہیں۔ ذرا سی تبدیلی سے ڈرتے ہیں۔ کوئی عربی فارسی سے چپکا رہنا چاہتا ہے کوئی نستعلیق کی کرسیوں سے۔ طلبا کی سہولت، بالغوں کی آسانی، غیر ملکی طلبا کی مشکلات کو کوئی نہیں دیکھتا۔ انیسویں صدی کی اُردو زبان اور بیسویں صدی کی اُردو زبان میں کچھ فرق تو ہوگا ہی۔ ہندی کے وہ الفاظ جو ہمارے صوتی نظام میں کھپ سکتے ہیں اور ان کا چلن ہو گیا ہے کیوں نہ لے لیے جائیں۔ اس طرح آئے دن کے استعمال میں آنے والے انگریزی کے الفاظ کو بھی اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے ضمیمے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان میں یورپین زبانوں کے علاوہ اُردو ہندی کے کچھ الفاظ بھی برابر لیے جا رہے ہیں۔ دراصل زبان کبھی جامد نہیں رہتی۔ وہ بڑھتی، پھیلتی، نئے نئے مفاہیم، افکار اور خیالات جذب کرتی رہتی ہے۔ اُردو کی مقبولیت اسی جذب و انجذاب کی صلاحیت کی وجہ سے ہے۔ جاگیردارانہ دور سے جو کچھ ہمیں لینا تھا لے چکے، اب سرمایہ داری کے دور، صنعت کاری کے فروغ، سوشلزم کی طرف اقدامات کے تقاضے بھی پورے کرنے ہیں۔

اُردو میں علوم جدید کا سرمایہ قابلِ فخر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک جدید ترقی یافتہ زبان کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ پہلے عثمانیہ یونیورسٹی نے پھر انجمن ترقی اُردو ہند نے اس سلسلے میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ مگر اس وقت جس منصوبہ بندی، جس جامعیت، جس لگن کے ساتھ یہ کام ہونا چاہیے نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے سے لوگ ڈرتے ہیں۔ اُردو میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تعلیمی سفر کی ہر منزل پر ہمارا ساتھ دے سکے۔

ثانوی تعلیم صرف مہاراشٹر اور جنوبی ہند میں کامیابی سے دی جا رہی ہے۔ شمالی ہند میں سسک کر چل رہی ہے۔ این۔ سی۔ آر۔ ٹی نے ثانوی منزل کی کتابیں ضرور تیار کی ہیں۔ ترقی اُردو بورڈ نے بھی اس طرف توجہ کی ہے مگر اتر پردیش میں خود اردو بولنے والوں نے اپنے اداروں میں ثانوی منزل پر اُردو میں تعلیم کو ایسا ہفت خواں سمجھ لیا ہے جو طے نہ ہو سکے۔ دینی تعلیم کے اداروں نے اس طرف توجہ کی ہے مگر وہ قدیم طریقۂ تدریس کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اُردو کو لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھاتی ہے اور وہ بھی سب طالب علم نہیں پڑھ پاتے۔ پلس ٹو کے مرحلے پر اور پہلی ڈگری کے لیے اُردو ابھی تک ذریعۂ تعلیم نہیں ہے۔ صرف بی۔ اے کے امتحان میں انگریزی کے علاوہ اُردو یا ہندی میں جوابات لکھنے کی اجازت ہے۔ میں نے اربابِ حل و عقد کو کئی دفعہ اس طرف توجہ دلائی مگر ہنوز روزِ اوّل ہے۔

اُردو زبان کو صرف اُردو دوست ہی بچا سکتے ہیں۔ وہی اسے ترقی کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔ حکومت اوّل تو یہ کرے گی نہیں اور کرے گی تو صرف خانہ پُری کے لیے۔ بچوں کے لیے ادب، بالغوں کے لیے ادب، علومِ جدیدہ کے تراجم اور تالیفات کے ذریعے سے اُردو کے علمی سرمائے میں اضافہ۔ یہ سب ایسی ضروریات ہیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ میں مشاعروں، کانفرنسوں، سیمیناروں کے خلاف نہیں ہوں، اُن کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ مگر صرف اُن سے اُردو کی ترقی ممکن نہیں۔ اُردو ادب کی بھی نہیں۔ ابتدائی درجے سے لے کر ثانوی درجے تک اُردو کے ذریعے سے تعلیم، پھر اعلیٰ تعلیم کی منزل پر اُردو ادب کے مطالعے کی سہولت، اس کے علاوہ شمالی ہند اور جنوبی ہند میں ایک ایک اُردو یونی ورسٹی۔ ہر منزل کے لیے مناسب لٹریچر کی فراہمی، اُستادوں کی تربیت، جدید علوم پر اُردو کتابیں اور انگریزی میں معیاری علمی کتابوں کے اُردو میں تراجم، طلبا کی علاقائی زبانوں اور ہندی سے واقفیت، خواتین اور اَن پڑھ بالغوں کے لیے مناسب تعلیمی مرکز، جہاں اُن کی تفریح کا بھی سامان ہو۔ یہ کام زیادہ ضروری ہیں۔ کوئی حکومت مختلف وجوہات کی بنا پر یہ سب کام نہیں کرے گی۔ ہاں کچھ کھلونوں سے ضرور بہلائے گی۔ اپنی مدد آپ ہی بہترین اصول ہے۔

میں مسلمان ہوں اور مولانا آزاد کے الفاظ میں "اسلام کے تیرہ سو سال کے سرمایے کا امین" میرا اسلامی تشخص میری روح کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور میں ہندوستانی بھی ہوں اور یہ ہندوستانیت بھی میری پہچان ہے۔ اسلام مجھے اس ہندوستانی قومیت سے نہیں روکتا بلکہ بقول مولانا آزاد "اس میں میری رہنمائی کرتا ہے" یہ واقعہ ہے کہ مذہب مجھے اپنے خاندان اور ماحول سے ملا۔ مگر میرے ذاتی مطالعے اور تجربات نے اس بنیاد کو مستحکم کیا۔ بدایوں کے ماحول میں مذہب، قدامت پرستی، روایت پرستی، معجزوں اور کرامات اور پیروں اور فقیروں پر اندھے اعتقاد کا نام تھا۔ توحید پر عقیدہ، مساوات انسانی کی طرف لے جاتا ہے۔ خدا صرف رب المسلمین نہیں، رب العالمین ہے۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی جامعیت مجھے شروع سے متاثر کرتی رہی ہے۔ اسلام ترکِ دنیا نہیں سکھاتا، یہ دنیا کا حق ادا کرنا سکھاتا ہے مگر دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتا ہے۔ اسلام میں کٹرپن نہیں ہے۔ میں نے کٹر آدمیوں کو اکثر اچھا آدمی نہیں پایا۔ اسلام میں حق اللہ سے زیادہ حق العباد کی اہمیت ہے۔ حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام ایک نہیں ہیں۔ دراصل اسلام کا اصول "خیر الامور اوسطہا" کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عرب شہنشاہیت نے اسلام کی جمہوری روح کو نقصان پہنچایا۔ اقبال نے خاص طور پر اس پر زور دیا ہے۔ چند کو چھوڑ کر مسلمان بادشاہ، بادشاہت کے نمائندے زیادہ تھے اسلام کے کم۔ ایک عرصے تک تصوف کی تحریک نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور اس کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ صوفی سب انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ ان کا عوام سے گہرا تعلق رہا ہے۔ بعد میں تصوف بھی پیر پرستی، قبر پرستی اور اذکار اور اشغال کے ایک لامتناہی سلسلے میں محدود ہو کر رہ گیا۔ علما شریعت کی حفاظت کی فکر میں لگے رہے۔ انھوں نے ظالم بادشاہوں کو من مانی کرنے دی کیوں کہ ان کے نزدیک ظالم حکمراں بھی گوارا تھا بشرطیکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہو۔ صرف شہنشاہیت نے ہی اسلام کی روح کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ان علما نے بھی جنھوں نے عقائد اور عبادت پر تو زور دیا، لیکن معاملات کو نظر انداز کر دیا۔ اسلام کی بنیاد قرآن کی تعلیم، سیرت رسولؐ اور صحیح احادیث کے احکام پر ہے شروع سے اس میں نئے حالات کے لیے اجتہاد کی گنجائش ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے

سے ایسا ہوا بھی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ علما اپنے سوا کسی اور مسلمان کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ اجتہاد کی بات کر سکے۔ اقبالؔ کو جدید دور کے تقاضوں کا احساس تھا۔ اُن کے نزدیک ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ وہ قرآنی تعلیمات کی تعبیر اور تفسیر اپنی بصیرت کے مطابق کر سکے۔ ہاں ہر کا روحِ قرآن سے آشنا ہونا اور صحیح احادیث کے سرمایے پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ فقہ میں سُنّیوں کے چار مکاتبِ فکر مستند ہیں۔ اس کے علاوہ فقہ جعفری بھی ہے۔ پروفیسر آصف فیضی کی، جو عربی کے عالم اور مُسلم لا کے ماہر تھے، یہ رائے تھی کہ آج کا مسلمان ان میں سے کسی دبستان کی اجازت سے کام لے سکتا ہے۔ علما میں ایسے لوگ کم ہی ہیں جو موجودہ دور کے مسایل اور میلانات کا کما حقہٗ علم رکھتے ہوں صنعتی انقلاب، نظریۂ ارتقا، فطرت کی تسخیر، اور کائنات کے زیادہ وسیع علم نے دنیا کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ انسانیت جاگیرداری کے دور سے سرمایہ داری کے عروج، پھر سوشلزم کے فروغ اور اب فلاحی ریاست تک آپہنچی ہے۔ دنیا سکڑ کر ایک گروی گاؤں GLOBAL VILLAGE ہو گئی ہے۔ ذرایعِ ابلاغ کی حیرت انگیز ترقی نے ساری انسانیت کو ایک کشتی میں سوار کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی رہ نمائی اب صرف وہ علما نہیں کر سکتے جو قدیم سرمایۂ علمی پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ ہاں وہ روشن خیال اور دانشور طبقہ کر سکتا ہے جو جدید علوم اور جدید زندگی پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ، اسلامی تعلیمات سے پوری طرح آشنا ہو اور یہ تعلیمات اُس کے لیے مشعلِ راہ ہوں۔ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ رسولِ مقبولؐ پر وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب انسانی ذہن آزاد ہے کہ اس کی روشنی میں نئے مطالبات کے ہجوم میں اپنی عقل سے کام لے۔ اقبالؔ اُس عقل پرستی کے خلاف تھے جو انیسویں صدی میں یورپ میں اُبھری تھی۔ وہ پُرسوز عقلیت کے قایل تھے۔ یعنی وہ عقل کو "ادب خوردہ دل" دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی نگاہ کوفہ و بغداد کی طرف نہیں تھی۔ وہ "تازہ بستیاں آباد" کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ خود مسلم پرسنل لا پر نظرِ ثانی کریں۔ اس کام میں حکومت کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جب اسلامی ممالک کے بعض علما نے اس سلسلے میں کچھ تجاویز پیش کیں تو مولانا آزاد نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا تھا اور اُن پر غور و خوض ضروری قرار دیا تھا۔ اس وقت خوش قسمتی سے ہمارے درمیان مولانا سعید

ابوالحسن علی (علی میاں) جیسی عدیم النظیر اور بے مثال شخصیت ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں مولانا کے علم فضل کا لوہا مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی جسٹس ہدایت اللہ جیسے قانون داں بھی ہیں جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہے ہیں۔ ان دونوں کی رہنمائی میں علما اور جدید دور کے عالموں اور اسکالروں کا ایک مشاورتی بورڈ جلد سے جلد وجود میں آجائے اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے وقتاً فوقتاً ہدایات جاری کرتا رہے تو ہماری ایک بڑی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ اس بورڈ کی سفارشات کو سب مسلمانوں کی تائید حاصل ہوگی اور ان کے مطابق قدم اٹھایا جا سکے گا۔ تعدد ازدواج تو دراصل کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے مگر نکاح کی رجسٹری ضروری ہے۔ کئی سال ہوئے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں، طاہر محمود صاحب نے ایک مقالے میں یہ واضح کیا تھا کہ کشمیر میں اسلامی قوانین کے بجائے رواجی قوانین کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ملے گی۔ شیخ عبداللہ نے اپنے دورِ حکومت میں نکاح کی رجسٹری پر زور دیا تھا۔ مگر وہاں کے اخباروں میں اس کی مخالفت ہوئی تھی۔ شمالی ہند میں اب نکاح کے ایک رجسٹر میں اندراج کا رواج ہو چلا ہے اسے قانونی حیثیت دے دی جائے تو کیا حرج ہے۔ طلاق کے سلسلے میں علما اور ماہرین قانون کے ایک بورڈ کی منظوری ضروری قرار دینے میں پس و پیش کیوں ہو۔ کم عمری میں لڑکیوں کی شادی پر پابندی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح بڑھتی ہوئی آبادی پر روک لگانے پر خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت مذہبی نقطۂ نظر سے کیوں کی جائے۔ اقبال اور بہت سے اہلِ نظر تو اس پابندی کو اسلام کی تعلیمات کے منافی نہیں سمجھتے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو اگر اپنے اسلامی تشخص پر فخر ہو تو اس میں کسی کو برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسلامی تشخص کسی طرح قومی تشخص کی نفی نہیں کرتا۔ اسلامی تشخص پر اصرار کے معنی علیحدگی پسندی ہرگز نہیں۔ ہندوستان ایک سیکولر جمہوریت ہے۔ یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے پچاسی کروڑ کے لگ بھگ لوگ رہتے ہیں۔ مگر ہندوستان کی ایک مشترک قومی تہذیب ہے جس کی کثرت میں وحدت ملے گی۔ ہندوستانی قومیت تکثیری (PLURALIST) ہے۔ وحدانی (MONOLITHIC) نہیں۔ ہماری جمہوریت وفاقی ہے۔ اس کی ریاستوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی ملنی چاہیے۔

سرکاریا کمیشن نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ خواہ تامل ناڈو ہو یا جھارکنڈ، بوڈولینڈ، یا میزورم، گورکھا لینڈ ہو یا پنجاب اور کشمیر۔ ان سب علاقوں میں علیحدگی پسندی کا جذبہ اس لیے ابھرا کہ ان کے باسیوں کو اپنی شناخت IDENTITY یا اپنی مخصوص پہچان کے لیے خطرہ محسوس ہوا۔ علاقائی خصوصیات کی نفی کر کے قومی خصوصیات نہیں ابھر سکتیں۔ علاقائی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ان پر وسیع اور ہمہ گیر قومی خصوصیات کا عظیم الشان ہیکل تیار کیا جا سکتا ہے۔ قومی احساس بہر حال ڈیڑھ سو سال پرانا ہوگا۔ حبِ وطن تو ہمارے خمیر میں ہے۔ ہماری قومیت ہندوستان کی پوری تاریخ کے جذب و انجذاب کے سلسلے، قدیم دور، وسطی دور اور جدید دور کے، سارے سرمائے کشمیر سے کنیا کماری اور کامروپ سے کچھ تک کے سارے حصوں کے بلوۂ صد رنگ سے عبارت ہے۔ رام چندر جی ہوں یا کرشن جی، گوتم بدھ ہوں یا مہاویر، جنوبی ہند کے بھگت ہوں یا شمالی ہند کے، نانک ہوں یا کبیر، بابا فریدؒ ہوں یا خواجہ غریب نوازؒ، نظام الدین اولیاؒ ہوں یا خسروؒ، اکبر ہوں یا ٹیپو سلطانؒ، پہلی جنگ آزادی کے سورما ہوں، یا آزادی کی تحریک کے رہنما، بھارتی ہوں یا اقبال و ٹیگور، مہاتما گاندھی ہوں یا سبھاش بوس، جواہر لال نہرو ہوں یا مولانا آزاد، حسرت موہانی ہوں یا محمد علی۔ یہ سب ہماری قومی بساط کے چاند تارے ہیں۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ "میرے گھر میں بہت سی کھڑکیاں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان میں ہر طرف سے ہوا آئے۔ مگر یہ نہ ہو کہ کوئی آندھی ہمارے گھر ہی کو اکھاڑ پھینکے"

آزادی کے بعد بلاشبہ ہمارے یہاں خاصی ترقی ہوئی ہے۔ غذا کے معاملے میں ہم خود کفیل ہو گئے ہیں۔ صنعتی دور میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ہم نے بجلی پیدا کرنے اور آب پاشی کے لیے بڑے بڑے منصوبے بنائے ہیں۔ پہلے ایک سوئی بھی باہر سے آتی تھی۔ اب ہم کاریں اور ہوائی جہاز بنا رہے ہیں۔ ہم نے بہت سی بیماریوں پر قابو پا لیا ہے اور زندگی کی توقع کی شرح اب ساٹھ کے قریب ہے۔ مگر ہماری ترقی کی رفتار سست ہے اور بہت کچھ ابھی کرنا باقی ہے۔ خواندگی کی شرح ابھی چوالیس فی صدی سے آگے نہیں بڑھی۔ نصف آبادی کے لگ بھگ ابھی غریبی کی لکیر میں ہے۔ ترقی کی اندھی دوڑ نے ہمارے قدرتی ماحول کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ فسادات کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اخلاقی قدروں کا خاص طور سے زوال ہوا ہے۔ سیاست نے

ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو قومی مفاد کے بجائے اپنے اقتدار کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ آزادی کے بعد تیسری دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملک کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہم ابھی تک مندر اور مسجد، ذات پات کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ دانشوروں سے امید تھی کہ وہ عوام کی ذہنی رہنمائی کریں گے، اور حقوق کے ساتھ فرائض کا احساس بھی دلائیں گے۔ مگر وہ گل افشانیٔ گفتار اور آرائشِ تحریر سے آگے نہیں بڑھے۔ ہندوستان میں کام سے لگاؤ کم ہو گیا ہے، ہوسِ زر بڑھ گئی ہے۔ مقبول رجحان جائز ناجائز کسی طرح سے اپنا کام نکالنے کا ہے۔ رشوت کا بازار گرم ہے، تعلیمی ادارے علم کے بجائے ہنر مندی کو نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ کتابوں کی دنیا اور روز مرّہ کی دنیا میں خلیج بڑھتی جاتی ہے۔ عقیدے کمزور ہو گئے ہیں۔ اور عمل سست۔ ہم زبان سے جمہوری اقدار، سیکولرزم، مساوات، انسان دوستی کی بات کرتے ہیں مگر ہمارا عمل اس کی مخالف سمت ہی ہوتا ہے۔ آزادی نے کچھ لوگوں کو فرعون بنا دیا ہے۔ عوام کا نام سب لیتے ہیں، عوام کے مفاد کی فکر کم لوگوں کو ہے۔ بڑے ملک کو چلانے کے لیے بڑے ذہن، وسیع القلبی، رواداری کی ضرورت ہے۔ ملک کے اور عوام کے مفاد کو ذاتی مفاد پر مقدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ آزادی میں صرف حقوق ہی نہیں ملتے کچھ فرائض بھی نبھانے ہوتے ہیں۔ حقوق کا چرچا تو بہت ہوتا ہے، فرائض کا احساس کم ہی ہے۔ مذہبیت کے معنی فرقہ پرستی نہیں ہیں۔ مذہبیت تو مذہب کی اخلاقی قدروں کو عام کرنے کا نام ہے۔ فرقہ پرستی صرف اپنے فرقے کے سیاسی مفاد کو ہی دیکھتی ہے۔ ایک فرقہ پرستی دوسری فرقہ پرستی کو ہوا دیتی ہے۔ پس ماندہ طبقوں کو ترقی کے مواقع فراہم کرنا فرقہ پرستی نہیں ہے۔ کسی جمہوری نظام کی صحت کا معیار یہ ہے کہ اس میں اقلیتیں کس حد تک مطمئن ہیں۔ اقلیتیں خواہ مذہبی ہوں یا لسانی۔ اکثریت کی جارحیت کا شکار تو نہیں ہیں۔ ان کے جائز مطالبات جن کی ملک کے دستور میں ضمانت ہے واقعی پوری کیے گئے ہیں یا صرف کاغذی زینت ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری جمہوریت ابھی سچی جمہوریت نہیں ہو پائی۔ رخنے اب بھی بہت ہیں اور رفو کا کام بھی ابھی بہت باقی ہے۔

مجھے تعلیمی مسائل سے شروع سے دلچسپی رہی ہے۔ درس وتدریس میرا پیشہ ہی نہیں رہا، عشق بھی رہا ہے۔ میں نے باون سال سے زیادہ اس کوچے میں گزارے ہیں۔ پہلے دو سال انگریزی پڑھائی پھر اُردو ادب کی تعلیم دی۔ بیچ میں ڈیڑھ سال ایک انٹر کالج کا پرنسپل رہا اور انتظامی کاموں کے علاوہ انگریزی اور اُردو پڑھاتا رہا۔ پھر لکھنؤ میں نو سال اور اس کے بعد اٹھارہ سال پڑھانے میں گزرے۔ شملے میں ریسرچ کا کام تھا۔ پھر سری نگر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ اور تدریس دونوں کا کام انجام دیا۔ اس تجربے کی بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ ادب کی تعلیم صرف لیکچروں اور کبھی کبھار چند مضامین لکھوانے سے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی ثانوی تعلیم کی منزل پر زبان کی جس بنیاد کی ہم توقع کرتے ہیں وہ دراصل طلبا میں نہیں ہوتی۔ اس لیے یونیورسٹی کی منزل پر اب بنیاد کو مستحکم کرنے کی سب سے پہلے ضرورت ہے۔ اُردو کی ناقدری کی بنا پر اساتذہ میں یہ رجحان تقویت پا رہا ہے کہ طلبا کو اچھے نمبر دیے جائیں تاکہ وہ اُردو ضرور لیں خواہ انھیں زبان و ادب سے واقفیت ہو یا نہ ہو۔ نصاب ایسا رکھا جانا چاہیے کہ دو یا تین سال میں کچھ انتخابات نظم و نثر کلاس میں پڑھائے جا سکیں۔ بی۔اے کی منزل پر یا ایم۔اے میں جن کتابوں کو پڑھنا ضروری ہے وہ سب کلاس میں نہیں پڑھائی جا سکتیں۔ اس لیے معمولی لیکچر دینے یا نوٹ لکھانے کے بجائے، منصوبہ بندی کے ذریعہ طلبا کے خود پڑھنے اور اُستاد کے مخصوص پہلوؤں پر لیکچر دینے کا انتظام کرنا چاہیے۔ اس کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے کہ طلبا نظم اور نثر صحت اور روانی کے ساتھ پڑھ سکیں اور اُن میں فن پارے کی قدر شناسی کا مادّہ اُبھر سکے۔ ایم۔اے کی منزل پر انتخابات کم سے کم ہوں، پوری نظمیں، قصائد، مراثی زیادہ۔ میر کے انتخاب سے زیادہ مفید میر کے پہلے دو دیوان ہوں گے۔ دیوان غالب پورا پڑھانا چاہیے۔ اسی طرح یا صرف بانگ درا، یا صرف بال جبریل، نظیر کی خاص خاص نظمیں اور انیس کے کم سے کم دس یا بارہ مرثیے پڑھانا چاہئیں۔ سب رس، کلیات ولی، باغ و بہار، فسانۂ عجائب، خطوط غالب پورے پڑھانا چاہیے۔ کلاس میں کلاسیکس کے اہم اجزا استاد پڑھائے۔ جدید دور پر طلبا کے اپنے مطالعے کے بعد اُستاد کے لیکچر ہوں۔ تحریری کام کو خاص اہمیت دی جائے۔ ایم۔اے کی منزل پر فارسی ادب کا ایک اختیاری پرچہ بھی ہو۔ ایم۔اے

کے نصاب میں لازمی پرچوں کے علاوہ ایسے اختیاری پرچے ضرور ہونے چاہئیں، جو فلسفہ، فنونِ لطیفہ اور مشترک تہذیب کی خصوصیات سے متعلق ہوں تاکہ اردو ادب کے مطالعے کے ساتھ طالب علم کو ادب اور تہذیب کے رشتے، فنونِ لطیفہ، جمالیات اور فلسفے کے اہم دبستانوں کا بھی علم ہو جائے اور ادب کا عالم خلا میں نہ ہو۔ تحریری کام میں عملی تنقید پر خاص توجہ بھی ضروری ہے۔ ریسرچ کے طریقۂ کار، اخبار نویسی، ریڈیو اور ٹی۔وی سے متعلق اختیاری پرچے بھی ضروری ہیں۔ غرض اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد نہ صرف کلاسیکی ادب پر گہری نظر ہونی چاہیے بلکہ جدید ادب کے تمام اہم میلانات کا عرفان بھی۔ طلبا کی تعداد کی طرف سے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کے معیار پر اصرار کرنا چاہیے۔ ہماری اعلیٰ تعلیم یک طرفہ ہوتی جا رہی ہے۔ سائنس پر توجہ ضروری سہی مگر سماجی علوم اور انسانی علوم کی طرف سے غفلت مجرمانہ ہے۔ سائنسی مزاج کو عام کرنے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہم اُن قدروں کی طرف سے غفلت برتیں جو ادبیات کے مطالعے اور سماجی علوم سے ہمیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہر یونیورسٹی میں فلسفہ بہت کم طلبا لیتے ہیں۔ فلسفہ ذہن کی تنظیم اور بنیادی اور جزوی باتوں میں امتیاز کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ادبیات کے مطالعے میں تو فلسفے خصوصاً فلسفۂ جمالیات کے علم سے بڑی مدد ملتی ہے۔ یونیورسٹیوں کا کام، مالِ تجارت فراہم کرنا نہیں۔ روشن خیالی، مرتّب ذہن، مہذب سماج کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ اختصاص کے دور میں یہ خطرہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ماہرین کم سے کم چیزوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانتے ہوں اور ایک پہلو کا ماہر دوسرے پہلو کے ماہر کے لیے اجنبی ہو۔ اس لیے یونیورسٹیوں میں ایک عام ذہنی بنیاد اور اس پر مخصوص دائرے میں مہارت کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ اب یونیورسٹیوں میں توسیعی لکچروں کا سلسلہ خاصا عام ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک اس کے ساتھ ہر شعبے میں کسی ایسے ماہر فن کو کم سے کم تین مہینے کے لیے بلانا چاہیے جو اپنے کام میں ملکی شہرت رکھتا ہو اور وہ لکچروں اور سمیناروں کے ذریعے اساتذہ اور طلبا میں تجسس بیدار کرے اور تحقیق و تدقیق، تنقید و تجزیے کے میدان میں نئی راہیں نکالنے کا عزم پیدا کر سکے۔ اساتذہ کے اولین انتخاب پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں بجائے مستقل ملازمت کے TENURE تین سال

کا تقرر ہونا چاہیے۔ استاد کے کام کا جائزہ لینے کے بعد اور اس کے معیار پر پورا اترنے کے بعد اُسے مستقل کیا جا سکتا ہے۔ اگر خیال ہے کہ اس کا معیار ابھی قابلِ اطمینان نہیں، مگر ایک موقع اُسے اور دیا جا سکتا ہے تو اُسے مزید تین سال کے لیے توسیع دی جائے۔ اگر پھر بھی قابلِ اطمینان نہ ہو تو یہ سلسلہ ختم کیا جائے۔ اُستادوں کے تقرّر کے لیے انٹرویو یونیورسٹی کی منزل پر ضروری نہیں۔ کمیٹی جس میں باہر کے ماہرین شامل ہوں، تمام امیدواروں کے اسناد اور کام پر غور کر کے سفارشات کرے۔ سفارشات کے وجوہ ضرور تحریر میں آنا چاہئیں۔ سی۔ ڈی۔ دیش مکھ نے جو یو۔ جی۔ سی کے صدر رہ چکے تھے اور بعد میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ مجھ سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ وہ امیدواروں کا سارا ریکارڈ خود دیکھتے تھے۔ دفتر کے خلاصے پر تکیہ نہیں کرتے تھے۔ دوسرے وہ لیکچرر کے تقرر کو ریڈر اور پروفیسر کے تقرر سے زیادہ اہمیت دیتے تھے "تاکہ بنیاد صحیح ہو۔ میرے نزدیک دیش مکھ کی یہ رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

طلبا اور اساتذہ کی ملک کی سیاست میں دلچسپی پر اصولاً کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ اساتذہ کا کام ذہنی قیادت ہوتا ہے ہاں عملی سیاست میں اُن کا حصّہ اتنا زیادہ نہ ہونا چاہیے کہ اُن کا اصلی کام پس پشت رہ جائے۔ میرے سامنے مشہور کمونسٹ اُستاد مارس ڈاب اور رالف رسل کی مثالیں ہیں۔ مارس ڈاب کیمبرج میں تھے اور رالف رسل لندن میں۔ دونوں اپنے فرائض منصبی میں ہنہمک رہتے تھے۔ ہاں تعطیل میں یا شام کے وقت ایسے اداروں میں تعلیم دیتے تھے جو پارٹی نے ذہنی تربیت کے لیے چلا رکھے تھے۔ ہندوستان میں یہ آداب کم ہی ہوتے جاتے ہیں۔ طلبا کا سیاست میں حصّہ زیادہ تر بعد میں کسی پارٹی میں کوئی پوزیشن یا عہدہ حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ یو۔ جی۔ سی نے یونیورسٹی کے معیاروں کو بلند رکھنے کے لیے کچھ ہدایات دی ہیں۔ ان ہدایات پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ اساتذہ سے یہ مطالبہ کسی طرح بے جا نہیں کہ وہ دن کا بڑا حصّہ درس و تدریس، ریسرچ یا لائبریری میں صرف کریں اور طلبا سے رابطے کے لیے کچھ وقت ضرور نکالیں۔ مگر جب اس قسم کی ہدایات پر غور و خوض کا سوال آتا ہے تو یونیورسٹی کی خود مختاری کے نام پر ان کی مخالفت کی جاتی ہے۔ یو۔ جی۔ سی نے آٹھ سال کی ملازمت کے بعد ترقی کے لیے جو اسکیم بنائی تھی اس پر عمل اس طرح ہوا ہے کہ اہل نااہل سبھی

انگلا زینہ چڑھ گئے۔ چنانچہ بعض شعبوں میں سب سے زیادہ تعداد پروفیسروں کی ہے، اس کے
بعد ریڈروں کی اور چند ہی لیکچرار رہ گئے ہیں۔ آزادی کے بعد یونیورسٹیوں کے وسائل میں
بہت اضافہ ہوا ہے۔ مگر کیا ہم ایمان داری سے کہہ سکتے ہیں کہ ان وسایل کا جائز استعمال کیا گیا
ہے اور ریوڑیاں نہیں بانٹی گئی ہیں۔ باہر کے ملکوں میں اساتذہ کے چند سال کے لیے جانے
پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے مگر یہ مدت تین سال سے زیادہ نہ ہو، اور کسی شعبے کے ایک
تہائی سے زیادہ استادوں کو ایک وقت میں باہر جانے کی اجازت کسی حال میں نہ دی جائے۔
سچی بات یہ ہے کہ مقبولیت کی ایسی ہوا چلی ہے کہ وائس چانسلروں کو ادارے کا مفاد دیکھنے کے
بجائے چند اشخاص کا ذاتی فائدہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے استاد عملِ صارفیت
(CONSUMERISM) کے چکر میں آ گئے ہیں۔ ان کا یہ حق ضرور ہے کہ سماج انھیں مادی آسودگی
اور ذہنی آزادی دے مگر (AFFLUENT) تعیش ان کی زندگی کا نصب العین
نہ ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ آج کل کی نسل کو میری یہ باتیں دقیانوسی معلوم ہوں۔ مگر میں کیا کروں
میں علم کے گہواروں کو نفع کا کاروبار بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ آج کی یونیورسٹیوں
میں سبھی گئے گزرے ہیں۔ ان میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ضرور ہوگی جو ملک وقوم کی
آبرو اور علم وفن کے چشم وچراغ ہوں گے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثریت اس
ذیل میں نہیں آتی اور کسی طبقے یا ادارے کے متعلق اندازہ اس کی اکثریت سے ہی لگایا جاتا ہے
دانشوروں کا آج کوئی خاص اثر نہ سماج پر ہے نہ حکومت پر۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ
ان لوگوں نے دانشوری کے فرائض کما حقہ انجام نہیں دیے۔ ان کا علم صرف لیکچر ہال یا تجزیہ گاہ
تک محدود ہے، یہ عام زندگی میں چلتی ہوئی گاڑی پر سوار ہونے والے، ذاتی منفعت کے
جال میں اسیر، اور کسی نہ کسی طرح اپنا کام نکالنے والے مصلحت کے پرستار اور ہوسِ زر
کے شکار ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ملک کی سیاست، عدم تحفظ کے احساس اور قدروں کے زوال
نے انھیں صراطِ مستقیم سے ہٹا دیا ہے۔ مگر ان سے توقع تو یہ تھی کہ وہ ہر حال میں ذہنوں اور
نگاہوں کو بلندی اور دلوں کو گداز عطا کرتے۔ نوجوانوں کی صلاحیتوں کو ابھار کر ملک کے
معیار میں اضافہ کرتے۔ ہندوستانی عام طور پر ذہین ہوتے ہیں۔ کرنا پڑتا ہے تو بہت

اچھا کام کرتے ہیں۔ باہر کے ملکوں میں اُن کے کام کی قدر کی جاتی ہے۔ پھر اپنے گھر میں اُن کی یہ کوتاہی کیوں؟ دفتر شاہی کا قصور مسلّم، سیاست دانوں کی ریشہ دوانیاں بھی تسلیم۔ مگر کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آج کام کی لگن، علم کا شوق، محنت کی عادت، ریاضت، لاد کاری ہمارے تعلیمی اداروں میں کم ہوتی جا رہی ہے۔ کسی ملک کے ذہنی معیار کا اندازہ اس کی یونیورسٹیوں کے معیار، اُس کے اساتذہ کے علمی کاموں میں انہماک اور طلبا کی علم کی پیاس سے لگانا چاہیے۔ اساتذہ کی ہر سال شائع ہونے والی کتابوں سے، طلبا کے لائبریریوں اور تجربہ گاہوں میں ہجوم سے، مطالعے اور تنقید کے ہر شعبے میں تازہ ترین معلومات سے فائدہ اٹھانے سے، خوب سے خوب تر کی جستجو سے، محض اساتذہ یا طلبا کی تعداد یا شاندار عمارات سے نہیں۔ اقبال نے غلط نہیں کہا ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

میرے دوست خوشونت سنگھ نے ایک دفعہ مجھے لکھا کہ تم زندگی کو ذرا زیادہ سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لیتے ہو۔ ان کا اگلا جملہ بڑا دلچسپ تھا "میں تو پھولوں سے، اچھی صورتوں سے اور اچھی شراب سے دل بہلاتا ہوں"۔ عرصہ ہوا ذاکر صاحب سے بھی اس سلسلے میں تبادلۂ خیالات ہوا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ناسازگار حالات کے لیے تین مجرب نسخے ہیں۔ ایک تصوّف، دوسرا شراب، تیسرا کام۔ میں نے تیسرا نسخہ آزمایا ہے"۔ ویسے یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ہر دور میں اہلِ نظر کو حالات کی ناسازگاری اور قدروں کے زوال کا شکوہ رہا ہے۔ حافظ نے کتنے پہلے کہا تھا ؎

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالان
طوق زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

اس موقع پر اپنے دو شعر یاد آئے ؎

کون اس دور میں کرتا ہے جنوں کا سودا
تیرے دیوانوں کی ٹوٹی ہوئی صف کیا کم ہے
کالی راتوں میں اجالے سے محبت کی ہے
صبح کی بزم میں اپنا یہ شرف کیا کم ہے

مجھے ملک کی سیاست اور عالمی سیاست سے برابر دلچسپی رہی ہے۔ میں اُس سوشلزم کا قائل ہوں جو انسانی چہرہ رکھتا ہے۔ گو میں اپنے مزاج کے اعتبار سے لبرل ہوں۔ اس انتہاپسندی کے دور میں لبرلزم کو میانہ روی کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے۔ دراصل لبرلزم حریّت فکر، مساوات، عدل، تحریر و تقریر کی آزادی اور منصفانہ سماج کا علمبردار ہے۔ اگرچہ یہ آزاد تجارت (FREE TADE) کا قائل ہے۔ مگر فلاحی ریاست کے ذریعے سے محنت کشوں اور مزدوروں کے حقوق اور حکومت پر بعض اہم شعبوں کی ذمہ داری بھی ڈالتا ہے۔ میرا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا پُرجوش حامی رہا گو اس جدوجہد میں کوئی عملی حصّہ نہ لے سکا۔ مسلم لیگ کی سیاست مجھے متاثر نہ کر سکی۔ گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، اچاریہ نریندر دیو، ذاکر صاحب سے ذہنی قربت رہی۔ گاندھی جی کو تو صرف دو دفعہ دیکھنے اور ایک دفعہ اُن کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ مگر جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد سے متعدد بار ملنے کا موقع ملا۔ نریندر دیو تو تین سال تک لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اُن سے خاصی قربت رہی۔ ترقی پسند تحریک سے دلچسپی کی وجہ سے کئی کمونسٹ لیڈروں کو قریب سے دیکھنے اور اُن سے تبادلۂ خیالات کرنے کا بھی سلسلہ رہا۔ ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر زیڈ اے احمد، سجاد ظہیر سے خاصا ربط ضبط بھی رہا۔ سماجی انصاف کی ضرورت کو محسوس کرنے کے باوجود میں کمونزم کو اُس کی تاریخی مادیت کے فلسفے کی وجہ سے قبول نہ کر سکا۔ مگر میں اینٹی کمونسٹ یا کمونسٹ مخالف کبھی نہیں رہا۔ آزادی کے بعد خصوصاً جواہر لال نہرو کی موت کے بعد کانگریس میں جو موقع پرستی آئی اور سیکولرزم اور سچی جمہوریت کے اصولوں کی طرف سے جو غفلت دیکھنے میں آئی اور جس طرح جن سنگھ کو فروغ ہوا اور اس نے اکثریت کو متاثر کیا، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے، بائیں بازو

کی جماعتوں اور دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کا سیکولرزم پر پیہم اصرار، میرے نزدیک ان پارٹیوں کی صحت ذہنی کا آئینہ دار ہے مگر ہندوستان کی سیاست کا عجوبہ یہ ہے کہ مرکزی یا درمیانی (CENTRIST) پارٹیاں فروغ پاتی ہیں۔ ان میں کچھ لوگ مرکز سے قدرے بائیں طرف رجحان رکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر کانگریس ہو یا جنتا پارٹی، نظریاتی اعتبار سے ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہاں جن سنگھ یا بھارتی جنتا پارٹی دائیں بازو کی جماعت ہے اور ہندو سرمایہ داروں، تاجروں اور ہندو راشٹر کا خواب دیکھنے والوں کے خوابوں کی علمبردار بھارتیہ جنتا پارٹی کے پیچھے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ (آر۔ ایس۔ ایس) کا ہاتھ ہے۔ گویا بھارتیہ جنتا پارٹی آر۔ ایس ایس کا سیاسی محاذ ہے۔ ۷۷ ۱۹ء سے ۱۹۷۹ء تک جنتا پارٹی کی جو حکومت جے پرکاش نراین کی کوشش سے وجود میں آئی تھی، اسکی شکست کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جنتا پارٹی کے چندر شیکھر جیسے سوشلسٹ لیڈر، دو وفاداریوں کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ جن سنگھ آر۔ ایس۔ ایس سے قطع تعلق کر لے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہندوستان کی سیاست کا یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ یہاں ہندو دھرم کو خطرے کا نعرہ بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ دراصل اکثریت کو کسی جمہوریت میں کوئی خطرہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ہندوستان کا وہ دستور جس کی اساس سیکولر جمہوریت پر ہے اور جس میں اقلیتوں کے حقوق کی پوری ضمانت ہے، بھارتی جنتا پارٹی، آر۔ ایس۔ ایس اور وشو ہندو پریشد، شیوسینا اور بجرنگ دل کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ تو ہندوستان میں ایک مذہبی ریاست چاہتے ہیں جس میں اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جائے گا۔ افسوس ہے کہ اکثریت میں یہ رجحان طاقت پکڑ رہا ہے اور عام ہندو بھی اس نعرے سے اثر قبول کر رہا ہے۔ فسادات کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اکثریت میں فرقہ پرستی کے رجحان کے فروغ اور اقلیتوں کے اننترپہ کرن کے نعرے نے اقلیتوں میں بجا طور سے عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا ہے اور اُن میں بھی علیحدگی پسندی بڑھ رہی ہے۔ صدر رادھا کرشنن نے اپنے یوم جمہوریت کے ایک خطبے میں (غالباً ۱۹۶۶ء کے آغاز میں) اس بات پر اظہار افسوس کیا تھا کہ انتخابات کی وجہ سے فرقہ واریت بڑھی ہے۔ اندرا گاندھی کو اُن کا یہ خطبہ بہت ناگوار

گذرا تھا اور اُن کا ارادہ اس کے خلاف بیان دینے کا تھا۔ مگر ذاکر صاحب نے انھیں اس سے باز رکھا۔ یہ بات ذاکر صاحب نے مجھے بتائی تھی۔ کہنا یہ ہے کہ انتخابات نے فرقہ پرستی اور ذات پات کو عملاً فروغ دیا ہے۔ گو زبان سے اس کی مخالفت کی ہے۔ پھر انتخابات میں قوتِ بازو اور دولت کی طاقت کا خاصا استعمال ہوا ہے اور اب یہ بات کسی سے بھی چھپی نہیں رہی کہ ہمارے انتخابات میں روپیہ، طاقت، فرقہ پرستی اور ذات پات کا اثر خطرناک حد تک بڑھ رہا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی کا جواب مسلم فرقہ پرستی نہیں ہے۔ مذہبی اقلیتوں کو اپنے مذہب، مخصوص تہذیبی عناصر اور زبان کی حفاظت پر اصرار کرتے ہوئے سیاسی اور قومی زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ گاندھی جی نے آزادی کے بعد اصرار کیا تھا کہ کانگریس ایک سیاسی جماعت نہ رہے بلکہ سماجی اور معاشرتی اصلاح کا کام کرے۔ اسی طرح مسلمانوں یا کسی دوسری اقلیت کا، مذہبی اور مخصوص تہذیبی حقوق کے لیے یکجا ہونا تو درست ہے، مگر اُن کی کسی سیاسی پارٹی کا جواز نہیں ہے۔ اکثریت اور اقلیت بھی سچی جمہوریت میں مذہبی بنیادوں پر نہیں، سیاسی نظریات کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہ منزل ابھی دور ہے۔ آزادی کے معنی کچھ لوگ ایک پرانے دور کو واپس لانے کے لیتے ہیں۔ یہ خواب تو شرمندۂ تعبیر ہونے والا نہیں۔ ہاں اس سے ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں دیر لگ سکتی ہے اور ملک کی ترقی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے ایک وفاقی نظام کو قبول تو کر لیا ہے، مگر ایک وفاقی نظام کے مضمرات سے آنکھیں چراتے ہیں۔ وفاقی نظام میں ریاستوں کو اپنی شناخت (IDENTITY) اپنی پہچان کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ اُن کی تہذیب اور زبان، اُن کے مذہب اور طرزِ زندگی کے تسلسل میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہیے۔ علاقائی خصوصیات کو فنا کر کے قومی یک جہتی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ قومی یک جہتی کے جذبے کو تقویت بھی مل سکتی ہے۔ کثرت میں وحدت، صرف تصوف ہی میں نہیں، سیاست میں بھی ایک اچھا اصول ہے۔ بقول غالب ؎

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے۔

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے
یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

جب آدمی کی عمر خاصی ہو جائے تو اُسے موت کا خیال تو آتا ہی ہے۔ مجھے بھی اکثر آتا ہے۔ میں موت کے خیال سے خائف تو نہیں ہوں، مگر اس خیال کا سایہ اکثر میرے ذہن پر منڈلاتا رہتا ہے۔ کچھ لوگ بے فکر ہوتے ہیں۔ علی گڑھ میں ایک زمانے میں ایک قانون کے اُستاد تھے۔ محمد اسحاق اُن کا نام تھا، بیوی انگریز تھیں اور ڈفرن اسپتال میں ڈاکٹر تھیں۔ یہ حضرت نپٹ بہرے تھے، مگر اپنی ذہانت کی وجہ سے کام چلا لیتے تھے، لیکچر تیار کر کے آتے تھے اور کلاس میں اپنی کہنے رہتے تھے۔ دوسرے کی سُن ہی نہ سکتے تھے شکار کے شوقین تھے، آخر عمر میں دل کی خرابی کی وجہ سے ہر وقت موت کا خطرہ رہتا تھا، مگر یہ شیر مرد، اپنا شکار کا شوق نہیں چھوڑتا تھا۔ آخر شکار ہی میں اُن کی موت ہوئی۔ دل کا دورہ پڑا اور ذرا سی دیر میں ختم ہو گئے۔ کچھ لوگ بڑھاپے میں ہر وقت نبض پر ہاتھ رکھے رہتے ہیں۔ جب دیکھو اپنی بیماریوں کا تذکرہ، ہنسنا بولنا بھی تکلف سے، تذکرہ بھی صرف ماضی کا۔ اور اُن میں اپنے کارناموں کا۔ شکر ہے کہ عمر کی اس منزل میں بھی ابھی مجھ میں جینے کا ولولہ، کچھ کام کر جانے کا ارمان، کوئی اچھی نئی کتاب پڑھنے کا شوق، دنیا کی نیرنگیوں سے، زندگی سے، حُسن سے دلچسپی باقی ہے۔ برسات میں شام کی شفق اب بھی نظر میں رنگ بھر دیتی ہے۔ ہرے ہرے کھیتوں کی ہریالی اب بھی آنکھوں کو تازگی بخشتی ہے۔ صبح کو چمن میں چڑیوں کا چہچہانا بہت اچھا لگتا ہے۔ اچھی صورت پر نظر ٹھہر ہی جاتی ہے۔ کوئی پرانا دوست مل جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ جوانی لوٹ آئی۔ ٹھنڈے پانی، اچھی چائے، مزیدار پان، پائے، کریلے، کباب، رساول کا لطف اب بھی یاد رہتا ہے۔ کوئی مزے کا فقرہ، کوئی اچھا شعر اب بھی وجد کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ میرا حافظہ ایک زمانے میں بہت اچھا تھا، اب وہ بات نہیں رہی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی بات بھول جاتا

ہوں، شکر ہے کہ تھوڑی دیر بعد یاد آجاتی ہے۔ ایک زمانے میں محفلوں، صحبتوں، جلسوں، کمیٹیوں میں بہت وقت گزرتا تھا۔ تنہائی کم ہی میسر آتی تھی۔ جب سے کشمیر سے آیا ہوں، زیادہ وقت گھر میں گزرتا ہے، مگر تنہائی سے مجھے وحشت نہیں ہوتی۔ اس معاملے میں میری بیوی میری ضد ہیں۔ وہ بچپن سے بھرے پُرے گھر میں رہیں۔ ہر وقت بہن بھائی، سہیلیاں، رشتہ دار ساتھ رہے۔ اب بچے بڑے ہو گئے۔ بڑا لڑکا دلّی میں ہے۔ چھوٹا جرمنی میں۔ لڑکی اور اس کے بچے بھی دہلی میں ہیں۔ کبھی کبھار یہ لوگ آجاتے ہیں، مگر زیادہ تر ہم میاں بیوی تنہا ہی رہتے ہیں۔ بیوی کو یہ تنہائی بہت کھلتی ہے۔ مجھے تو غنیمت لگتی ہے۔ بڑھاپے میں آدمی کچھ عادتوں کا غلام ہو جاتا ہے۔ وقت پر چائے مل جائے، وقت پر کچھ کام ہو جائے، کھانا بھی وقت پر ہو، تندرستی کے لیے جو دوائیں ضروری ہیں وہ بھی چلتی رہیں۔ اسی لیے اپنے اجاڑ گھر میں ہی دل لگتا ہے۔ علی گڑھ میں گپ کا بڑا مرض ہے۔ زیادہ تر لوگ گھنٹوں بیٹھے اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہتے ہیں، جس سے کام ہوتا ہے اُس کی خوشامد اور جس سے کام نہ نکلا اُس کی مذمّت۔ وقت کی پابندی کا بھی احساس کم ہی ہے۔ اس لیے اب کچھ سوچنے، اپنا جائزہ لینے، اپنے سے ملاقات، اپنے کو پہچاننے کا موقع ملا ہے تو میں اسے غنیمت سمجھتا ہوں۔ ہاں یہ جی ضرور چاہتا ہے کہ بچے اور زیادہ عرصے تک ساتھ رہا کرتے اور اُن کے ساتھ اور زیادہ وقت گزرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں ہوں، اپنے بچوں کا بھی نہیں۔ ٹھاٹ باٹ کی زندگی مجھے پسند نہیں۔ صاف ستھری، سیدھی سادی زندگی گزارنا ہی میرا شعار ہے

یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اب جتنا بھی وقت باقی ہے اس میں میرے سارے پارہ ہائے لخت لخت یکجا ہو کر شائع ہو جائیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب کشمیر میں میرا آخری سال تھا، اپنی پچھترویں سال گرہ پر میں نے ایک نظم لکھی تھی وہ یہاں درج کرنا شاید بے محل نہ ہو۔ ویسے میں اپنی سالگرہ مناتا نہیں، صرف یاد رکھتا ہوں۔

(اپنی سال گرہ پر)

پچھتر سال گزرے آج دنیا میں مجھے آئے؛
نظر کا شعلہ مدھم ہے، لہو کا رقص دھیما ہے۔

قدم بھی سست ہیں، سائے بھی لمبے ہوتے جاتے ہیں
صدا کوئی، کسی کوہِ ندا سے جانے کب آئے
نفس کا، آرزو کا کھیل کب خاموش ہو جائے
بہت دیکھا، بہت سوچا، بہت چاہا، بہت پایا
نظر شاداب ہے، آباد ہے دل، فکر روشن ہے
سہارا کتنے خوابوں کا، دلاسا کتنی یادوں کا
مرے پھولوں کی خوشبو، میری کلیوں کی جگرداری
مری سعیِ وفا، سعیِ جنوں، سعیِ حنا بندی
ہزاروں خواب ہیں پامال، لیکن خواب باقی ہیں
اجالوں کا سفر جاری رہے گا میری کرنوں سے
ستارے ماند ہوتے ہیں تو سورج بھی تو اُگتے ہیں
یہ سائے میرا کیا لیں گے، قبا ہی تو چرا لیں گے
سوادِ شام میں کھل کر، کسی تارے سے مل جل کر
لکیریں روشنی کی کچھ نئے جادو جگائیں گی
نئے خوابوں، نئی سعیِ جنوں کو جگمگائیں گی

(سری نگر، ۹ ستمبر ۱۹۸۶ء)

چند باتوں کا افسوس ضرور رہے گا۔ مشرقی اور مغربی موسیقی سے مجھے برائے نام واقفیت ہے۔ جس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولیں اُس میں موسیقی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اچھے لحن سے متاثر ہوتا ہوں اور مہدی حسن، غلام علی، شمشاد بیگم، نور جہاں، فریدہ خانم، بیگم اختر کی گائی ہوئی غزلیں پسند آتی ہیں۔ کبھی ایک فرانسیسی ناول ژاں کرسٹاف پڑھا تھا اس سے اندازہ ہوا کہ موسیقی روح کو کس طرح شاداب کرتی ہے۔ مصوری سے کچھ دلچسپی پیدا کی اور مشرق و مغرب کے کچھ مصوروں کے شاہ کاروں کی خوبیاں سمجھنے کی کوشش کی مگر فن مصوری کے اسرار و رموز سے زیادہ واقفیت نہیں۔ ہاں چغتائی کے خطوط، ستیش گجرال

کے احساس سے لبریز رنگ، حسین کے آڑے ترچھے نقوش کی معنویت سے متاثر ہوں مصوروں میں ریمبراں اور پکاسو اچھے لگتے ہیں۔ ماسکو میں ایک محنت کش عورت کے مجسمے میں اور لینن کے مجسموں میں مجھے جلال نظر آیا۔ اجنتا اور ایلورا کے غار دو دفعہ دیکھے ہیں اور ایک بار اور دیکھنے کی خواہش ہے۔ تاج محل کو تو بار بار دیکھا ہے اور ہر بار اس کے حُسن کا ایک نیا انکشاف ہوا ہے۔ اعتماد الدولہ کی جالیاں ذہن میں اکثر جال بنتی رہتی ہیں۔ کشمیر کے بعض مناظر اکثر نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔ شیش ناگ پر چودھویں کا چاند اب بھی دل و دماغ کو جگمگاتا ہے۔ ننگا پربت کا منارۂ نور اب بھی دل میں روشن ہے۔ سونا مرگ کے سبزہ زار اور لالہ زار بھولتے نہیں۔ میسور کا ورنداون اکثر یاد آتا ہے۔ میرؔ، غالبؔ اقبالؔ کا کلام جب بھی اٹھا لیتا ہوں ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔ پہلے مجھے انگریزی شاعر ایلیٹ بہت پسند تھا۔ اب ییٹس زیادہ اچھا لگتا ہے۔ چارلی چیپلن کے مشہور ڈرامے بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وڈہادس کو جب پڑھتا ہوں نیا لطف آتا ہے۔ مشتاق یوسفی ہر بار کیفیت کی ایک نئی لہر دیتے ہیں۔ میں تونگر نہیں، صاحب اقتدار نہیں، مگر میرے پاس جو دولت ہے وہ بھی ایسی گئی گزری تو نہیں۔ گرد و پیش کے احول، بڑھتے ہوئے تشدد، فرقہ واریت، قدروں کے زوال سے ملول ہوں مگر مایوس نہیں۔ اقبالؔ کا یہ شعر دہراتا رہتا ہوں ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

یہ دور سخن فہمی کا نہیں، طرفداری کا ہے۔ لوگ ادھر ہیں یا اُدھر۔ میرا کوئی گروہ نہیں، کوئی پارٹی نہیں۔ جانب داری کے اس دور میں میری خدمات کا وہ اعتراف نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا مگر مجھے ساری زندگی سے، سارے ادب سے، روشن خیالی سے، ماضی کی پاسداری کے ساتھ حال کے آشوب سے اور مستقبل کی طرف نظر سے، وفاداری کی قیمت تو بہر حال ادا کرنی پڑتی ہے۔ خیر میرے لیے یہ تسلی کیا کم ہے ؎

ہم نہ اس ٹولی میں تھے یارو نہ اُس ٹولی میں تھے
نہ کسی کی جیب میں تھے نہ کسی جھولی میں تھے

مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ میری زندگی منظم اور مرتب نہیں ہے۔ مجھ میں کوئی ایسی امنگ (AMBITION) نہیں جو ہر دم مجھے دنیا میں آگے بڑھنے اور نئی سیڑھیاں چڑھنے پر اکسائے۔ یکسوئی سے اور باقاعدگی سے کام کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں۔ پڑھتا زیادہ ہوں، لکھتا کم ہوں۔ درباری کسی طرح کی پسند نہیں، نہ اپنی نہ دوسروں کی، وقت پر کام نہیں کر پاتا، اکثر دیر ہو جاتی ہے۔ خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ اندھیر نہیں ہے۔ اپنی تعریف کسے اچھی نہیں لگتی۔ مگر اس تعریف سے کسی مغالطے میں مبتلا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو پہچاننے میں مجھ سے غلطی بارہا ہوئی ہے۔ مگر جب پہچان گیا تو اس حدیث کو یاد رکھتا ہوں کہ "مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں کاٹا جاتا" میں کام کرنا جانتا ہوں، دوسروں سے کام لینا زیادہ نہیں آتا۔ اشخاص سے زیادہ مجھے اصولوں سے دلچسپی ہے۔ مدح اور قدح دونوں میں میرے کچھ آداب ہیں۔ میں بعض لوگوں سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لیتا ہوں اور جب وہ پوری نہیں ہوتیں تو اُن سے کچھ دور ہو جاتا ہوں، اس طرح گہرے اور اٹل تعلقات جن پر نشیب و فراز کا اثر نہ ہو، میرے کم ہی لوگوں سے رہے ہیں۔ مجھے نوجوانوں سے، نئے خیالات سے ہمدردی ہے۔ مگر بعض اوقات ان نوجوانوں کی بے راہ روی اور ان خیالات کی تندی اور قطعیت سے الجھن ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب میں انکسار کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ آج اشتہاریت کا دور ہے۔ جسے دیکھو اپنا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے یا کسی کی قصیدہ خوانی میں ہر وقت مصروف ہے اور اس قصیدہ خوانی کے پیچھے کوئی ذاتی مقصد یا وقتی مصلحت ہے۔ آج اشتہار شہرت، مقبولیت و دولت سب کچھ عطا کرتے ہیں اور معیار بھی بنانے لگے ہیں۔ میں ہر پرانی چیز کو سونا نہیں سمجھتا، لیکن اپنی تہذیب کی صالح روایات کی قدر کرتا ہوں ہاں شاہراہوں کے بجائے پگڈنڈیوں پر چلنا مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے میرا ایک شعر ہے ؎

شاہراہوں سے گزرتے ہیں شب و روز ہجوم
نئی راہیں ہیں فقط چند جیالوں کے لیے

ہم لوگ اپنے آپ کو شاید کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔ کائنات کی وسعتوں اور

پہنائیوں میں انسان گرد کے ایک ذرّے سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ذرّہ جو اپنے اندر ایک سورج رکھتا ہے اور دوسروں کے اندر بھی کوئی سورج اگا سکتا ہے۔ اس کی آب و تاب کچھ کہتی تو ہے۔

یے ٹس نے 'سرکس کے جانوروں کا فرار' میں کہا ہے:

"PLAYERS AND PAINTED STAGE TOOK ALL MY LOVE

AND NOT THOSE THINGS THAT THEY WERE EMBLEMS OF"

کھلاڑیوں اور رنگ منچ نے (ہی) میرا سارا پیار سمیٹ لیا اور وہ چیزیں رہ گئیں جن کی یہ علامتیں تھیں۔

میرے خیال میں یہ یے ٹس کا ہی نہیں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کا مقدر ہے۔ شاعر اور ادیب خواب دیکھتا ہے تاکہ اس کے ذریعے حقائق کی توسیع کر سکے۔ ان خوابوں کے ذریعے سے وہ کائنات کی وسعت میں اپنی معنویت، اس کی پہنائی میں اپنی لہر، اس کے آفاق میں اپنا سوزِ نفس دیکھتا اور پاتا ہے مگر یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ وہ نقاب کی رنگینی میں، منظر کے سحر میں، بساط کے نقش و نگار میں، محو ہو جاتا ہے اور نقاب کے پیچھے، منظر کے باطن میں، بساط کے تانے بانے میں جو کچھ ہے اس سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ یہ کھیل، سرگرمی، لگن، لگاؤ کس لیے ہے۔ یہ سوچنے کے بجائے محض جلووں، کرنوں، رنگوں، کرشموں میں الجھ جاتا ہے۔ نیتشے نے نہ جانے کس عالم میں کہا تھا کہ انسان ایک ایسی ٹیڑھی لکڑی ہے جس سے کوئی سیدھی چیز نہیں بنائی جا سکتی۔ یہ تو خیر ایک بیمار خیال ہے مگر اتنی بات ضرور سچ ہے کہ زندگی بڑی پیچیدہ ہے اور تضادات، عجائبات، پستی اور بلندی، خیر اور شر، سبھی اس کے سمندر کی موجیں ہیں۔ زندگی کے لیے کوئی فارمولا، کوئی نظریہ بنانا اس کثرت میں وحدت تلاش کرنا ضروری تو ہے مگر مشکل بھی ہے اور ہر نظریہ یا فارمولا اس بے پایاں اور بے کنار حقیقت کا ایک حد تک ہی عرفان عطا کرتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ نے فرد کی آزادی کا اعلان کیا، انیسویں صدی نے انسان کی عظمت کا ترانا گایا اور ہیومنزم (انسان دوستی) کا چارٹر بنایا مگر بیسویں صدی میں فرائڈ نے اور پھر طبیعیات اور فلکیات کے عالموں نے

ایک ایسی کائنات کا سراغ لگایا جس میں انسان تو کیا اس کی بساط . یعنی یہ دھرتی بھی ایک ذرّہ ہے چنانچہ جیسے جیسے ہمارا علم بڑھتا جاتا ہے . زندگی کے متعلق اب تک کے ہر ادّعا کی ناسازی واضح ہوتی جاتی ہے . اس لیے جبلتوں کے جنگل اور دورِ وحشت کے سیلاب کی سطح سے اوپر جانے کی جدوجہد جسے ہم تہذیب کا سفر کہتے ہیں جاری رہنا چاہیے یعنی منزل اگرچہ متعین اور قطعی ہو یا نہ ہو کسی منزل کی سمت سفر ہمارا مقدر ہے . عرصہ ہوا میں نے ایک افسانہ پڑھا تھا . افسانہ نگار نے ایک ایسے ویرانے کی تصویر کشی کی تھی جو ایٹم بم گرنے کے بعد وجود میں آیا . ہر طرف راکھ تھی اور ملبے کے ڈھیر ، پوری دنیا میں صرف ایک آدمی بچا تھا جو کسی غار میں چھپ گیا تھا . غار سے نکلا تو وہ بھی فضا کی آلودگی سے متاثر ہو گیا اب اس سے چلا بھی نہ جاتا تھا مگر وہ کوشش کر کے کچھ دور سمندر تک گھسٹ گھسٹ کر اور پھر رینگ رینگ کر گیا تاکہ وہ سمندر میں گر جائے اور اس طرح سمندر سے زندگی کا سفر دوبارہ شروع ہو . مارٹن لوتھر نے کہا تھا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ کل دنیا ختم ہونے والی ہے تو آج ایک پیڑ ضرور لگاؤں گا . مجھے اب یہ احساس ہوتا جا رہا ہے کہ خیر و شر ، حق و باطل ، خوب و زشت ، سود و زیاں کے جو پیمانے اب تک وضع کیے گئے ہیں وہ زندگی اور اس کی پہنائی ، انسان اور اس کے پست و بلند کی پوری طرح عکاسی نہیں کرتے ، مگر یہ بہرحال انسانیت کی ایک سعیِ بلیغ تو ضرور ہیں . میر کی شاعری کے متعلق شیفتہ کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے . شیفتہ نے پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند نہیں کہا تھا بلکہ پستش اندک پست کہا تھا مگر یہ قول بہرحال زندگی اور آدمی پر ضرور صادق آتا ہے . دو بڑی لڑائیوں ، ایٹمی معرکوں کے خطروں ، سرد جنگ سے ہم نکل آئے . دو بڑی طاقتوں کی چپقلش کم ہوئی ، یہ احساس ہو گیا کہ ترقی کی دوڑ ماحول کو آلودہ ہی نہیں کرتی بلکہ اوزون کی پرت میں شگاف کر کے زندگی کے سلسلے بھی درہم برہم کر سکتی ہے . سرمایہ داری کو بھی فلاحی ریاست میں ہی نجات سوجھی اور سوشلزم کے انسانی چہرے کی معنویت کی طرف اور دھیان جانے لگا . مگر ساتھ ہی تیسری دنیا جو دھرتی کے بیچاروں کی دنیا ہے آزاد تو ہوئی ، مگر یہ آزادی نسلی ، قبائلی ، علاقائی ، مذہبی تعصبات کو ہوا دینے لگی ، مشرق میں جدید کاری نے مغرب زدگی میں اپنی منزل تو دیکھی مگر اس کے علم و ہنر کے فروغ ، اس کی جمہوریت کی روح ، اس کا خدمتِ خلق کا جذبہ نہ دیکھا ، اس کی حقیقت

کی جستجو پر دھیان نہ دیا، اس کی ریاضت، اس کی جنسی آزادی، ہلاکت کے اس کے نئے آلوں اور اشتہار کے نئے طریقوں سے اپنا اُلّو سیدھا کرنا ہی سب کچھ سمجھا، پھر ہمارے ملک میں آزادی کے تینتالیس سال بعد بھی سماجی انصاف کے بجائے مذہبی جنون کو ہوا دینے میں ہی اپنی نجات سمجھی۔ کوئی چار سال ہوئے میں علی گڑھ آکر اپنی بکھری ہوئی پرانی تحریروں کو یکجا کر رہا ہوں، ان خطوط کو دیکھ رہا ہوں جو پچاس سال کے عرصے میں میرے نام آئے کچھ پڑھ رہا ہوں، کچھ سوچ رہا ہوں، اپنا جائزہ لے رہا ہوں، گرد و پیش پر نظر ڈال رہا ہوں، موجودہ حالات سے دل گرفتہ ہوں، رہ رہ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے سائنس کی روح کو نہیں سمجھا، اس کے سامنے کے فوائد سے کام لیا، اپنے ادبیات کی طرف سے توجہ ہٹالی اور ادب کے ذریعے سے جو قدریں عام کر سکتے تھے اُن کی طرف سے غافل ہو گئے۔ ادب صرف تفریح یا پروپگنڈا نہیں ہے، یہ زندگی کی معلومات کی تلاش ہے، یہ حُسن، خیر اور صداقت کی جستجو ہے، یہ ذہن کی تنظیم اور روح کی شادابی کی جدوجہد ہے، ہم نے نہ اپنے کلاسیکی ادب کی قدروں کو ملحوظ رکھا، نہ جدید ادب کے درو داغ کو اور مغرب کے ادب کا بھی بہت سطحی مطالعہ کیا، ہم طرفداری میں لگے رہے، سخن فہمی کی طرف مائل نہ ہوئے، ہماری بنیادی کمزوری یہ ہے کہ آج ہم میں دانشوری عام نہیں ہے، ہنرمندی ہو تو ہو، وژن نہیں ہے، ہماری جست لب بام تک ہے، اردو والے ہوں یا ہندی والے سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں، کچھ لوگوں کو چھوڑ کر بیشتر بہتے پانی میں ہاتھ دھونا چاہتے ہیں، چلتی گاڑی میں سوار ہونا چاہتے ہیں، سچی بات اس ڈر سے نہیں کہتے کہ وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکیں گے یا شاید ان کو تھوڑی بہت زحمت اٹھانی پڑے گی، غور سے دیکھا جائے تو ہمارے ملک میں اب کسی چیز پر عقیدہ نہیں ہے، ہاں عقیدے کی بات ضرور چلتی رہتی ہے، ہم سب خوف اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ عقیدہ زندگی کا ایک محور دیتا ہے، عقیدہ کردار کو ایک صلابت عطا کرتا ہے، یہی صلابت زندگی میں سیرت فولاد عطا کرتا ہے اور شبستاں محبت میں حریر و پرنیاں بھی۔ اُردو والے اُردو کی زبوں حالی دیکھ رہے ہیں مگر مشاعروں کی تفریح، اکبر ڈمیوں کے کھلونوں، حکومت کے وعدوں سے بہل جاتے ہیں، خود کچھ نہیں کرتے، نہ ابتدائی تعلیم کے لیے اسکول قائم کرتے ہیں، نہ بالغوں کی تعلیم کے لیے، نہ استادوں کی تربیت کی فکر کرتے

ہیں۔ نہ کتابوں کی فراہمی کی۔ ہندی والے مگن ہیں کہ سرکاری مسند پر براجمان ہیں، وہ وژن، وہ لگن، وہ دھن، وہ گُن سماج میں عام کرنے کی انھیں فکر نہیں جو زندگی کو اخلاقی بلندی، سماجی خیر اور سماجی سوبھاؤ کی طرف لے جائے، شاعر اور ادیب کا اثر فوری نہیں ہوتا، یہ اس کی کمزوری نہیں طاقت ہے۔ ادب ذہن میں ہلچل پیدا کرکے تسلسل کی پاسداری کے ساتھ تغیر کی طرف لے جاتا ہے۔ ہندوستان میں عام ذہنی پستی اور دانشوری کے فقدان کا ثبوت یہ ہے کہ دانشور وقتی سیاست سے بلند نہیں ہو پاتے، بوتل کے لیبل سے مست ہونے لگتے ہیں، اقتدار کی طرف للچائی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں، مقبولیت کے چکر میں پڑ جاتے ہیں، وہ تنہا نہیں رہ سکتے، ان کے ساتھ مداحوں کی ایک بھیڑ ضرور ہونی چاہیے، اُردو والے صرف زخموں کی نمائش کرتے ہیں، ماحول کا ماتم اُن کا سب سے بڑا مشغلہ ہے، افق پر جو نئی کرنیں ہیں انھیں نہیں دیکھتے، آج کے سمندر کو متھ کر جو امرت نکالا جارہا ہے اس کی طرف دھیان نہیں دیتے، تہذیب کا ان کا تصور محدود ہے۔ وہ پورے سماج کی رنگارنگ، جاندار بوقلموں، گنگا جمنی بساط کے بجائے اس چمن بندی پر نظریں جمائے ہوئے ہیں جو گل ولالہ و نسترن اور شہید ازل لالہ خوں کفن سے عبارت ہے اُردو شاعری صرف میر غالب، اقبال کے سر بفلک ایوانوں کا نام نہیں، اس میں نظیر اکبرآبادی کا ہماری دھرتی اور اس کی بہاروں سے عشق بھی ہے۔ میں میر غالب، اقبال کی عظمت کا قائل ہوں مگر نظیر اکبرآبادی کی ایک دوسری قسم کی عظمت کا بھی، بڑا شاعر وہ ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر نظر آتا ہو، سہارا دیتا ہو، عرفان عطا کرتا ہو، میر غالب اور اقبال تو یہ کرتے ہی ہیں، نظیر بھی اپنے طریقے سے یہ کام انجام دیتے ہیں، تہذیب کی ایک پہچان حس ظرافت بھی ہے، غالب رنج و راحت اور سختی و سستی کو ہموار کرنے کا حوصلہ دیتے ہیں اور اپنے اوپر ہنس لینے کا ملکہ بھی۔ اقبال ایک آفاقی نظر اور آدم کو آداب خداوندی سکھانے کا ولولہ عطا کرتے ہیں، میر عاشقی کے ادب، آداب اور اس طرح زندگی کے ادب آداب سکھاتے ہیں، ہماری تنقید ابھی تک ہمارے ادب کے سارے سمندر کو نظر میں نہیں رکھ پائی اس کے جزیروں پر ہی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے، پورا ہمالہ ان کے احساس کا جز نہیں ہے صرف اس کی چند چوٹیاں ہی ان کے لیے سب کچھ ہیں۔ ہمارے معلم اور نقاد سائنس کی ترقی سے خوفزدہ، علوم جدیدہ سے گریزاں اپنی پناہ گاہ میں عافیت ڈھونڈتے

ہیں، حالاں کہ آج کے مختصر علم و عمل میں جمالیاتی، اخلاقی اور سماجی خیر کی قدروں کو اور عام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تہذیب انسانی یک طرفہ نہ ہو جائے۔ جہاد میں فتح و شکست نہیں دیکھی جاتی، جہاد کی لگن دیکھی جاتی ہے، میں تو آج بھی اقبال کی پرسوز عقلیت کا قائل ہوں، یہ وہ عقلیت ہے جو ادب خوردۂ دل ہے۔ بہرحال بقول جگر سے

ہم سے جو ہو سکا وہ کر گذرے
اب ترا امتحان ہے پیارے

آخر میں حال کی کہی ہوئی ایک غزل پیش ہے شاید اس سے میری بات کچھ اور واضح ہو:

جس کو دیکھو وہی لمحے کی مسرّت مانگے
دل دیوانہ جو مانگے تو بصیرت مانگے
حسن کی کوئی ادا، عشق کا کوئی اعجاز
دل جو مانگے تو یہی حرف و حکایت مانگے
فن جو آئینہ دکھاتا ہی رہا فطرت کو
آج فطرت کو بدلنے کی جسارت مانگے
اب کہاں ہے وہ کڑی دھوپ میں تپنے کا جلال
ہر کوئی سایۂ دیوار کی راحت مانگے
یہ تجارت کا صحافت کا سیاست کا ہے دور
آج کے دور میں کوئی نہ محبت مانگے
جن کو سنگین حقائق نے کیا ہے پامال
آدمی پھر انہی خوابوں سے حرارت مانگے
جرم اوروں نے کیا اور سزا ہم کو ملی
کوئی تو اک نئی میزانِ عدالت مانگے

فہرست مطبوعات آل احمد سرور

تصانیف!

۱۔ سلسبیل ۔ شاعری (۱۹۳۵ء)

۲۔ تنقیدی اشارے ۔ تنقیدی مضامین (۱۹۴۲ء)

۳۔ نئے اور پرانے چراغ ۔ 〃 (۱۹۴۶ء)

۴۔ تنقید کیا ہے ؟ 〃 (۱۹۴۷ء)

۵۔ ادب اور نظریہ 〃 (۱۹۵۴ء)

۶۔ ذوقِ جنوں ۔ شاعری (۱۹۵۵ء)

۷۔ سرسید ۔ ایک تعارف (۱۹۵۶ء)

۸۔ نظر اور نظریے ۔ تنقیدی مضامین (۱۹۷۳ء)

۹۔ مسرت سے بصیرت تک ۔ 〃 (۱۹۷۴ء)

۱۰۔ اقبال اور ان کا فلسفہ 〃 (۱۹۷۷ء) لاہور

۱۱۔ عرفانِ اقبال 〃 (۱۹۷۷ء) 〃

۱۲۔ اقبال ۔ نظریہ اور شاعری ۔ نظامِ خطبات، دہلی یونیورسٹی (۱۹۷۹ء)

۱۳۔ پہچان اور پرکھ ۔ تنقیدی مضامین، مکتبہ جامعہ (۱۹۹۰ء)

۱۴۔ تدھم لَے کا جادو ۔ شاعری 〃 (زیرِ طبع)

۱۵۔ دانشور اقبال ۔ تنقیدی مضامین ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (زیرِ طبع)

ترتیب

۱۶۔ انتخابِ جدید ۔ عزیز احمد کے ساتھ ۔ نئی شاعری کا انتخاب (۱۹۴۳ء)

۱۷۔ تنقید کے بنیادی مسائل ۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۱۹۶۷ء)

۱۸۔ جدیدیت اور ادب 〃 (۱۹۶۹ء)

۱۹۔ عکس غالب۔ غالب کے خطوط کا انتخاب۔ شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۱۹۶۹ء)

۲۰۔ عرفانِ غالب۔ غالب پر مقالات 〃 (۱۹۷۱ء)

۲۱۔ اُردو فکشن 〃 (۱۹۷۳ء)

۲۲۔ اقبال اور تصوف۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی (۱۹۸۰ء)

۲۳۔ اقبال اور مغرب 〃 (۱۹۸۱ء)

۲۴۔ تشخص کی تلاش اور اقبال 〃 (۱۹۸۴ء)

۲۵۔ جدیدیت اور اقبال 〃 (۱۹۸۵ء)

۲۶۔ اقبال اور اُردو نظم 〃 (۱۹۸۶ء)

۲۷۔ ہندوستان میں تصوف 〃 (۱۹۸۷ء)

۲۸۔ اُردو شعریات 〃 (۱۹۸۷ء)

۲۹۔ جدید دنیا میں اسلام، مسایل اور امکانات 〃 (۱۹۸۷ء)

۳۰۔ ISLAMIC RESURGENCE

۳۱۔ MODERNITY AND IQBAL

۳۲ ISLAM IN THE MODERN WORLD PROBLEMS AND PROSPECTS

خطبات:

۳۳۔ اقبال کے مطالعے کے تناظرات۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی (۱۹۷۸ء)

۳۴۔ ہندوستان کدھر۔ سید عابد حسین میموریل لیکچر (۱۹۸۳ء)

۳۵۔ ہماری تعلیمی صورت حال۔ شیخ عبداللہ میموریل لیکچر (۱۹۸۴ء)

۳۶۔ اُردو میں دانشوری کی روایت۔ عابد حسین میموریل لیکچر (۱۹۸۶ء)

۳۷۔ اُردو اور ہندوستانی تہذیب۔ فخرالدین احمد میموریل لیکچر (۱۹۸۶ء)

۳۸۔ اقبال، فیض اور ہم۔ فیض میموریل لیکچر، اُردو مرکز لندن (۱۹۸۸ء)

۳۹۔ مجیب صاحب اور ہندوستانی مسلمان۔ مجیب میموریل لیکچر (۱۹۸۹ء)

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس — علی گڑھ

اقبالیات

کلیات اقبال اردو صدی ایڈیشن		۴۰/.
اقبال معاصرین کی نظر میں	وقار عظیم	۵۰/.
اقبال کی اردو نثر	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۰/..
اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم	۲۰/..
اقبال فکر و فن	سید محمد ہاشم	۶۰/..
فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۵۰/..
شکوہ جواب شکوہ مع شرح		۳/..
بانگ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/..
بال جبریل (عکسی)	〃	۱۵/..
ضرب کلیم (عکسی)	〃	۱۵/..
ارمغان حجاز (اردو) عکسی	〃	۴/۵۰

غالبیات

دیوان غالب	نورالحسن نقوی	۲۰/..
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۵/..

سرسید

مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق	۲۰/..
سرسید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	۳۰/..
سرسید اور اردو زبان و ادب	قمرالہدیٰ فریدی	۳۵/..
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۱۰/..
سرسید ایک تعارف	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۳/..

فیض

کلام فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	۲۵/..
نقش فریادی (عکسی)	〃	۷/..
دست صبا (عکسی)	〃	۷/..
زنداں نامہ (عکسی)	〃	۷/۵۰
دست تہ سنگ (عکسی)		۶/..

لسانیات و جمالیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۳۰/..
اردو زبان و ادب	〃	۱۲/۵۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۱۵/..
لسانیات کے بنیادی اصول	ڈاکٹر اقتدار حسین	۴۰/..
اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۴۰/..
جمالیات شرق و غرب	پروفیسر ثریا حسین	۲۰/..
ادب میں جمالیاتی اقدار	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۱۰/..

ادب و تنقید

خواب باقی ہیں (خودنوشت)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۵۰/..
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	۹۰/..
کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید	طارق سعید	۷۵/..
انگریزی ادب کی مختصر تاریخ	محمد یٰسین	۷۵/..
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش	عبدالمغنی	۵۰/..
نذر مسعود	مرزا خلیل احمد بیگ	۱۵۰/..
اسلوبیاتی مطالعے	پروفیسر منظر عباس نقوی	۵۰/..
جدید اردو نظم نظریہ و عمل	عقیل احمد صدیقی	۹۰/..
انشائیہ اور انشائیے	سید محمد حسنین	۴۰/..
مقدمہ کلام آتش	خلیل الرحمن اعظمی	۲۵/..
فن تنقید اور تنقید نگاری	نورالحسن نقوی	۵۰/..
اردو ادب میں طنز و مزاح	وزیر آغا	۳۵/..
جواب دوست	نسیم انصاری	۳۰/..
اردو صحافت کی تاریخ	نادر علی خاں	۸۰/..
پریم چند ایک نقیب	ڈاکٹر صغیر افراہیم	۳۰/..
احساس و ادراک	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۲/..
انیس شناسی	ڈاکٹر فضل امام	۱۶/..
چہرہ پس چہرہ	ڈاکٹر ابن فرید	۲۵/.
میں ہم اور ادب		۲۰/..
غزل کا نیا منظر نامہ	شمیم حنفی	۱۰/..
غزل کی سرگذشت	اختر انصاری	۱۲/..
اردو قصیدہ نگاری	ام ہانی اشرف	۲۰/..
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۱۵/..
اردو ناول کی تاریخ و تنقید		۳۰/..
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	۱۲/..
آج کا اردو ادب	ابواللیث صدیقی	۲۵/..
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۱۵/..
اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	۱۶/..

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

اردو تنقید کا ارتقاء — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۳۵/..
جدید شاعری — 〃 — ۴۰/..
غزل اور مطالعہ غزل — 〃 — ۳۰/..
فن افسانہ نگاری — وقار عظیم — ۲۵/..
نیا افسانہ — 〃 — ۲۵/..
داستان سے افسانے تک — 〃 — ۲۵/..
آئیے اردو سیکھیں — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۰/..
اردو کیسے پڑھائیں — سلیم عبداللہ — ۱۲/..
ادب، ادب اور اصناف — سید محمد امین — ۳۰/..
میرا فرمایا ہوا — آوارہ — ۳۰/..
اردو داستان تحقیق و تنقید — قمر الہدیٰ فریدی — ۴۰/..
انتخاب مثنویات اردو — مغیث الدین فریدی — ۶/..
مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۶/..
اردو میں افسانوی ادب — جمال آرا نظامی — ۳۰/..
کلاسیکیت و رومانیت — ام ہانی اشرف — ۱۲/..
نثر، نظم اور شعر — منظر عباس نقوی — ۷/۵۰
ستارہ یا بادبان — محمد حسن عسکری — ۱۵/..
ادب کا مطالعہ — ڈاکٹر اطہر پرویز — ۳۰/..
ادب اور زندگی — مجنوں گورکھپوری — ۲۵/..
ادبی تنقید کے اصول — مترجم اشفاق محمد خاں — ۱۵/..
باغ و بہار — مقدمہ سلیم اختر — ۱۲/..
موازنۂ انیس و دبیر — مقدمہ ڈاکٹر فضل امام — ۱۵/..
مقدمہ شعر و شاعری — مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی — ۱۸/..
امراؤ جان ادا — مقدمہ تمکین کاظمی — ۱۸/..
مجموعہ نظم حالی — مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۷/۵۰
مثنوی گلزار نسیم — 〃 — ۱۰/..
مثنوی سحر البیان — 〃 — ۱۲/..

ڈرامے

اردو ڈراما تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی — ۲۵/..
یونانی ڈراما — مترجم عتیق احمد صدیقی — ۲۰/..
انار کلی — مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن — ۱۰/..
آگرہ بازار — حبیب تنویر — ۶/..
شطرنج کے مہرے — ۷/.

سیاسیات و تاریخ

دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) — محمد ہاشم قدوائی — ۳۰/..
تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پالیٹیکل تھاٹ) — 〃 — ۲۰/..
اصول سیاسیات — 〃 — ۳۰/..
جمہوریۂ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) — محمد ہاشم قدوائی — ۲۰/..
مبادئ سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) — 〃 — ۲۵/..
مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس) — 〃 — ۷/۵۰
تاریخ و تہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری) — اے۔ اے۔ ہاشمی — ۲۰/..
اسلامی تاریخ — 〃 — ۱۰/..

فارسی

نصاب فارسی — ڈاکٹر غلام سرور — ۷/..
سخن نو حصہ اول — ۵/..
گلہائے بہار — 〃 — ۳/..
قاآنی و قصیدہ نگاری او — ڈاکٹر نصیر احمد صدیقی — ۷/۵۰
جدید کتاب فارسی حصہ اول — آفاق احمد عرفانی — ۴/..
جدید کتاب فارسی حصہ دوم — 〃 — ۴/..
جدید کتاب فارسی حصہ دوم — 〃 — ۴/۵۰

دینیات

نصاب دینیات اول — اقبال حسن خاں — ۱۲/..
نصاب دینیات دوم — 〃 — ۱۲/..
عقائد و عبادات — سید فرمان حسین — ۱۰/..
ہادیان دین — 〃 — ۱۵/..

درسی مطبوعات

اردو نثر — پروفیسر ثریا حسین — ۱۰/..
معیار ادب (نثر و نظم) — 〃 — ۹/..
اردو شاعری — پروفیسر منظر عباس نقوی — ۹/..
اردو نثر و نظم — منظر عباس نقوی، عتیق احمد صدیقی — ۱۲/..
اردو افسانے، انشائیے اور ڈرامے — محمد قاسم صدیقی — ۹/..
خاکے انشائیے ڈرامے اور افسانے — 〃 — ۱۶/..
انتخاب اردو شاعری ۱۹۲۰ء تک — ڈاکٹر قیصر جہاں — ۱۰/..
انتخاب اردو شاعری ۱۹۲۰ء کے بعد — ابوالکلام قاسمی — ۶/..
انتخاب اردو نثر ۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۰ء تک — ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی — ۱۲/..
انتخاب نثر و نظم — محمد قاسم صدیقی — ۶/..
ادبی نمونے (نثر و نظم) — ڈاکٹر نور الحسن نقوی — ۸/..
اردو نصاب حصہ اول — قمر رئیس، ظہیر احمد صدیقی وغیرہ — ۷/..
اردو نصاب حصہ دوم — ۹/..
نقوش ادب حصہ نظم و نثر — مرتبہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی — ۱۲/..
خیابان ادب حصہ نظم — عظیم الحق جنیدی — ۹/..
خیابان ادب حصہ نثر — ۹/..

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

اوراق ادب (نثر)	مرتبہ مجلس تعلیم	۱۰/۰۰
اوراق ادب (نظم)	〃	۵/۰۰
انتخاب نو (اول)	مرتبہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی	۶/۰۰
انتخاب نو (دوم)	〃	۷/۵۰
نیا ادبی نصاب (نثر و نظم)	مرتبہ اطہر پرویز و جنیدی	۱۵/۰۰
آسان اردو	ڈاکٹر مسعود عالم	۵/۰۰
بنیادی اردو	ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی	۴/۵۰
ابتدائی اردو نصاب	ابوالکلام قاسمی	۷/۵۰
جدید لازمی اردو نصاب	اسعد بدایونی	۶/۰۰
لازمی اردو نصاب	خالدہ ناہید	۵/۰۰
منظومات اردو	عثمان الحق	۵/۰۰
نثر اردو	ڈاکٹر نورالحسن نقوی	۱۵/۰۰

متفرق

ایڈوانسڈ اکاؤنٹس	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۵۰/۰۰
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاءالدین علوی	۲۵/۰۰
اصول تعلیم	〃	۲۰/۰۰
عام معلومات	〃	۱۰/۰۰
ایجادات کی کہانی	〃	۹/۰۰
علم سماجیات تصورات و نظریات		۱۲/۰۰
جدید علم سائنس	وزارت حسین	۱۵/۰۰
رہبر صحت	مسرت زمانی	۱۲/۰۰
رہبر تندرستی	〃	۱۵/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	〃	۲۵/۰۰
علم خانہ داری	〃	۲۰/۰۰
بچوں کی تربیت	〃	۱۵/۰۰
گلدستۂ مضامین و انشاپردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۱۵/۰۰
اردو صرف	ڈاکٹر انصار اللہ	۷/۰۰
اردو نحو	〃	۵/۰۰

فیروز اللغات جیبی (عکسی)		۱۵/۰۰
فیروز اللغات جدید		۲۵/۰۰
اردو شکشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھیے)		۴/۵۰
ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم۔ اے۔ شہید	۱۲/۰۰

ناول اور افسانے

حضرت جان (ناول)	قاضی عبدالستار	۶۰/۰۰
داراشکوہ (ناول)	〃	۳۵/۰۰
صلاح الدین ایوبی (ناول)	〃	۳۰/۰۰
شب گزیدہ (ناول)	〃	۳۰/۰۰
چار ناولٹ (ناولٹ)	قرۃ العین حیدر	۵۰/۰۰
روشنی کی رفتار (افسانے)	〃	۵۰/۰۰
آخر شب کے ہمسفر (ناول)	〃	۴۵/۰۰
نیلمبر (افسانے)	حمیدہ سلطان	۲۰/۰۰
آنگن (ناول)	خدیجہ مستور	۳۰/۰۰
خدا کی بستی (ناول)	شوکت صدیقی	۴۵/۰۰
انتظار حسین اور ان کے افسانے	مرتبہ گوپی چند نارنگ	۳۰/۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۳۵/۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	〃	۳۵/۰۰
چوٹیں (افسانے)	عصمت چغتائی	۲۰/۰۰
ضدی (ناولٹ)	〃	۱۲/۰۰
ہمارے پسندیدہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۲۰/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	〃	۳۰/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	〃	۲۵/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس	۲۵/۰۰
نمائندہ مختصر افسانے	مرتبہ محمد طاہر فاروقی	۹/۰۰
ایک دن بیت گیا (ناول)	صلاح الدین پرویز	۴۰/۰۰
سارے دن کا تھکا ہوا پرش (ناول)	صلاح الدین پرویز	۳۰/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

رضا علی عابدی
جرنیلی سڑک
۹۰/۰۰

پروفیسر آل احمد سرور
خواب باقی ہیں
خودنوشت
۱۵۰/۰۰

طارق سعید
کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید
۷۵/۰۰